ASIAN AND NORTH INDIAN CHURCHES IN MIDDLE AGES.

BY THE REVD. BARAKAT ULLAH M. A.

تاریخ کلیسیائے ہندوستان جلد سوم

قرونِ وسطیٰ کی

ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں

مصنفہ

پادری برکت اللہ صاحب ایم۔اے

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی — لاہور

179

تاریخ کلیسیائے ہندوستان

جلد سوم

قرونِ وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسیائیں

مصنفہ

پادری برکت اللہ ایم۔ اے

سابق کینن لاہور کیتھیڈرل و آرچ ڈیکن امرت سر ڈایوسیس

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

۱۹۶۲ء

بار اوّل — تعداد ۱۰۰۰

یہ کتاب
امرتسر ڈایوسیس کے پہلے اُسقف
جناب بشپ سی۔ آر۔ ایچ وِلکنسن صاحب
کے نام معنون کی جاتی ہے
کیونکہ اُن کی حوصلہ افزائی اور مدد کے بغیر یہ لکھی نہ جاتی۔

برکت اللہ
امرتسر ڈایوسیس کا پہلا آرچ ڈیکن

فہرست مضامین

نقشہ جات

مقدمہ

درسناں سرائے محفل دوشینہ ایم ما — ازما فسانہائے کہن ہیتواں شنید

حمد اور سپاس ہو محسن خداوند کی جس نے اپنی لا زوال محبت سے مجھ کو از سرِ نو بینائی عطا کر کے اس قابل بنایا کہ میں تاریخ کلیسیائے ہند کے سلسلہ کی یہ تیسری جلد لکھ سکوں۔

میں نے جلد اوّل "مقدس توما رسول ہند" کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ ہندوستان کی کلیسیا کے واقعات کا تعلق نہ صرف ہندوستان کے سیاسی۔ سماجی۔ اقتصادی اور مذہبی واقعات سے ہے بلکہ ان تمام ممالک کی سیاسی، دینی اور کلیسیائی تاریخ سے بھی گہرے طور پر وابستہ ہے جن کا تعلق مختلف صدیوں کے دوران میں ہندوستان کی کلیسیا کے ساتھ رہا ہے کیونکہ ان ممالک کے تاریخی واقعات نے ہندوستان کی کلیسیا کی زندگی پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے۔

میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس سلسلہ کی پہلی جلد دو دفعہ شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد کا ترجمہ ہندی زبان میں بھی ہو گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض کے مسیحی اور غیر مسیحی کلیسیا کے گذشتہ کارناموں کا مطالعہ کر کے کلیسیائے ہندوستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھائیں۔

اسلامی تاریخ کے پہلے سات سو سالوں میں عرب۔ شام۔ عراق۔ ایران اور دیگر ممالک وسطِ ایشیا کی کلیسیاؤں کا تعلق ہندوستان کی کلیسیا کے ساتھ رہا ہے۔ پس ان ممالک کی سیاسی اور دینی تاریخ کا مطالعہ ایک ناگزیر امر ہے کیونکہ ان ممالک کے سیاسی اور دینی حالات نے وہاں کی کلیسیاؤں کی قسمت کا فیصلہ کیا ہے اور ان کلیسیاؤں کی قسمت قدرتاً

ہندوستان کی کلیسیا کی قسمت سے وابستہ رہی ہے۔ پس ہم نے اس جلد کے پہلے حصہ میں عرب۔ شام۔ ایران اور وسط ایشیا کے ملکوں کے سیاسی اور دیگر حالات اور ان حالات کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

دوسرے حصہ میں ہم نے شمالی ہند کی کلیسیا کا ذکر آٹھویں صدی مسیحی یعنی صدی ہجری سے کیا ہے جب عربوں نے ہندوستان پر فوجی مہمیں اور حملے شروع کئے تھے۔ یہ جلد تیمور کے حملہ (۱۳۹۸ء) پر ختم ہو جاتی ہے۔

(۲)

مذکورہ بالا غیر ممالک کے حالات زیادہ تر اسلامی مؤرخوں کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن ان ابتدائی اسلامی صدیوں میں علم تاریخ کا موجودہ مفہوم ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ آجکل کے طلبا جانتے ہیں کہ کسی ملک کی تاریخ، اس کے باشندوں کی تاریخ من حیث القوم ہوتی ہے جس میں عامتہ الناس اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں اور اپنی شہریت کے حقوق ادا کر کے ملک اور قوم کی زندگی میں حصہ لیتے ہیں۔ ملک کے لوگوں کی صحیح تصویر صرف وہی تاریخ پیش کر سکتی ہے جو علم تاریخ کے ان اصولوں کے مطابق لکھی جائے۔ مؤرخ کا یہ کام ہے کہ قوم و ملک کی تاریخی نشو و نما کی مختلف منزلیں بیان کرے اور عوام کی زندگی کے سماجی، مجلسی یعنی اقتصادی اور سیاسی وغیرہ پہلوؤں پر وسیع نظر ڈالے۔ ملک کی مختلف سماجوں۔ گروہوں اور مذہبوں کے باہمی تعلقات اور عمل و ردِ عمل کا حال بتلائے اور مختلف سماجوں اور مذہبوں کے اصلی چیلنجوں کا صحیح مقام معلوم کرے۔ چنانچہ شبلی مرحوم فرماتے ہیں "میں علانیہ اعتراف کرتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہنچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کئے ہیں اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لئے بالکل کافی نہیں۔ . . . واقعات بھی کچھ ایسے عامیانہ طریقہ پر جمع کر دیئے ہیں کہ نہ فنون کے اسباب و علل کا مرتب

سلسلہ معلوم ہوتا ہے اور نہ ان سے کسی قسم کے دقیق تاریخی نتیجے مستنبط ہو سکتے ہیں۔ .... تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلہ میں بندھا ہے ان وابستہ داریوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ بینی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا یہی وُہ چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور رُوح ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جو اختراع و ایجاد پر زیادہ تر ناز ہے وُہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے ....

جن باتوں کو قدما نے اس خیال سے نظر انداز کر دیا کہ یہ جزئی اور عام معمولی باتیں تصنیف کی متانت کے شایاں نہیں، آج انہیں کی تلاش ہے (المامون صفحہ ۷)۔ قرون وسطیٰ میں تاریخ کا مفہوم اس کے برعکس یہ تھا کہ ملک کے بادشاہوں کی فتوحات کا ہی ذکر کیا جائے۔ سلطنت دہلی کے زمانہ کی جو چار معاصر تاریخیں ہیں ان میں زمانہ کے مذاق کے مطابق جنگوں کی داستانیں ہی ہیں۔ علمی اور تمدنی حالات کہیں کہیں ضمنی طور پر ہی درج کئے گئے ہیں جن کی تلاش کے لئے بڑی محنت اور کاوش درکار ہے۔ یہ مورخ قوم و ملک کی نشو و نما اور اس کی فطری ارتقا کی مختلف منزلوں اور مرحلوں کی جانب سے بے نیاز تھے۔

اندریں حالات ہندی اور غیر ہندی مُسلمان مؤرخوں سے یہ اُمید کرنا عبث ہے کہ وہ مسیحی کلیسیاؤں کی وسعت اور ان کی تنظیم اور زندگی کا ذکر اپنے اپنے ملک کی تاریخوں میں کریں۔ کبھی کبھار جب کسی جابر مسلمان بادشاہ نے منظم طور پر مسیحی کلیسیاؤں کو کچل دیا ہے تو انہوں نے اس واقعہ کا صرف ضمنی طور پر ہی ذکر کیا ہے۔ اس قسم کے حالات پراگندہ منتشر اور نظروں سے اوجھل ہیں جن کو تاریک گوشوں سے روشنی میں لانا اور یکجا کرنا دیدہ ریزی اور عرق ریزی کا کام ہے۔ پھر چونکہ ہندوستان کی مسیحی کلیسیا نے انجیل کے حکم کے مطابق کبھی اپنے فرمانرواؤں سے بغاوت اختیار نہ کی اور نہ سلاطین اور راجاؤں نے ان کو کبھی باغی سمجھ کر کچلا لہٰذا مؤرخوں کی کتابوں میں ان کلیسیاؤں کا ذکر

نہیں ملتا۔ اسلامی دُنیا میں مسیحی کلیسیا کو صرف اسلام کا حریف ہی سمجھا گیا اور اس سے حریف کا سا سلوک کیا گیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں مسیحیوں کی ہندوؤں کی سی اکثریت نہ تھی جو کسی سلطنت کے لئے خطرہ کا باعث خیال کی جاتی۔ پس اگر ہندو اور مُسلمان مؤرخوں نے ہندوستانی کلیسیا کی اقلیت کا ذکر نہیں کیا تو یہ کوئی جائے حیرت و تعجب نہیں ہے۔ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اُس زمانہ میں ہر واقعہ اور ہر بات دینی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور اس کی ہستی کی وقعت مذہبی معیار سے پرکھی جاتی تھی۔ پس مُسلمان مؤرخ زیادہ تر ہندو مت کے پیروؤں کی، راجاؤں کی بُت پرستی اور سلاطین کی بُت شکنی وغیرہ کے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ وہ مسیحی کلیسیا کی بیکس اور ذلیل اقلیت کو قابلِ ذکر شمار نہیں کرتے۔

موجودہ زمانہ کے ہندوستانی مؤرخ بالعموم اس حقیقت سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ سلطنت دہلی کے زمانہ میں شمالی ہندوستان میں مسیحی کلیسیاؤں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عرب، عراق، ایران اور ایشیا کے دیگر مغربی ممالک اور وسط ایشیا کی عربی، شامی، نسطوری، یعقوبی، ملکی کلیسیاؤں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی زحمت نہیں اُٹھائی۔ کسی تاریخی واقعہ سے ناواقف ہونا عیب کی بات نہیں کیونکہ کوئی ایک شخص، اگرچہ وہ کسی ملک کی تاریخ کے تمام واقعات کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن جب یہ علم ہو جائے کہ سلطنت دہلی کے زمانہ میں شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسیحی کلیسیائیں بکثرت موجود تھیں تو پھر اُن کو نظر انداز کر دینا ناقابلِ معافی جُرم ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ زیرِ تحریر جلد ہمارے مُلک کے شوقِ تحقیق و تجسس کو چوگنا کرنے میں مدد دیں گی۔

جن صدیوں کا اس جلد میں ذکر کیا گیا ہے اُن کی تاریخ کا مطالعہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے چنانچہ مرحوم مولانا ابو الکلام آزاد نے دہلی میں انڈین ہسٹوریکل ریکارڈز کمیشن کی

پچیسویں سالگرہ (دسمبر ۱۹۴۳ء) کے موقعہ پر فرمایا تھا "ہندوستان کی تاریخ کا وُہ زمانہ جو ۱۰۰۰ء پر ختم ہوتا ہے خاص طور پر مطالعہ کرنے کے قابل ہے ایس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس زمانہ کی نئے سرے سے کھوج کی جائے۔ ہم کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے ہندوستان کا کچھ کچھ علم ہے اور ہرش کی سلطنت کے زمانہ کے حالات کا بھی کچھ علم ہے لیکن ان دونوں زمانوں کے درمیانی زمانہ کا علم نہیں جس کا تعلق غزنوی سلطنت کی ابتدا سے اور اس سلطنت کا شمال مغربی ہند میں پھیلنے سے ہے[1]۔ اس زمانہ کے سماجی اور سیاسی حالات کی کوئی صاف تصویر نظر نہیں آتی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس زمانہ کی اُن فارسی کُتبِ تاریخ کا مطالعہ بھی نہیں کیا گیا جن کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ ابوالفضل بیہقی نے غزنوی خاندان کی تاریخ تیس جلدوں میں لکھی تھی لیکن تاحال ہم کو اس کے پارے ہی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان گم شدہ جلدوں کے ملنے سے اُس زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ پر نئی روشنی پڑ سکتی ہے۔ پھر بھی ہم کو اس زمانہ کی چند نئی معلومات حاصل ہو گئی ہیں جو مفید ثابت ہونگی۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد کے زمانہ کے لئے بھی ہماری معلومات کا دارومدار قریباً صرف فارسی کتابوں پر ہی ہے لیکن ہم نے عربی کتابوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کی حالانکہ ان کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ لازم ہے کہ ہمارے مؤرخ ان عربی ماخذوں کا بھی مطالعہ کریں تاکہ ہندوستان کی تاریخ میں اس زمانہ کے تجارتی۔ اقتصادی۔ سماجی اور سیاسی حالات کا ہم کو بیش از بیش علم حاصل ہو سکے"۔ جب ہمارے ملک کے قابل اشخاص اس زمانہ کا بغور و تدبر مطالعہ کریں گے تو شمال مغربی ہندوستان کی کلیسیاؤں کے اندرونی اور بیرونی حالات کا بھی زیادہ علم حاصل ہو جائیگا کیونکہ جس طرح ساتویں صدی سے

[1] یہی زمانہ شمالی ہندوستان کی کلیسیاؤں کی زندگی اور موت کا زمانہ تھا۔ (برکت اللہ)

پہلے یونانی۔ پارتھی۔ سکدی۔ اور ہن افواج نے شمال مغربی ہند کے دروں میں سے گذر کر ملک پر حملے کئے تھے جن کا اثر یہاں کی کلیسیاؤں پر ہوا تھا اُسی طرح غزنوی افواج نے بھی انہی دروں میں سے گذر کر ہندوستان پر حملے کئے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ سرحد کے صوبہ اور شہروں میں بے شمار مسیحی کلیسیائیں بستی تھیں جن کا مستقبل ان تاریخی حملوں سے وابستہ تھا۔

(۳)

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی مؤرخ خالی الذہن ہو کر تاریخ نہیں لکھتا۔ اس کے خیالات، معتقدات اور ماحول وغیرہ اگر شعوری طور پر نہیں تو غیر شعوری طور پر اس کی تحریرات پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے۔ یہ مؤرخ عموماً اگر مسلمان ہوتے تھے جو ہر واقعہ کو اپنے خصوصی مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو کُتبِ تاریخ ہم تک پہنچی ہیں وہ کئی ایک اشخاص کے ذہنوں اور دماغوں کے خیالات سے متاثر ہو کر ہی ہم تک پہنچی ہیں۔ پس مروجہ کُتب جو ہماری ماخذ ہیں تعصب اور طرفداری یا کم از کم شخصی رائے اور انفرادی میلانوں سے خالی نہیں ہیں۔ پس لازم ہے کہ تاریخی کُتب کے پڑھنے والے ان کتابوں کے نتائج کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور اصل واقعات کو مؤرخوں کے خیالات۔ جذبات اور معتقدات وغیرہ سے جدا کر کے ان کو اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ بالخصوص جب کوئی مؤرخ زمانۂ قدیم کے لوگوں کی بے حد تعریف کرتا ہے اور ان کی دلیری شجاعت۔ راستبازی اور دانشمندی کو مبالغہ آمیز الفاظ میں بیان کر کے موجودہ نسل کے لوگوں کو ان کے مقابلہ میں کم عقل۔ کوتاہ اندیش۔ بزدل۔ دغا باز غدار وغیرہ بتلاتا ہے ایسی کتاب کے نتائج سے ہم کو محتاط ہونا لازم ہے کیونکہ ایسے بیانات مشکوک ہوتے ہیں۔ جس زمانہ کا اس جلد سے تعلق ہے اس کے مؤرخین عموماً غلو اور مبالغہ۔ افراط اور تفریط سے اکثر کام لیتے ہیں ہم کو

اس بات کا حق حاصل ہے کہ ہم ایسے مؤرخوں کے خیالات، قیاسات اور نتائج کو پرکھ کر اُن سے اختلاف کریں اور اُن کی قوتِ فیصلہ اور فہم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں۔

کسی مؤرخ کے لئے لازم نہیں کہ وہ جن واقعات کو قلمبند کرتا ہے اُن کی طرف وہ لاتعلقی کا وطیرہ اختیار کرے کیونکہ غیر جانبداری کا مطلب بے تعلقی نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو معروضی زاویۂ نگاہ سے دیکھے اور داخلی امور، شخصی تعصبات اور ذاتی خیالات کو تاریخی واقعات کو سمجھنے میں مُخل و دخل انداز نہ ہونے دے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر معروضی اور خارجی ہو اور ہم تاریخی واقعات کو اُن کے درست تناسب اور صحیح تناظر میں دیکھیں۔

(۴)

کلیسیائے ہندوستان کی گذشتہ تاریخ سے موجودہ پُشت سبق حاصل کر سکتی ہے۔ گذشتہ واقعات کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ ہم کو موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ دورِ حاضرہ کی جڑیں زمانۂ ماضی میں گڑی ہوتی ہیں اور موجودہ زمانہ کا اثر مستقبل کے مقدر پر پڑتا ہے۔ جو قوم اپنے ماضی کی طرف سے غفلت اختیار کر لیتی ہے اُس کی جڑیں گل سڑ جاتی ہیں۔ پس اگر ہم نے اپنے جلالی ورثہ سے کچھ فائدہ اُٹھانا ہے تو ہمیں لازم ہے کہ ہم کلیسیا کی تاریخ پر صحیح پہلو سے نظر ڈالیں۔ مختلف واقعات کا صحیح تناسب اور تناظر میں مطالعہ کریں اور عاقبت اندیشی سے کام لے کر عملی اقدامات اختیار کریں تاکہ گذشتہ صدیوں کے جاں نثارانِ صلیب کی بے لوث خدمات اور اُن کی سرفروشانہ مساعی کے پھل ضائع نہ ہوں بلکہ کلیسیا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اس میں نئی زندگی اور نئی رُوح پھونک دیں۔ قدیم زمانہ ہی سے انجیل جلیل کا نُور ہمارے مُلک کی مذہبی

اور رُوحانی حالت کو بدلتا، سنوارتا اور منور کرتا چلا آیا ہے۔ اور انجیلی تعلیم کی ملاحت نے اس برِ صغیر کو نمکین کرنے میں مدد دی ہے۔ اب جو خُدا نے ہمارے مُلک کو خود مختاری اور آزادی بخشی ہے کلیسیا کا یہ فرض ہے کہ مُلک اور قوم کے اخلاق کو سُدھارے۔ اس کی رُوحانی حالت کو بلند کرے اور اپنے ہم وطنوں کو جہان کے منجی کے قدموں میں لائے۔ پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد میں بھی الفاظ "ہند" اور "ہندوستان" سے مُراد وہ برِ صغیر ہے جو ۱۹۴۷ء کے بٹوارے سے پہلے سلطنتِ برطانیہ کے ماتحت تھا اور جس میں اب پاکستان اور ہندوستان دونوں شامل ہیں۔

اِس جلد میں ہم نے عموماً سنِ عیسوی کا حوالہ دیا ہے لیکن کہیں کہیں سنِ ہجری کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "محمد عربی" کے مقدمہ میں سنِ ہجری کی تدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ ناظرین کی سہولت کے لئے ہم ذیل میں وہ طریقہ لکھ دیتے ہیں جس سے وہ سنِ ہجری کو سنِ عیسوی میں خود تبدیل کر سکتے ہیں۔

سنِ ہجری کے دن عموماً ۳۵۴ ہوتے ہیں اور بارہ مہینوں میں یُوں تقسیم ہیں:۔
(۱) ماہ محرم (۳۰ دن)۔ (۲) صَفر (۲۹ دن)۔ (۳) ربیع الاوّل (۳۰ دن)۔ (۴) ربیع الآخر (۲۹ دن)۔ (۵) جمادی الاوّل (۳۰ دن)۔ (۶) جمادی الآخر (۲۹ دن)۔ (۷) رجب (۳۰ دن)۔ (۸) شعبان (۲۹ دن)۔ (۹) رمضان (۳۰ دن)۔ (۱۰) شوال (۲۹ دن)۔ (۱۱) ذوالقعدہ (۳۰ دن)۔ (۱۲) ذی الحجہ (۲۹ دن)۔

کوئی سال ایسا بھی ہوتا ہے جب سال کو پُورا کرنے کے لئے آخری ماہ میں ایک دن کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ تب آخری ماہ کے دن تیس ہو جاتے ہیں۔ سنِ ہجری کو سنِ عیسوی میں تبدیل کرنے کا طریقہ حسبِ ذیل ہے:۔

(سنِ ہجری − ۳ × ہجری صدی کے اعداد / ۱۰۰) + ۶۲۱ = سنِ عیسوی

مثلاً ہجری سن ۱۴۰۰ھ = (۱۴۰۰ − ۳ × ۱۴۰۰ / ۱۰۰) + ۶۲۱ = (۱۴۰۰ − ۴۲) + ۶۲۱ = ۱۹۷۹ء

سال [illegible]ھ بروز ۲۰ اگست [illegible]ء شروع ہوا تھا۔

ایک اور مثال:۔ ۱۳۲۹ھ = (۱۳۲۹ - ۱۳۰۰×۳/۱۰۰) + ۶۲۱ = (۱۳۲۹ - ۳۹) + ۶۲۱ = ۱۹۱۱ء ۔ سالِ ہجری ۱۳۲۹ھ بروز ۲ جنوری ۱۹۱۱ء شروع ہوا تھا۔

جیسا میں اس سلسلہ کی پہلی جلد میں عرض کر چکا ہوں میں نے طالب علمی کے زمانہ میں ان ممالک کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا جن کا ذکر اس جلد میں ہے۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لئے میں نے بیسیوں کتابیں پڑھی ہیں۔ لیکن ؎

تا بجائے رسید دانشِ من   کہ بدانم ہمیں کہ نادانم

میں نے کوشش کی ہے کہ صرف مستند مشرقی اور مغربی مؤرخوں اور سیرت نگاروں کی کُتب سے استفادہ حاصل کر کے اُن کے نتائج ناظرین کے سامنے پیش کروں چنانچہ اس جلد میں شاذ کوئی ایسی بات لکھی گئی ہے جو کسی نہ کسی کتاب سے ماخوذ نہ ہو۔ کتاب کے آخر میں انگریزی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے مشرقی زبانوں کی کتابوں کے نام متن میں دیئے گئے ہیں۔ اس فہرست کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین ان کتابوں کی طرف رجوع کریں اور مختلف واقعات کی نسبت خود رائے قائم کریں۔

میں ان تمام اصحاب کا ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تالیف میں میری مدد کی ہے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے ۔

احقر العباد
برکت اللہ

کوہِ منصوری۔ پارسٹن
۱۷۔ اگست ۱۹۶۰ء

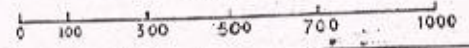
حصّہ اوّل

مغربی ایشیا اور وسط ایشیا کی کلیسیائیں

وسط اور مغربی ایشیا کے ممالک

ترکستان
خوارزم
خراسان
بحر عرب
بحیرۂ اسود
قسطنطنیہ
تفلس
آذربائیجان
بغداد
طیسفون
ہمدان
اصفہان
شیراز
کرمان
مکران
عراق
فارس
عمان
بحرین
بخارا
سمرقند
تاشقند
کاشغر
یارقند
مرو
طوس
نیشاپور
ہرات
غزنی
کابل
پشاور
قندھار
ملتان
دیبل
طبرستان
جرجان
قم
دمشق
حمص
قاہرہ
طائف
نجران
صنعا
حمیر
حضرموت
حبشہ
بادشاہت اکسوم

پیمانہ بحساب میل



باب اوّل

مسیحی کلیسیا کی ابتدائی صدیاں

فصل اوّل۔ مشرق و مغرب کی کلیسیائیں

مقدس لُوقا انجیل نویس اپنی تصنیف اعمال الرسل میں ہم کو مُجمل طور پر بتلاتا ہے کہ جب سنہ ۳۰ء کے قریب خُداوند مسیح کی ظفرمند قیامت ہُوئی تو آپ کے رسُول یروشلیم سے لے کر دُنیا کی انتہا تک مسیحی نجات کا جانفزا پیغام سُناتے چلے گئے۔ بالخصوص مقدس پولوس اور اُن کے ساتھیوں نے ۳۵ء سے ۶۰ء تک پچیس سال کے عرصہ میں جان توڑ کوشش کر کے مشرق و مغرب کے مختلف مُلکوں اور صُوبوں کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں انجیل جلیل کی تبلیغ کر کے شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں کلیسیائیں قائم کر دیں۔ دوازدہ رسُولوں نے بھی ان تھک کوششیں کر کے مشرقی ممالک کے مختلف حصّوں میں اور اُن کے شہروں میں جابجا صلیب کا جھنڈا گاڑ دیا۔ مقدس لُوقا ہم کو بتلاتا ہے کہ خُداوند مسیح کے ہزارہا سامعین جوق در جوق نہایت شوق سے اُن کی تعلیم کو سُنا کرتے تھے، اور بھیڑیں اِس قدر ہوتی تھیں کہ لوگ ایک دُوسرے پر گرے پڑتے تھے (۱۲: ۱)۔ ان ہزارہا سننے والوں نے بھی انجیل جلیل کی اشاعت و تبلیغ میں حصّہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یروشلیم کی فتح (ماہ ستمبر ۷۰ء) سے پہلے یعنی منجی جہان کے صعودِ آسمانی کے

واقعہ کے چالیس سال کے اندر اندر مشرق و مغرب کے مختلف ممالک کے یہود اور غیر یہود اور بت پرست لوگ لاکھوں کی تعداد میں نجات دہندہ کے قدموں میں آ گئے۔ مقدس پولوس نے ایشیا کے مشہور شہروں بالخصوص افسس میں صلیب کا جھنڈا لہرایا جہاں سے صلیب کے علمبردار ایشیائے کوچک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں نجات کی خوشخبری دیتے پھرے۔ انطاکیہ جیسے زبردست شہر میں اس سے بہت پہلے مسیحیت کا پیغام سنایا گیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صلیب کے جاں نثاروں کو پہلے پہل "مسیحی" کا نام ملا تھا۔

مغربی ایشیا میں یروشلیم۔ سامریہ۔ دمشق۔ قیصریہ۔ لدکیہ۔ سلوکیہ۔ لسترہ۔ طرسس وغیرہ شہروں میں اور یہودیہ۔ شام۔ سلیسیا۔ کپدوکیہ۔ پونٹس۔ گلتیا۔ پمفیلیہ۔ اسوریہ۔ فرگیہ۔ بتھنیہ وغیرہ صوبوں کے بے شمار شہروں اور قصبوں میں مسیحیت کا پیغام سرعت کے ساتھ پھیل گیا۔ یونان کے شمال کی جانب اخیہ۔ مقدونیہ۔ تھریسیا کے صوبوں میں اور بالخصوص تھسلنیکا۔ بیریا۔ فلپی۔ ایتھنز۔ کارنتھ۔ سینچریا کے شہروں، اور اُن کے مضافات میں کلیسیائیں جا بجا نہایت تیز رفتاری سے قائم ہو گئیں۔ سکندریہ میں اور سلطنت کے پایۂ تخت روم میں ہزاروں مسیحی بستے تھے اور انجیل جلیل کا جانفزا پیغام ہسپانیہ کے ملک تک جا پہنچا تھا۔ صلیب کے مختلف جانبازوں نے یہ سب کچھ پہلی صدی کے آخر تک سرانجام دے دیا۔

عرب میں انجیل کا جلیل پیغام پہلے پہل مقدس متی رسول اور مقدس برتلمائی رسول نے پہنچایا۔ جیسا ہم جلد اوّل میں بتلا چکے ہیں، مقدس توما رسول نے پہلے شمالی ہندوستان میں اور پھر جنوبی ہند میں خداوند کی انجیل سنائی۔ اور متعدد مقامات میں کلیسیائیں قائم کیں اور بالآخر مدراس کے قریب شہید ہو گئے۔

ارضِ مقدس کنعان کے دونوں طرف کے ملکوں یعنی شام اور مصر میں دوسری صدی میں لاکھوں مسیحی رہتے تھے۔ ملک شام میں انطاکیہ کا شہر اس جانب کی کلیسیاؤں کا مرکز تھا جہاں سے انجیل جلیل کی اشاعت دور دور تک مشرق اور جنوب کی طرف ہو گئی۔ ایسا کہ دوسری صدی کے ختم ہونے سے پہلے یا نصیبا کی حدود پر بھی مسیحی اپنے ایمان پر قائم رہنے کی خاطر شہید کئے گئے۔ ہم جلد اوّل میں ایڈیسہ کے بادشاہ ابگرس کا ذکر کر آئے ہیں۔ ۱۷۰ء کے بعد یہاں کے بادشاہ اور لوگ مسیحی تھے۔ ایشیائے کوچک میں مسیحیت نے ملک کے اندرونی حصوں میں اور بالخصوص فرگیہ میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی لیکن ایشیائے کوچک کا مغربی حصہ ترقی کی سرعت میں اس سے بھی گوئے سبقت لے گیا۔ چنانچہ بتھنیہ کے رومی حاکم پلینی (از ۱۰۹ء تا ۱۱۱ء) نے رومی قیصر ٹراجن کو لکھا کہ مسیحیت ملک کے ہر شہر اور قصبہ میں ہر طبقہ کے لوگوں میں اس قدر پھیل گئی ہے کہ مندر سونے پڑے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ میں کیا کروں، تاکہ آپ کے حکم پر عمل کیا جائے۔ دوسری صدی کے دوسرے نصف میں مسیحیت نہایت سرعت کے ساتھ ملک شام کے باشندوں کے ہر طبقہ میں پھیل گئی۔ یہ لوگ سریانی زبان بولتے تھے۔

ارضِ مقدس کنعان کے مغرب میں مقدس پولوس رسول نے صلیب کا جھنڈا گاڑا تھا۔ یہاں سے نئی کلیسیائیں ہر طرف اور ہر جگہ رومی سلطنت کے کونے کونے میں نمودار ہو گئیں۔ ان مغربی کلیسیاؤں میں روم کی کلیسیا ممتاز ترین کلیسیا تھی جس میں ہر طبقہ کے لوگ، کیا ادنیٰ، کیا اعلیٰ، حتیٰ کہ قیصر کے گھرانے کے افراد تک شامل تھے۔ ان تمام کلیسیاؤں کی زبان یونانی تھی جو مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کی بھی زبان تھی۔ اس زبان میں اناجیل جلیل کی کتابوں کی زبان ہو گئی تھی مشرق و مغرب کے ممالک کی کلیسیاؤں کی یگانگت کو قائم و برقرار رکھا۔ یہ کلیسیائیں روز افزوں ترقی کرتی گئیں۔ خیال رہے کہ روم اور دیگر ممالک کے فرمانرواؤں نے مسیحی بشپوں اور مبلغوں کو طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ عام مسیحیوں کو بھی ایسی ایسی عقوبتیں دی گئیں

کہ ان کے خیال سے ہی بدن پر رعشہ پڑ جاتا ہے لیکن بایں ہمہ یہ کلیسیائیں ایسی حیرتناک ترقی کر گئیں کہ تمام ممالک کے غیر مسیحی انگشت بدنداں تھے اور مسیحیت کی کامیابی پر دانت پیستے تھے۔ دوسری تیسری صدی کے مسیحی مبلغین مثلاً جسٹن شہید، ٹرٹولین وغیرہ فخریہ ان غیر مسیحیوں کو کہتے تھے کہ دنیا کا کوئی ملک اور شہر ایسا نہیں رہا جہاں انجیل کا جانفزا مژدہ نہیں گیا۔ ہر مشرقی اور مغربی ملک میں بے شمار مسیحی بستے تھے جو یہودی اور غیر یہودی اور بت پرست مذاہب سے منجی جہان کے قدموں میں آئے تھے۔ مؤرخ گبن کا قیاس ہے کہ تیسری صدی کے نصف میں جب رومی قیاصرہ کی ایذا رسانیاں پے در پے جاری تھیں خاص روم کے شہر میں پچاس ہزار مسیحی بستے تھے۔ بالفاظِ دیگر تمام شہر کا بیسواں حصہ مسیحی تھا۔ اس کا یہ بھی قیاس ہے کہ متواتر ایذاؤں کے باوجود تمام رومی سلطنت کا بیسواں حصہ ۳۱۲ء میں مسیحی تھا۔ لیکن قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسیحیوں کی تعداد درحقیقت ان اعداد و شمار سے کہیں زیادہ تھی۔

دوسری صدی کے آخر میں مسیحیت نے اُن ممالک میں ترقی کی جن کی زبان یونانی نہ تھی بلکہ لاطینی زبان تھی۔ چنانچہ شمالی افریقہ میں مسیحی کلیسیائیں تیسری صدی میں بڑی تیز رفتاری سے پھیل گئیں۔ ان کلیسیاؤں کی ابتدا غالباً روم کے عوام مسیحیوں کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ تھیں۔ یہ مسیحی مبلغ غالباً تاجر تھے جو اطالیہ کے ملک سے نقل مکانی کر کے وہاں بس گئے تھے۔ مسیحیت نے یہاں ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ تیسری صدی کے شروع میں ہم کو بے شمار افریقی بشپ نظر آتے ہیں۔ ملک گال میں بھی دوسری صدی کے دوسرے نصف میں بہت شہروں میں کلیسیائیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں لائینز اور وینی (LYONS VIENNE) کی کلیسیائیں مشہور تھیں۔ ان کی ابتدا ایشیائے کوچک کے مبلغین نے کی تھی۔

ارضِ مقدس کے مغرب کی جانب مصر کے ملک میں دوسری صدی میں لاکھوں مسیحی رہتے تھے۔ مصر کے مغرب کی جانب سائیرانیکا میں مسیحیت دوسری صدی کے اوائل میں پھیل گئی۔ عرب کے متعدد قبائل دوسری صدی میں مشرف بہ مسیحیت ہو گئے تھے۔ جیسا ہم بتلا چکے ہیں خداوند مسیح کے رسولوں نے پہلے پہل یہاں انجیل کا جانفزا پیغام سنایا تھا۔ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ حبش (ابی سینیا) میں کب مسیحیت کا پیغام پہنچا لیکن ۴۸۰ء میں یعنی رسولِ عربی کی پیدائش سے ایک صدی پہلے اس ملک کی ایک بڑی تعداد مسیحی تھی اور یہ سلطنت مسیحی سلطنت کہلاتی تھی۔ وہاں کی کلیسیا کا سردار اب "ابونا" کہلاتا ہے اور اس کو مصر کا پیٹرپارک نامزد کرتا ہے قبطی کلیسیا بعد میں "مونوفی زائٹ" یعنی مسیح کی وحدتِ ذات ماننے والی ہو گئی اور آج تک اس کے یہی عقائد ہیں۔ حبش کی کلیسیا بھی یہی عقیدہ رکھتی ہے۔ آج کل قبطی کلیسیا کے ۱½ لاکھ سے زیادہ شرکاء ہیں۔ اس کلیسیا کا پیٹرپارک اب تک سکندریہ کا پیٹرپارک کہلاتا ہے اگرچہ اس کی رہائش گاہ قاہرہ میں ہے۔ اس کی عبادتیں قدیم قبطی زبان میں ہوتی ہیں اگرچہ اب اس کی بجائے عربی بعض اوقات استعمال کی جاتی ہے۔

مصر کی کلیسیا "مونوفی زائٹ" ہی رہی لیکن شام کی کلیسیا تقسیم ہو گئی۔ اس کے شرکا نسطوری ہو گئے۔ ہم نے جلد دوم میں نسطوری کلیسیا کا مفصل ذکر کیا ہے۔

نسطوریس ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کا پیٹرپارک مقرر ہوا تھا۔ افسس کی کونسل نے ۴۳۱ء میں اس کے خلاف بدعت کا فتویٰ صادر کیا۔ اس کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن وہ اس

فتوے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہا اور کہتا تھا کہ جس بدعت کی بنا پر اُس کے بدخواہوں نے اُس پر فتویٰ لگایا ہے وہ اس قسم کے خیالات سے خود بیزار ہے بلکہ وہ خود جب صاحبِ اختیار تھا تو بدعتیوں کی سرکوبی کیا کرتا تھا۔

چھٹی صدی کے نصف میں مار یعقوب عرف البردائی JACOB BARADAEUS (تاریخ وفات ۵۷۸ء) نے اس فرقہ کے پھیلانے میں جان توڑ کوشش کی۔ وہ ۵۴۱ء میں بشپ کے عہدے پر ممتاز ہوا اور اُس نے اسی ہزار شماسوں اور قسیسوں کا تقرر کیا۔ اس کی جانکاہ محنت کی وجہ سے اِس فرقہ کے مخالف اس کو "جیکوبائٹ" کہتے ہیں۔ اس فرقہ کی کلیسیا کا سر انطاکیہ کا پیٹریارک" کہلاتا ہے اگرچہ صدیوں سے اس کی رہائش دجلہ کی وادی میں رہی ہے۔

تیسری صدی کے اواخر میں گریگوری کی تبلیغی کوششوں سے آرمینیا کا ملک مسیحی ہو گیا۔ اُس نے وہاں کے بادشاہ تری داتس (۲۳۸ء تا ۳۱۴ء) کو بپتسمہ دیا۔ تمام مسیحی کلیسیا کی تاریخ میں آرمینیا پہلا ملک تھا جس کا بادشاہ پہلے پہل مسیحی ہوا، قسطنطین قیصر روم نے ابھی تک مسیحیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس ملک کی کلیسیا نہایت سرعت کے ساتھ روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ اس کلیسیا کو گریگوری کی وجہ سے گریگوری کلیسیا بھی کہتے ہیں۔ اب بیسویں صدی کے شروع میں اس کلیسیا کے شرکا کی تعداد تیس لاکھ کے قریب تھی۔

اِن کلیسیاؤں کے نظام وعقائد کے اختلافات دراصل خداوند مسیح کی طبیعت و ذات کے نظریہ پر مبنی تھے۔ طبیعت کے مفہوم میں سب سے مقدم قوت اور جوہر فعال ہیں۔ اصلی مسئلہ یہ ہے کہ آیا آنخداوند کی ذات میں انسانی اور الٰہی ارادہ اور فعل ایک تھے یا نہیں۔ طبیعتِ واحد کے پرستار (مونوفزائٹ یا یعقوبی)

انسانی عنصر کو رد کر کے خداوند مسیح میں وحدت کو نمایاں جگہ دیتے تھے۔ اس کے خلاف نسطوری کلیسیا ارادے اور فعل کے مقابلہ میں مخصوص انسانی وجود ، ارادے اور فعل پر زور دیتی تھی۔ یہ کلیسیا طبیعتِ الٰہی اور طبیعتِ انسانی میں تمیز کرتی تھی۔ طبیعتِ واحد کے پرستاروں کے مطابق خداوند مسیح کی ذات میں الوہیت اور انسانیت دونوں موجود تھیں۔

(۳)

اِن ابتدائی صدیوں میں مسیحی علما اور فضلا نے اہل یہود اور بُت پرست عالموں کے جواب دینے اور مسیحی عقائد کی توضیح و تشریح کرنے کے لئے بے شمار کتابیں یونانی، لاطینی اور سریانی وغیرہ زبانوں میں تصنیف کیں۔ آئرنیوس۔ سکندریہ کے کلیمنٹ۔ اوریجن۔ ٹرٹولین۔ ہپولیٹس۔ یوسیبیس جیسے فضلائے روزگار کے نام فوراً زبان پر آجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سکندریہ کا اتھاناسیس۔ گریگوری تھومیٹرگس۔ جولیس افریقینس۔ لکٹن ٹیس۔ نووے شیئن۔ وکٹورینس۔ ہیمرفیس۔ مانچوڈس۔ انطاکیہ کے لوسین وغیرہ بیسیوں علما نے مسیحیت اور مسیحی فلسفہ پر کتابیں تصنیف کر کے ہزاروں دانشوروں کو مسیح کا غلام بنا لیا۔ ان مسیحی فضلائے نامدار کی کتابیں اب بھی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

کپدوکیہ کا سکول مسیحی اساتذہ کے لئے مشہور تھا چنانچہ قیصریہ کا باسل اور نیزی اینزن کا گریگوری اور نیسا کا گریگوری جیسے مسیحی فضلا اس کے روشن ستارے تھے جو یگانۂ روزگار تھے۔ ان سب میں نیسا کا گریگوری زیادہ قابل اور فاضل عالم تھا۔ یہ علما ۳۶۲ء سے ۳۹۲ء تک کلیسیا کے جامع کے زبردست رہنما تھے۔ انطاکیہ کا سکول قدیم سے چلا آتا تھا اور سکندریہ جیسے عظیم الشان مدرسہ کا رقیب تھا گو اس میں سکندریہ کے سے علامۂ دہر نہ تھے۔ اس

مدرسہ کی بناء کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ شہر قدیم زمانہ ہی میں مسیحی ہو گیا تھا اور غیر یہود مسیحیوں کا پہلا مرکز تھا۔

ان ابتدائی صدیوں کے مسیحی فضلاء میں سکندریہ کے سکول کے علماء سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے ہر ایک علامۂ دہر اور فرزانۂ روزگار تھا مثلاً پنٹی نیس کا ذکر ہم نے جلد دوم کے باب اول میں کیا ہے۔ برہمنوں کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے ۱۹۰ء میں ہمارے ملک ہندوستان میں آیا تھا۔ اس کا شاگرد کلیمنٹ (از ۱۵۰ء تا ۲۲۰ء) قدیم مسیحی علماء کا سرتاج تھا۔ کلیمنٹ کے شاگرد اوریجن (از ۱۸۵ء تا ۲۵۴ء) نے سکندریہ کے سکول کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ سکول مسیحی کلیسیا میں اس قدر مشہور تھا کہ تمام مشرق و مغرب کے مسیحی علماء کی گردنیں اس کے سامنے جھکتی تھیں۔ اسی وجہ سے سکندریہ کا بشپ "تمام دنیا کا پوپ" کہلاتا تھا۔

ایشیائے کوچک کی کلیسیائیں دوسری صدی میں علم و فضل کا مرکز تھیں۔ اس میں آئرینیوس۔ اگنیشیس۔ پولیکارپ اور پیپٹو جیسے زبردست علما تھے۔ ہپولیٹس بھی اسی صدی میں تھا۔ اگرچہ اس نے اور آئرینیوس دونوں نے مغربی ممالک میں اپنی تبلیغی اور کلیسیائی خدمات انجام دیں لیکن یہ علماء مشرقی کلیسیا کے تھے اور عمر بھر یونانی زبان میں ہی اپنی کتابیں تصنیف کرتے رہے۔ آئرینیوس ۱۷۷ء میں شہر لائنز کا بشپ مقرر ہوا۔ وہ سمرنا کے بشپ پولی کارپ کی صحبت میں رہا تھا جس نے مقدس یوحنا کی صحبت کا فیض حاصل کیا تھا۔ ایشیائے کوچک کی کلیسیائیں پشت در پشت علم و فضل کا مرکز رہیں چنانچہ خلفائے اسلام کے شروع زمانہ میں دمشق کا مقدس یوحنا علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھا۔ اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

افریقہ کی کلیسیا کا سکول زبردست علماء اور جید فضلا پر مشتمل تھا۔ اس سکول کے مصنف لاطینی زبان میں کتابیں تصنیف کرتے تھے۔ ٹرٹولین (از ۱۶۰ء تا ۲۳۰ء) اپنے زمانہ کے اعلیٰ ترین علماء میں سے تھا۔ اس کے بعد کی پشت میں سپرین قابل ترین علماء میں سے تھا۔ وہ کارتھیج کا بشپ تھا اور ایسا جوشیلا غیور مسیحی تھا کہ اس نے جائز آرام کو بھی اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا تاکہ مسیح کی خاطر کلیسیا کی احسن طور پر خدمت کر سکے۔ جب وہ ۲۶۱ء میں شہید کیا گیا تو فتوے دینے والے بت پرست حاکم پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ سپرین کی شہادت نے اس پر ایسا اثر کیا کہ وہ چند روز بعد خود مر گیا۔ اس کلیسیا میں اتھاناسیس جیسے زبردست عالم تھے جنہوں نے ہمیشہ کے لئے کلیسیا کے عقائد کو وضع کر دیا۔ جان خرسستم (تاریخ پیدائش ۳۴۵ء) اپنے زمانہ کا فاضل روزگار تھا۔ وہ ایسا فصیح البیان تھا کہ اس کا نام ہی خرسستم (زرین زبان) پڑ گیا۔ ۳۹۶ء میں اس کو قسطنطنیہ کا پیٹریارک بنا دیا گیا حالانکہ یہ اس کی خواہش نہ تھی۔

(۳)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسیحیت کی حیرت انگیز اشاعت کو کرنے والے نہ عالم تھے اور نہ فاضل، اور نہ وہ گدی نشین تھے۔ وہ عام خدا رسیدہ انسان تھے جو سرگرم مسیحی تھے۔ انہوں نے اپنے روحانی تجربہ سے یہ بات حاصل کر لی تھی کہ خدا ان سے لازوال محبت رکھتا ہے جس کا مکاشفہ خداوند مسیح کے ذریعہ ہوا ہے اور جس کی وجہ سے وہ شیطان کی غلامی سے نجات پا گئے ہیں۔ یہ ایمان ہر شخص کو مجبور کرتا تھا کہ دوسروں کو بھی اس محبت بھرے خدا کا عرفان حاصل ہو۔ ان کے ولولۂ محبت نے ہر قسم کی رکاوٹوں پر فتح حاصل کی۔ ان کے اس جذبہ نے ان کے تبلیغی جنون اور جوش کو دوبالا کر رکھا تھا۔ یہ مبلغ عام انسان تھے جو بہت لکھے

پڑھے نہ تھے لیکن ان کو معرفت الٰہی حاصل تھی۔ وہ نہ تو بشپ تھے اور نہ قسیس اور شماس تھے وہ نہ تو کلیسیائی تنظیم میں کسی عہدہ پر ممتاز تھے اور نہ وہ کسی عہدے اور شہرت کے طالب تھے۔ ان مبلغوں کے وطن میں تبلیغ کے لئے روپیہ کسی منظم طور پر جمع نہیں کیا جاتا تھا جس سے نوزائیدہ کلیسیاؤں کی پرورش اور ترقی ہوتی رہے۔ اور نوزائیدہ کلیسیائیں بالعموم پردیسی مبلغین اور پردیسی ممالک کے روپیہ کی جانب سے جلدی بے نیاز ہو جاتی تھیں۔ کلیسیاؤں کے مبلغ زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے تھے لیکن جہاں بھی وہ جاتے وہ خدا کی لازوال محبت کا پیغام ہر کس و ناکس کو پہنچاتے تھے۔ ان مبلغوں میں بہت سے غلام تھے جو اپنے ساتھی غلاموں کو خدا کے محبت والے درد بھرے دل کا پیغام سنا کر ان کو نجات دہندہ کے قدموں میں لاتے تھے۔ غرضیکہ جو مسیحی جس کوچہ میں رہتا وہ اپنے ہمسایوں کو انجیل جلیل کی یہ خوشخبری دیتا کہ خدا اُن کے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور اُن کو فضل عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ یہ مبلغ تنخواہ دار نہ ہوتے تھے بلکہ جوشیلے ایمان دار تھے جو فرض شناس تھے اور لوگوں کو اپنے منجی کے قدموں کے پاس لائے بغیر رہ نہ سکتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک مقدس پولوس کی طرح اپنا کام کر کے اپنی کمائی سے پیٹ بھرتا تھا اور اُس کے ہم آواز ہو کر کہتا تھا "مجھ پر افسوس اگر میں مسیح کی منادی نہ کروں"۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق و مغرب کے ممالک میں مسیحیت کی تحریک ہر شہر اور قصبہ میں بڑے زوروں پر چل پڑی اور جگہ جگہ مسیحی کلیسیائیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ یہ عوام کی تحریک تھی اور عام لوگوں نے ہی ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں خداوند کی وفات کے ایک سو سال کے اندر اندر چھوٹے

بڑے شہروں میں کلیسیاؤں کی ابتدا کی۔ کوئی نہیں جانتا کہ فلاں شہر میں کس نے صلیب کا جھنڈا پہلے پہل گاڑا کیونکہ ان شہروں کے اولین مبلغین گمنام اشخاص تھے۔ تاریخ ان کے ناموں سے ناآشنا ہے لیکن ان کے نام کتابِ حیات میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر دو عظیم ترین شہروں کو لے لو۔ کوئی شخص وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ روم اور سکندریہ میں کس نے پہلے پہل انجیل کا پیغام پہنچایا۔ روایت ہے کہ روم میں مقدس پطرس نے یہ کام سرانجام دیا لیکن جب مقدس پولوس روم قید ہو کر گئے تو وہاں ہزاروں مسیحی موجود تھے اور مقدس پطرس تو مقدس پولوس کے بعد وہاں گئے تھے۔ اسی طرح روایت ہے کہ مقدس مرقس نے سکندریہ میں مسیحی [illegible]ت کا پیغام پہلے پہل پہنچایا لیکن اس روایت کی پشت پر کوئی تاریخی شواہد موجود نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ خداوند کی نجات کے مژدہ دینے والے معمولی گمنام تاجر اور غلام اور دیگر افراد تھے جو ادنیٰ طبقہ کے شمار کئے جاتے تھے لیکن وہ گمنام رہے۔ ہندوستان کی کلیسیا کے لئے یہ حقیقت نہایت سبق آموز ہے کیونکہ وہ اپنے سہارے اور ملک کی تبلیغ کے لئے مغربی ممالک کی دست نگر رہتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کلیسیا کی اشاعت بیرونی موافق حالات پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی کا تمام انحصار اس کی اپنی اندرونی طاقت پر ہے جس کی وجہ سے وہ تبلیغ و اشاعت کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ بیرونی حالات خواہ کیسے ہی موافق یا غیر موافق کیوں نہ ہوں جب تک مسیحی اپنے نجات دہندہ کی محبت سے سرشار نہ ہوں مسیحیت کی اشاعت ناممکن امر ہو جاتی ہے۔ یہ نہایت سبق آموز مقام ہے جو ہندوستان کی کلیسیا کے لئے تازیانہ کا کام دیتا ہے۔

کلیسیا کی تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مشرقی ممالک میں مسیحیت کی

اشاعت کا طریقہ یہی رہا ہے کہ پہلے پہل چند افراد نے تاجروں، راہبوں اور مبلغوں کے ذریعہ اس کو قبول کیا۔ ان افراد کو ایذائیں اور مصیبتوں کا بھاری توڑ مقابلہ کرنا پڑا جن کی انہوں نے مطلق پروا نہ کی۔ اس کے بعد مسیحیت کی تحریک بڑھتی گئی اور لوگ جوق در جوق مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ ایک دو صدیوں کے بعد حکمران سمیت ملک کا ملک اور قوم کی قوم مسیحیت کو اختیار کر لیتی رہی حتیٰ کہ مسیحی مذہب چند افراد کا مذہب ہونے کی بجائے ملک و قوم کا مذہب ہو جاتا رہا جس کو ترک کرنا ملک، قوم، قبیلہ اور وطن کے ساتھ غداری کرنے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

مسیحیت کی ترقی کا ایک بیّن سبب یہ بھی تھا کہ ان ممالک کے مذاہب کچھ ابتدائی قسم کے تھے۔ اور بت پرستی اور مظاہر قدرت کی پرستش میں مبتلا تھے۔ پس وہ مسیحیت کے مقابل کھڑے نہ رہ سکے۔ ہاں جن ممالک میں بت پرستی، سماج کا جزو بن گئی تھی مثلاً ہندوستان، وہاں اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مسیحیت کے پہلے پانچ سو سال میں اور اس کے آگے کے ایک ہزار سالوں میں ایک اور بڑا فرق یہ تھا کہ پہلی پانچ صدیوں میں وہ مشرق و مغرب کے ایسے ممالک میں گئی جہاں تہذیب و تمدن کی منازل بہت ترقی پر تھیں لیکن ان ممالک کے مذاہب اور فلسفہ ترقی کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ پس ہر چہار طرف ان کے باشندے ایسے عقائد کی جستجو میں تھے جو ان کے زمانہ کے نئے حالات کے مطابق ہو کیونکہ ان کے اپنے مذاہب ان لوگوں کے سوالات کے جواب دینے کے قطعی اہل نہ تھے۔ پس مسیحیت کو ہر طرف فاتحانہ ترقی حاصل ہوتی گئی۔ ہم نے اس نکتہ پر اپنی کتاب نور الہدیٰ میں مفصل بحث کی ہے۔

مسیحیت کی تحریک ایسے زبردست پیمانہ پر چلی کہ کسی کے دبانے سے نہ دبی۔ بادشاہ سے لے کر گدا تک اس کے خلاف تھے لیکن یہ ایک رَو تھی جو کسی کے روکنے سے نہ رکی۔ مشرق و مغرب کے ممالک کے عوام اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ کر اس کے مجنون پیروؤں کا ٹھٹھا کرتے تھے۔ ان پر طرح طرح کے الزام تراش کر لگاتے تھے۔ حتیٰ کہ تین صدیوں تک وہ ان پر خون آشامی اور دیگر ہیبت ناک جرائم کے الزام لگاتے رہے۔ مشرق و مغرب کے فلاسفہ مسیحیت کو خلافِ عقل ثابت کرنے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ اہل یہود اس کے پیروؤں کے خون کے پیاسے تھے۔ بت پرست کاہن اور آتش پرست موبد اس کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ مشرق میں ساسانیوں کی سلطنت کے شاہنشاہ شاپور اعظم سے لے کر آخری شہنشاہ تک سب کے سب صدیوں تک مسیحیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا قتل عام کرتے رہے۔ رومی سلطنت کے قیصر بھی نیرو سے لے کر قسطنطین تک چار صدیاں مسیحیت کی بیخ کنی میں مشغول رہے۔ یہ دونوں سلطنتیں ایک دوسرے کی دشمن جان تھیں لیکن دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ مسیحیوں کو جہاں پائیں ان کا استیصال کر کے رہیں۔ لیکن مشرق و مغرب کی کوئی طاقت مسیحیت کی تحریک کو نہ روک سکی۔ مسیحیوں کا یہ حال تھا کہ جیسا مورخ گبن لکھتا ہے جس کو دیکھو وہ شہادت کے شوق میں سرگرداں تھا۔ مشرق و مغرب کے ممالک کے اعیان سلطنت تک شہادت کے شوق کے جذبہ سے سرشار ہو کر مقتل میں کود پڑتے تھے۔ شہداء کا خون دیگر کلیسیاؤں کا بیج ثابت ہوا اور جہ ہر جگہ شہیدوں کے خون سے سینچی گئیں لیکن باایں ہمہ وہ روز بروز ترقی کرتی گئیں ایسا کہ رسول عربی کی پیدائش کے وقت مشرق و مغرب کے براعظموں میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جس کے شہروں اور قصبوں

میں مسیحی کلیسیائیں موجود نہ تھیں۔ اسلام کی آمد سے پہلے مشرق و مغرب کی کلیسیائیں منظم طور پر انطاکیہ، سکندریہ، قسطنطنیہ اور روم کے پیٹریارکوں کے ماتحت پھلتی پھولتی اور بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جا رہی تھیں۔

فصل دوم قبل از اسلام عرب کی مسیحی کلیسیائیں

روایت ہے کہ خداوند مسیح کے دوازدہ رسولوں میں سے رسول برتلمائی نے پہلے پہل عرب میں اپنے آقا کی نجات کا پیغام سنایا تھا۔ ابن خلدون چودھویں صدی کے آخری نصف میں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ "حضرت برتلمائی عرب اور حجاز کی جانب بھیجے گئے تھے"۔ روایت کے مطابق مقدس برتلمائی نے حمیر لوگوں میں انجیل جلیل کی منادی کی تھی۔ عرب میں کلیسیائیں تیزی کے ساتھ بڑھتی گئیں ایسا کہ ۲۲۵ء میں بیت قطریہ (جو عرب کے جنوب مغرب میں بحرین جزائر کے مقابل ہے) ایک بشپ کا اسقفی علاقہ تھا۔

جب ایران کے ساسانی شہنشاہوں نے ایذا رسانیاں شروع کیں تو ایران کے مسیحی عرب کے جزیرہ نما میں آ کر پناہ گزین ہو گئے۔ یہ نسطوری مسیحی جنوبی عرب میں بھی آ بسے اور نجران۔ یمن۔ حضر موت اور عمان کے صوبوں میں رہنے لگے۔ عرب کے مؤرخین ہم کو بتلاتے ہیں کہ عرب کے قبائل قضاعہ۔ سلیح۔ اور غسان مسیحی ہو گئے تھے۔ حیرہ اور یمن کے ملوک بھی عیسائی تھے۔ ان ملوک میں سے طے۔ بہراء۔ لخم۔ اور ایاد عیسائی تھے۔ علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ "عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقتور غسانی قبیلہ تھا جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح کام کرتے تھے۔ بہراء۔ وائل۔ بکر۔ لخم۔ جذام، عاملہ وغیرہ قبائل ان کے ماتحت تھے۔ ان کے علاوہ دومۃ الجندل۔ ایلہ۔

جربا۔ ارح۔ تبالہ۔ جرش وغیرہ کے رئیس یہودی اور عیسائی تھے"۔ بنی حارث یمن کے شمال میں نجران میں رہتے تھے جو ایک شامی مسیحی مبلغ کی طفیل منجی عالمین کے قدموں میں آ گئے تھے۔ حمیر کی بادشاہت مسیحی تھی۔ مترجم قرآن سیل کے مطابق ربیعہ۔ تغلب اور تنوخ کے قبائل بھی مسیحی تھے اور نجد اور حرتہ قبائل کے بہت لوگ مسیحی تھے۔ ڈاکٹر زویمر کی تحقیق کے مطابق مدینہ اور کوفہ کے درمیانی علاقوں کے قبائل بھی مسیحی تھے۔ نجد کے شعراء "ایام جاہلیت" میں مسیحی تھے۔ ۳۸۰ء میں حرتہ اور کوفہ میں مسیحی بستے تھے۔ ۵۱۲ء میں حرتہ کا بادشاہ المنذر مسیحی ہو گیا۔ حرتہ کے میٹروپولیٹن شمعون نے اس کو بپتسمہ دیا تھا۔ اس کی بہن ہند بھی مسیحی ہو گئی اور اس نے ایک خانقاہ عورتوں کے لئے بنائی جہاں وہ خود بھی راہبہ تھی۔ کوفہ۔ بیت رمن۔ بصرہ۔ قرنہ میسینی کے اسقف اور حرتہ کا میٹروپولیٹن سب سلوکیہ کے پیٹریارک کے ماتحت تھے۔

عرب کے جو قبائل رومی قیصروں کے خیر خواہ تھے وہ بھی قدیم زمانہ ہی سے مسیحی ہو گئے تھے۔ اعمال ۲/۱۱ سے ظاہر ہے کہ جب عید پنتیکوست کے روز روح القدس کا نزول ہوا تو متعدد عرب خداوند مسیح پر ایمان لے آئے تھے۔ مقدس پولوس بپتسمہ پانے کے بعد عرب چلے گئے تھے (گلتی ۱/۱۷) جہاں وہ مسیحی بادشاہ حارث کے علاقہ میں رہے جس کی بادشاہت میں دمشق شامل تھا۔ (اعمال ۹/۲۵ و ۲ کرنتھی ۱۱/۳۲)۔ نیکایاہ کی کونسل میں عرب کے چھ بشپ موجود تھے جن میں سے ایک بصرہ کا بشپ تھا۔ ان قدیم عربی کلیسیاؤں کے بعض مسیحی اس بدعت میں مبتلا تھے کہ انسان کی روح اس کے بدن کے ساتھ ہی مر جاتی ہے اور کہ وہ دونوں قیامت کے روز زندہ کئے جائیں گے۔ جوں جوں عرب کے ساتھ روم اور قسطنطنیہ کے تعلقات بڑھتے گئے مسیحیت عربوں میں

پھیلتی گئی قسطنطنیہ۔ افسس اور کیلسڈونیہ کی کونسلوں میں عرب بشپوں کے دستخط مثلاً عبداللہ۔ وہب اللہ وغیرہ موجود ہیں۔

عرب میں مسیحی مذہب زیادہ تر اُن تارک الدنیا اور عزلت نشین راہبوں کی طفیل پھیلا جو صحرا اور بادیہ میں رہتے تھے۔ اگرچہ مسیحیت کی تبلیغ واشاعت راہبوں کے ذریعہ ہُوئی لیکن راہبوں کا اوّلین فرض تبلیغ نہ تھا کیوں کہ وہ ریاضت کش تھے اور غاروں میں رہتے تھے لیکن وہ تمام لوگ جو دُنیا سے اُکتا چکے تھے ان راہبوں کی جانب قدرتاً کھنچے چلے آتے تھے۔ عربی راہب شمعُون (SIMON STYLITES) کی تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ متعدّد عرب قبائل مسیحیت کی آغوش میں آگئے۔ اس کا نام یمن کے گوشہ گوشہ میں مشہُور تھا۔ قبائل عرب کے رؤسا اس کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور اس کو مستجاب الدعوات جان کر اس کے مُعتقد تھے۔ لائی بینی اُس کے پہاڑی علاقہ کے بُت پرست قبیلے اس کی تبلیغ ونصیحت کوسُن کر مُنجی کے قدموں میں آگئے۔ عرب کے یہ گوشہ نشین راہب علم طب میں ید طُولےٰ رکھتے تھے اور غربا کا علاج نہایت تندہی اور محبّت سے مُفت کیا کرتے تھے۔ ان راہبوں کی محبّت بے شمار عربوں کو مسیحیت کے حلقہ میں کھینچ لاتی تھی۔ چنانچہ یوتھی میس راہب کے ذریعہ الیسپ بٹس جو ایک عرب قبیلہ کا سردار تھا مسیحی ہوگیا اور وُہ متعدّد بدوی قبائل کو خُداوند مسیح کے قدموں میں لے آیا۔ مسیحی ہونے کے بعد اُس نے قبیلہ کی سرداری پر لات ماری اور تارک الدُنیا ہو کر گوشہ عزلت میں جا بیٹھا یروشلیم کے بطریارک نے اُس کو بدوی قبائل کا بشپ بنا دیا۔ اُس کا نام تمام بادیہ اور صحرا میں زُہد کے لئے مشہُور تھا۔ لوگ چاروں طرف سے اُس کے ہاتھوں بپتسمہ پانے کے لئے چلے آتے تھے۔ آدمیوں کی آمد ورفت کا تانتا لگا رہتا تھا

ایسا کہ مؤرخ لکھتا ہے کہ "جس طرح پانی بہتا چلا جاتا ہے اسی طرح لوگوں کی آمد ورفت شب وروز جاری رہتی تھی جس کا کوئی آخر نہ تھا"۔ سب قبائل میں یہ بات مسلّم تھی کہ جو شخص ان گوشہ نشینوں اور زاہدوں کے پاس آجاتا تھا وُہ مامُون ہو کر جان کی امان پاتا تھا۔

بادیۂ عرب کی اطراف واکناف میں متعدّد اُسقفی علاقے قائم ہوگئے۔ چنانچہ بصریٰ کا آرچ بشپ بیس اور بقول دیگر تینتیس ۳۳ بشپوں کا نگران تھا۔ چوتھی صدی تک تمام قاران مسیحی ہوگیا تھا اور اس کے امیر کا نام عبداللہ تھا۔ ۳۶۳ء میں ایک عرب راہبان کے ذریعہ حیرہ کا امیر نعمان ابو قابوس مسیحی ہوگیا اور اس نے حیرہ کے علاقہ میں متعدّد گرجے تعمیر کئے (ابوالفدا) اس کی ــــــ رعایا کے بہت سے اشخاص بھی مسیحی ہوگئے۔ اس کی سلطنت ۵۸۹ء سے ۶۱۱ء تک رہی۔

ہم جلد دوم میں باب دوم کی فصل سوم میں شاپور اعظم کی تباہ کاریوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اس نے مسیحی کلیسیا پر روا رکھی تھیں۔ اس نے عرب پر بھی چڑھائی کی اور جہاں گیا فتح اس کے ہم رکاب رہی۔ اس نے مخالف افواج کے کسی شخص کو اور بالخصوص مسیحیوں کو زندہ نہ چھوڑا۔ وُہ قیدیوں کے کندھوں کو چھید کر ان میں لوہے کے زنجیر پرو کر ان کو باہم گر باندھ دیا کرتا تھا۔ وُہ عیسائیوں کو طرح طرح کی عقوبتیں دے کر ان کو شہید کرتا چلا گیا۔ اس کے جانشینوں نے بالخصوص بہرام اور یزدجرد نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔

ابتدا ہی سے جنوبی عرب بدوی عرب سے الگ تھا اور صدیوں سے تمدّن وتہذیب کا گہوارہ تھا۔ وہاں کی حکومت مضبُوط اور مستحکم تھی جو آٹھ سو سال قبل از مسیح صابیوں کے ہاتھوں میں تھی۔ دُوسری صدی عیسوی میں

حمیر جنوبی عرب کے فرمانروا تھے۔ یہاں کا بادشاہ یمن کا باشندہ تھا جس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اُس نے اپنی حکومت کو وسعت دینا چاہا اور اپنی حمیری قوم کی قوّتِ بازو پر بھروسا کر کے اُس نے حبش یعنی ابی سینیا کی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اُس کی بغاوت کامیاب ثابت ہوئی کیونکہ وُہ ایک قومی بغاوت تھی اور ابی سینیا کی حکومت عیسائی حکومت تھی۔ اور لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ چونکہ وُہ عیسائی ہیں لہٰذا وُہ پردیسی رُومی سلطنت کے تحت ہیں۔

بنی صالب یمن کے شمال میں نجران میں رہتے تھے۔ وُہ ایک شامی مسیحی مبلّغ کی طفیل خداوند مسیح کے قدموں میں آ گئے تھے۔ یثرب کے یہود نے ذُونواس کو اُکسایا اور اُس نے نجران پر حملہ کر دیا لیکن چونکہ اس کے گرد ایک بڑی خندق اور زبردست فصیل تھی لہٰذا وُہ طویل محاصرہ کے باوجود اس کو فتح نہ کر سکا۔ پس اس نے دغا سے کام لے کر قسم کھائی کہ وُہ عیسائیوں کے مذہب سے کوئی تعرّض نہ کریگا۔ اس پر شہر کے دروازے کھول دیئے گئے لیکن ذونواس نے اپنے وعدہ کو توڑ دیا۔ اُس نے خندق کو آگ سے بھر دیا اور ان تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس میں دھکیل دیا جو مسیحی ایمان پر قائم رہے۔ اُس نے بشپ کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیاں جلوا دیں۔ ملکہ رُوما اور اس کی دو کنواری بیٹیاں ذونواس کے رُوبرو لائی گئیں۔ جب انہوں نے مسیحی ایمان کا اقرار کیا تو بیٹیوں کو ماں کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ ان کا خون ماں کے مُنہ میں زبردستی ڈالا گیا اور اُس کو بھی بے طرح عذاب دے کر شہید کر دیا گیا۔ وہاں کی عورتوں میں سے ایک جس نام ان عورتوں کی تعداد میں نہ تھی جنہوں نے یک زبان مسیح کا اقرار کیا تھا۔ اُس نے دُعا کی کہ "اے خدا میرے گناہوں کو یاد نہ کر اور اپنے بیٹے کی خاطر مجھ کو بھی یہ عزت بخش کہ میں بھی شہیدوں میں شامل

ہونے کے لائق ٹھہروں"۔ اُس کی دُعا قبول ہوئی۔ اُس کو گرفتار کر کے دو جنگلی اونٹوں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور اُونٹوں کو جنگل میں ہانک دیا گیا۔ یہ ایذا رسانی ذونواس (جس کا نام مسروق بھی تھا) نے ۵۲۳ء میں ایک ہفتہ (از ۲۰ نومبر تا ۲۸ نومبر) تک جاری رکھی۔ وُہ خود شہر کی نواحی میں رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا۔ اِس جانکاہ واقعہ کا ذکر قرآن (سورہ بروج ۸۵) اور کُتبِ حدیث میں پایا جاتا ہے۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر بیس ہزار مسیحی شہید ہو گئے۔

شاہِ حبش نے اِس واقعہ کو سُن کر ذونواس پر چڑھائی کی اور اس کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ یمن کے گرجاؤں کو ذونواس نے مسمار کر ڈالا تھا وُہ دوبارہ تعمیر کئے گئے۔ یمن شاہِ حبش کے ماتحت ہو گیا اور اب سکندریہ کے پیٹریارک کے ماتحت اس پر بشپ اور قسیس مقرر ہونے لگے۔ اوائل زمانہ میں وُہ بصرہ کے میٹروپالیٹن کے ماتحت ہوتے تھے۔

مولوی سلیمان کہتے ہیں کہ یہ سلطنت ۵۲۵ء سے ۵۹۵ء تک قائم رہی (ارض القرآن)۔ اس عہد کا ایک کتبہ موجود ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں "رحمان۔ مسیح اور رُوح القدس کی قدرت اور فضل سے"۔ اس یادگاری کے پتھر پر لکھا ہے "ابراہا (ابرہہ) اکزومی حبشیوں کے رئیس نے یہ یادگار قائم کی ہے۔ . . . رحمان کی عنایت سے نجاشی کی طرف سے سفیر ۵۴۳ء میں دوستی اور محبت کے اظہار کے لئے آئے" (ارض القرآن مؤلفہ سید سلیمان ندوی جلد اوّل صفحہ ۱۹)۔

جہاں تک مسیحی عقیدہ کا تعلق ہے اِس کتبہ کا لفظ "رحمان" قابلِ غور ہے۔ پروفیسر محمد اجمل خاں کہتے ہیں کہ رحمان اسمِ ذات ہے اور قرآن میں اللہ کا مترادف

ہے۔ عرب کے مسیحی خُدا کو رحمان کے نام سے پُکارتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ لفظ "باپ" کا مترادف تھا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ کفارِ قریش کہتے تھے کہ ہم الرحمان کو اپنا خُدا ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ وُہ عیسائیوں کا خُدا ہے جنہوں نے مکہ پر حملہ کر کے کعبہ کو ڈھانا چاہا تھا۔ جب ابنِ مسعودؓ نے کعبہ کے سامنے جا کر بالجہر تلاوت کی "الرحمان علم القرآن" وغیرہ تو مشرکین نے کہنا شروع کیا کہ یمامہ کا الرحمان محمد کو قرآن سکھاتا ہے۔ محمد عیسائیوں کا دوست ہے اور پھر وُہ اہلِ حبش سے ہم پر حملہ کروانا چاہتا ہے (حالاتِ ہجرتِ اولیٰ۔ رجب ۵ سنہ نبوی در سیرت النبی)۔

یہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ قرآن کی جن سُورتوں کا تعلّق خاص عیسائیوں کے ساتھ ہے مثلاً سورۂ مریم۔ سورہ طٰہٰ۔ سورۂ کلیم۔ ان میں کثرت سے الرحمٰن کا لفظ وارد ہُوا ہے۔ مُشرکین قریش یہ مانتے ہی نہ تھے کہ الرحمٰن ہی اللہ ہے (سورۂ فرقان)۔ عیسائی شاعر امراء القیس جو "زمانۂ جاہلیت" کا شاعر تھا ۵۴۰ء میں خُدا کے لئے الرحمٰن کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ فاضل پروفیسر لکھتا ہے "عرب کے شعرائے نصرانی بھی اللہ کو الرحمٰن کہتے تھے" (رسالہ برہان فروری ۱۹۵۶ء)

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ نجران کے شہر صنعا میں ایک نہایت عالیشان گرجا تھا جس کا نام "کعبۂ نجران" تھا جس کو عبد المدان نے کعبہ کے مقابلہ پر بنایا تھا۔ عرب بھر میں کوئی گرجا اس کا ہمسر نہ تھا۔ اس کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی۔ ابرہہ چاہتا تھا کہ زائرینِ عرب مکّہ کے کعبہ کو جانے کی بجائے مسیحیت کے اِس گرجا کی زیارت کیا کریں جو صنعا میں تھا۔ قدرتاً اِس کا اثر اہلِ مکّہ کی آمدنی پر پڑتا تھا اور وُہ اس بات کی برداشت نہ کر سکے پس ایک شخص مکّہ سے صنعا گیا اور وہاں اُس نے گرجا میں جا کر اس کو

ناپاک کر دیا۔ ابرہہ اس بے حُرمتی کی برداشت نہ کر سکا پس اُس نے کعبہ کو گرانے کے لئے حجاز کا رُخ کیا اور اُس نے حضرت محمد کے دادا عبد المطلب کے زمانہ میں مکہ پر غالباً ۵۶۷ء میں حملہ کیا۔ اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل (سورت ۱۰۵) میں مجمل طور پر اور کُتبِ احادیث وغیرہ میں مفصل طور پر پایا جاتا ہے۔ اس حملہ کے تین سال بعد حضرت محمد کی ولادت ہُوئی۔

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ رسُولِ عربی کی پیدائش سے پہلے مسیحیت عرب میں اس قدر اشاعت پا چکی تھی کہ وُہ تمام عرب میں ہر چہار سُو پھیلی ہُوئی تھی مسیحیت نے عرب پر تین اطراف سے اثر کر رکھا تھا۔ شمالی مغرب میں ملک شام کی طرف سے، شمالی مشرق میں مسوپوتامیہ کی طرف سے اور مغرب میں ابی سینیا کی طرف سے مسیحیت اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ موخر الذکر یعنی ابی سینیا نے بحرِ احمر کی طرف سے اور جنوب میں یمن کی طرف سے اثر کیا کیونکہ وُہ ابی سینیا کی مسیحی حکومت کے ماتحت تھا۔ پس مختلف اطراف سے عرب مسیحیت سے متاثر ہو رہا تھا گو جنوب میں مسیحیت کی جڑیں مضبُوط تھیں۔ غرضیکہ عرب کے لوگ مسیحی تعلیم اور عقائد سے واقف تھے کیونکہ عرب شتر سوار اور بدّو وغیرہ دُور دُور کا سفر کیا کرتے تھے۔ مسیحیت شمال مشرق کی جانب سے خلیج فارس کے کناروں تک پھیل گئی۔ شمال مغرب کی طرف سے وُہ عرب کے وسط اور شمال کی جانب بڑھی اور جنوب کی جانب بحرِ احمر تک پھیل گئی۔ کُتبِ احادیث میں آیا ہے کہ خُداوندِ مسیح کا ایک مجسّمہ کعبہ میں تھا جس سے ظاہر ہے کہ حجاز میں مسیحیت کا اثر مکّہ اور مدینہ میں موجُود تھا۔

"زمانۂ جاہلیت" کے شعراء کا کلام بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ شاعر مسیحیت، مسیحی تعلیم اور رسُوم و عبادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے کلام میں

مسیحی زاہدوں اور درویشوں کا اکثر ذکر آتا ہے۔ چنانچہ لبید (جو رسولِ عربی کا ہمعصر تھا اور بعد میں مسلمان ہو گیا تھا) کے اشعار میں جو اس نے اسلام اختیار کرنے سے پہلے لکھے، بار بار خُدا، دُعا، گناہ کی مُعافی، فضل، نیک اعمال اور خُدا کے رحم و شفقت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جو اس نے مسیحیت سے حاصل کئے تھے مشہور شاعر امراء القیس بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ تک گیا تھا۔ یہ شاعر مسیحی قبائل مثلاً حیرہ اور غسان کے سرداروں کے ہاں جاتے اور اُن سے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے "زمانہ جاہلیت" کے اشعار میں آرامی زبان کے وُہ الفاظ ملتے ہیں جو مشرقی کلیسیا میں مروّج تھے مثلاً کنیسہ۔ صورہ (بُت) قسیس وغیرہ۔ قرآن میں بھی الفاظ قسیس شماس یصلوٰۃ (دُعائے عام) تسبیح۔ تزکہ۔ عبد۔ قرار۔ ملائکہ رحمان اور غیرہ استعمال ہُوئے ہیں جو مسیحی اصطلاحات تھیں۔ "زمانۂ جاہلیت" کی محترم ہستیاں مسیحیت سے متاثر تھیں۔ مثلاً ورقہ بن نوفل جو مسیحی ہو گیا تھا اور انجیل کا مترجم تھا آنحضرت کی بیوی خدیجہ کا رشتہ دار تھا۔ عبیداللہ بن جحش جو مرنے سے پہلے مسیحی ہو گیا تھا۔ زید بن عمرو جو اپنی موت تک حق کا متلاشی رہا۔ عثمان بن حویرث جو مسیحی ہو گیا تھا۔ یہ اور دیگر بزرگ ہستیاں "زمانۂ جاہلیت" میں مسیحیت اور مسیحی تعلیم کے اثر کی گواہ ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ مسیحی مذہب قبل از اسلام عرب کے خاص و عام کو متاثر کر رہا تھا۔ ہم ناظرین کی توجہ امام المناظرین اکبر مسیح مرحوم کی کتاب "تالیف القرآن" کی جانب مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

فصلِ سوم۔ محمدِ عربی کے زمانہ کی مشرقی کلیسیائیں

گذشتہ فصلوں میں ہم بتلا چکے ہیں کہ حضرت محمد کے زمانہ سے بہت پہلے مسیحی کلیسیائیں ہزاروں کی تعداد میں مغربی ایشیا کے تمام ممالک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہُوئی تھیں۔ اور دن بدن ترقی کرتی چلی جا رہی تھیں۔ آرمینیا، شام، مصر اور ابی سینیا (حبش) کی کلیسیائیں "مونوفی زائٹ" تھیں۔ پانچویں صدی کے درمیان میں اس کلیسیا کے دو بشپوں کی تقدیس ہُوئی جن میں سے ایک بشپ مار یعقوب البرداعی (جیکب براڈیوس) ایڈیسہ کا بشپ تھا۔ یہ شخص نہایت قابل عالم اور جوشیلا تھا جو ۴۹۰ء کے قریب پیدا ہُوا۔ وُہ عربی، یونانی اور سریانی زبانوں کا ماہر تھا اور جوانی کے عالم میں ہی ریاضت کشی کی جانب مائل تھا۔ جب وُہ بشپ ہُوا تو اس نے اپنی کلیسیا کی طرف توجہ کی۔ وُہ ۵۴۲ء سے ۵۷۷ء تک بشپ رہا اور اس دوران میں اس نے دو پیٹریارکوں، ۹۰ بشپوں اور ایک لاکھ قسیسوں کی تقدیس و تقرر کیا۔ جن کی تبلیغی مساعی کی وجہ سے بازنطینی سلطنت کے مشرقی اور جنوبی صوبوں کے گوشہ گوشہ میں مونوفی زائٹ کلیسیا کی تعلیم پھیل گئی۔ اس کی کوششوں کی وجہ سے ہی اس کلیسیا کا نام یعقوبی کلیسیا پڑ گیا اگرچہ اس سے پہلے بھی یہ کلیسیا کہتی تھی کہ وُہ خُداوند کے بھائی یعقوب کے عقائد کی محافظ ہے۔ البرداعی عموماً پا پیادہ نشی بس سے سکندریہ تک سفر کیا کرتا تھا اور ہمیشہ موٹے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اُس نے ساسانی بادشاہ خسرو اوّل کے بیٹے کو بپتسمہ دیا تھا۔ ۶۲۹ء میں یعقوبی کلیسیا نے ایران میں ایک خاص نظام قائم کیا جس کے مطابق تکریت کا بشپ اس کا میٹروپولیٹن ہو گیا

اور اس کے ماتحت بارہ بشپ تھے۔ ایرانی حکومت نے اس کلیسیا کو ایک الگ ملت تسلیم کر لیا تھا اگرچہ اس کے شرکا کی تعداد نسطوری کلیسیا کے شرکا کے برابر نہ تھی۔

اس کلیسیا کا عقیدہ یہ تھا کہ خداوند مسیح کی ذات واحد تھی، اُس کی مشیت واحد تھی اور اس مشیت کا فعل بھی واحد تھا (طبیعة واحدة ومشیئة واحدة وفعل واحد)۔ جو لوگ آنخداوند میں دو ذاتوں کے قائل تھے، اُن کی نسبت وُہ کہتے تھے کہ وہ "خداوند کی ذات کے دو ٹکڑے کرتے ہیں پس ان کے بھی دو ٹکڑے کر دینے چاہئیں"۔ مار یعقوب نہایت زبردست عالم تھا اور اُس کی تعلیم کے ماننے والے شام کی سرحد میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ اِس کلیسیا کے لاکھوں بشپ، قسیس اور شماس تھے۔

عرب کے مسیحی قبائل بھی "مونوفی زائٹ" یعنی مسیح کی ذات کی وحدت ماننے والے تھے۔ چنانچہ مغربی عربوں کا بادشاہ الملک الحرث البدوی اِس فرقہ کا زبردست حامی تھا۔ غسان کا تمام قبیلہ بھی یعقوبی فرقہ کا تھا۔ بادشاہ الحرث نے انطاکیہ کے پیٹریارک پال کو اور دیگر بشپوں کو (جو رومی شہنشاہ جسٹینین کے مذہبی تعصب کے ظلم و ستم کے ہاتھوں بھاگ نکلے تھے) اپنے ہاں پناہ دی۔ حیرہ کے بادشاہ نے بھی بہت بشپوں اور قسیسوں کو پناہ دی اور یعقوبی فرقہ عرب میں ہر طرف پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ نجران اور مہرتس جیسے دُور و دراز مقامات میں اور دیگر قبائل کی اطراف میں یہ فرقہ چھا گیا۔ عرب کے بادیہ کے قبائل کے سردار مار یعقوب البرداعی کے زبردست حامی تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس نے عرب کے جنوب اور دُور کے مُلک حبشہ میں بھی اپنی تعلیم کی اشاعت کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب مؤرخین بشپ جیکب

کو "مار یعقوب البرداعی راس اساقفة الیعاقبة السریان والنوبة والحبشة" کہتے ہیں۔ یعقوبی یعنی مونوفی زائٹ کلیسیا کے معتقد اپنے مخالفین کو ازراہِ طعنہ "ملکی" بلاتے تھے کیونکہ وُہ شہنشاہ (ملک) جسٹینین کے اشاروں پر چلتے تھے۔

مصر کی قبطی کلیسیا بھی "مونوفی زائٹ" تھی۔ چھٹی صدی کے شروع میں مونوفی زائٹ کلیسیا کے عربستان میں تین مرکز تھے جہاں سے انجیل جلیل کی اشاعت ہر چہار سُو کی جاتی تھی۔ یہ مرکز طور عابدین، تکریت اور مار متی تھے۔ ان کے علاوہ مُوصل کے مغرب میں اِس کلیسیا کا ایک اور مرکز سنجر تھا جو سائنس اور طِب کے علوم کے لئے مشہور تھا۔

(۲)

رسُولِ عربی کے زمانہ سے پہلے ایران کی کلیسیا زیادہ تر نسطوری فرقہ کے مسیحیوں پر مشتمل تھی۔ اِس کلیسیا کا بیشتر حصّہ مسوپوٹامیہ اور عراق کے چھ صُوبوں میں تھا اور اس کے شرکا بتدریج ۵ لاکھ سے زیادہ تھے۔ یہ صُوبے حسبِ ذیل تھے:۔ (۱) بابلونیا کے صُوبہ کا کیتھولیکوس سلوکیہ طیسیفون (مدائن) میں رہتا تھا۔ (۲) صُوبہ خوزستان کا میٹرو پولی ٹن جندے شاپور (بیت لاپت) میں رہتا تھا۔ (۳) بیت عربائے کا میٹرو پولی ٹن نصیبین (نسی بس) میں اقامت گزین تھا۔ (۴) خلیج فارس کے نزدیک میشان کے صُوبہ کا میٹرو پولی ٹن بصرہ میں سکونت کرتا تھا۔ (۵) ادیابین کے صُوبہ کا میٹرو پولی ٹن آربیل میں رہتا تھا اور (۶) بیت گرمئے یا باجرمئے کا میٹرو پولی ٹن کرکوک میں رہائش رکھتا تھا۔ ان صُوبوں کے علاوہ مسیحی کلیسیائیں ۱۹۶ء سے پہلے گیلان اور بکتریا میں موجود تھیں۔ ۴۱۰ء میں فارس میں بشپ

تھے۔ اور بحیرین۔ بیت ماضائے کے صوبہ میں حلوان، دینا ور، ہمدان میں مسیحی کلیسیائیں تھیں۔ بیت رازی کائے کے صوبہ میں مسیحی کلیسیائیں رے (طہران) میں تھیں۔ صوبہ خراسان میں شہر نیشاپور میں مسیحی تھے۔ ۴۲۴ء میں رے۔ نیشاپور۔ مرو۔ ہرات کے بشپ ایک کونسل میں جمع ہوئے تھے تاکہ وہ مختلف کلیسیائی امور پر باہم غور کریں۔ ۴۹۰ء سے پہلے دریائے آکسس کے نزدیک ہن اور ترک اقوام کے لوگ مسیحی ہو گئے تھے جن کے لئے ۵۴۹ء میں ایک بشپ کی تقدیس کی گئی تھی۔ ۵۸۸ء میں ہرات کے اضلاع کی کلیسیائیں شمار میں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ ہرات کا بشپ میٹروپولیٹن بنا دیا گیا تھا۔ سمرقند میں ایک بشپ تھا جو میٹروپولیٹن کا عہدہ رکھتا تھا۔ حضرت محمد کی وفات سے تین سال پہلے جیکو بائٹ کلیسیا بھی ایران میں ایسی منظم ہو گئی تھی کہ ۶۲۹ء میں تکریت کا بشپ میٹروپولیٹن بنا دیا گیا تھا۔ جس کے ماتحت بارہ بشپ تھے۔

(۳)

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ رسول عربی کے زمانہ سے پہلے عرب کے متعدد قبائل مسیحی ہو چکے تھے۔ یمن میں مسیحی حکومت تھی جو نہایت زبردست تھی۔ اس کی شمالی حد پر نجران کا شہر مسیحیوں کا گڑھ تھا کیونکہ وہ تجارت کے راستہ پر لنگر کا مقام تھا۔ اس کے علاوہ یمن کے دوسرے شہروں اور چھوٹے بڑے قصبوں میں مسیحی بستے تھے۔ حضرموت کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد مسیحیوں پر مشتمل تھی۔ اسلامی مؤرخ صنعا کے بڑے گرجا کا ذکر کرتے ہیں۔ حمیریوں میں مسیحیت کی اشاعت ہو چکی تھی۔ صنعا سے ۵۵ میل مشرق شمال مشرق کی جانب معرب میں مسیحی کلیسیا تھی۔ حضرموت

کے علاقہ میں عدن سے ۲۰۰ میل شمال مشرق کی جانب ضوفار میں (جو آجکل عمان کے علاقہ میں ہے) ایک بڑا گرجا تھا۔ بعض عرب قبائل عرب کے شمال کی جانب عراق اور شام میں جا کر بس گئے تھے اور مسیحی ہو گئے تھے۔ مثلاً بنو تغلب جو الجزیرہ (مسوپوتامیہ) سے تھے۔ غسان اور بہرا اور تنوخ قبائل ملکِ شام تھے۔ آنحضرت کے زمانہ میں بنو غسان جو شام کی سرحد پر تھے اور بنو حیرہ جو ایران کی سرحد پر تھے سب سے زیادہ مشہور مسیحی قبیلے تھے۔ سطے کا قبیلہ شمالی حجاز میں تیمہ میں چلا گیا تھا۔ یہ قدیم جگہ شام میں اس قدر مشہور تھی کہ اس کا ذکر کتابِ مقدس میں بھی آیا ہے (پیدائش $\frac{25}{15}$ یسعیاہ $\frac{21}{14}$ - یرمیاہ $\frac{15}{23}$) اس قبیلہ کی ایک بڑی اکثریت مسیحی تھی۔ علاوہ ازیں سینا کے جزیرہ نما میں کئی کلیسیا کی بے شمار خانقاہیں تھیں۔ پس عرب پر تین اطراف سے یعنی ایران، شام اور مصر کی جانب سے مسیحیت اپنا اثر کر رہی تھی۔ یہ تینوں طرفیں تجارت کی راہیں تھیں اور یہی تجارتی علاقے تہذیب و تمدن کے گہوارے تھے جن میں مسیحی کلیسیائیں انجیل کے روح پرور پیغام کو ہر کس و ناکس تک پہنچا کر ان کو منجیٔ عالمین کے قدموں میں لاتی تھی۔

اب ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حضرت محمد کے رجحانات، خیالات اور اعتقادات نے کس فضا میں پرورش پائی تھی۔ تمام عرب میں جا بجا مسیحی کلیسیائیں موجود تھیں۔ آپ کے وطن حجاز میں مسیحی کلیسیائیں تھیں۔ آپ کی دایہ ام ایمن حبشی مسیحی تھیں۔ آپ کا قریبی رشتہ دار ورقہ بن نوفل مسیحی عالم تھا جو مترجم انجیل تھا۔ آپ کی ملاقات مسیحی کلیسیاؤں کے مختلف علماء اور فضلاء سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی کیونکہ عرب تاجر ملکِ شام کے بڑے بڑے شہروں میں ہر جنس اور ملت کے لوگوں

سے ملتے جلتے تھے اور آپس میں تجارتی تعلقات اور دیگر روابط رکھتے تھے۔ خود آنحضرت تجارت کے سلسلہ میں ان شہروں میں گئے تھے۔ مسلمان مؤرخین بتلاتے ہیں کہ ان کی بحیرہ نام راہب سے ملاقات تھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں مصر اور شام کے ممالک علمِ طب اور یونانی فلسفہ و تصوف کے اور ملکِ ایران (بالخصوص نصیبین) منطق اور دیگر علوم کے گہوارے تھے۔ نوشیرواں وغیرہ کی سرپرستی نے جندے شاپور کے نسطوری مسیحی مدرسہ کے مدِمقابل ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس پر بھی آخر زمانہ میں نسطوری کلیسیا چھا گئی تھی۔ اسلامی کتب میں ہم کو چند اطبا کے نام ملتے ہیں جو یا تو مسیحی تھے اور یا مسیحی کلیسیا کے اداروں میں تعلیم پا چکے تھے اور وہ آنحضرت کے عہد کے تھے۔ چنانچہ طبقات الامم میں ہے کہ آپ کے زمانہ میں عرب میں مشہور طبیب حرث بن کلدۃ الثقفی تھا جو طائف کا رہنے والا تھا اور جندے شاپور کا مدرسہ کا فاضل تھا۔ وہ آنحضرت اور ابوبکر، عثمان، علی اور معاویہ کے زمانہ میں زندہ تھا۔ اس کا بیٹا نضر نہ صرف طب کا ماہر تھا بلکہ وہ علوم فلسفہ کی مختلف شاخوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ عیون الانبا میں ہے "نضر بن الحرث بن کلدۃ الثقفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ماموں کا لڑکا تھا جس نے اپنے باپ کی طرح بہت سے شہروں کا سفر کیا تھا اور مکہ وغیرہ شہروں کے علما اور فضلا اور یہودی علما اور کاہنوں کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ علومِ قدیم کی باتوں، حکمت اور فلسفہ، طب اور دیگر علوم کو بھی جانتا تھا جو اس نے اپنے باپ سے سیکھے تھے"۔ (ماخوذ از برہان۔ نومبر ۱۹۵۹ء)۔ یہ شخص نبیٔ اسلام کے بدترین دشمنوں میں سے تھا اور اپنے علم کے سبب اپنے آپ کو ان کا حریف سمجھتا تھا۔ چنانچہ

جنگِ بدر کی فتح کے بعد اس کی گردن ماری گئی۔ آنحضرت کے عہد کا ایک اور مشہور طبیب ابن ابی رمثہ تھا۔ یہ وہ طبیب تھا جس نے روایت کی ہے کہ میں نے رسول کے دونوں کندھوں کے درمیان مُہرِ نبوت دیکھی ہے اور میں نے کہا تھا کہ میں طبیب اور جراح ہوں اور اس کا علاج کر سکتا ہوں۔

مذکورہ بالا کوائف کی روشنی میں ہم اس فضا کا اندازہ کر سکتے ہیں جس میں رسولِ عربی کے خیالات اور اعتقادات کی نشوونما ہوئی تھی۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ بائبل کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے نازل ہونے کا واحد مقصد یہی ہے کہ جو باتیں پہلے لوگوں کو عبرانی اور یونانی زبانوں کے ذریعہ بتلائی گئی تھیں ان کو سلیس عربی زبان میں اہلِ عرب پر ظاہر کرے جو کتبِ سالفہ کی عبرانی اور یونانی زبانوں میں ہونے کی وجہ سے ان کے مضامین سے ناواقف تھے۔ آنحضرت نہایت ذہین شخص واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی مکی زندگی کے ایام میں اہلِ یہود سے میل جول پیدا کیا تھا اور انبیائے یہود کی کتب اور تعلیم سے اور یہودی روایات سے واقف تھے۔ لیکن اہلِ یہود کفار کی طرح ان کی تضحیک کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل یہود کی جانب سے بھی بدظن ہو گیا۔ آپ کا ان سے اور ان جیسے دیگر علما سے صحبت رکھنے کی وجہ سے کفار کہتے تھے کہ آپ کو تو فلاں فلاں لوگ سکھلاتے ہیں (فرقان آیت ۵۔ نحل ۱۰۵ وغیرہ)۔ بعض اس بنا پر قرآن کو "اساطیر الاولین" قرار دیتے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ آپ کا پالا ایسے یہود سے پڑا جو آپ کو الٹ پلٹ باتیں بتلاتے تھے (البقرہ ۹۳۔ ۵: ۱۶ وغیرہ) اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر جواب دیا کرتے تھے (نساء ۴۸۔ مائدہ آیت ۴۵ وغیرہ) پس آنحضرت

یہودی قوم سے بیزار ہو گئے (البقرہ ۱۱۴)۔ لیکن بایں ہمہ آپ اُن کی کُتبِ انبیائے سالقہ کو "امام"۔ "نُور"۔ "ہدایت"، ہی قرار دیتے رہے۔ اور اُن پر ایمان رکھتے رہے۔

یہود کے وطیرہ کے برعکس مسیحی کلیسیا کے قسیس، شماس اور مسیحی آنحضرت سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے مسیحی راہبوں میں سے ایک یعنی بحیرہ راہب کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آنحضرت ہجرت سے پہلے مسیحیوں کے بہی خواہ اور دوست تھے۔ (سورہ ۸۵ + بقرہ ۵۹ و ۱۱۵ و ۱۳۰ و ۱۴۱ - مائدہ ۷۳ + وغیرہ) اور آپ نے مسلمانوں کو کہا کہ اُن کو عیسائیوں سے بہتر دوست نہ ملینگے۔ ان تعلقات کا یہ نتیجہ ہُوا کہ آنحضرت کُتبِ یہود کے مضامین کی نسبت انجیلی خیالات اور بالخصوص غیر مُستند اناجیل کی روایات سے زیادہ واقف تھے۔ قرآن کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ گو آپ کا رشتہ دار ورقہ بن نوفل مترجم اناجیل تھا لیکن آپ نے اناجیل کو پڑھا نہ تھا۔ قرآن کا یہ نظریہ کہ خُداوند مسیح کی جگہ کوئی دُوسرا شخص مصلوب ہُوا تھا بعض بدعتی مسیحی کلیسیاؤں میں بھی پایا جاتا تھا جو غناسطی اور ایبونی یا سرنتھس کی بدعتوں میں مُبتلا تھیں۔ نسطوری مسیحی بھی خُداوند مسیح کی دو ذاتوں کو جُدا مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یسوع جو انسان تھا مصلوب ہُوا تھا لیکن اُس کی اعلیٰ مسیحائی آسمان کی طرف پرواز کر گئی تھی۔ آنحضرت مسیحی کلیسیاؤں کے فرقوں سے بھی واقف تھے جو عرب میں جابجا پائے جاتے تھے (۵۷ : ۱۷ وغیرہ)۔

جب آنحضرت مکہ سے ہجرت کر گئے تو جُوں جُوں آپ کو اقتدار حاصل ہوتا گیا آپ کے اور اہلِ کتاب کے درمیان خلیج حائل ہوتی گئی اور

پھر بڑھتی گئی۔ (۲ : ۱۰۳ و ۱۱۴ + ۳ : ۱۱۴ وغیرہ) حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب مُسلمانوں کو حکم ہُوا "مومنو۔ تُم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ تُم میں سے جو کوئی اُن کا دوست ہُوا تو وُہ اُن میں ہو گیا۔ بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ (سورہ مائدہ آیت ۵۷)۔ رسُولِ عربی نے بعض یہود اور یہُودی قبائل کو قتل اور بعض کو جلاوطن کر دیا۔ جب آپ تمام مُلکِ عرب کے مالک ہو گئے تو آپ نے حُکم دیا کہ عیسائیوں میں سے جو اسلام قبُول نہ کریں "تُم جو مُسلمان ہو" ایسوں سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ وُہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں" (سورہ توبہ آیت ۲۹)۔

بالآخر ۹ھ میں حضرت محمدؐ نے حج مکّہ کے موقعہ پر اعلانِ برأت کر دیا۔ اور کہا "اے مُسلمانو، جن مُشرکوں سے تُم نے عہد باندھا تھا اُن کو اب اللہ اور رسُول کی طرف سے قطعی جواب ہے۔ پس اے مُشرکو۔ چار ماہ تک اس مُلک میں چل پھر لو اور جان لو کہ تُم اللہ کو عاجز نہیں کر سکو گے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رُسوا کریگا۔ حجِ اکبر کے روز اللہ اور اس کے رسُول کا یہ علانیہ اشتہار ہے کہ اللہ اور اُس کا رسُول بھی مُشرکوں سے بیزار ہے۔ اگر تُم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تُم نہ مانو (یعنی اسلام قبُول نہ کرو) تو یہ سمجھ لو کہ تُم اللہ کو تھکا نہ سکو گے۔ کافروں کو دُکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سُنا۔ جن مُشرکوں سے تُم نے عہد کیا تھا اور اُنہوں نے بد عہدی نہیں کی اور نہ کسی کو تمہارے مقابلہ میں مدد دی ہے اُن سے تُم اپنا عہد اُن کی (چار ماہ کی) مُدت تک پُورا کر لو۔ پھر جب (چار ماہ کی) مُحرمت کے مہینے گذر جائیں تو مُشرکوں کو جہاں پاؤ اُن کو قتل کرو۔ اُن کو گھیرو۔ اُن کو پکڑ لو اور ہر جگہ اُن کی گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر

وہ توبہ کرلیں (یعنی مسلمان ہوجائیں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو تم اُن کی راہ چھوڑ دو (وہ جہاں چاہیں پھریں) اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔ (سورہ توبہ آیات ۱ - ۵)۔

بالفاظِ دیگر رسولِ عربی نے حکم دیا کہ عرب کا ملک مسلمانوں کے لئے ہے اس میں کسی دوسرے مذہب کے پیرو کار نہیں رہ سکتے۔ اس حکم کا اثر اُن تمام مسیحی قبائل اور بے شمار مسیحی افراد پر پڑا جو مختلف مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا تھے اور جن کے آبا و اجداد سالہا سال سے پشت در پشت صدیوں تک عرب میں رہتے چلے آئے تھے۔ حضرت عمر کی خلافت میں ان تمام مسیحیوں کو جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے ان کے آبائی وطن ملک عرب سے نکال دیا گیا۔

حق تو یہ ہے کہ اسلام کا آنا تھا کہ مشرق کی کلیسیاؤں میں انجیل کی تبلیغ و اشاعت کی تحریک پہلے تھم گئی اور پھر رفتہ رفتہ رک گئی۔ ان مشرقی کلیسیاؤں میں زوال آنا شروع ہو گیا حتیٰ کہ بعض مشرقی ممالک میں مسیحیت کا مکمل استیصال ہو گیا۔ اسلام کی آمد کے چند سالوں کے اندر اندر شام، کنعان، مسوپوتامیہ، اسیریا، بابلونیا، مصر اور ایران کے ممالک فتح ہو گئے۔ بانیٔ اسلام ۶۳۲ء میں فوت ہوئے۔ اُن کی وفات کے تین سال بعد ۶۳۵ء میں دمشق فتح ہو گیا۔ اس کے تین سال بعد ۶۳۸ء میں بیت المقدس، یروشلیم اور انطاکیہ فتح ہو گئے اس واقعہ کے تین سال بعد ۶۴۱ء میں سکندریہ فتح ہو گیا۔ اس کے دس سال بعد ۶۵۱ء میں ایران فتح ہو گیا۔ اس کے ساٹھ سال بعد اسلامی افواج نے جبرالٹر کو پار کر کے ہسپانیہ کو فتح کر لیا جہاں سے اسلامی افواج

فرانس کی جانب بڑھیں۔ چارلس مارٹل نے حضرت محمد کی وفات کے ایک سو سال بعد ۷۳۲ء میں ان کو شکست دے کر مغربی ممالک میں اسلام کی طاقت کو توڑ دیا۔ قسطنطنیہ کی بازنطینی مسیحی سلطنت اسلامی افواج کا تقریباً نصف صدی تک جان توڑ مقابلہ کرتی رہی لیکن بالآخر مغلوب ہو کر ختم ہو گئی۔ شام، مصر اور شمالی افریقہ جو مسیحیت کے گڑھ تھے ہمیشہ کے لئے اسلام کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان کو فتح کر کے حضرت محمد کی وفات کے ۸۰ سال بعد اسلام کا پرچم شمال ہندوستان میں لہرایا۔

اس جلد کے آئندہ ابواب میں ہم ان تاریخی اسباب کا بیان کریں گے جن کی وجہ سے مشرقی ممالک کی کلیسیائیں یکے بعد دیگرے ختم ہو گئیں۔ جس طرح بدھ مت اپنے وطن ہندوستان سے ختم کر دیا گیا تھا اسی طرح مسیحی کلیسیائیں اپنے وطن سے جہاں اس کی جڑیں صدیوں سے مستحکم تھیں اور مضبوطی سے گڑی ہوئی تھیں ختم کر دی گئیں۔ بدھ مت کی طرح مسیحیت نے اپنے وطن سے نکل کر غیر ممالک میں ترقی کرنی شروع کر دی لیکن غیر مساعد حالات کی وجہ سے اس کا مستقبل تاریک ہوتا گیا اور وہ ان ممالک میں بھی چند دن کی مہمان ہو گئی۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ انہی کلیسیاؤں نے اسلام کی آمد سے پہلے موت کو قبول کیا تھا لیکن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ یہ کلیسیائیں مسلسل ایذا رسانی اور متواتر قتلِ عام کے باوجود ہر ملک اور قوم میں پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی رہتی تھیں۔ ہم ان تاریخی اسباب پر محض ایک مورخ کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے اور تاریخ کے اوراق پلٹ کر ان پر معروضی نقطہ نگاہ ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ کلیسیائیں جو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ چھ صدیاں پیشتر ان مشرقی ممالک میں ہر سو پھیل گئی تھیں ان کا

ایسا حسرت ناک انجام کیوں ہُوا!

اُس زمانہ میں مشرقی ممالک کی یہ کلیسیائیں ہندوستان کی کلیسیاؤں کی ماں تھیں جن کو اُنھوں نے جنم دیا تھا۔ ان کلیسیاؤں کے بشپ اور قسیس ہندوستان کی کلیسیاؤں کے بشپ اور قسیس ہُوا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان کلیسیاؤں کے نیم جان اور پھر بے جان ہو جانے سے شمالی ہندوستان کی کلیسیائیں بھی پژمُردہ اور نیم مُردہ رہ کر صدیوں کے بعد آخر ختم ہو گئیں۔ پس شمالی ہندوستان کی کلیسیا کے مورخ کے لئے یہ لازم ہے کہ مذکورہ بالا مشرقی کلیسیاؤں کے مر مٹنے کے تاریخی اسباب کی تلاش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں مغربی ایشیا اور وسط ایشیا کے ممالک کی کلیسیاؤں کی تاریخ اور اُن کے زوال کے اسباب کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔

ان تاریخی اسباب کے صفِ اوّل میں پہلا درجہ قرآن، اسلامی تعلیم اور اسلامی نظامِ حکومت کو حاصل ہے۔ پس ہم آیندہ ابواب میں ان کا ذکر کریں گے۔

باب دوم۔ اسلام کا نظامِ حکومت

فصل اوّل۔ اسلامی مملکت کے خصائص و لوازم

پاکستان کی تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کی رپورٹ میں پنجاب ہائی کورٹ کے فاضل جج اسلام کے نظامِ حکومت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

"اسلام ایک ایسا نظام ہے جو پانچ موضوعات پر حاوی ہے:- (۱) مسلمات یعنی بنیادی عقائد (۲) عبادات (۳) اخلاقیات (۴) ادارات معاشرتی اقتصادی اور سیاسی (۵) شریعت۔ ان تمام موضوعات کے متعلق قواعد و ضوابط کی لازمی بنیاد الہام پر ہے نہ کہ عقل پر۔ گو یہ دونوں باہم مطابق بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ مطابقت اتفاقی ہوگی کیونکہ عقل انسانی ناقص ہو سکتی ہے اور عقل کا حقیقی اور قطعی ذریعہ صرف اللہ کے علم میں ہے جو انسانوں کی رشد اور ہدایت کے لئے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی وساطت سے عالم انسانی کو اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ اس لئے انسانوں کو چاہیے کہ عقائد کو تسلیم کریں۔ عبادات کی پابندی اختیار کریں۔ اخلاقی تعلیمات پر عمل کریں۔ قانون کی اطاعت کریں اور ان اِدارات کو قائم کریں جو اللہ نے الہام فرمائے ہیں خواہ ان کی عقلی مصلحت ظاہر نہ ہو بلکہ خواہ وہ عقل انسانی کے خلاف ہی ہوں کیونکہ ذات باری تعالےٰ منزّہ عن الخطا ہے۔ پس الہامِ الٰہی کے ذریعہ سے جو کچھ بھی معلوم ہو اُس کو ایک قطعی صداقت کی حیثیت سے قبول کرنا ہوگا خواہ اس کا موضوع رُوحانی اور ماورائے طبیعی ہو یا تاریخ۔ قانون اور عبادات سے تعلق رکھتا

ہو یا کسی ایسے موضوع سے متعلق ہو جس کو ذکر انسانی تحقیق علمی سے وابستہ سمجھتا ہو شلاً انسان کی پیدائش، ارتقاء، علم جنات یا علم ہیئت، تحقیق یا معیار قطعی معیار نہیں اور اس حقیقت سے انکار گویا اللہ تعالےٰ کی عقل کُل اور اس کے عزائم کا انکار ہے اور یہ کُفر ہے۔

اللہ تعالےٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کی معرفت جن میں ہمارے رسُول پاک آخری تھے، اپنا الہام بھیجا ہے۔ یہ الہام قرآن مجید میں موجود ہے اور مندرجہ بالا پانچ موضوعات پر حاوی ہے . . . . ہمارے رسُول پاک کا ہر قول و فعل یقیناً اللہ کی طرف سے تھا لہذا وہ بھی رسمی الہام کی مانند غلطی سے پاک سمجھا جاتا ہے کیونکہ انبیاء معصوم ہیں اور [illegible] یا فعل کی اہمیت ہی نہیں [illegible] منشائے الٰہی کے خلاف ہو۔ یہ افعال و اقوال "سُنّت" کہلاتے ہیں اور سُنّت قرآن ہی کی طرح غلطی [illegible] سے پاک ہے۔ اس [illegible] کی تفصیل حدیث میں درج ہے۔ حدیث رسُول پاک صلعم اور ان [illegible] کے اقوال و افعال کے تذکرے [illegible] دیے۔ اوّلین دور میں [illegible] وہ لوگ جنہوں نے رسُول پاک کی صحبت میں زندگی بسر کی [illegible] بہترین اور مستند ماخذ تھے۔ بعد کے لوگوں کو تابعین کے [illegible] کرنا پڑا۔ یہ لوگ رسُول کے بعد پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے [illegible] صحابہ سے علم حاصل کیا تھا۔ پھر انہی کے بعد کی نسل کے بیانات پر انحصار کرنا پڑا جو تبع تابعین کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ رسُول کے بعد دُوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے تابعین سے کسب علم کیا تھا۔ مرفوع حدیث وہ ہے جو رسُول پاک کے متعلق کسی بیان پر مشتمل ہو۔ موقوف حدیث اُس کو کہتے ہیں جس میں صرف

صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہو۔ اور مقطوع حدیث وہ ہے جو رسُول پاک کے بعد کی پہلی نسل سے قبل پر حاوی نہ ہو بلکہ صرف تابعین کے اقوال و افعال پر مشتمل ہو۔ بعض احادیث میں خود اللہ تعالےٰ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ایسی حدیث کو حدیثِ قدسی یا حدیثِ الٰہی کہتے ہیں تاکہ عام "حدیثِ نبوی" سے ممیز ہو سکے . . . . . .

"تدوینِ حدیث کا کام تیسری صدی ہجری سے شروع ہُوا اور صحاح ستہ اسی صدی میں مرتب کی گئیں جن کے مصنفین یہ حضرات تھے:-

(۱) بخاری (وفات ۸۷۰ء)۔ (۲) مسلم (وفات ۸۷۵ء)۔ (۳) ابوداؤد (وفات ۸۸۸ء)۔ (۴) ترمذی (وفات ۸۹۲ء)۔ (۵) نسائی (وفات ۹۱۵ء)۔ (۶) ابنِ ماجہ (وفات ۸۸۶ء)۔

زمانۂ حاضر کے قوانین شہادت کی رُو سے احادیث، سُنّت کی قابلِ قبول شہادت نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک متعدد راویوں کے سلسلے سے ہم تک پہنچی ہے . . . . . دُوسری اور تیسری صدیوں میں عبادات و رسُوم عقائد و معلمات اور اہم ترین سیاسی و اجتماعی ادارات نے قطعی شکل اختیار کر لی۔ عقیدے کے اصول اساسی اس وقت تک مالک بن انس، الشافعی اور دیگر علماء کی تصانیف میں قائم ہو چکے تھے جو مختلف حلقوں میں مستند اور معتبر سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ زیادہ تر رسولِ پاک صلعم کی احادیث کی سند پر ہی مبنی تھے۔ جتنا وقت گزرتا گیا کسی نے ان احادیث کی صحت پر شبہ کرنے کی جرأت نہ کی اور آج تک صحاح ستہ کی احادیث کی صحت و صداقت کا تقریباً قطعی یقین برابر چلا آیا ہے . . . . . ہم اب تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی موضوع پر کوئی حکم بھی ہو اگر اس کا استخراج قرآن مجید

اور سُنّتِ رسُولِ پاک سے کیا گیا ہے تو وُہ ہر مُسلمان کے لئے واجب التعمیل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اِس نظریہ کو پُوری طرح سمجھ لیا جائے کہ اسلام کے عقائد ۔ اخلاق اور ادارات غلطی سے پاک ہونے کے عقیدے پر مبنی ہیں، خواہ وُہ بے خطائی قرآن ہیں ۔ سُنّت ہیں ۔ اجماع ہیں یا اجتہادِ مُطلق میں مضمر ہو تو اس سے جو نتائج بھی مستنبط ہوں گے وُہ آسانی سے سمجھ میں آجائینگے ۔ چُونکہ ہر معاملہ میں خواہ وُہ عبادات سے متعلق ہو یا اس کی نوعیت سیاسی یا اجتماعی یا اقتصادی ہو، آخری معیارِ صداقت الہامِ الٰہی ہے اور الہام قرآن مجید ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور سُنّت بھی الہام ہی کی مانند بے خطا ہے اور سُنّت کی صحت کی تنہا شہادت حدیث ہے لہٰذا اسلامی مملکت کے قائم کرنے کے خواہشمندوں کا پہلا فرض یہ معلوم کرنا ہے کہ کس حُکم کا حالاتِ حاضرہ پر اطلاق ہوتا ہے وُہ آیا قرآن و حدیث میں موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اجماع کے معنی ہیں مجتہدینِ ملّت کا اتفاقِ رائے ۔ مجتہدین وُہ لوگ ہیں جو رسولِ پاک صلعم کے وصال کے بعد اپنے علم کی بنا پر خود حُکم لگانے اور فیصلے کرنے کا حق رکھتے ہیں ۔ اجماع سے متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق احکام معیّن کر دیئے جاتے تھے اور جب وُہ ایک دفعہ معیّن ہو جاتے تھے تو دین کا جزو لاینفک بن جاتے تھے اور ان سے انکار کرنا کُفر قرار دیا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اجماع اور اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ اجماع اجتماعی اور اجتہاد انفرادی ہوتا ہے ۔ اجتہاد کے معنی ہیں کسی مفہوم یا قانون کے کسی حُکم کے متعلق رائے قائم کرنے میں انتہائی محنت کرنا ۔ اجتہاد قرآن اور سُنّت پر قیاس کے اطلاق سے کیا جاتا ہے ۔ اجتہاد پہلے پہل غلطی سے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے نتائج ہمیشہ ظنّی خیال کئے

جاتے تھے ۔ یہ صرف اِس حالت میں غلطی سے پاک سمجھا جاتا تھا جب مختلف افراد کے اجتہاد مِل کر اجماع بن جاتا تھا ۔ ۔ ۔

"جتنے قوانین قرآن اور سُنّت میں پائے جاتے ہیں وہ اسلامی مملکت کی مُسلمان رعایا کے لئے قانُونِ مُلکی کا ہی ایک حصّہ ہیں ۔ اسی طرح اگر قرآن و سُنّت میں کوئی ایسا حُکم ہو جو دُوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مُسلمان رعایا اور دُوسری مملکتوں کی رعایا کے درمیان روابط سے تعلق رکھتا ہو تو اس حُکم کا نفاذ بھی اتنا ہی لازمی ہوگا جتنا قرآن یا سُنّت کے دُوسرے احکام کا نفاذ ضروری ہے ۔ پس صحیح معنوں میں اسلامی مملکت کے دستُور میں ذیل کی دفعات ضرور ہونی چاہئیں :۔ (۱) تمام قوانین جو قرآن و سُنّت میں موجود ہیں مُسلمانوں کے لئے قانُونِ مُلکی کا ایک حصّہ متصوّر ہوں گے اور اسی حیثیّت سے نافذ کئے جائیں گے ۔ (۲) دستُور کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سُنّت کے منافی ہوگی وُہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائیگی ۔ ۔ ۔ ۔ (۳) بین الاقوامی قانون کا کوئی قاعدہ اور کسی ایسے میثاق یا معاہدے کی کوئی دفعہ اگر قرآن یا سُنّت کے خلاف ہوگی تو کسی مُسلمان پر اس کی پابندی واجب نہ ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام ایک مکمّل مذہب ہے، اس میں واضح قوانین بھی ہیں اور اجماع اور اجتہاد سے مستنبط بھی کئے جا سکتے ہیں اور وُہ انسانی فعالیّت کے پُورے دائرے پر حاوی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام ایک مکمل اور جامع ضابطہ ہے اور اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کے انسانی فعالیّت کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل مہیّا کر سکتا ہے اور کسی ایسے خلا کا قائل نہیں جس کو تازہ قانُون سازی سے پُر کرنے کی ضرورت ہو ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام مشورے کا حُکم دیتا ہے ۔ ۔ ۔ لیکن مجلسِ شوریٰ کے علماء کا کام

یہ تھا کہ کسی خاص نکتے پر جس کا ذکر قرآن و سُنّت میں نہ پایا جاتا ہو فیصلے کا تعین کرے لہٰذا وُہ صرف قانون کا انکشاف و اطلاق کرتے تھے وُہ قانون کو وضع نہ کر سکتے تھے ۔ البتہ جو فیصلہ وُہ کر دیتے تھے، نہ صرف اُس خاص مقدمہ پر بلکہ بعد کے موقعوں پر بھی واجب العمل نظیر بن جاتا تھا ۔ (صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۹) ۔

ہم نے اس رپورٹ کا طویل اقتباس کیا ہے کیونکہ پنجاب ہائی کورٹ کے دو فاضل ججوں نے مختصر لیکن واضح الفاظ میں اسلام کے اساسی اصُول اور اسلامی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر بار بار اِس کتاب میں آئیگا ۔ ان اساسی اصُول کا ایشیائی ممالک کی مسیحی کلیسیاؤں کی زندگی اور بقا پر بڑا اثر پڑا ۔

فصلِ دوم ۔ قرآنی احکام اور مسیحی کلیسیاء کا مقام

ہم جلد دوم کے باب چہارم کی فصل اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ رسُول عربی کی وفات کے زمانہ میں جنوبی ہند ۔ پنجاب ، بنگال اور وسط ہندوستان میں متعدد بشپ اور بے شمار کلیسیائیں موجود تھیں جو ہندوستان کے طول و عرض میں چار ہزار میل کے فاصلہ تک پھیلی ہوئی تھیں ان کلیسیاؤں کے مسیحی اپنے آپ کو مقدس توما کے مسیحی کہتے تھے شمال اور وسط ہندوستان اور بنگال کی کلیسیائیں رِیو اردشیر کے میٹرو پالیٹن کے ماتحت تھیں لیکن جب ہندوستان کے اپنے میٹرو پالیٹن کی تقدیس ہوگئی تو وُہ قدرتاً اُس کے ماتحت ہوگئیں ۔ یہ کلیسیائیں شمار میں اِس قدر بڑھتی گئیں کہ چودھویں صدی میں ہندوستان کے میٹرو پالیٹن کا درجہ تمام نسطوری کلیسیاؤں کے

میٹرو پالیٹینوں میں رُتبہ کے لحاظ سے پندرھواں ہوگیا ۔

نوویں صدی مسیحی میں ایک میٹرو پالیٹن کا صدر مقام ٹیکسلا کے نزدیک شہر گندس پور میں تھا جو موجودہ شاہ آباد کے قریب واقع تھا ۔ بنگال اور وسط ہندوستان کی کلیسیائیں بھی روز افزوں ترقی کر رہی تھیں وسط ہندوستان کے تین راجے مسیحی تھے اور ۱۲۲۲ء میں پٹنہ کا شہر یہاں کے میٹرو پالیٹن کا صدر مقام تھا ۔

ہم نے جلد دوم کے باب چہارم کی فصل سوم میں مختصر طور پر ان کلیسیاؤں کے انحطاط اور زوال کا ذکر کیا ہے ۔ ساتویں صدی مسیحی سے مسیحی کلیسیا کے لئے ابتلا کا دور شروع ہوتا ہے ۔ اسی زمانہ میں اسلام نے عروج پکڑا اور جُوں جُوں اسلام عروج پکڑتا گیا مسیحی کلیسیا کو زوال آتا گیا ۔ پس یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے اسلامی احکام اور اصُول کا ذکر کریں تاکہ ناظرین اُن تاریخی اسباب کو معلوم کر سکیں جن کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان کی مسیحی کلیسیاؤں کی زندگی بلکہ تمام ایشیائی ممالک کی کلیسیاؤں کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ گئی اور جہاں جہاں اسلام غالب ہوا مسیحی کلیسیا امن فضا میں سانس نہ لے سکی ۔

(۱)

قرآن کے مطابق آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور وُہ ہر شے پر قادر ہے (۵/۲۰) ۔ اسلامی حکومت خدا کی بالادست حکومت ہے جس کا فرمانروا اعلیٰ خدا خود ہے جو رب العالمین یعنی فرمانروائے عالم (۲/۱) الملک القدوس یعنی مقدس بادشاہ (۲۳/۲۸) ۔ الملک الحق یعنی بادشاہ برحق (۱۱۴/۲۰ - ۱۱۶/۲۲) ۔ مالک الملک یعنی فرمانروائے مملکت (۲۵/۳) ۔ احکم الحاکمین یعنی

حکمرانوں کا حکمران (۴۵/۱۱)، خیر الحاکمین یعنی بہترین حکمران (۸۷/۷)، ملک الناس یعنی انسانیتِ عامہ کا فرمانروا (۲/۱۱۴)، رب العرش العظیم (۱۲۹/۹) وغیرہ ہے۔ جو اسلامی حکومت دنیا میں قائم ہوتی ہے وہ خدا کی بالادست حکومت ہے جس کی حقیقت خدا کے حکم میں مرکوز ہے اور جس کا سرچشمہ خدا کا پیغام ہے (۵۷/۶ - ۴۰/۱۲ - ۶۲/۶ وغیرہ)۔ یہ حکومت درحقیقت ایک نمائندگی کا درجہ رکھتی ہے اور نیابتی ذمہ داری ہے جو "حکومت در حکومت" یا "خداداد حکومت" کے اصول پر اپنے حقیقی اقتدار کو ظاہر کرتی ہے۔ پس اس حکومت کے ترجمان کے خطابات یہ ہیں:۔ (۱) امام اعظم۔ (۲) اولو الامر یعنی ایسی ہستی جو صاحبِ حکومت ہے اور جس کے لئے علم اور دین کی پابندی لازم ہے۔ (۳) خلیفۃ المسلمین (۴) زعیم الامۃ۔ (۵) رئیسِ عام یعنی ریاستِ عامہ کا صدر (۶) والیٔ عام یعنی ولایتِ عامہ کے منصبِ جلیل کا ذمہ دار۔ یہ اسلامی حکومت انسانی حکومت نہیں ہے بلکہ نیابتی حکومت ہے (مفردات امام راغب)۔ اصل حاکم خدا ہے اور انسان زمین پر اس کا خلیفہ (نائب) ہے جو حکومت در حکومت کے اصول پر نیابت کی تمام ذمہ داریوں کو مذہبی فرائض سمجھ کر پورا کرتا ہے۔ اس حکومت کا دنیاوی بادشاہ نہیں ہوتا۔ اس کا نہ تاج و تخت ہوتا ہے اور نہ ولی عہد، نہ شاہی شاہزادے ہوتے ہیں اور نہ ان کے موروثی حقوق ہوتے ہیں۔ الٰہی حکومت سے مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر تن تنہا صرف ایک واحد خدا ہی کی حکومت ہے جو وہ اپنے تمام قانونی اقتدار اعلیٰ محض خود اختیار سے کرتا ہے۔ قرآن اس اسلامی حکومت کا اٹل قانون ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لئے خدا کی طرف سے حکم موجود ہے جو قطعی اور واجب التعمیل ہے۔ اس میں تمام ضابطے موجود ہیں جن میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی ممکن

نہیں۔ پس اسلامی حکومت سر تا سر اسلام کے اٹل اور اساسی قانون کی پابند ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی شعبوں سے ہے۔ اسلامی حکومت محض دنیاوی تنظیم نہیں ہے بلکہ وہ ایک دینی نظام ہے۔ وہ اپنی حکمتِ عملی میں ایک مکمل مجموعۂ قانون یعنی قرآن و کتابِ مسطور کی پابند ہے۔

قانونِ قرآن اور فقہ میں خاص ربط ہے کیونکہ قانون کے علم کا نام ہی فقہ ہے چنانچہ امام غزالی لکھتا ہے "الفقہ ھو معرفۃ القانون" یعنی فقہ قانون کی معرفت کا نام ہے جس کا تعلق معاملات میں قانونِ الٰہی اور امورِ سیاسی دونوں سے ہے (احیاء العلوم)۔ فقہا خدائی قانون کے ماہر ہیں۔ لازم ہے کہ فقہ کا منبع قانونِ اساسی ہو۔ تب فقہ کے احکام قطعیت کے ساتھ قائم رہیں گے (دیکھو الموافقات شاطبی جلد اول ص ۲۹)۔ چنانچہ علامہ ابنِ خلدون کہتے ہیں کہ سیاست اُس ذمہ داری کا نام ہے جس کے ذریعہ خدا کی نیابتی حکومت بندگان کے درمیان اللہ کے قوانین کو نافذ کرتی ہے اور احکام کا اجرا عمل میں لاتی ہے (مقدمہ ابنِ خلدون)

(۲)

جہاد ہر مومن پر فرض ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "قتال تم پر فرض ہوا اور وہ تم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاید تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور شاید تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" (۲: ۲۱۲ و ۲۱۳) از روئے قرآن اسلامی فوج خدا کی فوج ہے اور اللہ رب الافواج ہے (۳۷: ۱۷۳)۔ اس کے لئے فتح خدا کی طرف سے مقدر ہے (۳۷: ۱۷۳)۔ پس چاہیے کہ مسلمان خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑے اور مارا جائے یا غالب ہو ہم

اُس کو بڑا ثواب دیں گے" (۴/۷۶ و ۵/۳۹) "اے مسلمانو! کافروں کو یہاں تک قتل کرو کہ فتنہ (غلبۂ کفر) نہ رہے اور تمام دین اللہ کا ہی ہو جائے" (۸/۴۱)۔ "مسلمانو۔ جنگِ کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے قوت اور گھوڑے باندھنے کی تیاری کرو تاکہ ایسا کرنے سے تم اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤ اور اُن کے علاوہ اور لوگوں کو بھی ڈراؤ جن کو تم نہیں جانتے" (۸/۶۲)۔ قرآن میں آنحضرت کو حکم ہوا "اے نبی مسلمانوں کو لڑائی پر اُبھار" (۸/۶۶ - ۹/۲۲۳)۔ "اے نبی کافروں اور منافقوں کے ساتھ لڑائی کر اور اُن پر سختی دکھلا۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے" (۹/۷۳) "کافروں کے ساتھ بڑے زور سے مقابلہ کرو" (۲۵/۵۲ - ۶۶/۹ - ۸/۶۵ وغیرہ) "اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کرنے کا حق ہے" (۲۲/۷۸) "اللہ پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو۔ (اے رسول) اہلِ دولت تجھ سے رخصت مانگتے ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھ رہنے والوں میں چھوڑ دو اور پچھلی عورتوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگی ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور اُس کے ایماندار ساتھی اپنی جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں اور انہی کے لئے خوبیاں ہیں اور وہی مراد کو پہنچیں گے۔ اُن کے لئے اللہ نے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے" (۹/۸۶ - ۹/۱۲ - ۹/۸۷ وغیرہ۔ نیز دیکھو) ۲:۱۹۰-۱۹۳ + ۲۲:۳۹-۴۰ + ۶۰:۸ + ۴:۷۴-۷۶ + ۹:۵ + ۲۵:۵۲ + ۹:۵-۶ + ۹:۲۹ وغیرہ

جہاد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہوں گے" (۱۱۰:۲)۔ اسلامی فوج کے سپاہی کا قرآنی نام مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ "دنیا کی زندگی تو کھیل ہے" (۶/۳۲)۔ اس کے

لئے "مال اور اولاد کا خیال ایک فتنہ ہے" (سورہ انفال)۔ مجاہد اُن تمام شہریوں پر فوقیت رکھتا ہے جو فوجی خدمت پر حاضر نہیں ہوتے (سورہ نسا) اگر مجاہد فتح پا کر زندہ رہے تو وہ غازی ہوتا ہے لیکن اگر وہ خدا کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے (حدید آیت ۱۰۔ صف ۴ + عمران آیت ۱۵۰ و ۱۶۹ وغیرہ)۔ جہاد سے صرف کمزور، مریض اور تنگ حال شہری مستثنےٰ ہیں بشرطیکہ وہ دیگر طریقوں سے اسلام سے خیرخواہی کا حق ادا کریں۔

امام راغب مفردات القرآن میں جہاد کی یوں تعریف کرتے ہیں: "الجہاد استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو" یعنی انتہائی قوت سے دشمن کی مدافعت کرنا جہاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں اور اُس کے تمام جنگی مرکزوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے۔ چنانچہ کلیات العلوم میں ہے "الجہاد الدعاء الی دین الحق والقتال مع من لا یقبلہ" اس کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو اور کافروں کی بات نیچی ہو"۔ "بے شک اللہ اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح قطار باندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں" (۶۱/۴)۔ ایماندار انسانوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہوتی ہے لیکن جب کافر لڑتے ہیں تو اُن کی جنگ "شیطانی" ہوتی ہے۔ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ ایماندار ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ اختیار کریں۔ وہ معرکہ آرا ہوں تو خدا کے رستے میں اور زندہ رہیں تو خدا کے رستے میں۔ مجاہد کسی دنیاوی رشتہ کو جہاد کے سامنے ترجیح نہیں دیتا چنانچہ سورۂ توبہ میں ہے "اے رسول تو مسلمانوں کو کہہ دے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں، تمہارا

کُنبہ قبیلہ، تمہاری کمائی ہُوئی دَولت اور تمہاری وُہ تجارت جس کے ٹھپ ہو
ہو جانے کا تُم کو خطرہ ہے اور تمہارے رہنے کے مکانات جو تُم کو عزیز ہیں،
اگر یہ باتیں تُم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے، اُس کے رسُول سے اور اُس کی
راہ میں جہاد کرنے سے، تو تُم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ کرے
(اور تُم کو سزا مِل جائے) ۔ اللہ نافرمانوں کی ہدایت نہیں کرتا (ع ۳ ۔ وغیرہ)
لیکن جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وُہی اللہ کی رحمت کے اُمید دار ہیں۔"
(۲/۲۱۶)۔ نعمائے بہشت اُنہیں کے لئے ہیں ۔ ان کو انعام میں بہشت
ملیگا ۔ جہاں نہریں اور چشمے جاری ہیں اور خوشے نیچے لٹکے ہُوئے ہیں۔
وہاں تخت، پیالے، چاندنیاں، قالین اور فرش وغیرہ ہوں گے ۔ وہاں
پھل اور میوے ہیں ۔ پانی، دُودھ، شراب اور شہد کی نہریں بہتی ہیں ۔
وہاں کی شراب سے نہ تو سر گھُومے گا اور نہ پینے والے بیہودہ بکیں گے ۔
وہاں انگور، کیلے، بے خار بیریاں، کھجور، انار وغیرہ ہیں ۔ بہشت میں گھنیرے
گھر اور بالا خانے ہیں ۔ وہاں حُوریں ہیں گی اور انگور اور انواع و اقسام کے
شربتوں کے پیالوں کا دَور چلیگا ۔ مجاہدین کو سونے چاندی کے کنگن، ریشمی
لباس اور موتی پہنائے جائینگے ۔ جس قسم کے پرندوں کا وُہ گوشت چاہینگے
اُن کو ملیگا ۔ ان کے حضور ہمیشہ زندہ رہنے والے غلمان گشت کرینگے اور
جو وُہ چاہیں، پائینگے ۔ بہشت میں مسلمان مردوں اور عورتوں کا سنگار کیا
جائیگا اور وُہ بہشتی جڑاؤ تختوں پر مخمل کے بچھونوں پر آمنے سامنے تکیے
لگا کر بیٹھیں گے اور عورتوں سے باتیں کرینگے جو گوریاں ہونگی، سُتھری بڑی
آنکھوں والی جیسے چھپے موتی ۔ پیار دلانے والی کنواریاں جو شرم سے
نیچی نگاہ والیاں ہیں جیسے شترمرغ کے انڈے یعنی کے ساتھ بہشتیوں

سے پہلے کوئی آدمی یا جن ہمبستر نہیں ہُوا ۔ جو یاقوت اور مونگا کی سی ہیں
اور خیموں میں رُکی بیٹھی ہیں ۔ (قرآن)
اسیرانِ جنگ کے لئے بھی اسلامی شریعت میں قانون ہے۔ جنگِ
بدر کے بعد اللہ نے آنحضرت کو فرمایا تھا "نبی کے لئے یہ مناسب نہ تھا
کہ اچھی طرح خونریزی کے بغیر لوگوں کو قیدی بنائے ۔ تُم دُنیا کی دَولت
چاہتے ہو (کہ اگر قیدی ہاتھ آجائینگے تو اُن کا زرِ فدیہ ملیگا) لیکن خُدا آخرت
چاہتا ہے" (انفال آیت ۶۸) ۔ اگر دشمن کا مُلک اُن کا زرِ معاوضہ ادا
کرے تو قیدی رہا کر دیئے جائیں ۔ قیدیوں کے تبادلہ کی بھی اجازت ہے
لیکن اگر ان دونوں صُورتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہ ہو تو قیدی ہمیشہ
کے لئے غلام بنا لئے جائیں ۔ اِس پر مذکورہ بالا پاکستانی رپورٹ کے منصف
جج لکھتے ہیں "یہ اِس قانون کا بھی بین الاقوامی قانون سے تصادم یقینی ہے"
(صفحہ ۲۴۳)۔ کیونکہ یہ اسلامی قانون زمانۂ حاضرہ کے بین الاقوامی قانون سے
بُنیادی طور پر مختلف ہے اور دونوں نظام ایک بُنیادی فرق پر مبنی ہیں ۔
جہاد کے متعلق مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ میں لکھا
ہے "جہاد ۔ اسلحہ کے زور سے اسلام کی اشاعت مسلمانوں کا علی العموم
مذہبی فریضہ ہے ۔ یہ اسلام کا چھٹا رُکن بنتے بنتے رہ گیا لیکن خارجیوں
کے اولاد و احفاد اسے حقیقتہً چھٹا رُکن تسلیم کرتے ہیں مسلمان اس موقف
پر تدریجی طور پر لیکن سُرعت کے ساتھ پہنچ گئے ۔ قرآن کی مکی سُورتوں میں
حملے کے مقابل صبر کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اس کے سوا کوئی دُوسرا رویہ ممکن
ہی نہ تھا (یہاں آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر
نہیں، کی طرف اشارہ ہے) ۔ لیکن مدینہ میں حملے کے دفاع کا حق قائم ہو گیا

اور رفتہ رفتہ اہلِ مکہ کے خلاف لڑنا اور اُن کو مطیع کرنا فرضِ عین قرار پاگیا... جہاد فرض علی الکفایہ ہے جو اُن تمام مسلمانوں پر علی العموم عائد ہوتا ہے جو مرد ہوں۔ آزاد ہوں۔ بالغ ہوں۔ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح العقل ہوں اور مسلمان فوج تک پہنچنے کی ضروری استطاعت رکھتے ہوں.... جہاد اُس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک پوری دُنیا اسلام کے زیرِ نگیں نہ ہو جائے... جن لوگوں کے خلاف جہاد کرنا مقصود ہو اُن کو سب سے پہلے قبول اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر اُن سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ مسلم حکومت کے آگے سر جُھکا دیں۔ ذمّی بن جائیں، جزیہ اور خراج دیں اور اگر یہ بھی نہ مانیں تو جنگ کریں۔ پہلی حالت میں ان کی جانیں، ان کے خاندان اور ان کا مال بالکل محفوظ رہیگا لیکن ان کی حیثیت ادنٰی ہوگی۔ ان کو شہریت کے اصطلاحی حقوق حاصل نہ ہونگے اور ان سے صرف ذلت میں لٹے ہوئے اشخاص کا سا سلوک ہوگا۔ اگر وہ جنگ کرینگے تو وہ اور ان کے افرادِ خاندان غلام بنا لئے جائیں گے۔ اُن کے مال پر بطور غنیمت قبضہ کر لیا جائیگا جس کا پانچواں حصہ فاتحین کے لشکر کو دیا جائیگا... اگر عقیدہ جہاد کو خارج کردیا جائے تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا"

(ماخوذ از پاکستانی رپورٹ، صفحہ ۲۲۴)۔ رپورٹ کے لکھنے والے جج لکھتے ہیں کہ "عام طور پر مسلّمہ رائے یہ ہے کہ سُورۂ توبہ کی پانچویں آیت نے اُن کل آیات کو منسوخ کردیا ہے جن میں صرف دفاع کے لئے کفار کے خلاف قتال کی اجازت دی گئی تھی"۔ (صفحہ ۲۴۱)۔ چنانچہ قرآن خود کہتا ہے کہ اس کی بعض آیات دیگر آیات کو منسوخ کردیتی ہیں (۲:۱۰۶ + ۱۶:۱۰۱)، پس آیتِ قتال نے آیت لا اکراہ فی الدین کو منسوخ کردیا ہے۔ آگے چل کر یہی فاضل جج لکھتے ہیں

"عقیدۂ جہاد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے اُس کا نتیجہ یہی نکلیگا کہ اسلام اسلحہ اور فتوحات کے زور سے پھیلا ہے۔ اب جارحیت اور نسل کشی انسانیت کے خلاف جرائم قرار پا چکے ہیں.... ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے"۔ (صفحہ ۲۴۲)۔

اسلام کے مطابق دُنیا دو حصّوں میں منقسم ہے :- (۱) دارالاسلام اور (۲) دارالحرب۔ دارالاسلام وہ مُلک ہے جہاں اسلامی شریعت نافذ ہے اور جو کسی مُسلم فرمانروا کے ماتحت ہے۔ دارالحرب وہ مُلک ہے جو ابھی تک فتح کے ذریعہ دارالاسلام نہیں بنا۔ خواہ اِس سے جنگ کی جائے یا نہ کی جائے، نظریاتی زاویۂ نگاہ سے اسلامی مملکت ہر غیر مُسلم مُلک سے دائم برسرِ جنگ رہتی ہے کیونکہ وہ کسی وقت بھی دارالحرب بن سکتی ہے۔ دُنیا کے لوگ بھی دو حصّوں میں منقسم ہیں :- اوّل مومن یعنی وہ جو اللہ اور نبی پر ایمان لاتا ہے۔ دوم کافر یعنی جو مومن نہیں ہے۔ کافروں کے ساتھ مکمل مقاطعہ کا حکم ہے چنانچہ قرآن میں ہے "مومنو۔ اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کی نسبت کُفر کو درست رکھیں تو تم اُن کو اپنا رفیق نہ بناؤ تم میں سے جو اُن کے ساتھ رفاقت رکھیگا، وہی ظالم ہے"۔ ($\frac{9}{22}$)۔

(۲۳)

اسلامی شریعت میں جو شخص ایک دفعہ اسلام قبول کرکے مُرتد ہو کر واپس لوٹ جائے، اُس کی سزا قتل ہے "مُرتد" کے معنے لغت میں (راجع) یعنی کسی چیز سے لَوٹنے اور پھر جانے والے کے ہیں اور اسلامی شریعت کی اصطلاح میں مُرتد اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو دینِ اسلام کو اختیار کرکے اُس سے پھر جائے۔ چنانچہ امام راغب ارتداد کے معنی لکھتے ہیں "ھو

"الرجوع من الاسلام الی الکفر" اسلام سے کفر کی طرف پھر جانا" (مفردات صفحہ ۱۹۲) - اور اس کی سزا موت ہے۔

اسلامی اصول کے مطابق کسی شرعی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے چار دلیلیں ہو سکتی ہیں: (۱) قرآن (۲) سنّتِ نبی (۳) اجماع مجتہدین (۴) قیاس و استنباط۔ قتل مرتد کی سزا ان چاروں دلیلوں سے ثابت ہے

(۱) قرآن - قرآن میں مصدر ارتداد کا صیغہ ماضی (بحالت واحد، تثنیہ اور جمع) استعمال کیا گیا ہے مثلاً "فارتد بصیرا" (سورۂ یوسف۔ سورۂ کہف اور سورۂ قتال میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے - لفظ مرتد صیغۂ مضارع ہے اور سورۂ بقرہ، سورۂ ابراہیم اور سورۂ مائدہ میں وارد ہوا ہے بعض قرآنی آیات ایسی بھی ہیں جن میں گو لفظ مرتد یا ارتداد وغیرہ نہیں ہیں لیکن بلا کسی شک اور شبہ کے ان میں اسلام سے روگردانی کرنے والوں کا ذکر ہے مثلاً سورۂ نحل آیت ۱۰۸ - سورۂ آل عمران میں اس باب پر مسلسل پانچ آیات موجود ہیں - سورۂ نسا، سورۂ برات، سورۂ مائدہ اور سورۂ بقرہ میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر آتا ہے جو بعد از ایمان اسلام سے پھر گئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت "ومن یرتد . . . فیہا خالدون" میں الفاظ "فیمت وھو کافر" سے مفسرین نے قتل مرتد استنباط کیا ہے - سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستوں کے لیے حکم "فاقتلوا انفسکم" (اپنے آدمیوں کو قتل کرو) موجود ہے جس کی پابندی مسلمانوں پر واجب ہے کیونکہ نہ تو قرآن نے اور نہ نبی عرب نے اس کو منسوخ کیا ہے - قرآن کی نظر میں ارتداد ایک ایسا فتنہ ہے جس کو مٹانے کے لیے جارحانہ اور مدافعانہ جہاد بالسیف کا حکم قرآن میں آیا ہے - (سورۂ بقرہ ۲۱۴) -

۹ھ میں حج کے موقع پر اعلان برأت کیا گیا - اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑتے رہے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی مہلت دی گئی تاکہ اگر انہوں نے اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کر لیں اگر وہ ملک چھوڑ کر کہیں چلے جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں - مدت مقررہ کے اندر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا - اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائینگے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو تو ان کی تلوار سے چارہ جوئی کی جائیگی - "اگر وہ (قبول اسلام کے) عہد کے بعد اپنی قسم کو توڑ دیں اور (مرتد ہو کر) تمہارے دین پر زبانِ طعن دراز کریں تو تم ان کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں - کیا تم ان سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑیں" (۹:۱۱ - ۱۲) "وہ چاہتے ہیں کہ جیسے وہ خود کافر ہیں تم بھی کافر ہو کر ان کے برابر ہو جاؤ . . . وہ تم سے جنگ کرتے رہینگے تاکہ اگر ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں" "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین للہ" یعنی دشمنانِ اسلام کو اس وقت تک قتل کرتے جاؤ کہ فتنہ کا وجود نہ رہے اور اللہ کا دین ہی ہو جائے اور "اللہ کے دین" کی قرآن تخصیص کر کے بتلاتا ہے "اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے" اور "جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا" (آل عمران آیات ۱۷ و ۷۹) - دیگر آیاتِ قرآنی کے لیے دیکھو سورۂ نسا آیت ۹۰ - سورۂ مائدہ آیت ۵۹ - سورۂ نحل آیت ۱۰۸ - ان آیات کی نسبت کتب تفاسیر صاف اور واضح الفاظ میں بتلاتی ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے -

(۲) سنّتِ رسول بھی واضح طور پر ثابت کر دیتی ہے کہ قرآن کا حکم یہی ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے - چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ عربی نے کہا

"من بدل دینه فاقتلوه" یعنی جو اپنا دین بدلے اُس کو قتل کر دو۔ (صحیح بخاری) یہ حدیث تمام معتبر کُتبِ حدیث میں موجود ہے۔ کُتبِ احادیث میں تو حکمِ نبوی بہ سلسلۂ ذکرِ حدود اور قتلِ مرتد ہر جگہ صاف ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں تو ایک باب کا باب "باستتاب المرتدین" کے عنوان سے قائم کر دیا گیا ہے۔ مرتد کے قتل کی سزا کی حدیث ابنِ ماجہ، ترمذی، مسندِ امام حنبل وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ "رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان ہو اگر وُہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور جماعت کو ترک کر دے تو اُس کا خون حلال ہے" (بخاری، مسلم و ابو داؤد)۔ قتلِ مرتد کی حدیث جو حضرت عائشہ سے مروی ہے اس باب میں قاطع دلیل ہے (ملاحظہ ہو ابو داؤد۔ باب حدود و مسند حنبل اور تفسیر طبری)۔ یہ روایت نہ صرف حضرت عائشہ سے مروی ہے (نسائی) بلکہ حضرت عثمان سے بھی ہے (نسائی باب الحکم فی المرتد)۔ عبد اللہ بن مسعود کی مندرجہ بالا روایت کی نسبت امام نووی شارحِ صحیح مسلم لکھتے ہیں کہ اس کا اطلاق عمومیت کے ساتھ ہر اُس شخص پر ہوتا ہے جو دینِ اسلام سے برگشتہ ہو جائے اور اگر تائب ہو کر از سرِ نو اسلام قبول نہ کرے تو وُہ واجب القتل ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ وُہ ایک مشہور حدیث لکھتا ہے کہ "رسول اللہ نے فرمایا کہ تین حالتوں میں مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے۔ اوّل۔ زانی۔ دوم۔ قاتل اور سوم مرتد کا جو اسلام کو ترک کر دے" اور اس پر لکھتا ہے "زانی کو سنگسار کر دینا چاہیئے۔ قاتل کو جُرم کے ثبوت کے بعد تلوار سے قتل کر دینا چاہیئے لیکن مرتد کو جو خُدا اور رسُول کا نافرمان ہو جاتا ہے یا کاٹ ڈالنا چاہیئے یا مصلوب کر دینا چاہیئے اور یا دُنیا سے نابود کر دینا چاہیئے"۔

فی الحقیقت رسولِ عربی قرآنی احکام کو اگلے پچھلے مسلمانوں سے بہتر سمجھتے تھے

اور وُہ کوئی ایسا حُکم صادر نہیں کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے جو منشائے خُداوندی کے خلاف ہو۔ پس اُن کا طرزِ عمل اس باب میں فیصلہ کُن ہے چنانچہ عُکل والی حدیث میں آیا ہے کہ عُکل کے چند آدمی آنحضرت کے پاس آئے اور اُنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ قضا کار چند دنوں کے بعد وُہ بیمار ہو گئے۔ حضرت نے آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے اُن کو ایک صحت بخش مقام میں بھیج دیا جہاں صدقے کے اُونٹ رکھے جاتے تھے جب اُن کی صحت بحال ہو گئی تو وُہ مرتد ہو گئے اور اُونٹوں کے چرواہوں کو قتل کر کے اُونٹوں کی قطار لے کر بھاگ گئے۔ حضرت نے اُن کو پکڑ منگوایا۔ لوہے کی سلائیاں گرم کر کے اُن کی آنکھوں میں پھیر دیں اور اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے۔ آپ نے اُن کے زخموں کا خُون روکنے کی بھی کوئی تدبیر نہ فرمائی۔ اُن کو دھوپ میں ڈال دیا گیا۔ وُہ پانی مانگتے رہے لیکن اُن کو پانی نہ دیا گیا یہاں تک کہ وُہ سِسک سِسک کر مر گئے۔

حضرت ابُو موسٰے اشعری اور معاذ بن جبل پر رسُول اللہ نے یمن کا علاقہ تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت معاذ ابو موسٰی اشعری کے پاس گئے تو دیکھا کہ ایک شخص اُن کے پاس بندھا کھڑا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وُہ مُرتد ہے جو پہلے یہُودیت سے اسلام لایا اور پھر یہُودی ہو گیا تھا۔ حضرت ابُو موسٰے نے معاذ کو بیٹھنے کو کہا۔ اُس نے جواب دیا میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک یہ قتل نہ کر دیا جائے۔ تین مرتبہ یہی گفتگو ہُوئی۔ حضرت معاذ نے کہا کہ یہ اللہ اور اُس کے رسُول کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ وُہ قتل کر دیا گیا۔ (صحیح بخاری)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جنگِ اُحد کے موقعہ پر جب

مسلمانوں کو شکست ہوئی تو ایک عورت مرتد ہو گئی۔ اس پر نبی صلعم نے حکم دیا کہ اُس سے توبہ کرائی جائے اور اگر وُہ توبہ نہ کرے تو قتل کر دی جائے۔

خلفائے راشدین نے بھی مرتدوں کو موت کی سزا دی۔ حضرت علی کو ایک دفعہ اطلاع ملی کہ ایک گروہ جو پہلے عیسائی تھا وُہ مسلمان ہو گیا اور پھر عیسائی ہو گیا ہے۔ جب وُہ گرفتار کر لئے گئے تو اُنہوں نے کہا کہ ہم عیسائی تھے پھر ہم کو اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں۔ تب ہم نے اسلام اختیار کر لیا۔ مگر اب ہماری یہ تحقیق ہے کہ ہمارے سابق دین عیسوی سے کوئی دین افضل نہیں ہے۔ پس ہم پھر عیسائی ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت علی کے حکم سے وُہ لوگ قتل کئے گئے اور اُن کے بیوی بچے غلام بنا لئے گئے۔

جب حضرت ابوبکر نے عرب کے مختلف گوشوں میں مرتد قبائل کے خلاف فوجیں روانہ کیں تو یہ فرمانِ عام لکھا "تم میں سے جو لوگ اللہ سے بےخوف ہو کر شیطان کی پیروی کر کے اسلام سے کفر کی طرف پھر گئے ہیں۔ اب میں نے تمہاری طرف فلاں کو فوج کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور ہدایت کر دی ہے کہ ایمان کے سوا تم سے کچھ قبول نہ کرے۔ پس جو کوئی دعوت الی اللہ کو قبول کریگا وُہ اُس کو راہِ راست پر چلنے میں مدد دیگا۔ لیکن جو انکار کریگا اُس سے لڑیگا۔ یہاں تک کہ وُہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اُس کو حکم دیا گیا ہے کہ انکار کرنے والوں میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑے۔ اُن کی بستیوں کو جلا دے۔ اُن کو نیست و نابود کر کے اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنائے۔" حضرت عمرؓ نے بھی مرتدوں کو موت کی سزا دی۔

(۳) قرآن، سنتِ رسول اور خلفائے راشدین کے علاوہ اجماعِ آئمۃ الاسلام بھی یہی ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب

شعرانی میزانِ کبریٰ میں لکھتے ہیں "تمام آئمہ کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے اُس کا قتل واجب ہے۔"

(۴) قیاس صحیح کا بھی اسلامی علماء کے مطابق یہی حکم ہے کہ مرتد قتل کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم کہتے ہیں "جب قتل عمد کی سزا قتل ہے تو دین کو برباد کرنے کی سزا بطریقِ اولیٰ قتل ہونی چاہیئے کیونکہ ایک نفس کا ہلاک ہونا دین کی تباہی سے بہتر ہے۔ اس کے زندہ رہنے میں کسی نیکی اور بہتری کی اُمید نہیں ہے۔

(۵) امام مالک اور امام شافعی کے مطابق مرتد آدمی اور مرتدہ عورت کو قتل کر دینا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا حکم ہے کہ عورت کو جب اسلام ترک کرے قید میں رکھنا چاہیئے تاوقتیکہ وُہ توبہ نہ کرے۔

مرتد کی جائداد اس کے مسلمان ورثا کو دی جائے اور جو جائداد اُس نے ارتداد کے زمانہ میں حاصل کی وُہ بیت المال میں جائے۔ اگر خاوند اور بیوی دونوں مرتد ہو جائیں اور عورت بچہ جنے تو جب اسلامی لشکر اُس ملک کو فتح کرے جہاں وُہ بھاگ گئے تھے تو وُہ بچہ اور اُس کی اولاد سب مالِ غنیمت شمار ہونگے۔

بعض فقہا کہتے ہیں کہ مرتد کو تین دن کی مہلت ملنی چاہیئے تاکہ قتل سے پہلے اُس کو توبہ کا موقعہ ملے۔ لیکن اگر ان تین دنوں کی مہلت میں کوئی مسلمان اُس کو جان سے مار ڈالے تو اُس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

(۶) شیعہ مذہب میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے۔ اگر کوئی مرد اسلام کو ترک کر دے تو وُہ قتل کیا جائے۔ اُس کی بیوی بچے اُس سے چھین لئے جائیں اور اُس کی جائداد ضبط کی جائے۔ اگر عورت اسلام کو ترک کر دے تو وُہ عمر بھر قید میں رہے اور نماز کے اوقات میں اُس کو دُرّے لگائے جائیں۔ اگر وُہ کوئی بچہ

جنے تو وُہ بھی واجب القتل ہے۔

(۷) مندرجہ بالا احکامِ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس اور فقہا کے مطابق گذشتہ ایک ہزار اور تین سو سال سے تمام اسلامی سلطنتیں مرتد کو واجب القتل قرار دے کر اُن کو قتل کی سزا دیتی رہی ہیں۔ شریعتِ ارتداد کے قوانین کی وجہ سے مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا ایک دفعہ اسلام قبول کر کے واپس مسیحیت کے حلقہ بگوش نہیں ہو سکتے اور پیدائشی مسلمان اسلام کو ترک کر کے مسیحی مذہب کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی سلطنتوں میں مسیحی کلیسیاؤں کی تاریخ کے اوراق خونین ہیں اور رے منڈ لل جیسے جوشیلے مبلغ اور اُن کے نومرید قتل ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں ترکی کے وزیر اعظم نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا کہ قرآن کسی شخص کو جبراً مسلمان کئے جانے کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن قرآنی احکام نہایت سختی سے اُن مسلمانوں پر عائد ہیں جو اسلام ترک کر کے کسی دُوسرے مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں یا جو ایک دفعہ برضا و رغبت خود مسلمان بن کر اسلام کو ترک کر دیتے ہیں۔ ایسے اشخاص کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور وُہ کسی قسم کے رحم کا اُمیدوار نہیں ہو سکتا۔"

مندرجہ بالا احکام صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مدعا ہی یہ ہے کہ غیر مسلموں کو دارالاسلام میں شامل کیا جائے اور جب وُہ ایک دفعہ شامل ہو جائیں تو تلوار کے زور سے اُن کو دائرہ اسلام میں رکھا جائے۔ پہلی صدی ہجری سے دَورِ حاضر تک کے فقہا اور علما کی تحریریں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام کے آئمہ کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، اُن سب کا اس ایک امر پر اتفاق ہے کہ "مرتد کی سزا قتل ہے"۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ چنانچہ مولانا حامد الانصاری غازی صاف لکھتے ہیں: "اسلام ایک مذہب ہے جو مذہب

ہی کی حیثیت سے دُنیا پر حکومت کرنے کے لئے ظاہر ہُوا ہے۔ اسلام کا مطمح نظر دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ ہے۔ یہ ایک ایسا تصوّر ہے جس سے اسلامی فکر کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا"۔ (اسلام کا نظامِ حکومت صفحہ ۲۳۲) آگے چل کر ہم بتلائیں گے کہ یہ احکامِ اسلام کی اشاعت، قیام، تحفظ اور بقا کے لئے لازمی اُمور تھے لیکن ان کی بدولت مسیحی کلیسیاؤں کا وجود ایسا معرضِ خطر میں پڑا کہ چند صدیوں کے اندر اکثر ایشیائی ممالک میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

(۴)

قرآن نے جہاد کرنے والوں کے لئے اگلے جہان میں نعمائے بہشت کا وعدہ کیا ہے اور اس کے ساتھ اِس جہان میں اُن کو لُوٹ کے مال کا حصہ دار بنایا ہے۔ اُن کو مالِ غنیمت کا اَسّی فیصدی حصہ اور قیدی اور غلام عطا کئے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے "یہ جان لو کہ جو شئے تم لُوٹ کر لائے ہو، اُس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسُول اور (رسُول کے) قرابتیوں کا، اور یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کے لئے ہے . . . باقی کی لُوٹ جو تم لائے ہو تمہارے لئے حلال اور پاک ہے۔ تم کھاؤ" (۸: ۴۲ و ۷۰)۔ اس کے علاوہ قیدی بھی مجاہدوں کا مال ہیں اور اُن کے غلام ہیں۔ عورتیں بھی "اُن کے ہاتھ کا مال" ہیں جو اُن کی باندیاں ہیں جن سے وُہ ہم بستری کر سکتے ہیں۔ پس عیسائی قیدی عورتیں اور بچے اُن کے لونڈی اور غلام ہو جاتے تھے۔ ان لونڈیوں کے ساتھ وُہ نکاح کر سکتے تھے خواہ وُہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں (مائدہ آیت ۶)۔ اگر کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے ہاتھ آ جائے تو حکم ہے کہ "کافروں کو کھپا مارو" لیکن اگر کوئی غیر مسلم عورت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے تو اُس کو واپس نہ کیا جائے۔

ممتحنہ آیت ۱۰ : ۱۱)۔ سنہ ۳ ھ میں مسلمانوں سے مشرکہ کا نکاح حرام ہو گیا۔ اور نکاح سے پہلے اُن پر قبولِ اسلام لازم ہو گیا۔

حاجی عبدالحمید غزنوی کتاب "دستور الالباب فی علم الحساب" میں مالِ غنیمت کے متعلق لکھتا ہے "جب مسلمان کافروں پر حملہ کر کے اُن سے دینار یا درہم یا دیگر قیمتی اشیا حاصل کریں تو وہ "مالِ غنیمت" ہیں۔ کفار کے مکانات اور دیگر عمارات کو "فی" کہا جاتا ہے۔ جن مسلمانوں نے کافروں سے جنگ کی ہے اُن میں سے ہر پیدل سپاہی ایک حصّہ کا اور ہر سوار دو حصّوں کا حقدار ہوتا ہے۔ بار بردار جانور از قسم اُونٹ، گھوڑا، گدھا وغیرہ کا حق پیدل سپاہی کے برابر ہے۔ رسول اللہ نے جنگِ بدر (سنہ ۲ ھ مطابق سنہ ۶۲۴ ع) میں اعلان کیا تھا کہ "جو ایمان دار کسی کافر کو قتل کرے گا تو مقتول کا مال قاتل کا ہوگا۔" "فی" وہ مال ہے جس کو مرعوب دُشمن چھوڑ جاتا ہے اور جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے (۵۹ ۔ آیت ۲ تا ۷)۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں "جو واپس آ جائے"۔ امام شافعی کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ جو مال لوٹ میں ہاتھ آ جائے وہ ازروئے شرع مسلمانوں کا حق ہے۔ علی ابنِ عیسیٰ کہتا ہے کہ لفظ "فی" میں سب کچھ شامل ہے یعنی مالِ غنیمت بھی اس میں شامل ہے۔

لوٹ کے مال وغیرہ کے احکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدینِ اسلام ممالکِ ایشیا کو فتح کر کے اتنی دولت سے مالا مال ہو گئے جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی۔ حضرت محمد کی وفات کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ اس قدر مالِ غنیمت آیا کہ حضرت کے صحابہ مالا مال ہو گئے۔ مکّہ اور مدینہ اب معمولی مقام نہ رہے بلکہ ایک زبردست سلطنت کے دینی اور سیاسی دار السلطنت بن گئے جن کی عظمت و شان کسی دوسرے دار السلطنت سے کم نہ تھی۔ چنانچہ حافظ بتلاتا

ہے کہ مکّہ میں جو گھر پہلے ایک مشکیزہ کی قیمت ادا کرنے پر مل جاتا تھا وہ اب کم از کم ساٹھ ہزار درہم کے عوض ملتا تھا۔ آنحضرت کے رشتہ دار زبیر کی جائداد پانچ کروڑ درہم کی تھی۔ ان کے دیگر صحابہ کی جائدادوں کی قیمت حیران کن رقموں کی تھی۔ مدینہ میں اُونٹوں کی قطاروں کی قطاریں مالِ غنیمت سے لدی ایران، شام، مصر وغیرہ ممالک سے آتی تھیں۔ مسلمان مورخوں کا بیان ہے کہ ابتدا میں مالِ غنیمت کی قدر و قیمت نہیں جانتے تھے کیونکہ اس قسم کا مال انہوں نے کبھی دیکھا سُنا بھی نہ تھا لیکن جب اُن کو اس کا صحیح اندازہ ہو گیا تو مکّہ اور مدینہ کے شرفا لاکھوں کروڑوں کی جائدادوں کے مالک ہو گئے۔ مسلمان امرا کے پاس ایک ہزار غلاموں کا ہونا ایک عام بات ہو گئی۔ تاریخ کامل میں ہے کہ حضرت ابوبکر کو چھ ہزار سالانہ تھا۔ خلیفہ عمرؓ کے متعلق صحیح بخاری میں ہے "عمرؓ کا حساب کیا گیا تو بیت المال کا چھیاسی ہزار اُن کے ذمّہ نکلا۔" طلحہ کی آمدنی تاریخ خمیس کے مطابق ہزار درہم روزانہ تھی اور وہ مرتے وقت دو کروڑ درہم اور دو لاکھ اشرفیاں چھوڑ گئے۔ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ وہ طلائے خالص اس قدر چھوڑ گئے تھے جو تین سو اُونٹوں کا بوجھ تھا (جلد ۲ صفحہ ۳۱۱)۔ زبیر بن العوام کی نسبت تاریخ خمیس میں ہے کہ اُن کے ہزار غلام تھے جو خراج ادا کیا کرتے تھے اور جب اُن کی املاک بیچی گئی تو اُس کی قیمت چالیس کروڑ تھی (صفحہ ۳۱۱)۔ شاہ عبدالعزیز تحفہ اثنا عشریہ میں بتلاتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے متروکہ کے آٹھویں حصّہ کا چوتھا حصّہ اسّی ہزار درہم سے زیادہ تھا (صفحہ ۵۹۵)۔ مالِ غنیمت کے متعلق مذکورہ بالا پاکستانی رپورٹ میں فاضل جج لکھتے ہیں "اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غنیمت اور خمس کو جہاد کا لازمی جزو سمجھا جائے تو بین الاقوامی معاشرہ اس کو محض لوٹ اور رہزنی

قرار دے گا" (صفحہ ۲۴۴) -

جن ممالک سے یہ مالِ غنیمت آتا تھا وہاں کے اکثر مالدار تاجر مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا ہوتے تھے - ان مسلسل جہادوں کی وجہ سے لاتعداد مسیحیوں کے مال کا بے اندازہ نقصان ہُوا - اور بے شمار مسیحی اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنے آبائی وطنوں کو خیرباد کہہ کر بھاگ گئے اور ہر چہار سُو منتشر ہو گئے -

(۵)

حکومتِ الٰہی کے بیت المال کے مالی وسائل میں سب سے زیادہ آمدنی کے ذرائع وہ تھے جن کا تعلق غیر مسلموں سے تھا - مثلاً خمس یعنی مالِ غنیمت کا بیس فی صدی حصّہ (۲) "فی" یعنی مرعوب دشمن کا مال جس کو چھوڑ کر وہ بھاگ جاتا ہے - (۳) خراج یعنی وہ سرکاری لگان جو غیر مسلم کاشتکاروں کی زمین پر سالانہ عائد ہوتا ہے - یہ زمین اُن کی مقبوضہ زمین نہیں ہوتی (۴) عشور یعنی تجارت ٹیکس جو غیر مسلموں سے مسلمانوں کی نسبت دُگنی لی جاتی تھی - (۵) جزیہ جس کا ذکر آگے چل کر آئیگا - (۶) زکوٰۃ یعنی ہر مسلمان کی آمدنی کا $\frac{1}{40}$ حصّہ - امام ابنِ تیمیہ تصریحاً بتلاتے ہیں کہ زکوٰۃ کوئی سرکاری ٹیکس نہیں ہے بلکہ نماز کی طرح ہر صاحبِ نصاب پر منفرداً عائد ہوتی ہے اور ہر فرد کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ بطورِ خود اپنے مال سے ۲½ فی صدی نکال کر مستحقین میں تقسیم کرے - (۷) عشر مسلمان کاشتکاروں پر لگان - بارانی زمین پر دسواں حصّہ اور چاہی زمین پر $\frac{1}{20}$ حصّہ - (۸) وقف جو خدا کے نام پر دیا جائے -

(۶)

یہودیوں اور عیسائیوں کی نسبت قرآن میں صریح حکم آیا ہے کہ "اہلِ کتاب میں سے جو دینِ حق (اسلام) قبول نہیں کرتے مسلمانو - تم اُن سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں" (۹/۲۹) حنفی علما کے مطابق جزیہ اس غرض سے لیا جاتا ہے کیونکہ اُن کو موت کی سزا نہیں دی گئی گویا عیسائی جزیہ دے کر اپنی جان و مال کا امان خریدتے ہیں - جزیہ دینے والے اسلامی اصطلاح میں "ذمّی" کہلاتے ہیں -

سب سے پہلے رسولِ عربی کے زمانہ میں ۹ھ کے قریب نجران کے عیسائیوں پر جزیہ مقرر ہُوا - نجران کا ضلع مکہ سے سات منزل پر تھا اور عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا - خاص نجران کے گرجا کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی - آنحضرت نے مغیرہ بن شعبہ کو دعوتِ اسلام کے لئے نجران بھیجا - جب وہ عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکا تو آنحضرت نے بشپ ابو حارثہ کو لکھا کہ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو تم کو ہماری اطاعت قبول کرنا ہوگی اور جزیہ دینا ہوگا - پس بشپ مذکور معہ ساٹھ رفقا کے مدینہ گیا - اور اعلیٰ قیمتی لباس میں ملبوس ہو کر مسجد میں آیا - آنحضرت نے اُن کو نہایت عزّت و توقیر کے ساتھ مسجد میں اُتارا - جب اُن کی نماز کا وقت آیا اور انہوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ مزاحم ہوئے لیکن آنحضرت نے اجازت دے دی اور اُنہوں نے مسجد میں اپنی نماز ادا کی - رسولِ عربی نے اُن پر سالانہ دو ہزار حلّہ جزیہ کے طور پر لگایا - بعد کے زمانہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ نے اس معاہدہ کی تصدیق کی - حضرت عمرؓ نے عرب کے عیسائی قبیلہ بنو تغلب سے جو قسطنطنیہ کی سلطنت کی سرحد پر رہتے تھے مسلمانوں سے دُگنا خراج لیا کیونکہ اُنہوں نے دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا تھا -

جزیہ کا خراج عیسائی سے جبراً شریعت کے حکم کے مطابق وصول کیا جاتا تھا۔ محدود ذرائع کے کاریگروں سے ۱۲ درہم سالانہ اور اوسط درجہ کے اشخاص سے ۲۴ درہم سالانہ اور امیر طبقہ کے آدمیوں سے ۴۸ درہم سالانہ وصول کیا جاتا تھا۔ "امیر طبقہ کا آدمی وُہ تھا جس کے پاس دو سَو درہم ہوں۔ بعض کے نزدیک متموّل وُہ ہے جو کام کر کے اتنا کمالے کہ وُہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرلے اور پھر اُس کے پاس کچھ بچ جائے۔ اوسط درجہ کا شخص وُہ تھا جو اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے بعد کچھ پس انداز نہ کرسکے۔ اور محدود ذرائع کا انسان وُہ تھا جس کی آمدنی اُس کے اور اُس کے خاندان کے لئے کافی نہ ہو۔ جزیہ نے عام یہودیوں اور عیسائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا اور اُس سے پُوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں یہودی ہُوں۔ پھر پُوچھا کہ بھیک کیوں مانگتے ہو۔ جواب ملا کہ تنگی اور مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ کے ادا کرنے کے لئے (مقالاتِ شبلی جلد اوّل صفحہ ۲۱۹)۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اگر کسی نے اسلامی فوج کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑنے پر رضامندی ظاہر کی تو وُہ جزیہ سے بری رہتا تھا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب حبیب بن مسلمہ نے عیسائی قوم جراجمہ پر فتح پائی تو انہوں نے فوجی خدمت میں بوقتِ ضرورت شامل ہونا منظور کر لیا اور وُہ جزیہ سے بری رہے۔ جب عتبہ بن فرقد نے آذربائیجان فتح کیا تو عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا اُس میں یہ الفاظ تھے: "وُہ جزیہ ادا کریں لیکن جو شخص کسی سال لڑائی میں بلایا جائیگا تو اُس کو اُس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔"

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عیسائی ملک آرمینیا کے بعض حصے فتح ہوئے تو سپہ سالار نے یہ معاہدہ کیا: "یہ لوگ جب لڑائی پیش آئے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو وُہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں۔ اس صورت میں ان پر جزیہ نہیں لگایا جائیگا۔ لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وُہ بیٹھ رہے تو اُس کو آذربائیجان والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا۔" حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جرجان وغیرہ مسیحی ممالک کے ساتھ جو معاہدہ ہُوا اُس میں لکھا ہے "ہم اگر کسی ذمی سے امانت لینگے تو اس امانت کے بدلے میں جزیہ چھوڑ دیا جائیگا۔ حضرت عمرؓ نے کئی دفعہ یہ احکام بھیجے کہ اگر کسی ذمی سے اتفاقیہ کسی موقعہ پر مدد لو تو اُس سال کا جزیہ چھوڑ دو" (مقالاتِ شبلی الجزیہ)۔ ان معاہدوں پر یہ الفاظ "اتفاقیہ" "بوقتِ ضرورت" قابلِ توجہ ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ صرف ناگہانی ضرورت مراد ہے، جب کوئی فوری کارروائی لازم ہو جائے۔ ورنہ عیسائیوں کو فوجی خدمت کے لئے بحیثیت شہری ہونے کے بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ ایس ابتدائی زمانہ میں بھی فاتح اور مفتوح کی تمیز کو برقرار رکھا گیا اور عیسائیوں کو نہ دیوانی اور نہ فوجی خدمتوں میں لیا جاتا تھا کیونکہ بقول شبلی مرحوم "اسلامی حکومتوں میں سول اور ملٹری ڈیپارٹمنٹ کسی زمانہ میں بھی صاف صاف الگ نہیں ہُوئے" (مقالاتِ شبلی جلد اوّل)۔

عیسائیوں کو جو اسلام قبول نہیں کرتے تھے اور غلام نہیں بنائے جاتے تھے "ذمی" کہا جاتا تھا کیونکہ اُن کے مال و جان کی امان کا اس شرط پر ذمہ لیا جاتا تھا کہ وُہ جزیہ ادا کریں۔ بانیٔ اسلام نے جن قوموں پر جزیہ لگایا اُن کو تحریر کر کے ذریعہ یہ حقوق عطا کئے: (۱) اگر کوئی دشمن اُن پر حملہ کریگا تو اُن کی طرف سے مدافعت کی جائیگی۔ (۲) اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ

نہیں کیا جائیگا (۳) جزیہ دینے کے لئے ان کو محصل کے پاس خود جانا نہیں پڑیگا (۴) اُن کی جان محفوظ رہیگی (۵) اُن کا مال محفوظ رہے گا۔ (۶) اُن کے قافلے اور کارروان (یعنی تجارت) محفوظ رہینگے۔ (۷) اُن کی زمین محفوظ رہیگی۔ (۸) تمام چیزیں جو اُن کے قبضہ میں ہیں بحال رہیں گی۔ (۹) پادری قسیس اور رہبان اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے (۱۰) صلیبوں اور مُورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔ (۱۱) ان سے عشر نہیں لیا جائیگا۔ (۱۲) اُن کے مُلک میں فوج نہیں بھیجی جائیگی۔ (۱۳) اُن کا پہلا عقیدہ اور مذہب بدلوایا نہیں جائیگا۔ (۱۴) اُن کے پہلے حقوق جو اُن کو حاصل تھے زائل نہیں ہونگے۔ (۱۵) یہ احکام اُن پر بھی لاگو ہونگے جو اس وقت حاضر نہیں ہیں (مقالات شبلی جلد اوّل)۔

رسُولِ عربی نے جن غیر مسلموں کو خط لکھے تھے اُن میں سے ایک ملکِ مِصر کا قبطی اُسقفِ اعلیٰ بھی تھا۔ مصر میں یعقوبی مسیحی اور راسخ الاعتقاد مسیحی دونوں تھے لیکن آنحضرت نے راسخ الاعتقاد بشپ کو نہ لکھا بلکہ قبطی بشپ کو لکھا۔ یہ دونوں برسرِ پیکار رہتے تھے قبطی اُسقف نے آنحضرت کے پیامبر کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ وُہ لوٹتے وقت اپنے ساتھ قیمتی تحائف اور دو قبطی کنیزیں رسُول کے لئے لے گیا۔ اُن میں سے ایک بی بی مریم (ماریہ قبطیہ) تھی جس کے بطن سے آنحضرت کا بیٹا ابراہیم پیدا ہُوا۔ بصریٰ کے بادشاہ شرجیل بن عمرو نے آنحضرت کے قاصد کو قتل کر دیا اور ایک لاکھ فوج لیکر مسلمانوں پر چڑھ آیا اور غزوہ موتہ میں اُن کو شکست دی۔ غزوہ تبوک کے بعد ایلہ کے سردار یوحنّا نے اور اذرح کے اور جربا کے عیسائیوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور صلح ہوگئی۔ قبائل عرب پر فتح مکّہ

نے اور اسلام کے غلبہ نے اس قدر اثر کیا کہ غیر مُسلم جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے اور جیسا ہم آگے چل کر دیکھینگے عرب کے متعدد مسیحی قبائل نے بھی اسلام اختیار کر لیا۔

جب ہم ذمیّوں کے حقُوق کی جانب نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی احکام اور بانیٔ اسلام نے عیسائیوں کو جزیہ کے عوض بہت حقوق عطا کئے تھے۔ ان کے جان و مال کی حفاظت کی گئی لیکن وُہ اسلامی سلطنت میں مسلمانوں کے ہم پلّہ شہری نہ تھے۔ اُن کو کبھی برابری اور مساوات کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ وُہ ہر زمانہ اور ہر مُلک میں ہر جگہ کمتر اور ادنے لوگ ہی تصور کیے گئے۔ وُہ فوجی خدمت اور لشکری سپاہ میں بھرتی نہیں کیے جاتے تھے اور ان کو ہتھیار بندی کی اجازت نہ تھی پس وُہ بیکس اور نہتے ہو کر ایسے لاچار ہو گئے کہ وُہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم آگے چل کر دیکھینگے کہ عرب کے اقتدار نے مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کی حالت ناگفتہ بہ کر دی۔ جب کبھی اسلامی سلطنت میں کسی وجہ سے بے چینی پھیلتی اور فساد برپا ہو جاتا تو ان کلیسیاؤں کے لاچار اور نہتے شرکا کی شامت آجاتی۔ وُہ جزیہ دینے والی ذلیل اقلیت کے شرکا ہی رہے۔

جزیہ اور صدقہ زکوٰۃ وغیرہ میں بڑا فرق تھا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی ایک باعزت شے تھی لیکن جزیہ قرآنی حُکم کے مطابق ذلت کی نشانی تھی۔ بعض فقہا کے نزدیک جزیہ غلامی کا مترادف تھا۔ ہاں۔ اسلام کی قبولیت سے نو مُرید پر نماز، روزہ وغیرہ کی پابندیاں عائد ہو جاتی تھیں جن کی وجہ سے نبیٔ عربی کی وفات کے بعد متعدد قبائل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں جنگ میں شمولیت بھی لازمی تھی جو قرآن کے مطابق مسلمانوں پر گراں گزرتی تھی۔ مسیحی ان پابندیوں سے آزاد

تھے جو اُن کے لئے تالانی کُن بات تھی۔ ذمیوں کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ مسلح نہ ہوں اور جب کبھی مُسلمان عیسائیوں کی جماعت کے خلاف جنگ آزما ہوں تو وہ اپنے مسیحی بھائیوں کی حمایت بالکل نہ کریں۔ اِس شرط کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب مسیحیوں نے دیکھا کہ اُن کی کوئی پیش نہیں چلتی تو وہ ہمت ہار کر لیست ہمت اقلیت ہو گئے۔

قرآن کے احکام پر عمل کرنے سے مذہب کی تبدیلی سے ہر نو مرید کی خاندانی زندگی پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ جب کوئی مسیحی مُسلمان ہو جاتا تو وہ اپنے خاندان کا فرد نہ رہتا اور اُس کا باقی خاندان سے رشتہ کٹ جاتا تھا۔ وُہ ایک نئی برادری میں شامل ہو جاتا تھا اور وُہ پُرانے خاندان کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتا تھا۔ نَو مُسلم کو ہر قسم کے حقُوق عطا کیے جاتے تھے اور اُس پر کوئی تنگی ہوتے نہ پاتی تھی اسلام قبُول کرنے سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ہر مُسلمان عیسائی عورت سے بیاہ کر سکتا ہے لیکن کوئی مُسلم عورت کسی غیر مُسلم سے نکاح نہیں کر سکتی (۲: ۲۲)۔ امام شافعی اِس بات پر بھی اصرار کرتا ہے کہ مختلف مذاہب والے ایک ہی ورثہ میں ہم میراث نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان عیسائی ہو جائے تو اگر وُہ بھاگ کر سزائے قتل سے بچ جائے تو اُس کی جائداد مالِ غنیمت شمار کی جائیگی اور بیت المال میں داخل کی جائیگی۔

علاوہ ازیں اسلامی شرع کے مطابق صرف ایک آزاد شخص کی شہادت ہی قابلِ قبُول ہے لیکن کسی مُسلمان غلام کے خلاف کسی آزاد مسیحی کی شہادت قابلِ قبول نہیں ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک آزاد مسیحی کو ایک ایماندار غلام پر فوقیت حاصل ہے اور یہ بات قرآن کے خلاف ہے کیونکہ سورہ بقر میں صاف آیا ہے "البتہ مسلمان غلام مُشرک سے بہتر ہے" (آیت ۲۲۱)۔

جہاں تک ایک مُسلم اور غیر مُسلم کی جان کا تعلق ہے، نبیٔ عرب اور خلفائے

راشدین کے زمانہ میں اور اُن کے بعد کے زمانہ میں ہم کو بہت فرق نظر آتا ہے۔ اگر کوئی مُسلمان کسی عیسائی کو جان سے مار ڈالے تو کیا مُسلمان قصاص میں قتل کیا جا سکتا ہے؟ قرآن میں سوائے مُوسوی حُکم کے "جان کے بدلے جان" کوئی دُوسرا واضح حکم اِس بارے میں نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ کافر کو قتل کرنے کی سزا میں مومن کو قتل نہیں کرنا چاہیئے لیکن ایک اور حدیث میں روایت ہے کہ آپ نے عُمر بن اُمیّہ کو قصاص میں قتل کر دیا تھا۔ خلیفہ عُمر نے حُکم دیا تھا کہ قاتل کو قتل کر دینا چاہیئے۔ حضرت عثمان نے بھی ایک دفعہ یہی حُکم جاری کیا تھا لیکن اُن کے مشیروں نے اُن کو باز رکھا۔ حضرت عُمر اور حضرت علی کے عہد میں ایسے قاتل کو مقتُول کے خاندان کے حوالہ کر دیا جاتا یا حکُومت خود اُس کو قتل کر دیتی یا زرِ فدیہ دیا جاتا تھا۔ اور یہ امام ابو حنیفہ کا بھی مسلک ہے لیکن امام شافعی کے مطابق اگر کوئی عیسائی کسی مُسلمان کو قتل کر دے تو وُہ واجب القتل ہے لیکن اگر کوئی مُسلمان کسی عیسائی کو قتل کر دے تو مومن کو کافر کی قتل کی سزا میں قتل کرنا جائز نہیں ——— اس سوال کے جواب میں کہ قصاص میں زرِ فدیہ کی رقم کیا دی جائے' اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زرِ فدیہ کی رقم وُہی ہونی چاہیئے جو مُسلمان کے قتل کئے جانے پر ادا کی جاتی ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ رقم برابر نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس سے مساوات پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ رقم نصف ہونی چاہیئے۔ امام شافعی کے مطابق یہ رقم تیسرا حِصّہ ہونی چاہیئے اور مُسلمان قاتل کو معمُولی دُرّے لگائے جائیں یا اُس کو قید کی سزا دی جائے جو ایک سال سے کم نہ ہو۔

کُتبِ فقہ سے ظاہر ہے کہ مُسلمان اور مسیحی دونوں غُلام رکھتے تھے کیونکہ اُس زمانہ کے سماجی حالات ہی ایسے تھے کہ غُلاموں کا رکھنا ایک ناگزیر امر

تھا۔ لیکن فقہا کے مطابق کوئی مسلمان کسی مسیحی کا غلام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مسلمان کسی مسلمان کا ہی غلام ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی غلام اسلام اختیار کر لیتا تھا تو سلطنت کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ مسیحی مالک کو اُسے فروخت کرنے پر مجبور کرے۔

امام مالک نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر مسلمان کے لیے کسی مسیحی کی مزدوری کرنا بھی حرام ہے۔ ایک موقعہ پر امام مالک سے کہا گیا کہ مسلمان تاجر قبرص جا کر بھیڑیں، شہد اور مکھن وغیرہ خریدتے ہیں اور غیر مسلموں کو اُن کے عوض درہم اور دینار دیتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ میں اس قسم کی تجارت کے سخت خلاف ہوں کیونکہ یہ جائز نہیں کہ جن سکوں پر اللہ کا نام اور اُس کی کتاب کا کوئی لفظ کندہ ہو وہ ناپاک ہاتھوں میں جائے۔

اگر کوئی عیسائی عورت مسلمان ہو جاتی تو مسیحی خاوند کے لیے لازم ہو جاتا کہ یا تو وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لے اور یا وہ اپنی بیوی کو طلاق دے جو از روئے انجیل جائز نہیں (متی ۵: ۳۲)۔ امام مالک کے مطابق اگر کوئی مسیحی اپنی زمین کو کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت کر دے تو پھر بھی اُس کو فروخت کردہ زمین کا خراج ادا کرنا ہوگا اور یہ خراج اُس کو معاف نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر بیچنے والا مسیحی اسلام کو قبول کر لے تو خراج معاف ہوگا۔

ہم ان پابندیوں پر آگے چل کر زیادہ روشنی ڈالیں گے۔ ان پابندیوں سے ظاہر ہے کہ جب عیسائیوں کا قتل عام نہ بھی ہوتا تھا اُس زمانہ میں بھی مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا پر زبردست سیاسی، سماجی اور اقتصادی دباؤ ڈالے جاتے تھے تاکہ وہ مسیحیت کو ترک کر کے مسلمان ہو جائیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کمزور ایمان والے مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

یہ تعداد روز بروز اس قدر بڑھنے لگی کہ اس کا اثر اسلامی حکومت کے مالیہ پر ہوا اور ایک وقت ایسا آیا کہ حکم دیا گیا کہ عیسائیوں کو مسلمان ہونے نہ دیا جائے۔ کیونکہ اس سے جزیہ کی رقم کثیر پر بڑا زبردست اثر پڑا اور یہ کمی کسی دوسرے طریقہ سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن عیسائیوں پر ایسی سخت پابندیاں عائد تھیں کہ وہ بے دست و پا ہو کر اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے مسیحی عموماً یا تو کمزور ایمان والے ہوتے تھے یا وہ حکومت کے عہدیدار ہوتے تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ اپنے سرکاری فرائض کو مسیحی رہتے ہوئے کما حقہ ادا نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کا ایمان اُن کو بعض ایسی باتوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا تھا جو اسلام کا جزو سمجھی جاتی تھیں۔ تاریخ اسلام میں بار بار ایسے عیسائیوں کے اسلام لانے کا ذکر آیا ہے جو حکومت کے ملازم تھے اور حاکم وقت کے ایماء پر اپنا دین ترک کر دیتے تھے تاکہ وہ اعلیٰ ترین عزت و منزلت حاصل کر سکیں۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مسیحی کلیسیاؤں کے ہادی اور پیشوا ایسے مرتدوں کی مجبوریوں کو سمجھ کر ان سے ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ بعض مسیحی ایسے بھی تھے جو اپنے ہم مذہبوں سے لڑ کر دین اسلام محض اس واسطے قبول کر لیتے تھے کہ وہ بآسانی تمام اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکیں۔ بعض اوقات مسیحی جو طب وغیرہ علوم کو سیکھنے کے خواہشمند ہوتے تھے اسلام قبول کر لیتے تھے کیونکہ اُن کے مسلمان اُستاد کسی غیر مسلم کو اپنے حاصل کردہ علوم نہیں سکھلاتے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض مسیحی ایسے بھی تھے جو صدق دل اور خالص نیت سے اسلام قبول کر لیتے تھے۔ اسلامی مورخین ایسے مسیحیوں کا اکثر ذکر کرتے ہیں جو بغیر کسی لالچ یا دباؤ کے یا حاکم وقت کے ایماء کے برضا و رغبت خود مسلمان ہو جاتے تھے۔ ہم انشاء اللہ اس بات پر آگے چل کر

بحث کریں گے۔

مسیحی کلیسیاؤں کے لئے اصل مصیبت یہ تھی کہ تبدیلیٔ مذہب دو رویہ نہ تھی بلکہ وُہ یکطرفہ ہی تھی۔ عیسائی تو اسلام قبول کر لیتے تھے لیکن مسلمان اپنا مذہب تبدیل کر کے مسیحیت اختیار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جیسا ہم بتلا چکے ہیں شریعتِ ارتداد کے قانون کے مطابق وُہ قتل سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ مشرقی ممالک میں جُوں جُوں اسلام پھیلتا گیا مسیحی کلیسیاؤں کی تعداد اور ان کے شرکا کی تعداد کم ہوتی گئی۔ مسیحی کلیسیا روز بروز ایک کمزور اقلیت ہوتی گئی۔ اور اگر "کلیسیا کے بقیہ" کی زندگی میں مسیحائی دم نہ ہوتا تو یہ بقیہ اب کسی مشرقی مُلک میں نظر بھی نہ آتا۔

جنگی جہاد کے علاوہ مسیحی کلیسیائیں لسانی جہاد کا بھی شکار ہو گئیں۔ مصر اور شام کے ممالک کے مسیحی اپنی مادری زبان بھی کھو بیٹھے۔ انہوں نے مسلم فاتحین کی زبان عربی اختیار کر لی۔ مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کو یہ دقت پیش نہ آئی تھی۔ رُومی بُت پرست قیاصرہ کی ایذا رسانیوں کے زمانہ میں لاطینی زبان نے انجیل کی زبان یعنی یُونانی زبان کو سلطنتِ رُوم سے خارج نہ کیا تھا۔ لیکن اسلامی اقتدار کے زمانہ میں تمام اسلامی مقبوضات میں ہسپانیہ اور شمالی افریقہ سے لے کر وسطِ ایشیا تک ایک ہی زبان یعنی عربی زبان بولی جاتی تھی۔ عربی نے تمام دیگر زبانوں کو مفتوحہ ممالک سے خارج کر دیا۔ اگر کسی مُلک کی کلیسیا نے نسطوری کلیسیا کی طرح اپنے ایمان اور زبان کو تھامے رکھا تو اُس کی حالت نسطوری کلیسیا کی طرح بد سے بدتر ہوتی گئی۔ وُہ برائے نام آزاد تھی لیکن درحقیقت غلام تھی۔ عرب فتوحات کا یہ دور لسانی فتوحات کا دور ہے جس میں عربی زبان نے تمام مفتوحہ اقوام کی زبانوں کو فتح کر لیا۔ عہدِ عباسیہ میں یہ دور انتہائی عروج پر تھا۔

(۷)

مسیحی کا یہ لازمی اور دائمی فرض ہے کہ وُہ بنی نوعِ انسان کے ہر فرد بشر کو اپنے مُنجی کی نجات اور خُدا کی لازوال ابدی محبت کا پیغام دے۔ پس ہر مسیحی کا یہ حق ہے کہ وُہ انجیلِ جلیل کی تبلیغ کرے لیکن اسلامی شریعت نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔ ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کسی مُسلمان کو اسلام سے نکل کر کوئی دُوسرا مذہب اختیار کرنے کا حق نہیں دیتا۔ جب ایک مُسلمان کے لئے تبدیلِ مذہب ہی جُرم ہے جس کی سزا موت ہے تو لامحالہ اس کا مطلب یہی ہے کہ دارالاسلام میں اسلام کے بالمقابل مسیحیت کے پیرو انجیلِ جلیل کے جانفزا پیغامِ نجات کی تبلیغ سرے سے کر ہی نہیں سکتے۔ قرآنی قانونِ ارتداد خود بخود انجیل کی تبلیغ کے حق کو کالعدم کر دیتا ہے قتلِ مُرتد کے قانون کا قدرتی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام اپنے حدودِ اقتدار میں تبلیغِ انجیل کا روادار نہیں ہے۔

قرآن نوعِ انسانی کے سامنے اسلام کا راستہ پیش کر کے قطعیت کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ یہی راستہ صحیح ہے اور باقی تمام راستے غلط ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے "اور یہ کہ میرا یہ راستہ ہی ایک سیدھا راہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرو اور تم دُوسرے کسی راستہ کی پیروی نہ کرو ورنہ تم اللہ کے راستہ سے ہٹ جاؤ گے" (انعام)۔ مسیحیت بھی پُوری قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ خُداوندِ مسیح کا مکاشفہ ہی کامل اور اکمل ہے اور کسی دُوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے نیچے بنی آدم کو یسُوع نام کے سوا کوئی دُوسرا نام نہیں دیا گیا جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں" (اعمال ۴/۱۲)۔ پس دونوں مذاہب کی ٹکرانے کی بات تھی کیونکہ دونوں مذاہب یہی تعلیم دیتے ہیں کہ صرف اس کا اپنا ہی راستہ انسان کے لئے ایک واحد راہِ نجات ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اسلام یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی حدُود کے

اللہ دو عوتیں پھیلیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ بادلِ نخواستہ یہ گوارا کرتا ہے کہ جو شخص عیسائی دین پر قائم ہے اور وہ اس پر قائم رہنے کو ترجیح دیتا ہے وہ اس کو یکسر رہنے دے لیکن اسلام سے یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ مسیحی کلیسیا کو یہ اختیار دے کہ وہ مسیحیت کی تبلیغ کر کے کسی قسم کا غلبہ حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن میں ہے "اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" (توبہ) "تم ان کو قتل کرو یہاں تک کہ فتنہ (غلبۂ کفر) باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کا ہی ہو جائے" (بقرہ)۔ پس اسلامی مملکت کے لئے یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کے بالمقابل مسیحیت کی دعوت کو پھیلنے کا موقع دے کیونکہ ایسا موقع دینے کے لازماً معنی یہ ہیں کہ "دین پورا کا پورا اللہ کے لئے" نہ ہونے پائیگا۔ اور "فتنہ" سر اٹھانے کا موقع پا کر بڑھتا ہی جائیگا۔

جزیہ کی قرآنی آیت کے الفاظ صاف اور غیر مبہم ہیں:- حتّٰی یعطوا الجزیۃ عن یدٍ وھم صاغرون (۹/۲۹) "یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں چھوٹے بن کر (یعنی ذلیل ہو کر) رہیں"۔ اس آیت کی رو سے عیسائی ذمیوں کا صحیح مقام ظاہر ہے کہ وہ "صاغرون" بنے رہنے پر قناعت کریں "ظاہرون" بننے کا سودا ان کے سر میں نہ سمائے۔ اسی طرح اسلامی ممالک کے باہر سے آنے والے عیسائی "مستامن"

۲ مستامن وہ غیر مسلم ہیں جو اسلامی سلطنت میں بیرونی ملک سے جائز طریقوں سے آئیں اور مملکت کے اسلامی قوانین اور اسلامی نظم و نسق کا احترام لازم سمجھیں۔ ایسے لوگوں کو تحفظ دیا جاتا ہے لیکن ان کو شہریت کے حقوق نہیں ملتے۔ مکمل شہریت کے حقوق صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہیں جو مسلم ہوں خواہ وہ اسی سلطنت کے پیدائشی باشندے ہوں یا باہر سے ہجرت کر کے آئے ہوں۔ مگر جو شخص مسلم ہو یا مسلم بن چکا ہو وہ سلطنت میں رہتے ہوئے پھر غیر مسلم نہیں بن سکتا۔ ہاں۔ اگر وہ سلطنت سے باہر جا کر چاہے تو غیر مسلم بن جائے لیکن اگر وہ سلطنت کے اندر ایسا تو کرنا تو اس صرف اس کو

(باقی صفحہ ۸۹ پر)

کی حیثیت سے دار الاسلام میں داخل ہو کر تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ تمدنی مقاصد کے لئے آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں لیکن مسیحیت کی تبلیغ ہرگز نہیں کر سکتے مبادا اللہ کا بول نیچا اور کفر کا بول بالا ہو جائے اور "کلمۃ الذین کفروا" کو دوبارہ "سفلیٰ" سے پھر "علیا" کرنے کی کوششیں بار آور ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جزیہ کے عہد بدولت میں مسیحیوں کو تبلیغ مسیحیت کا کبھی حق نہ دیا گیا۔ چنانچہ پاکستانی رپورٹ کے فاضل جج عنوان "دوسرے مذاہب کی تبلیغ" کے ماتحت لکھتے ہیں "ارتداد کی سزا کیا ہونی چاہیے اور آیا غیر مسلموں کو علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے یا نہیں، یہ دونوں مسئلے باہم مربوط ہیں جس اصول کے ماتحت ایک مرتد کو سزائے موت دی جاتی ہے اسی کا اطلاق "کفر" کی علی الاعلان تبلیغ پر بھی ہونا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ نظریہ مسلم قرار دیا جائے گا کہ ارتداد کی سزا موت ہوگی اور اسلام کے خلاف کسی حملے یا مظاہرے کو بھی ارتداد قرار دیا جائیگا اور اس کی سزا بھی وہی ہوگی جو ارتداد کی ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر غیر مسلم مذہب کی کھلم کھلا تبلیغ ممنوع قرار پائے گی" (صفحہ ۲۲۱)۔ اسلامی فقہ کی تمام کتب میں بھی اس حق کا کہیں ذکر پایا نہیں جاتا۔ حالانکہ فقہا نے "مستامن" بن کر باہر سے آنے والے مسیحیوں کا معاملہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بانیٔ اسلام کے زمانہ میں اور خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلامی سلطنت کا یہی طرزِ عمل رہا۔ یوں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس کی ترقی رک گئی۔

(بقیہ صفحہ ۸۸) ذمی یا "مستامن" کے حقوق نہ ملینگے بلکہ اس کو یہ فعل بجائے خود غدر قرار دیا جائیگا۔ باہر سے آنے والے غیر مسلم بھی اگر "ذمی رعایا" بن کر رہنا چاہیں تو ذمیت کی پوری شرائط ادا کر کے وہ ایسا کر سکتے ہیں اور ان کو تحفظ کے ساتھ نیم شہریت کے حقوق ملتے ہیں لیکن ذمی بن جانے کے بعد ان کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ ذمہ سے خارج ہو سکیں۔ ذمہ سے نکلنے کی ان کے لئے صرف واحد صورت یہ ہے کہ وہ مملکت سے نکل جائیں۔

(۸)

قرآنی احکام نے مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا ہر راہ بند کر کے ایک چھوٹی "اقل ذلیل" اقلیت بنا دیا۔ قانونِ ارتداد نہ صرف اُن پر لاگو ہے جو پہلے مسیحی ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے بلکہ اُن کے بعد کی نسلوں پر بھی پُشت در پُشت لاگو ہے۔ اگر اُن کی اولاد یا اولاد کی اولاد ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور مسیحیت کو اختیار کرنا چاہے تو اُس کو بھی سزائے موت کے خوف سے اسلام کے دائرہ کے اندر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ قرآن اختیاری اور پیدائشی پیروؤں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب کوئی مسیحی اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا تو نہ صرف وہ خود بلکہ اُس کی اولاد، اور اُس کی اولاد کی اولاد نسل در نسل مسیحیت کے دائرہ سے نکل گئی۔ یوں اسلام کے دائرہ میں اضافہ ہوتا گیا اور مسیحیت ہر نسل کے ساتھ چھوٹی اقلیت ہوتی گئی۔ تمام ایشیائی ممالک کی کلیسیائیں اپنے ہی مُلک میں ایک ایسی اقلیت ہو گئیں جو "ذمی" تصور کی گئیں۔ اُن کو احساس کمتری ہمیشہ ستاتا رہا۔ اُن کو یہ احساس ہمیشہ رہا کہ وہ مسیحی اقلیت ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں ہو سکتیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ مُسلم اکثریت نے بے بسی کی ذہنیت اور لاچاری کا احساس اُن کے دلوں میں صدیوں سے ایسا ڈال رکھا ہے کہ اب اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آتا کہ وہ مُسلم عوام کو انجیل جلیل کی دعوت بھی دیں۔ اُن کا مذہب بس ایک خاندانی اور خانگی معاملہ ہی رہ گیا ہے۔

علاوہ ازیں قرآنی احکام کی رُو سے مُسلم چار بیویوں اور لاتعداد لونڈیوں سے اولاد پیدا کر کے (۴:۳ و ۲۹ و ۲۴:۳۲) ہر لحظہ دائرہ اسلام کی تعداد کو بڑھا کر اُس کی اکثریت میں اضافہ کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن مسیحیت صرف ایک بیوی کی اجازت دیتی ہے اور دیگر ہر عورت سے مباشرت کرنی حرام تصور کرتی ہے

پس کوئی کلیسیا نکاح کے ذریعہ اولاد بڑھا کر اپنی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایشیائی ممالک میں اسلام کی اکثریت بڑھتی گئی اور قرآنی قانون کے مطابق مسیحی کلیسیا "صاغرون" ہی بنتی گئی۔ آج سعودی عرب میں کوئی عیسائی ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا اور برّ اعظم افریقہ اور مشرق و مغرب کے دیگر اسلامی ممالک میں مسیحیوں کی تعداد پانچ سے پندرہ فی صدی تک ہی باقی جاتی ہے۔

(۵)

ایک اور قرآنی حکم ہے جس کے ذریعہ مسیحیوں کو یہ ترغیب ہُوئی کہ وہ مسیحی دین کو ترک کر کے اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ چنانچہ لکھا ہے "زکوٰۃ کا مال صرف فقیروں اور محتاجوں کے لئے ہے اور اُن کے لئے جو اُس پر کارندے ہیں اور اُن کے لئے بھی ہے جن کے دل اسلام کی طرف راغب کرنے منظور ہیں۔ اور قیدیوں کے چھڑانے اور قرضداروں اور خرچ جہاد اور مسافروں کیلئے ہے۔ یہ خُدا کی طرف سے فرض ہُوا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اُن میں کوئی ہے جو تقسیم زکوٰۃ کی بابت تجھ پر عیب لگاتا ہے۔ اگر اس میں سے اُن کو ملے تو وہ راضی ہوں اور اگر اُن کو اس میں سے نہ ملے تو فوراً ہی ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر راضی ہوتے جو اللہ اور اُس کے رسُول نے اُن کو دیا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے۔ ہم کو اللہ اور اُس کا رسُول اپنی مہر سے پھر بھی کچھ دیتا رہیگا تو بہتر ہوتا" (۹/۵۸---۶۰)۔ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضرت نے مکہ کے رؤسا کو جو ایمان لے آئے تھے لیکن اُن کا ایمان متزلزل تھا، اُن کے دلوں کو اسلام پر مستحکم کرنے کے لئے مالِ غنیمت میں سے فیاضی کے ساتھ انعام دیئے۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے "مولفۃ القلوب" کہا ہے۔ چنانچہ ابو سفیان کو تین سو

اُونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی دی گئی۔ حکیم بن حزام، نضر بن حارث، صفوان بن اُمیّہ، قیس بن عدی، سہیل بن عمرو وغیرہ کو سو سو اُونٹ دیئے گئے۔ قریش کے بہت سے آدمیوں کو آپ نے سو سے کم عنایت کیے جن میں عباس بن مرداس بھی تھا۔ جب اُس کو کم ملے تو اُس نے ناراض ہو کر چند اشعار لکھے۔ اس پر آنحضرت نے صحابہ کو حکم دیا کہ اُس کو اور اُونٹ دے دو، تاکہ اُس کی زبان بند ہو جائے۔ چنانچہ اُس کو اتنے اُونٹ ملے کہ وہ خوش ہو گیا۔

تاریخ اسلام ہم کو بتلاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیات کی رو سے بے شمار مسیحیوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کر لیا گیا۔ اسلامی نظام حکومت نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ جہاد کی جنگوں نے اُن کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ بیشمار مسیحی تہ تیغ کر دیئے گئے تھے۔ جن کے گھر بار، مال جائداد وغیرہ تباہ ہو کر فاتحین کی نذر ہو چکی تھیں۔ جن کی عورتیں اور بچے قید ہو کر باندی غلام بنا لئے گئے تھے۔ جزیہ، خراج، عشر، تجارت ٹیکس وغیرہ نے اُن کو مفلس کر رکھا تھا۔ وہ ہر جگہ اقلیت میں ہو کر ذلیل شمار کیے جاتے تھے اور اکثریت کے رحم پر تھے۔ اُن کے دین، مذہبی رسوم اور رواج کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی (جو اُن کا مذہبی فرض تھا) اجازت نہ تھی۔ اُن کے گرجا گھر شہید کیے جاتے تھے اور وہ اس بات کے مجاز نہ تھے کہ نئے گرجے تعمیر کریں۔ وہ یہ استطاعت نہ رکھتے تھے کہ کلیسیا کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لئے قدم اُٹھائیں۔ قانون کی نظر میں اُن کا وجود کچھ معنی نہ رکھتا تھا کیونکہ اسلامی نظامِ سلطنت میں اُن کا کوئی حصہ نہ تھا۔ عوام مسلمانوں کی نگاہ میں اُن کو کوئی عزت و توقیر حاصل نہ تھی۔ پس ہزاروں مسیحیوں نے ایسی زندگی بسر کرنے کی نسبت شہید ہونے کو ترجیح دی۔

اور اپنے خون سے اپنے ایمان پر مُہرِ صداقت لگائی۔ لیکن بے شمار مسیحیوں نے مرنے کی بجائے اور ذلیل زندگی بسر کرنے کی بجائے اسلام کا جوا پسند کیا اور اپنی اور اپنے خاندانوں کی آبرو اور مال و جان پر اپنے ایمان کو قربان کر دیا۔ لوگ جو مسیحی ایمان سے منحرف ہو گئے اُن کو جزیہ وغیرہ سے نجات ملی۔ جزیہ دینے کی بجائے اُن کو انعامات ملے اور وہ اکثریت میں شامل ہو کر سب قیود سے آزاد ہو گئے اور اسلامی نظامِ حکومت میں حصہ دار ہو گئے۔ اُن کے طرزِ عمل نے اکثریت کی جماعت کی تعداد اور بھی بڑھا دی یوں مسیحی کلیسیا جو پہلے ہی اقلیت تھی، اُس کی تعداد اور بھی قلیل ہو گئی۔ لیکن جن مسیحیوں نے اپنے ایمان کو تھامے رکھا اُن کی حالت امتدادِ زمانہ کے ساتھ بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اُن کی ذہنی، سماجی، اقتصادی زندگی میں روز بروز نمایاں فرق آتا گیا۔ اُن کا مذہب گویا ایک قید خانہ تھا جس سے باہر وہ نکل ہی نہ سکتے تھے اور اُس کے پیرو اپنے پنجرے میں اپنے بال و پر پھڑپھڑاتے رہے۔ وہ بے بال و پر ہو کر صدیوں سے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

(۱۰)

برِّ اعظم افریقہ اور ایشیا کے ممالک کی مسیحی کلیسیاؤں کا یہ حسرتناک انجام محض حکومتِ الٰہی کے دینی قانون کی وجہ سے ہے جس کا صحیح نظریہ ہے کہ تمام انسانی ذمہ داریوں کو خواہ وہ دُنیا کے ماحول کے متعلق ہوں یا اصلاحِ آخرت سے متعلق ہوں، سب کو اسلام اور اسلامی شریعت کی دفعات کے تحت کر دیا جائے۔ علامہ ابن خلدون کہتے ہیں کہ یہ حکومت شرعی نصب العین کے ماتحت آخرت کی فلاح کو اصل تصور کرتی ہے اور دُنیا کے تمام معاملات، کوائف اور احوال کو اور تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو عاقبت کے مفاد کے ماتحت کر دیتی ہے۔ ایسی

باب کی فصل اوّل کے شروع میں پاکستانی رپورٹ کے فاضل ججوں کے جنچے تُلے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (جو عُلمائے اجتماعیات کی صفِ اوّل میں ہیں) حجۃ البالغہ میں بھی یہی فرماتے ہیں کیونکہ قرآن کا ایک بڑا حصہ اسلام اور حکومتِ الٰہی کے تعلقات پر احکام صادر کرتا ہے۔ احادیث میں تو اس قسم کی ہدایات بکثرت موجود ہیں۔

موجودہ زمانہ کے بعض روشن دماغ اور آزاد خیال تعلیم یافتہ اصحاب جو اسلامی حکومت کے مختلف احکام کو زمانۂ حاضر کے حالات اور بین الاقوامی قانون کے خلاف پاتے ہیں اس نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے۔ ہم پاکستانی رپورٹ کے فاضل ججوں کے بعض خیالات جو انہوں نے مختلف موضوعات پر ظاہر کئے ہیں سطورِ بالا میں درج کر آئے ہیں۔ چنانچہ قتلِ مُرتد کی سزائے موت کے متعلق وہ لکھتے ہیں "ارتداد کے لئے سزائے موت بہت دُور رس متعلقات کی حامل ہے اور اس سے اسلام مذہبی جنونیوں کا دین ظاہر ہوتا ہے جس میں حریتِ فکر مستوجبِ سزا ہے۔ قرآن تو بار بار عقل و فکر پر زور دیتا ہے۔ رواداری کی تلقین کرتا ہے اور مذہبی اُمور میں جبر و اکراہ کے خلاف تعلیم دیتا ہے۔۔۔ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو یا خود اسلام قبول کر چکا ہو، وہ اگر اس خیال سے مذہب کے موضوع پر فکر کرے کہ جو مذہب اُس کو پسند آئے اُس کو اختیار کرے وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلام کامل ذہنی فالج کا پیکر بن جاتا ہے" (صفحہ ۲۳۷)۔ اس قسم کے خیالات عام سمجھدار مسلمانوں کے دلوں میں بھی آتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب سید عبدالحی رضوی لکھتے ہیں: "ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے مُرتد کو قتل کئے جانے کا حکم دیا ہے۔ دُوسری طرف یہ دعوے بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔

ان دونوں کی مطابقت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اسلام امن و سکون کا پیغام تھا اور جیسا کہا جاتا ہے کہ دین کے معاملہ میں وہ "جبر و اکراہ" کو پسند نہیں کرتا تو پھر قتلِ مُرتد کے کیا معنی؟ اگر کوئی شخص اسلام سے منحرف ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہے لہٰذا آپ اس جرم میں اُس کو مستوجبِ قتل قرار دیتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اُسے جبراً اسلام پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔" (رسالہ نگار، دسمبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۴۱)۔

مولانا شبلی نعمانی مرحوم ایسے وسیع الخیال مسلمانوں کے گروہ کی بابت لکھتے ہیں "اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مسائل کی تعبیر کرنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک علمائے قدیم، دوسرا جدید تعلیم یافتہ طبقہ۔ علما کا تو یہ حال ہے کہ اُن کو زمانہ کی موجودہ زبان میں بولنا نہیں آتا۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے مبلغِ علم ناقص ہیں لیکن بدقسمتی سے یہی دُوسرا گروہ جس میں سید امیر علی شامل ہیں، قومی لٹریچر پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اسی گروہ کی آواز اسلامی آواز سمجھی جاتی ہے (مقالات جلد اوّل صفحہ ۱۰۵)۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی یوں رقمطراز ہیں "ایسے ثابت شدہ مسائل کی نسبت جن لوگوں نے موجودہ زمانہ کی روشن خیالی سے متاثر ہو کر اختلافی بحث کا دروازہ کھولا ہے اُن کے لئے زیادہ معقول طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ واقعہ ہے اور مستند شہادتوں سے ثابت ہے اُس کو واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے اور پھر اس امر پر غور کرتے کہ آیا ہم ایسے دین کی اتباع کریں یا نہ کریں جو مُرتد کو سزاء موت دیتا ہے۔ اپنے مذہب کی کسی ثابت اور مسلّم چیز کو اپنے عقلی معیار کے خلاف پا کر یہ شخص ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز سرے سے مذہب میں ہے ہی نہیں" (صفحہ ۸)۔ یہ گروہ شکست خوردہ لوگوں کی اُس پرانی پالیسی پر عمل کرتا ہے کہ اپنے دین کے جس مسئلے پر معترضین کی گرفت مضبوط پڑے،

اُس کو اپنی کتاب آئین میں سے چھیل ڈالو اور صاف کہدو کہ یہ مسئلہ سرے سے ہمارے دین میں ہے ہی نہیں۔ دوم: دُوسرا گروہ جس کے لئے پہلے گروہ کی طرح حقیقت کا انکار کر دینا ممکن نہ تھا، سو اُس نے امرِ واقعی کا اظہار تو کر دیا لیکن اس سے عقلی اعتراضات کا کوئی جواب بن نہ پڑا......
(مرحوم مولانا محمد علی دہلوی جیسا سچا مسلمان بھی ان دلایل سے شکست کھائے بغیر نہ رہ سکا" (مُرتد کی سزا صفحہ ۴۲)۔

ہم کو یہاں مناظرہ سے غرض نہیں۔ بلکہ اس باب میں اور آیندہ ابواب میں ہم کو تواریخ کے اوراق کی ورق گردانی کرنے ہی سے غرض ہے۔ ہم اس کتاب میں اسلامی سلطنت کے قوانین اور قرآنی احکام کو صرف تاریخی اسباب اور مشاورات ہی سمجھ کر اُن کا ذکر کرینگے اور اُن کو تاریخی واقعات گردان کر ہی اُن اسباب پر نظر ڈالینگے جو اُن حقیقتوں، خانوتوں اور حکموں کی بناء پر مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کے زوال کا باعث بنے۔ ہم اس رسالہ میں اُن مختلف تاریخی واقعات و اسباب کے حسن و قبح پر بحث نہیں کرینگے بلکہ اُن کو مؤرخانہ نظر ہی سے دیکھینگے اور بے لاگ ہو کر تاریخ کے اصولوں کے پابند رہ کر اُن صداقتوں کے ثابت شدہ واقعات کو تاریخی واقعات ہی کی حیثیت سے تسلیم کر کے اُن تاریخی بیانات کو من وعن ناظرین کے سامنے رکھنے کی کوشش کرینگے تاکہ موجودہ زمانہ کی کلیسیائیں اپنے ماضی کے حالات سے واقفیت حاصل کر کے اپنی روش پر نگاہ ڈالیں اور اُن سے سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل پر غور کر سکیں ÷

باب سوم

خلفائے اسلام کا زمانہ اور مشرقی کلیسیاؤں کی پراگندگی

فصل اوّل خلفائے راشدین کا زمانہ

(۱)

اسلامی دورِ حکومت کا زمانہ عموماً خلافتِ راشدین سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء تک شمار کیا جاتا ہے جب خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ لیکن ہم اس کتاب میں اندلس کی امارت بنی اُمیہ (از ۷۵۶ء تا ۱۰۳۱ء) کا اور خلافت فاطمیہ کا جو ملکِ مصر اور بربر میں قائم ہوئی تھی اور خلافتِ عثمانیہ یعنی عثمانی ترکوں کی حکومت کا ذکر نہیں کرینگے کیونکہ ان حکومتوں کا کلیسیائے ہندوستان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس کتاب میں صرف اُن حکومتوں کا ہی ذکر کرینگے جن کا اثر ہندوستان کی کلیسیا پر بالواسطہ یا بلاواسطہ پڑا تھا۔ وُہ حکومتیں حسب ذیل ہیں:۔

اوّل۔ خلافتِ راشدین از ۶۳۲ء تا ۶۶۱ء مطابق ۱۱ھ تا ۴۱ھ

دوم۔ خلافتِ بنی اُمیہ یعنی دمشق میں خاندانِ بنی اُمیہ کی حکومت از ۶۶۱ء تا ۷۵۰ء مطابق ۴۱ھ تا ۱۳۲ھ

سوم۔ خلافتِ عباسیہ از ۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء مطابق ۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ

چہارم - سلاطینِ دہلی کی سلطنت از ۱۱۹۲ء تا ۱۵۲۶ء
پنجم - سلطنتِ مغلیہ از ۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء

حضرت ابوبکر خلیفۂ اوّل (از ۶۳۲ء تا ۶۳۴ء)

جب حضرت محمد ۶۳۲ء میں وفات پا گئے تو حضرت ابوبکر اُن کے خلیفہ ہُوئے۔ وُہ نہایت غیور اور زاہد دیندار مُسلمان تھے۔ قبولیتِ اسلام سے پہلے بھی اُن کی طبیعت میں ایسی متانت تھی کہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفا میں حضرت عائشہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ اُنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا (صفحہ ۱۸)۔

اسماعیلی نے لکھا ہے کہ حضرت عُمر کہتے ہیں کہ رسُول اللہ کی وفات کے بعد اکثر اہل عرب مُرتد ہو گئے۔ اُنہوں نے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ مَیں نے ابوبکر کو کہا کہ یہ لوگ وحشی ہیں بالفعل آپ اُن کی تالیفِ قلوب اُلفت اور ملائمت سے کریں۔ اُس نے ناراض ہو کر کہا کہ مجھے تو تُم سے مدد کی اُمید تھی۔ جاہلیت میں تو تُم نہایت سخت گیر تھے تعجب ہے کہ بعد از اسلام تُم سُست ہو گئے ہو۔ مَیں اُن کی تالیفِ قلوب کس ذریعہ سے کرُوں؟ کیا مَیں اُن کے سامنے اشعار پڑھوں یا جادُو کے ذریعہ التفات کراؤں؟ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہے مَیں اُن سے جہاد کرُونگا گو تمہارے جیسے دانا مُجھے باز کیوں نہ رکھیں۔ واللہ مَیں اُن لوگوں سے ضرور جنگ کرُونگا۔ اُس نے خالد بن ولید کو ہدایت کی کہ مُرتدوں سے پانچ اُمور کی خاطر جنگ کرنا۔ اوّل کلمہ لا اِلٰہ اِلّا اللہ۔ دوم۔ مُحمّد عَبدُہٗ وَرسُولُہٗ۔ سوم۔ نماز۔ چہارم زکوٰۃ۔

پنجم - روزہ کا رکھنا۔ اگر کوئی شخص ان پانچ میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے تو اُس سے ایسا ہی جنگ کرنا کہ گویا وُہ پانچوں ہی سے انکاری ہے۔ مخالفین میں سے بنی اسد۔ بنی غطفان اور دیگر بہت سے قبائل قتل ہُوئے اور باقی اسلام پر قائم ہو گئے" (تاریخ الخلفا صفحہ ۹۴ - ۹۴)۔

نبیِ اسلام کی وفات کے بعد صرف قریش اور ثقیف ہی مہاجر اور انصار کے ساتھ مُسلمان رہ گئے۔ باقی تمام قبائل عرب مُرتد ہو گئے۔ بحرین میں دو قومیں بستی تھیں ایک بنی عبد القیس جو بدستور مُسلمان رہے اور دُوسرے بنی بکر جو مُرتد ہو گئے۔ ارتداد کی اس عام تحریک کو دبانے کے لئے ابوبکر نے خالد بن ولید کو لکھا کہ اس کا انسداد کرے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خالد بن ولید کو حکم اور ہدایت ہے کہ جو باغی کلمۂ شہادت قبول نہ کریں وُہ اُن سے لڑے۔ وُہ جہاں ہوں اور جہاں کہیں بھی بھاگ کر جائیں، اُن میں سے جو خالد کے ہاتھ آئیں وُہ اُن کو قتل کر دے . . . . اُس کو حکم ہے کہ وُہ یمامہ کی طرف پیش قدمی کرے اور پہلے بنو حنیفہ اور اُن کے کذّاب مسیلمہ سے لڑے۔ لڑنے سے پہلے اُن کو اسلام کی دعوت دے . . . . اگر وُہ قبول نہ کریں تو اُن کو ہتھیاروں اور آگ دونوں سے تباہ کر دے۔ اور اُن کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑے جس کو وُہ مار سکتا ہے۔ اُس کو ہدایت ہے کہ گھٹیا درجہ کے عربوں کو فوج میں بھرتی نہ کرے جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے کہ وُہ کون ہیں اور اُن کا حسب نسب کیا ہے۔ اور وُہ کیوں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ والسّلام"۔ بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ نے ایک مراسلہ عوام کے نام بھی بھیجا اور خالد کو حکم دیا کہ ہر مجمع میں سُنایا جائے۔ اس میں یہ تھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مَیں خالد بن ولید کو قریش کے مہاجرینِ اوّلین اور انصار کی ایک فوج کے ساتھ تمہارے پاس بھیج رہا ہُوں۔

اس کو حکم ہے کہ کسی شخص سے اُس وقت تک نہ لڑے اور نہ قتل کرے جب تک اُس کو کلمۂ شہادت کی دعوت نہ دے۔ پھر جو شخص اسلام کو قبول کر لے اور توبہ کرے وُہ اس کا اسلام قبول کر لے لیکن جو شخص دعوت سُن کر اور دوبارہ سنبھلنے کا موقعہ پا کر بھی اسلام قبول کرنے سے انکار کرے وُہ ایسوں سے خود اور اُس کے خدائی جان نثار نہایت سخت جنگ کریں اور مُطلق نرمی نہ برتیں۔ اُن کو آگ میں جلا دیں اور عورتوں بچّوں کو قید کر لیں اور کسی سے کلمۂ شہادت کے علاوہ اور کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔" (برہان جون ۵۹ء)۔

خالد بن ولید وہ شخص تھا جس کو جنگِ موتہ کے بعد آنحضرت نے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ تاریخ طبری میں ہے" ابو بکر کا عہد اپنے لشکر سے یہ تھا کہ جب کسی کے گھر پہنچو اور اذان کی آواز سُنو تو اُن سے تعرض نہ کرو لیکن اگر اذان نہ سُنو تو لُوٹ مار کرو اور قتل کرو، اور جلا ڈالو۔ شرح بخاری عینی میں ہے کہ خالد نے بہت سے مُرتدوں کو زندہ جلا دیا جس پر حضرت عمرؓ نے ابو بکر سے کہا کہ اس شخص کو موقوف کرو جو خدا کے عذاب (یعنی آگ) سے لوگوں پر عذاب کرتا ہے۔ ابو بکر نے کہا ہم اُس تلوار کو میان میں نہیں رکھینگے جس کو خدا نے مشرکین پر کھینچا ہے" (جلد ۷ صفحہ ۵۵)۔ لیکن جیسا ہم اُوپر بتلا چکے ہیں، اور تاریخ خمیس میں لکھا ہے خود ابو بکر نے خالد کو لکھا تھا کہ "اگر خدا تجھے مظفر کرے اہل یمامہ پر تو اُن میں سے کسی کو نہ چھوڑنا۔ زخمیوں کو قتل کر دینا۔ بھاگے ہُوؤں کو ڈھونڈ نکالنا۔ قیدیوں کو قتل کرنا اور اُن کو آگ سے جلا دینا۔ خبردار میرے حکم کے خلاف نہ کرنا"۔ ان مرتدوں میں سے مالک بن نویرہ کی مثال اُس سلوک کی نوعیت ظاہر کر دیتی ہے جو خالد نے مُرتدوں سے کیا۔ کنز الاعمال میں ہے" خالد بن ولید نے کہا کہ مالک مُرتد ہو گیا ہے۔ مالک نے (جو رسُول کا صحابی اور اپنی قوم کا سردار تھا) ارتداد سے

انکار کیا اور ابو قتادہ انصاری اور عبداللہ بن عمرؓ نے اس پر گواہی دی لیکن خالد نے ضرار کو حکم دیا کہ اُس کی گردن مارے۔ پھر خالد نے اُس کی زوجہ اُمِ متمم کو لیا اور اُس سے نکاح کر لیا۔ جب عمرؓ کو یہ خبر ملی تو اُس نے ابو بکر سے کہا کہ اُس نے زنا کیا ہے اُس کو سنگسار کیا جائے ابو بکر نے انکار کر دیا۔ عمرؓ نے کہا کہ اُس نے ایک مسلمان کو قتل کیا ہے اس کے قصاص میں قتل کرو ابو بکر نے جواب دیا کہ ہم خالد کو ہرگز قتل نہ کرینگے۔ عمرؓ نے کہا کہ اس کو کم از کم معزول کر دو ابو بکر نے جواب دیا میں اس شمشیر کو غلاف نہ کرونگا جس کو خدا نے مسلط کیا ہے"۔ وفیات الاعیان ابن خلکان میں ہے "خالد نے مالک کے سر کو دیگچی کا چولھا بنایا۔ اُس کے سر پر اس قدر بال تھے کہ کھانا پک گیا مگر آگ کی آنچ اُس کے چہرہ تک نہ پہنچی اور خالد نے اُس کی زوجہ پر تصرف کر لیا"۔ تاریخ خمیس میں ہے" خالد نے پکار کر کہا کہ اگر کسی شخص کو کھانا پکانا ہو یا پانی گرم کرنا ہو تو اُس کا چولھا کسی آدمی کا سر بنا لے۔ خالد نے یہ بھی حکم دیا کہ لکڑی کے مکان بنائے جائیں۔ پھر اُس میں آگ روشن کی اور حکم دیا کہ قیدیوں کو اُس میں زندہ پھینک دیا جائے۔ حامیہ بن سبیع کو بھی اُن کے ساتھ جلا دیا حالانکہ یہ وُہ صحابی تھا جس کو آنحضرت نے خود اُس کی قوم کا عامل صدقہ مقرر کیا تھا جس کے بعد وہ مُرتد ہو گیا تھا۔ اس واقعہ میں ام طاعہ ایک عورت گرفتار ہُوئی۔ اُس کو اسلام کی دعوت دی گئی جس کو اُس نے قبول نہ کیا اور آگ میں کود پڑی۔ پھر خالد نے حکم دیا کہ قیدی آگ میں جلا دیئے جائیں۔ چنانچہ سب زندہ جلا دیئے گئے"۔ (صفحہ ۲۳۱)۔ جب مُسلمانوں نے اس بے رحمی پر اعتراض کیا تو خالد نے جواب دیا کہ دیکھو یہ حکمنامہ ابو بکر کا ہے جس میں ہم کو لکھا ہے کہ اگر خدا تجھے ظفر مند کرے تو سب کو آگ میں جلا دینا (جلد ۲ صفحہ ۲۳۱)

تشدد کا یہ حال تھا کہ تاریخ کامل میں ہے کہ" بنی اسد، بنی غطفان، بنی طے،

بنی سلیم اور بنی عامر کا کوئی عذر قبول نہ کیا گیا۔ اُن کو حکم دیا گیا کہ اُن لوگوں کو حاضر کریں جنہوں نے حالتِ ارتداد میں مسلمانوں پر زیادتی کی تھی اور اُن کو مُثلہ کیا تھا (یعنی ناک اور کان کاٹ دیئے تھے) اور جلا دیا تھا۔ وہ سب لائے گئے۔ اُن کے ناک، کان کاٹ کر مُثلہ کیا گیا۔ وہ زندہ جلا دیئے گئے۔ اُن کے سر پتھروں سے کچلے گئے۔ پہاڑوں پر سے نیچے پھینک دیئے گئے اور کنوؤں میں ڈالے گئے" (جلد ۲ صفحہ ۱۳۲) جنہوں نے میری کتاب "محمد عربی" پڑھی ہے اُن کو یاد ہوگا کہ جب معاویہ کی ماں نے عمِ رسُولِ عربی حمزہؓ کا مُثلہ کیا تھا تو حضرت نے کہا تھا کہ اگر مجھ کو موقع ملا تو میں ستّر آدمیوں کا مُثلہ کرونگا۔ تب یہ قرآنی آیت نازل ہوئی تھی کہ "اگر انتقام لو تو صرف اسی قدر لو جتنا اُنہوں نے تم کو ستایا ہے اور اگر صبر کرو تو بہتر ہے"۔ اس پر آنحضرت نے یہ ارادہ چھوڑ دیا تھا۔

خالد بن ولید کے علاوہ خلیفہ ابوبکر نے علاء ابن حضرمی، عکرمہ بن ابوجہل اور زیاد بن ولید وغیرہ گیارہ اشخاص کو سرلشکر مقرر کر کے مختلف مُرتد قبائلِ عرب کے خلاف جنگ کرنے کو بھیجا اور اُن کو بھی وُہی احکام دیئے۔ ان جنگوں میں ہزاروں اشخاص مقتول ہوئے ایسا کہ عرب کی سرزمین مُرتدوں کے خون سے رنگین ہوگئی۔ خلیفۂ اوّل کی دو سالہ حکومت میں ارتداد کا خاتمہ ہو گیا اور مُلکِ عرب میں اسلام از سرِ نو قائم ہو گیا۔

حضرت عُمر کا عہدِ خلافت (از ۶۳۴ء تا ۶۴۳ء)

حضرت عُمر کی خلافت کا زمانہ ایک ممتد زمانہ ہے۔ اس کی حکومت کا نمایاں اور غالب تصوّر یہ تھا کہ اسلام کی عسکری اور مذہبی حکومت کی نشو و نما اور ترقی ہو اور جن مُلکوں اور قوموں کو اسلام کا مطیع کر لیا جائے اُن کی تذلیل ہو۔ جہاں تک

مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کا تعلق ہے ۶۳۳ء سے ۶۳۹ء تک کے سات سال فیصلہ کُن سال ہیں جن کے دوران میں متعدد مسیحی کلیسیائیں اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔

ہم سطُورِ بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ بانیٔ اسلام نے نجران کے مسیحیوں سے معاہدہ کر کے اُن کے جان و مال اور دین وغیرہ کے تحفظ کا ذمہ لیا تھا۔ اپنی وفات سے پہلے اُنہوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ عرب میں اسلام کے علاوہ کوئی دُوسرا مذہب نہ رہے۔ خلیفہ عمر نے اُن تمام عیسائیوں کو عرب سے نکال دیا جنہوں نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نجران کی کلیسیا جس کا ایمان ذونواس کی ایذا رسانی کے ایام میں کُندن کی طرح چمکتا رہا تھا اسلام قبول کرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ پس یہ سب مسیحی عراق کی جانب مُلک بدر کر دیئے گئے اور کوفہ جلاوطن کر دیئے گئے جس کی وجہ سے اس مقام کا نام نجران الکوفہ پڑ گیا۔ بعد کے خلفا کے زمانہ میں جب نجران کے اسقفوں کا ذکر ۸۶۴ء اور ۹۳۵ء میں آتا ہے تو اس "نجران" سے نجران الکوفہ ہی مُراد ہوتی ہے نہ کہ عرب کا نجران۔ نجران کے مسیحیوں کی حالت کوفہ میں روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ ان میں سے بہتوں کو وہاں مُسلمان بنا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس قبیلہ کا شمار اس قدر کم ہو گیا کہ جب عُمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہُوا تو ان عیسائیوں نے اس سے شکایت کی کہ ہماری بیخکنی ہو رہی ہے اور عراق کا گورنر حجاج ہم پر ظلم کر رہا ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اُن کی مردم شماری کی جائے۔ تب معلوم ہُوا کہ وُہ اب صرف دس فیصدی رہ گئے ہیں۔ پہلے وُہ چالیس ہزار تھے لیکن اب بڑھنے کی بجائے اُن کی تعداد صرف چار ہزار رہ گئی ہے۔

بنو غسّان کا قبیلہ کنعان کے مشرق اور جنوبی شام کی اطراف پر

حکمران تھا۔ ایامِ جاہلیت میں اس مسیحی قبیلہ کے شرکا اُمرا اور بڑے شجاع شمار کیے جاتے تھے۔ اُن کا بادشاہ حارث مسیحی ایمان پر قائم رہا۔ لیکن اس قبیلہ کے لوگوں نے اسلام کو جلدی قبول کر لیا۔ یہ قبیلہ اسلام کا درخشاں ستارہ ہو گیا اور اُن کی تبدیلیٔ مذہب سے اسلام کو بڑا فروغ حاصل ہُوا۔ لیکن جو اپنے ایمان پر قائم رہے وہ رُومی سلطنت کے علاقہ میں ہجرت کر کے چلے گئے کیونکہ حضرت عمرؓ نے اُن کے سردار جبلہ کو کہا تھا کہ تیرے لئے تین راہ کھُلے ہیں۔ یا تو اسلام قبول کر اور یا جزیہ دے اور یا جہاں تیرا جی چاہے نکل جا۔ پس اُس نے ایمان کے انکار پر ہجرت کو ترجیح دی اور تیس ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایشیائے کوچک چلا گیا۔

بنو تغلب کے قبیلہ نے اسلام اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ نے اُن کو جزیہ ادا کرنے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ جزیہ دینا ذلّت کی نشانی ہے۔ ہم جزیہ کے عوض مسلمانوں سے دُگنا صدقہ دیا کریں گے۔ یہ قبیلہ قومیت کے جذبات سے سرشار تھا۔ چنانچہ بُویب کے میدانِ جنگ میں اس قبیلہ نے ایرانیوں کے خلاف مسلمانوں سے مل کر ایسے جوہر جوانمردی دکھلائے کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ اس کا ایک مسیحی شجاع ایرانیوں کے کمانڈر کو قتل کر کے اور اُسی کے گھوڑے پر سوار ہو کر اسلامی فوج میں للکار کر کہتا ہُوا آیا "میں بنو تغلب کا ہُوں اور میں نے ایرانی افسرِ فوج کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا ہے"۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہم کو اسلامی فتوحات کی ابتدائی تاریخ میں ملتے ہیں مثلاً سنہ ۱۳ھ کی جنگ میں جب مسلمانی افواج ایرانیوں کے ہاتھوں شکست کھا رہی تھی تو بنی طے کے مسیحی قبیلہ کے سردار سے نہ رہا گیا۔ وہ مسلمانوں کی مدد کے لئے لپکا اور اُس نے اسلامی فوج کے جرنیل مثنّیٰ

کی آڑے وقت میں بروقت مدد کی۔ اس کا نمونہ دیکھ کر ایک اور مسیحی قبیلہ بنو نمر (جو قسطنطنیہ کی سرحد پر رہتا تھا) اسلامی افواج کی مدد کے لیے چاروں طرف سے میدانِ جنگ میں کود پڑا اور بُویب کے میدان میں مثنّیٰ کی ایسی امداد کی کہ جنگ نے پلٹا کھایا۔ اس پر مثنّیٰ نے سردارِ قبیلہ کو مخاطب کر کے کہا "تم اور ہم ایک ہی خون سے ہیں۔ آؤ ہم اکٹھے مل کر حملہ کریں اور غنیم کو شکست دیں"۔ مسیحی قبائل کی مدد سے اسلامی فوج نے دشمن کو ایسی شکستِ فاش دی کہ یہ جنگ یادگار جنگ کہلاتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود خلیفہ عمرؓ نے بنو تغلب سے خراج کے عوض دُگنا جزیہ لیا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ اپنے بچوں کو بپتسمہ نہ دیں۔ یہ شرط نئی اور نرالی تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ وہ اپنے بچوں کو پانی میں غوطہ نہ دیں گے اور نہ اُن کو عیسائی بنائیں گے۔ زیاد کہتا ہے کہ "مجھے عمرؓ نے حکم دیا کہ میں بنو تغلب سے سختی کروں کیونکہ وہ عرب ہیں اور شاید وہ اس طرح مسلمان ہو جائیں گے"۔

حیرہ کا شاندار شہر بھی مسیحیت کا زبردست مرکز تھا۔ خاص عرب کے باہر وہ پہلا بڑا شہر تھا جو اسلامی افواج کے ہاتھ آیا۔ گو قرائن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ بانیٔ اسلام کا یہ خیال نہ تھا کہ عرب دُنیا کو فتح کریں۔ لیکن حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ اس کو کوئی روک نہ سکا۔ مسیحی فرقوں کے باہمی تفرقہ اور خانہ جنگی نے ان حالات کو تقویت دی۔ اس کا مفصل ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہ درست ہے کہ خالد بن ولید بڑا زبردست جرنیل تھا اور کہ اُس کے مقابلہ کی افواج شمار میں کثرت سے ہوتی تھیں لیکن یہ بھی ایک تواریخی حقیقت ہے کہ یہ مسیحی افواج نہایت بے دلی سے جنگ کیا کرتی

تھیں اور کہ کسی مُلک کے لوگوں نے اسلامی افواج کا جان توڑ مقابلہ نہ کیا۔ چنانچہ ۶۳۴ء میں جو فیصلہ کُن جنگ خالد نے قیصر ہراکلس سے کی تھی، اُس میں قیصر اپنی عربی امدادی فوجوں پر بڑا اعتماد رکھتا تھا جو عیسائی تھیں۔ لیکن جب جنگ شروع ہُوئی تو یہ مسیحی عرب اسلامی فوج سے مِل گئے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جنگ نے پلٹا کھایا اور مُسلمانوں کو فتح نصیب ہُوئی۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی کہ عرب کے مسیحی زیادہ تر یعقوبی فرقہ کے عیسائی تھے جن کے پیچھے باقی فرقے اور بالخصُوص سلطنتِ بازنطائن ہاتھ دھو کر پڑے ہُوئے تھے۔ دُوسری وجہ یہ تھی کہ وُہ اور اسلامی افواج دونوں عرب تھے۔

چنانچہ خالد نے بڑی کوشش بھی کی کہ حیرہ کے لوگ اسلام قبُول کر لیں۔ اُس نے اُن کو کہا کہ تُم بھی عرب ہو۔ ہمارے ساتھ ایک ہی دین میں شامل ہو جاؤ۔ جب محصُورین نے خالد کے پاس ایک وفد بھیجا تو اُس نے پُوچھا۔ تُم کون ہو؟ کیا تُم ایرانی ہو یا عرب ہو؟ وفد کے سردار عدی نے جواب دیا کہ ہم خالص عرب نژاد ہیں۔ خالد نے جواب دیا کہ اگر تُم عرب ہوتے تو ہماری مخالفت نہ کرتے۔ اَب تُم تین باتوں میں سے ایک قبُول کر لو۔ یا تو تُم مسلمان ہو جاؤ۔ اس حالت میں تمہارے اور ہمارے حقُوق مساوی ہوں گے اور یا تُم جزیہ دو یا تُم جنگ اور تلوار قبُول کر لو۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم جزیہ دینے کو تیار ہیں۔ خالد نے کہا۔ تُم بدنصیب ہو کیونکہ اس زندگی کے صحرا میں ایک ایسے رہنما (ایران) کو چُن رہے ہو جو عرب نہیں ہے"۔ حیرہ کے وفد میں ایک مسیحی عبدالمسیح تھا۔ خالد نے ایک لاکھ درہم سالانہ لگایا اور کہا کہ وُہ ایرانیوں کے خلاف اس کے مُعاون ہوں۔ اس شرط سے ظاہر ہے کہ اس کو ماننے والے سلطنت ایران کے خیرخواہ نہ تھے۔ ہم پہلے بتلا چُکے ہیں کہ

مسیحیوں کو ایرانی سلطنت سخت ایذائیں دیتی تھی اور دے رہی تھی۔ پس ان مسیحیوں نے اسلامی افواج کا خیر مقدم کیا۔ اور خالد نے یہ معاہدہ لکھ دیا کہ مسیحیوں کے گرجے برباد نہ کئے جائیں گے۔ اُن کو سنکھ اور ناقوس بجانے سے نہ روکا جائیگا۔ اُن کی عیدوں اور تہواروں کے موقعہ پر اُن کو صلیبیں نکالنے سے نہ روکا جائیگا۔ بنو حیرہ کے مسیحیوں کی تعداد سات ہزار کے قریب تھی۔

یہاں یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی قیصر ہراکلس کا کلیساؤں پر ستم ڈھانے کا مقصد یہ تھا کہ مشرق و مغرب کے ممالک کی کلیساؤں کو راسخ الاعتقاد کلیسیا کے ماتحت کر کے سب کو ایک واحد کلیسیا بنا دے۔ چنانچہ یعقوبی مسیحی مؤرخ ابو الفرج (BAR HEBREWS) لکھتا ہے "جب ہمارے لوگ ہراکلس سے جا کر شکایت کرتے تھے تو وُہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ پس انتقام لینے والے خُدا نے ہم کو عربوں کے ذریعہ رُومیوں کے پنجہ سے رہائی دلوائی۔ اگرچہ عرب کی زیرِ حکومت ہم کو اپنے گرجے واپس نہ ملے لیکن ہر جگہ کی کلیسیا اپنے مقبُوضات کو سنبھالے رہی اور ہم کو رُومیوں کے ظلم و ستم سے چھٹکارا ملا"۔

علاوہ ازیں ہم بتلا چُکے ہیں کہ مُلک شام کے یعقوبی مسیحی اور شام کے ہمسایہ ممالک کے مسیحی سب عرب نژاد تھے اور وُہ مُسلمان عربوں کے خلاف نہ صرف دِل و جان سے نہیں لڑتے تھے بلکہ اُن کے ہمقوم ہونے کی وجہ سے اکثر دِل میں اُن کے طرفدار تھے۔ چنانچہ بلاذری نے جن فتوحات کا بیان لکھا ہے وُہ ظاہر کر دیتا ہے کہ مسیحی عرب ڈٹ کر مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ مثلاً حمص کا شہر بغیر کسی سخت جنگ کے اسلامی افواج کے ہاتھ آگیا۔ اس سے پہلے

سنہ ۱۴ھ میں دمشق اسلامی افواج کے ہاتھ آچکا تھا کیونکہ ایک مسیحی بشپ کا ہاتھ اُس کے سر ہو جانے میں تھا۔ اُس نے خالد سے کہا "اے ابو سلیمان۔ شہر کے متعلق میرے ساتھ سمجھوتہ کر لو خالد نے اُس کو یہ لکھ کر دے دیا:۔
"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خالد بن ولید کا خط اہلِ دمشق کے نام۔ جب اسلامی لشکر شہر میں داخل ہوگا تو ہم عیسائیوں کے جان و مال اور گرجاؤں کے محافظ ہوں گے۔ اُن کے شہر کی فصیل برباد نہ کی جائیگی۔ اُن کے گھروں پر قبضہ نہ کیا جائیگا۔ یہ اللہ اور اُس کے رسُول اور امیر المومنین کا اُن سے عہد ہے۔ اگر وُہ جزیہ ادا کرینگے تو اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا"۔ واقدی کہتا ہے کہ اُس نے یہ عہد نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ایڈیسہ مسیحیت کا مرکز تھا۔ البلاذری ہمیں بتاتا ہے کہ میسوپوتامیہ کے شہروں کے عیسائیوں سے حسب ذیل شرائط کی گئیں "جب عیاض بن غنم نے الروھا (ایڈیسہ) کو فتح کیا تو مسیحیوں نے کہا کہ ہمارے گرجاؤں اور عمارتوں کو منہدم نہ کیا جائے۔ ہم مسلمانوں کی مدد اُن کے دشمنوں کے خلاف کرینگے۔ پس عیاض نے ان لوگوں کی جان و مال کا ذمہ لیا اور کہا کہ جب تک وُہ جزیہ ادا کرتے رہینگے اُن کے گرجے مسمار نہیں کئے جائینگے اور نہ اُن پر قبضہ کیا جائیگا۔ وُہ کسی قسم کی سازش میں شریک نہ ہوں گے۔ یہ بھی شرط کی گئی کہ وُہ نئے گرجے نہ بنائیں گے۔ عبادت کے وقت وُہ علانیہ گھنٹے نہیں بجائینگے۔ عیدِ قیامت کی رسُوم کو علانیہ ادا نہیں کرینگے اور صلیبوں کو سرِ عام لے کر نہیں نکلینگے۔ اگر کوئی مسلمان راستہ بھول جائے تو وُہ اُس کے رہنما ہوں گے اور سڑکوں اور پلوں کی مرمت کیا کریں گے"۔ (فتوح البلدان)۔۔ آرمینیا کے شہروں کے مسیحیوں سے بھی یہی شرطیں کی گئیں۔ اور رقہ کو بھی انہی شرائط

پر فتح کیا گیا۔

ان شرائط میں سب سے عجیب شرط (جس کا اثر ہر اسلامی مُلک کی کلیسیا پر بعد کے زمانہ میں پڑا) یہ تھی کہ عیسائی کوئی نیا گرجا تعمیر نہ کریں گے۔ غالباً یہ شرط ابتداء میں صرف ایسے شہروں اور قصبوں پر ہی عائد کی گئی ہوگی جہاں گرجے بہت زیادہ تعداد میں موجود ہوں گے جو وہاں کے عیسائیوں نے اپنے جوشِ عقیدت کے اظہار کے لئے کوچہ کوچہ میں بنا رکھے ہوں گے۔ اس شرط کو طے کرتے وقت اُن قصبوں اور شہروں کے مسیحیوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ اُن خاص مقامات میں زیادہ گرجاؤں کے بنانے کی ضرُورت نہ پڑے گی۔ اُن کو کیا معلوم تھا کہ بعد کے زمانہ میں اِس شرط کو ایک نظیر بنا لیا جائیگا اور اس کو عام شرط قرار دے کر ہر اسلامی سلطنت اور ہر مُلک کے عیسائیوں پر عائد کر دیا جائیگا۔ اہلِ فقہ نے اِس خاص شرط کو عام بنا دیا۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کُتبِ فقہ مرتب کی گئیں اُس زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد اِس قدر کم ہوگئی تھی کہ نئے گرجے بنانے کی ضرُورت ہی نہ رہی تھی۔

مُلکِ شام کے باقی شہروں نے بھی دمشق کا وطیرہ اختیار کر لیا حمص، ارتھوسا، طرابلس اور دیگر مسیحی شہروں نے جزیہ دے کر عربوں کی متابعت اختیار کر لی۔

جب عمرو بن العاص نے ۱۶ھ میں یروشلیم کو فتح کر لیا تو خلیفہ عمرؓ نے یروشلیم کے اہالیان کو یہ نامہ دیا:۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وُہ عہد نامہ ہے جو خُدا کا بندہ اور امیر المومنین عمرؓ یروشلیم کے باشندوں کے ساتھ کرتا ہے۔ ہر ایک شخص خواہ وُہ توانا ہو یا بیمار اپنے مال و جان کی امان پائیگا مسیحیوں کے گرجے، اُن کی صلیبیں اور جو چیزیں اُن کے مذہب سے متعلق

ہیں محفوظ ہوں گی ۔ اُن کے گرجے انسانوں کی رہائش گاہ نہ بنائے جائینگے اور اُن کو تباہ نہ کیا جائیگا ۔ اُن گرجاؤں کی قدر کسی طرح بھی کم نہ کی جائیگی ۔ باشندوں کے گھروں کی صلیبیں اور اُن کے مال و جائداد محفوظ رہینگے ۔ کوئی شخص دین کے معاملہ میں مجبور نہ کیا جائیگا ۔ اُن میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائیگا ۔"

یروشلیم کے مالدار باشندوں پر پانچ دینار ، اوسط درجے کے لوگوں پر چار دینار اور غریب طبقہ پر تین دینار جزیہ لگایا گیا ۔ خلیفہ نے پیٹر یارک کے ساتھ مقدس مقامات کی زیارت کی ۔ کہتے ہیں کہ جب وہ کنیسۂ قیامتِ مسیح میں تھے تو نماز کا وقت ہوگیا ۔ پیٹر یارک نے خلیفہ کو گرجا کے اندر نماز ادا کرنے کی اجازت دی لیکن اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میں نے یہاں نماز ادا کی تو میرے بعد مسلمان اس گرجا کو مسجد بنا لیں گے ۔

خلیفہ عمرؓ نے یہ پابندیاں لگائیں : " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ فلاں فلاں شہر کے مسیحیوں کی طرف سے خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب کی جانب ۔ جب آپ نے ہم پر فوج کشی کی تھی تو ہم نے اپنی جانوں کے لئے ، اپنی اولاد اور اپنے مال کے لئے اور اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت کے لئے امان کی درخواست کی تھی ۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنے شہروں یا مضافات میں کوئی نیا گرجا یا نئی خانقاہ نہیں بنائینگے ۔ نہ ہم کوئی نیا صومعہ بنائینگے ۔ ہم کسی عمارت کو جو خراب ہو جائے مرمت نہیں کرینگے ۔ ہم اپنے گرجاؤں میں کسی مسلمان کو داخل ہونے سے نہیں روکینگے خواہ وُہ دن کے وقت آئیں یا رات کے وقت آئیں ۔ ہمارے گھروں کے دروازے مسافروں کے لئے کھلے رہینگے اور اُن کو تین دن اور تین رات اپنے ہاں رکھینگے اور کھلائینگے ۔ ہم کسی جاسوس کو اپنے گھروں اور گرجاؤں میں نہیں آنے دینگے اور نہ مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپائینگے

ہم اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھائینگے اور نہ اپنے مذہب کی رسوم کو اعلانیہ ادا کریں گے ۔ ہم کسی شخص کو اپنے مذہب کی جانب دعوت نہیں دیں گے ۔ اگر ہم میں سے کوئی اسلام کو اختیار کرنا چاہے تو ہم نہیں روکینگے ہم مسلمانوں کی عزت کرینگے اور اگر وُہ ہمارے جلسوں میں آ بیٹھیں تو ہم سب کھڑے رہا کرینگے ۔ ہم مسلمانوں کا سا لباس نہیں پہنیں گے ۔ نہ اُن کا سا عمامہ ، نہ ٹوپی ، نہ جوتا پہنیں گے ۔ ہم اپنے بالوں کو اُن کی طرح نہ سنواریں گے ۔ ہم اُن کی طرح ایک دوسرے کو سلام نہیں کرینگے ۔ اور نہ اُن کے سے نام رکھینگے ہم زین سواری نہیں کرینگے اور نہ تلواریں اور نہ اسلحہ لگائینگے اور نہ اُن کو رکھیں گے ۔ ہم اپنی مُہروں پر عربی کتبے نہیں کھدوائیں گے اور شراب فروخت نہیں کریں گے ۔ ہم اپنے سروں کو سامنے سے مونڈیں گے ۔ اور جہاں بھی ہوں ہم اپنا خصوصی لباس ہی پہنیں گے ۔ ہم اپنی کمروں میں زنار پہنینگے اور اپنے گرجاؤں پر صلیبیں نصب نہیں کریں گے ۔ ہم اپنی مقدس کتابیں مسلمانوں کے گلی کوچوں میں اور بازاروں میں نہیں دکھلائیں گے ۔ ہم گرجاؤں کے گھنٹے نہایت دھیمے بجائینگے ۔ اور اپنی جاذبیں ایسی اونچی آواز سے نہ کرینگے کہ وُہ کسی مسلمان کے کانوں میں پڑیں ۔ ہم نہ تو اپنی مورتیوں کو اور نہ کھجوروں کی ٹہنیوں کو جلوس میں لے کر کوچوں میں سے گذرینگے ۔ ہم مُردوں کے دفن کرنے کے وقت مسیحی گیت نہایت دھیمی آواز سے گائینگے اور ایسے اوقات میں موم بتیوں کو بازاروں میں اور مسلمانوں کے کوچوں میں لے کر نہیں گذرینگے ۔ ہم ایسے غلام نہیں رکھینگے جو کبھی کسی مسلمان کے غلام رہ چکے ہوں ۔ ہم کبھی مسلمان کے گھر میں نہیں جھانکیں گے اور نہ کسی مسلمان کو زدوکوب کرینگے ۔ ہم اپنی طرف سے اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ان شرائط کے پابند

رہینگے۔ ان تمام باتوں کے عوض ہم کو آپ کی طرف سے امان ملیگی۔ اگر ہم کسی بات میں وعدہ خلافی کریں تو ہم آپ کی حفاظت سے محروم ہو جائینگے اور آپ ہمارے ساتھ دشمنوں اور باغیوں کا سا سلوک کر سکتے ہیں۔

البلاذری (سال وفات ۹۲۳ء) ملک مصر کی قبطی کلیسیا کی نسبت لکھتا ہے کہ مصر کے بشپ نے عمرو بن العاص سے کہا کہ اگر تم ہم سے وہی عہد و پیمان کرو جو تم نے ملکِ شام کے مسیحیوں سے کیا ہے اور ہماری جائدادوں کو ہمارے ہی قبضہ میں رہنے دو تو ہم بھی تم کو جزیہ ادا کیا کرینگے اور زمین کا خراج ادا کیا کرینگے۔ پس عمرو نے ہر بالغ پر دو دینار جزیہ لگایا اور ہر زمیندار پر خراج لگایا اور کہا کہ جب تک تم ان شرطوں پر عمل کرتے رہوگے تمہاری عورتیں اور بچے غلام نہیں بنائے جائیں گے۔ وہ نہ فروخت کیے جائینگے اور نہ اُن کو قید کیا جائیگا۔ اور تمہارے جان و مال بھی محفوظ رہینگے۔ خلیفہ عمر نے اس عہد نامہ کی تصدیق کر دی اور مصر کا تمام ملک جزیہ اور خراج ادا کرنے لگ گیا۔

سلوکیہ کے پیٹریارک ییشو یحب دوم (از ۶۲۸ء تا ۶۴۳ء) نے پہلے حضرت محمد سے اور پھر خلیفہ عمر سے عہد نامہ کیا جس کی رو سے نسطوری کلیسیا اور یعقوبی مونوفزائٹ کلیسیا (جو مسیح خداوند کی وحدتِ ذات کی قائل تھی) کے ممبر ذمی قرار دیئے گئے اور اُن سے مذہبی آزادی کا عہد و پیمان کیا گیا۔

عدی قبیلہ طے کا سردار تھا طے کا قبیلہ مسیحی تھا۔ اُس نے اسلام قبول کر کے اپنی جان کی، اپنے خاندان اور قبیلہ کی امان پائی۔ دومۃ الجندل کے مسیحی بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یمن جیسی زبردست مسیحی حکومت

کا بادشاہ اور رعایا، سب نے اسلام قبول کر لیا۔ تدمور کے سردار نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ غنم کا گرجا مسمار کر دیا گیا۔ جب خالد نے عانات کو مطیع کیا تو وہاں کے بشپ کے ساتھ یہ شرطیں قرار پائیں کہ اُن کے گرجے برباد نہیں کئے جائیں گے۔ نماز کے وقتوں کے سوا وہ جب چاہیں دن اور رات کے وقت ناقوس بجا سکتے ہیں اور تمام تہواروں کے دنوں میں صلیبیں نکال سکتے ہیں۔

بنو تنوخ کے قبیلہ کی اکثریت مسیحی تھی۔ یہ مسیحی ۱۲ھ میں دیگر مسیحی قبائل کے ساتھ خالد بن ولید کے مطیع ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ تاہم اس قبیلہ کے بہتیرے افراد اپنے ایمان پر قائم رہے۔ بعد کے زمانہ میں جب خلیفہ مہدی (از ۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) نے سنا کہ وہ اب تک مسیحیت پر قائم ہیں تو اُس نے حکم دیا کہ اُن کو جبریہ مسلمان کر لیا جائے۔ تب پانچ ہزار اشخاص مسیحیت ترک کر کے مسلمان ہو گئے۔ لیکن خلیفہ کے احکام کے باوجود اس قبیلہ کے ایک شخص نے اپنے منجی کا انکار نہ کیا اور وہ شہید کر دیا گیا۔

ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں کہ ایران کے شہنشاہ مسیحی کلیسیاؤں پر ظلم و ستم کرتے تھے حتیٰ کہ اس سلطنت کا آخری شہنشاہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے وقت تک بھی مسیحیوں کو ایذائیں پہنچاتا تھا۔ پس عرب کے مسیحی قبائل ایران کے خیرخواہ نہیں تھے بلکہ اُن کے اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ بانیٔ اسلام نے ان میں سے بعض سے عہد نامے بھی کر لئے تھے۔ جیسا ہم سطورِ بالا میں بتلا چکے ہیں بعض مسیحی برضا و رغبتِ خود اسلامی فوج کی امداد کرتے تھے۔ وہ اسلامی حکومت کو ایرانی حکومت پر اور بازنطائن کی مسیحی حکومت پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ ایرانی حکومت اُن سے ظالمانہ سلوک کرتی تھی اور بازنطائنی حکومت

اُن کو ان کے بدعتی عقائد کی وجہ سے ایذائیں دیتی تھی۔ علاوہ ازیں قیصر ہراکلس نے اُن مسیحی قبائل کو جو سلطنت بازنطین کی سرحد کی صحرا پر رہتے تھے اور اس علاقہ کے نگہبان مقرر تھے اُن کو امدادی رقوم دینی بند کر دی تھیں۔ یہ قبائل تنگ آکر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے اور نئی حکومت کے وفادار تھے اور اپنی وفاداری کی وجہ سے اُن میں سے بہت لوگ ارتداد کی تحریک سے جو وفاتِ محمد کے بعد ہوئی بچ گئے۔ پھر یہ قبائل عرب کی فتوحات کو ایرانی اور رُومی فتوحات کے مقابل قومی فتوحات سمجھتے تھے۔ پس یہ مسیحی قبائل جو صدیوں سے مسیحیت پر قائم رہے تھے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

علاوہ ازیں جیسا آرنلڈ کہتا ہے عرب افواج کا حقیقی مقصد اسلام کے دین کو پھیلانا اور گمشدہ رُوحوں کو بچانا نہ تھا۔ وُہ فاقہ کشی اور اقتصادی تنگی میں مُبتلا تھے۔ مالِ غنیمت کی حرص نے اُن کی نگاہیں صحرائے عرب کی جانب سے ہٹا کر اُن ممالک کی طرف لگائیں جو متموّل تھے۔ اسلامی کلمہ نے اُن مختلف قبائل کو یکجا کر رکھا تھا اور مفتوحہ ممالک کی خوشحالی اور دولت اسلام کی اشاعت کا باعث ہوئی" (باب سوم)۔ پس فرات کے قرب و جوار کے بدو عرب زیادہ مدت تک مسیحیت پر قائم نہ رہ سکے۔ اور وُہ یکے بعد دیگرے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ چنانچہ قادسیہ کی فتح عظیم (۱۴ھ) کے بعد جب ایرانی فوج کو شکستِ فاش ہوئی تو بہت سے بدوی قبائل جو دریائے فرات کے دونوں کناروں پر آباد تھے اسلامی فوج کے جرنیل سعد کے پاس آئے اور کہنے لگے "جن قبائل نے ہم سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا وُہ ہم سے زیادہ دُور اندیش اور دانش مند ثابت ہوئے ہیں۔ اب جو رُستم (ایرانی فوج کا جرنیل) مقتول ہو چکا ہے ہم بھی اسلام قبول کر لیتے ہیں" مسلمان ہو کر

یہ قبائل اسلامی افواج میں شامل ہو گئے اور فتح پر فتح حاصل کر کے لُوٹ کے مال میں برابر کے حصّہ دار ہو گئے اور یُوں امیر ہو گئے اور ان کی دُنیاوی حالت بہتر ہو گئی۔ چُنانچہ اسلامی مؤرخ لکھتے ہیں کہ وُہ کہا کرتے تھے کہ "واللہ اگر ہم خُدا کی راہ میں جہاد کرنے کی خاطر نہ بھی جنگ کریں پھر بھی ہم ان نعمتوں کی خاطر جو ہم کو اب حاصل ہیں ضرور جنگ کیا کرینگے۔ اب ہم غریبی اور افلاس سے چھُٹ گئے ہیں اور بھوک اور تنگی کی جانب سے بے فکر ہو گئے ہیں"۔ یہ نو مسلم شجاع ہمیشہ جنگوں میں صفِ اوّل میں پائے جاتے تھے اور اسلامی افواج کے افسر بھی ہوتے تھے مثلاً جنگِ مرج الدیباج میں فوجِ اسلام کا کمانڈر یُونس تھا جو پہلے عیسائی تھا۔

یہ تو بدوی مسیحی قبائل کا حال تھا۔ لیکن جو مسیحی کلیسیائیں شہروں میں آباد تھیں اور عرب اور غیر عرب اقوام پر مشتمل تھیں، اُن میں اسلام اس قدر جلدی نہ پھیلا۔ سلطنتِ بازنطین کے مشرقی حصّہ کے مسیحی اسلامی فتوحات کے بعد بھی مسیحیت کے وفادار رہے اور اپنے دین پر قائم رہے اور اُن کی آل اولاد زمانۂ حال تک بھی مسیحیت پر قائم ہے۔ تاریخ ہم کو شمالی عرب کے مسیحی قبائل کے اسلام کے حلقہ بگوش ہو جانے کی نسبت بہت کچھ نہیں بتلاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسیحی قبائل اپنے ارد گرد کی بے شمار اسلامی آبادی میں جذب ہو گئے اور رفتہ رفتہ مختلف وجُوہ کے باعث دائرۂ اسلام میں آ گئے۔

جو قبائل مسیحیت کو ترک کر کے اسلام اختیار کر لیتے تھے، اُن کی تعلیم و تربیّت کا خاطر خواہ انتظام کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ہر مُلک اور قوم و قبیلہ میں ایسے اُستاد مقرر کر دیئے جو نو مسلموں کو قرآن پڑھاتے

اور نماز، روزہ وغیرہ کی تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ تمام قاضیوں کو حکم تھا کہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ تمام نو مُرید پانچوں وقت نماز پڑھیں۔ جُمعہ کی نماز ادا کریں اور روزہ پر زور دیں۔ اس تعلیم و تربیت پر اس قدر زور دیا جاتا تھا کہ کوئی بیت المال کا افسر جو معزز رُتبہ کا سمجھا جاتا تھا، اِس کام پر مقرر تھا۔

خلیفہ عُمرؓ نے حُکم دیا کہ عیسائی تاجروں سے پانچ فیصدی اور مسلمان تاجروں سے ۲½ فیصدی تجارت ٹیکس وصُول کیا جائے۔ جب ایران فتح ہو گیا تو وہاں کی کلیسیاؤں کے ساتھ عرب کے مسیحیوں کا سا جبر نہ کیا گیا۔ خلیفہ عُمرؓ کی افواج نے ایران کو تباہ اور برباد کر دیا۔ وہاں کی مسیحی کلیسیائیں سخت مصائب و آلام کا شکار ہو گئیں۔ عیسائیوں کی جائدادیں ضبط ہو گئیں۔ بے شمار مسیحی کلیسیائیوں سے زبرِ شمشیر اسلام کے حلقہ بگوش کر لئے گئے۔ بہتیرے شہید ہو گئے لیکن اُنہوں نے اپنے ایمان کا انکار نہ کیا۔ بہتیرے غیور مسیحی ہجرت کر کے غیر ممالک میں جا بسے۔

حضرت عُمرؓ نے مسیحی کلیسیاؤں پر جو پابندیاں عائد کیں اُن کا ہم نے سطُورِ بالا میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ یہ پابندیاں خلیفہ عُمرؓ کی حکومت کے سخت گیر اصُولِ جہانبانی کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ مرحُوم ایس۔ خُدا بخش لکھتے ہیں "عُمرؓ نے سخت احکام جاری کئے کہ اسلامی ناجیین اور غیر اسلامی ادیان بالخصوص مسیحی دین کے پیروؤں کے درمیان کوئی ایک بات بھی مُشترک ہونے نہ پائے۔ اسی خاص وجہ کے تحت اس نے تمام غیر مُسلم عربوں کو حُکم دیا کہ یا تو وُہ دینِ اسلام قبُول کر لیں اور یا وُہ مُلکِ عرب سے نکل جائیں جو پُشت در پُشت اُن کا آبائی وطن چلا آیا تھا۔ پس نجران کے جفاکش اور محنتی خُوشحال مسیحی جنہوں نے

اسلام کے جُوئے کو گوارا نہ کیا، وُہ اس حُکم کی رُو سے عرب سے نکال دیئے گئے۔ اُنہوں نے دریائے فرات کے کنارے کی سرزمین میں بُود و باش اختیار کر لی۔ . . . . عُمرؓ کے عہد میں مُلکِ شام اور دریائے آکسس تک ایران کا مُلک، اور ہندوستان کی سرحد اسلامی مقبُوضات میں شامل ہو گئے . . . . . . عیسائیوں کے لئے صرف دو راہ ہی کُھلے تھے، جن میں سے ایک کو اختیار کر کے وُہ غُلامی سے بچ سکتے تھے۔ یا تو وُہ اسلامی حکومت سے ہمیشہ برسرِ جنگ رہتے اور یا وُہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے لیکن ان کے لئے دقت یہ تھی کہ جب وُہ اسلام قبُول بھی کر لیتے تھے تب بھی اُن کو مُشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ گو اُن کو دیگر مُسلمانوں کے سے مدنی حقُوق حاصل ہو جاتے تھے پھر بھی اُن کو اپنی زمینوں اور جائدادوں سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا کیونکہ وُہ مُسلمانوں کے قبضہ میں آ جاتی تھیں جو اُن کے لئے صرف خراج ادا کیا کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۷۰ و ۱۶۱)۔

حضرت عُمرؓ کا عہد اسلامی نظامِ حکُومت کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ ایک تو یہ زمانہ طویل تھا اور دُوسرا اس زمانہ میں غیر عرب ممالک کی فتُوحات کی وجہ سے غیر مُسلموں کے ساتھ سلطنت اور رعیت کے تعلّقات قائم ہو گئے۔ اُن کے عہد میں غیر مُسلم رعایا اور بالخصُوص مسیحی کلیسیا کے جس قدر حقُوق قائم ہو سکتے تھے وُہ قائم ہو چکے تھے۔ خلیفہ عُمرؓ کی حکُومت، اسلامی حکومت کا نمُونہ اور بہترین تصویر شمار کی جاتی ہے اور بعد کے زمانہ کے بہترین مُسلم فرمانروا اس حکُومت پر اپنے اپنے قوانین ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عُمرؓ کی خلافت کے بعد مسیحیت عرب میں زندہ مذہب نہ رہی۔

حضرت عُمرؓ نے حُکم دیا کہ کوئی مُسلمان عرب غُلام نہیں ہو سکتا چونکہ غلامو

کے بغیر اسلامی ریاست کا کام چل نہیں سکتا تھا لہٰذا دیگر ممالک اور مذاہب کے افراد کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ یوں متعدد مسیحی جو مفتوحہ ممالک میں آزاد بستے تھے غلام بنا لئے گئے اور ان کی بہو بیٹیاں لونڈیاں اور کنیزیں بنائی گئیں۔ اور عرب کے مسلمان اُن کی تجارت کیا کرتے تھے مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ یہ تجارت بھی بڑھتی گئی۔ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں دی گئیں اور اُمرا اور سرداروں کو ہزار ہزار غلام اور لونڈیاں ملیں۔ چنانچہ خلیفہ عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ واقعہ ارک کے بعد تو لونڈی غلام اس کثرت سے تھے کہ وہ ایک ایک درہم کے عوض فروخت ہونے لگے۔ مسلمان فاتحین غلاموں اور کنیزوں کے اس قدر شوقین تھے کہ بربرا اور دیگر ذمی جزیہ کے عوض ان ہی کو پیش کیا کرتے تھے۔ ہر کنیز اپنے مالک کی مدخولہ اور داشتہ ہوتی تھی لیکن جو بچے ان لونڈیوں سے پیدا ہوتے تھے وہ آزاد شمار کئے جاتے تھے اور فروخت نہ ہو سکتے تھے۔ ان بچوں کا درجہ کسی دوسرے بچے سے کم تصور نہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں غلام بادشاہ تک ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں سلطنت دہلی کے ایام میں خاندان غلاماں کی حکومت رہی جس کا ہم آگے چل کر ذکر کرینگے۔ حق تو یہ ہے کہ کسی اسلامی ملک کی رعایا بھی غلام بادشاہوں کی رعیت ہوتا معیوب خیال نہ کرتی تھی۔

(۲)

خلیفہ عمر کے زمانہ میں مصر کی فتح (۲۰ھ = ۶۴۲ء) نے حکمت و فلسفہ اور دیگر علوم کا دروازہ مسلمانوں پر کھول دیا اور مسلمان یونانی فلسفہ سے متعارف ہوئے جس کا پھل خلافتِ عہدِ عباسیہ میں پوری طرح نظر

آیا جس کا ہم آگے چل کر ذکر کرینگے۔ بعض اسلامی مصنفین کہتے ہیں کہ جو لوگ عمرو بن العاص کو مصر کی فتح کی مبارک باد دینے آئے تھے ان میں مشہور مسیحی فلاسفر یوحنا النحوی بھی تھا۔ یہ شخص نہایت زبردست پایہ کا عالم تھا۔ تثلیث کا منکر ہونے کی وجہ سے وہ کیلسیڈن کی کونسل (۴۵۱ء) میں کلیسیا سے خارج کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اسلامی مصنف ابن القفطی لکھتا ہے:۔

"یحییٰ النحوی عمرو بن العاص کی فتح مصر و اسکندریہ تک زندہ تھا۔ وہ اس کے پاس آیا۔ جب عمرو کو اس کے علمی مرتبہ اور مسیحی معتقدات کا پتہ چلا اور اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کو نصاریٰ کے ہاتھوں کیا کیا تکالیف پہنچی ہیں تو اُس نے اُس کی عزت و تکریم کی اور اُسے اونچا درجہ دیا۔ عمرو نے ابطالِ تثلیث میں اُس کی تقریر سُنی جو اُس کو بہت پسند آئی۔ اُس نے "انقضائے دہر" کے مسئلہ پر اُس کا کلام سُنا اور اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ اُس نے اُس کے منطقی دلائل کو دیکھا اور ایسی فلسفیانہ اصطلاحیں سُنیں جن کو اہل عرب جانتے بھی نہ تھے۔ چونکہ عمرو بن العاص مردِ عاقل اور دوسروں کی باتوں پر غور و فکر کرنے والا تھا اُس نے یحییٰ کو اپنے پاس رکھ لیا اور اُس کی جدائی کسی وقت بھی اُس کو گوارا نہ تھی" (اخبار العلما باخبار الحکما صفحہ ۲۳۲)۔

لیکن یحییٰ کی عمرو سے ملاقات ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ ابن ابی صیبعہ لکھتا ہے "میں نے نصاریٰ کی بعض کتبِ تواریخ میں دیکھا ہے کہ یحییٰ النحوی کا معاملہ چوتھی کونسل میں پیش ہوا تھا جو شہر خلقدونیہ میں منعقد ہوئی تھی جب پادریوں نے اُس کو کلیسیا سے خارج کر دیا تھا" کیلسیڈونیہ کی کونسل ۴۵۱ء میں ہوئی تھی۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس کونسل کے انعقاد

کے وقت یحییٰ کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی تو فتح مصر کے وقت وُہ سوا دو سو سال سے اُوپر کا ہوگا! بعض مُسلمان مصنفوں نے نواس کو خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کے عہد میں بھی زندہ بتلایا ہے۔ چنانچہ بیہقی صوان الحکمہ میں لکھتا ہے "یحییٰ النحوی جو بطریق کے لقب سے مُلقب تھا اور دیلم کی طرف منسوب تھا ایک نصرانی فلسفی تھا۔ اُسے امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے عامل نے فارس سے نکالنا چاہا اور اُس کی خانقاہ کو تباہ کرنا چاہا۔ یحییٰ نے اس بات کی بابت علی کو لکھا اور اُس سے امان چاہی۔ پس اُس کے حکم سے محمد بن الحنفیہ نے اُس کے لئے امان نامہ لکھا جس کی نقل میں نے طوس کے نصرانی حکیم ابی الفتوح مستوفی کے ہاتھوں میں دیکھی تھی"۔ اگر یہ بیان درست ہے تو یحییٰ کی عمر ڈھائی سو سال سے بھی زائد ہو جاتی ہے!!

یحییٰ نحوی نے ارسطو کی کتاب فزکس (PHYSICS) کا ترجمہ اور اس کی تفسیر ۵۲۹ء میں لکھی تھی۔ یعنی اُس کی عمر ایک سو بیس سال سے زائد تھی اور یہ زیادہ قرینِ عقل ہے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس حساب سے وُہ قبل از اسلام فوت ہو گیا ہوگا۔

ابن القفطی نہ صرف یہ بیان کرتا ہے کہ یحییٰ النحوی حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کی صحبت میں رہتا تھا بلکہ وُہ سکندریہ کے کتب خانہ کا قصہ یُوں بتلاتا ہے "ایک روز یحییٰ النحوی نے عمرو کو کہا۔ آپ نے تمام سکندریہ پر پہرہ بٹھا دیا ہے اور سب قسم کی چیزوں پر مُہر لگا دی ہے۔ ہم آپ سے اس چیز کی بابت جو آپ کے فائدہ کی ہے کچھ نہیں کہتے لیکن جو چیز آپ کے کام کی نہیں ہے وُہ آپ سے مانگتے ہیں۔ آپ اس پر سے پہرہ اُٹھا دیں۔ عمرو نے پوچھا کہ وُہ کیا چیز ہے جس کی تم کو ضرورت ہے۔ یحییٰ نے جواب دیا کہ آپ نے شاہی کتب خانہ

کی حکمت و فلسفہ کی کتابوں پر مُہر لگا رکھی ہے اور ہم کو ان کتابوں کی ضرورت ہے جو آپ کے لئے بیکار ہیں۔ عمرو نے پوچھا کہ ان کتابوں کو کس نے جمع کیا۔ اور ان کا کیا قصہ ہے؟ اس پر یحییٰ نے بتلایا کہ ان کو بطلیموس فیلاڈلفیوس نے جمع کیا تھا اور بعد کے زمانہ میں اس کتب خانہ میں ہمیشہ اضافے ہوتے رہے ہیں۔ ابن القفطی لکھتا ہے کہ یہ بات سُن کر "عمرو نے کہا کہ میرے لئے اس معاملہ میں حکم جاری کرنا ممکن نہیں لیکن امیر المومنین عمر سے اجازت لینی ہوگی۔ پس اُس نے عمر کو لکھا اور یحییٰ کی باتیں بتلا کر اُس سے ہدایت طلب کی۔ امیر المومنین عمر نے لکھا کہ وُہ کتابیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر ان کا مضمون کتاب اللہ (قرآن) کے موافق ہے تو ہم کو ان کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے لیکن اگر ان میں کتاب اللہ کے خلاف لکھا ہے تو بھی ہم کو اُن کی ضرورت نہیں۔ ان کو بہر حال برباد کر دو۔ پس عمرو بن العاص نے ان کتابوں کو سکندریہ کے حماموں میں تقسیم کر دیا اور حماموں کی بھٹیوں میں جلوا دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چھ ماہ تک یہ کتابیں جلتی رہیں۔ پس اس واقعہ کو سُنو اور تعجب کرو" (اخبار العلما باخبار الحکما صفحہ ۲۳۳)۔

حضرت عمر کے اس جواب سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلیفہ عمر کے زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرآن کے وجود میں آنے سے دُنیا کی تمام کتابیں زائد اور فضول ہو گئی ہیں اور جو کتابیں اس کے خلاف ہیں وُہ خطرناک ہیں اور فضول ہیں۔ موجودہ زمانہ کے متعدد علما اس قصہ کو ایک بے سرو پا افسانہ بتلاتے ہیں۔ چنانچہ برٹرنڈ رسل کہتا ہے "حقیقت امر یہ ہے کہ کتب خانہ سکندریہ کئی مرتبہ تباہ ہُوا اور کئی مرتبہ از سرِ نو قائم کیا گیا۔ اس کو سب سے پہلے رُومی فاتح قیصر جولیس سیزر نے تباہ کیا تھا اور آخری

مرتبہ پیغمبرِ اسلام کے زمانہ سے پہلے برباد کیا گیا تھا" (نگار جون ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۰)۔ بہرحال یحییٰ النحوی کا اس واقعہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا خلافتِ راشدہ تک زندہ رہنا بعید از قیاس ہے کیونکہ اگر وُہ رسُولِ عربی کی پیدائش تک بھی زندہ رہا ہو تب بھی وُہ اُس وقت ایک سَو ساٹھ ۱۶۰ سال کے لگ بھگ ہوگا۔

خلیفہ عثمان (از ۶۴۳ء تا ۶۵۶ء):۔

خلیفہ عُمر کی شہادت کے بعد حضرت عثمان خلیفہ ہُوئے اور اُن کی شہادت کے بعد حضرت علی پانچ سال تک خلیفہ رہے۔ تاریخ اسلام کا وُہ زمانہ جو خلافتِ عثمان سے شروع ہو کر شہادتِ حسین پر ختم ہوتا ہے فتنۂ عظیم کا دَور کہلاتا ہے۔

حضرت عثمان کے عہد میں ایران فتح ہوگیا۔ عرب کی افواج نے ایران پر قبضہ کرتے ہی دینِ زرتشت کو پامال کر دیا۔ خُدا کی قُدرت جس مذہب نے صدیوں تک مسیحیت کے لئے ستمرانی روا رکھی تھی وُہ اب خود اسلام کے زیر ہو کر تباہ حال ہوگیا۔ اس کے پیرو مجبُور ہو گئے کہ یا وُہ اسلام قبُول کریں یا جزیہ دیں۔ جن ایرانیوں نے دونوں باتیں قبُول نہ کیں وُہ اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان میں سے بعض ہمارے مُلک ہندوستان میں آکر پناہ گزین ہوگئے۔ موجُودہ دَور کے "پارسی" انہی زرتشتیوں کی اولاد ہیں۔

مسیحیوں نے ان جنگوں میں اسلام کے خلاف ایرانیوں کی مدد نہ کی۔ وُہ سمجھتے تھے کہ خُدا نے اُس ظلم وستم کا بدلہ لیا ہے جو ایرانی سلطنت نے صدیوں تک کلیسیاؤں پر کیا تھا۔ ان کلیسیاؤں نے اسلامی افواج کا خیر مقدم کیا۔ عرب افواج نے بھی عیسائیوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ ایک عرب شاہزادے

سعید نجرانی نے جو مسیحی تھا خلیفہ سے اُن کے لئے سفارش کی جس کی وجہ سے بھی ایرانی کلیسیاؤں پر زیادتیاں نہ ہُوئیں۔

خلیفہ عثمان ایک دولتمند اور صاحبِ حیثیت شخص تھے جن کی زندگی راحت وآرام میں بسر ہُوتی تھی۔ مؤرخ مسعُودی کے بیان کے مطابق ان کے ذاتی خزانہ میں پندرہ ہزار دینار اور دس لاکھ درہم نقد موجُود تھے اور وادی القریٰ اور حنین وغیرہ میں اُن کی جائداد ایک لاکھ سے کم نہ تھی۔ اس کے علاوہ اُونٹوں اور گھوڑوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ لیکن ابوبکر اور عُمر جیسے خلفا کے بعد ایک ایسے خلیفہ کی ضرُورت تھی جو بڑی سُوجھ بُوجھ، سیاست، حزم وثبات اور جفاکشی کا مالک ہوتا۔ لیکن عثمان خلیفہ عُمر کے سے جفاکش نہ تھے اور اُن کی طرح عمال کی نگرانی میں سخت محاسبہ سے بھی کام نہیں لیتے تھے۔ اس سے بنی اُمیّہ نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ یعقوبی کا بیان ہے کہ جب ۲۷ھ میں افریقیہ کا مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو اس میں دیگر بے شمار اشیا کے علاوہ پچیس لاکھ نقد دینار تھے جس کا پانچواں حصّہ بیت المال میں جمع ہونا چاہئے تھا لیکن عثمان نے یہ رقم مروان بن الحکم کو دے کر اپنی بیٹی کا اُس سے نکاح کر دیا۔ افراطِ دَولت کے سبب اُمرا کا طبقہ پیدا ہوگیا۔ ہر جا شیش محلات بن گئے۔ نغمہ وسرود کی طرف عرب کا میلان ہوگیا۔ خوبصُورت کنیزیں گرد وپیش رہنے لگیں۔ جاگیرداری کا بول بالا ہوگیا۔ گورنر اپنے علاقوں میں نیم خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں معاویہ، طلحہ، زبیر اور مروان بن الحکم جیسی بزرگ ہستیاں شامل تھیں۔ ان حالات میں ایک ایسے عاقبت اندیش خلیفہ کی ضرُورت تھی جو عربوں میں نئے دَورِ عسکریت کو کامیاب بنا سکتا اور اسلام کے اس نازک ابتدائی دَور میں فہم وفراست سے کام لے کر

مسلمانوں کی صحیح رہبری کر سکتا۔ چھاؤنیوں اور فوجیوں کی تنظیم وغیرہ کی جانب توجہ کرتا۔ جبری و تعدی اور دولت کی افزونی کی برائیوں کو سختی سے روکتا اور بڑھتی ہوئی جماعتِ مومنین اور عرب کے دوبارہ جاگتے ہوئے قدیم رقابت کے جذبوں کو سختی سے دباتا۔ یہ بڑے اور اہم کام تھے جن کے لئے فراست۔ بلند نظری۔ وسعتِ خیال اور دور اندیشی کی ضرورت تھی۔ لیکن خلیفہ عثمان بڑھتے ہوئے خراب حالات کو سنبھال نہ سکے۔

اسی زمانہ میں عثمان نے قرآن میں اختلافِ قرأت کے باعث مصحفِ عثمانی (موجودہ قرآن) تیار کروایا اور پھر دیگر قرآنی نسخوں کو جلوا دیا۔ اس واقعہ نے نہ صرف جماعتِ قراء کو برہم کر دیا بلکہ عمار بن یاسر۔ ابوذر۔ عبداللہ بن مسعود جیسے ذی شان صحابۂ رسول کو ناراض کر دیا۔ قرآنی نسخوں کو آگ میں جلا دینے سے عوام بھی بھڑک اٹھے۔ علاوہ ازیں عثمان کے مشیر بھی نااہل ثابت ہوئے۔ پس ۳۰ھ اور ۳۳ھ میں عراق کے اندر قراء کی جماعت (جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی تھی) نے سر اٹھایا۔ کوفہ سے خلافت کا اقتدار جاتا رہا۔ مصر میں بے چینی پھیل گئی۔ مخالفت بڑھتی گئی اور باغی مدینہ کی طرف بڑھے اور حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔

حضرت علی بن ابی طالب (از ۶۵۶ء تا ۶۶۱ء)

حضرت علی ۲۵- ذی الحجہ ۳۵ھ (۲۴- جون ۶۵۶ء) کو منصبِ خلافت پر فائز ہوئے۔ ان کا عہدِ خلافت خانہ جنگی میں گزرا۔ بالفاظ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ "اس دور میں تلوار اہلِ قبلہ ہی میں آپس میں چلتی رہی"۔ جنگِ جمل میں حضرت عائشہ اور جنگِ صفین میں معاویہ اور صحابۂ رسول اور دیگر جید

مسلمان آپ کے خلاف تھے۔ جنگِ صفین کی واپسی کے بعد علی اپنی ہی پارٹی کے ایک گروہ (خوارج) سے قتل و قتال میں الجھ گئے۔ تاآنکہ ایک خارجی ابنِ ملجم نے زہر آلود خنجر سے ان کو ہلاک کر دیا۔

باہمی جنگ و جدال کی وجہ سے علی کے زمانہ میں نہ کوئی جہاد ہوا اور نہ کوئی ملک اور شہر فتح ہوا۔ لیکن وہ ارتداد کا انسداد کرتے رہے۔ چنانچہ فتح الباری اور عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ انہوں نے زنادقہ کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ قبیلہ بنو تغلب کے مسیحی اپنے بچوں کو نہ تو بپتسمہ دیں اور نہ ان کی مسیحی تعلیم و تربیت کریں لیکن بنو تغلب نے اس نرالی شرط کو نظر انداز کر دیا اور جرأت سے کام لے کر وہ اپنے بچوں کو بپتسمہ دیتے رہے اور ان کو مسیحی عقائد سکھلاتے رہے۔ حضرتِ علی کو یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ مغیرہ کہتا ہے کہ علی کہتے تھے کہ مجھے فرصت مل لینے دو میں بنو تغلب کے بالغوں کو قتل کر دوں گا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر دوں گا لیکن وہ خود قتل ہو گئے اور بنو تغلب اپنے بچوں کو بپتسمہ دلواتے اور انجیل سکھلاتے رہے۔

خلافتِ راشدہ قریباً تیس سال تک قائم رہی۔ اس دور میں عرب کے ملک میں مسیحی مذہب ختم ہو گیا۔ لیکن باوجود خلفائے راشدین کی سختیوں اور پابندیوں کے مجموعی طور پر عرب کے باہر کی مسیحی کلیسیائیں خلفا کی حکومت کو ساسانیوں اور قیاصرہ کی حکومتوں پر ترجیح دیتی تھیں۔ کیونکہ قرآن عام طور پر عیسائیوں کا اور خداوندِ مسیح کا مدح خواں تھا۔ اور خلفا نے نسطوری پیٹریارکوں کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ چنانچہ پیٹریارک عیشو یحیب سوم (از ۶۶۰ء تا ۶۴۷ء) صوبۂ فارس کے ریو دشیر کے بشپ کو لکھتا

ہے" عرب مسیحی مذہب پر حملے نہیں کرتے بلکہ ہمارے مقدس مذہب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ہمارے مقدسوں اور قسیسوں کی عزت کرتے ہیں"۔

فصل دوم ۔ خلافتِ بنی اُمیّہ کا زمانہ

(از ۴۱ھ تا ۱۳۲ھ مطابق ۶۶۱ء تا ۷۵۰ء)

جن اصحاب نے میری کتاب محمد عربی پڑھی ہے اُن کو یاد ہوگا کہ قبل از اسلام مکہ کے قبائل قریش اور بنو ہاشم میں جذبۂ رقابت اور اختلاف چلا آتا تھا۔ ابوسفیان جو قریش کا سردار تھا بانی اسلام کا جو بنو ہاشم میں سے تھے دشمن تھا۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو قریش (بنو اُمیّہ) نے بر بنائے مجبوری اسلام اختیار کرلیا۔ اور یوں وفاتِ نبی سے دو سال پہلے ۸ھ میں ابوسفیان اور اُس کا بیٹا معاویہ داخل اسلام ہوکر "مولفۃ القلوب" میں شمار ہوئے۔ (سیوطی الکمال فی اسماء الرجال)۔ ہاشمی اور قریشی کی تفریق مٹانے کے لئے جہادوں میں اُن کو شریک کرلیا گیا۔ لیکن آنحضرت کی وفات کے بعد یہ قدیمی رقابت پھر اُٹھی۔ چنانچہ جب ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان علی کے پاس آیا اور کہا اگر تم کہو تو میں تمہاری مدد کے لئے مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔ مگر حضرت علی اُمتِ محمدیہ میں تفرقہ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اُنہوں نے ابوسفیان کو ڈانٹا۔ جب مُلکِ شام فتح ہوا تو یزید بن ابوسفیان کو وہاں کا گورنر بنا دیا گیا اور جب وہ مرگیا تو حضرت عثمان نے اُس کے بھائی معاویہ کو گورنر مقرر کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کو قبل اسلام کا سا اقتدار

پھر حاصل ہوگیا اور بنو ہاشم صرف زُہد و تقوےٰ اور نبوّت کے امانت دار ہی رہ گئے۔

عثمان خاندانِ بنی اُمیّہ میں سے تھے جنہوں نے تمام بڑے مُلکی عُہدے بنی اُمیّہ کو دے دیئے۔ اس کے عہد میں معاویہ شام کا گویا مستقل فرمانروا ہوگیا۔ حضرت علی نے اُس کو معزول کردیا۔ اِس پر معاویہ نے قدیم قبائلی عصبیت کو جگا دیا جس کا نتیجہ جنگِ صفین ہوئی جو ذی الحجہ ۳۶ھ سے صفر ۳۷ھ تک جاری رہی۔ اس کے بعد صُلح ہوگئی لیکن معاویہ علی کی پریشانیوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتا رہا۔ علی کے بعد اُس نے اُن کے بیٹے امام حسن سے سمجھوتہ کرلیا اور اب وہ ۲۰ سال کی ولایت کے بعد خلیفہ یا امیر منتخب ہوگیا اور بیس سال تک سلطنت کرتا رہا۔ وہ خود نہایت زبردست مدبّر اور سیاست دان تھا اور عرب کے تمام نامور دماغ اِس کے مشیر تھے جن میں عمرو بن العاص فاتح مصر اور مغیرہ بن شعبہ والیٔ کوفہ تھے۔ یہ وہی مغیرہ ہے جس نے معاویہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنالے۔ پس معاویہ کے وقت سے خلافت موروثی ہوگئی اور خلفائے راشدین کے بعد شخصی حکومت شروع ہوگئی۔ اس کی تائید میں کثیر روایات موضوع کی گئیں۔ اُس وقت سے آج تک جہاں جہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی وہ شخصی اختیارات اور مطلق العنانی کے اصُول پر قائم ہوئی جس کا لازمی خاصہ یہ تھا کہ فرمانروائے وقت کسی عام مُلکی قانون کا پابند نہ تھا۔ شریعت کے مسلّمہ اصُول بھی اُس کی ذاتی خواہشوں کے مطابق ڈھالے جاتے رہے۔ احادیث اُن کی مزاج کے مطابق موضوع کی جاتی رہیں۔ ان باتوں کا اثر قدرتاً مسیحیت کے مستقبل اور مسیحی کلیسیاؤں کی تاریخ پر پڑا۔ خلیفۂ وقت یا امیر کے نائب

سلطنت اور عمال بھی اپنے اپنے اختیارات کی حدود تک قریب قریب خود مختار حاکم وقت ہوتے تھے اور اس کا اثر ہر مملکت کے صوبوں اور شہروں کی کلیسیاؤں پر بعد کے زمانہ میں پڑا۔

(۲)

امیر معاویہ خاندانِ بنی اُمیّہ کا مؤسس تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنے لئے بادشاہ کا خطاب تجویز کیا (ملاحظہ ہو الیعقوبی جلد دوم صفحہ ۲۰۶)۔ چنانچہ سعد ابن مصعب نے کہا "وہ اوّل شخص تھا جس نے مومنین کی حکومت کو سلطنت میں تبدیل کر دیا"۔ "یوں بنی اُمیّہ نے اسلام کو مذہب کے درجہ سے گرا کر حربیت کے درجہ پر کر دیا اور پھر خالص سلطنت کے درجہ پر کر دیا" شبلی مرحوم لکھتے ہیں "حدیث کی تدوین بنو اُمیّہ کے زمانہ میں ہوئی ... سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔ (سیرۃ النبی حصہ اوّل صفحہ ۶۱)

امیر معاویہ نے نہ صرف اسلام کی تاریخ میں پہلی دفعہ خلافت کو تلوار سے حاصل کر کے اس کو اپنی اولاد میں منتقل کر دیا اور اس غرض کے لئے بیت المال کو لٹا دیا بلکہ اُس نے بیت المال کے مقصد کو بھی بدل دیا۔ جو پہلے مسلمانوں کا مال تھا اب وہ خلیفہ کا ذاتی مال ہو گیا اور معاویہ اپنی مقصد براری کے لئے جس طرح چاہتا خرچ کرتا۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو اُس نے کڑک کر جواب دیا۔ "زمین خدا کی ہے۔ میں اُس کا نائب ہوں۔ جو کچھ ہے وہ میرا ہے اور یہ میری مہربانی ہے کہ میں اس میں سے لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں"۔ معاویہ سے پہلے کوئی خلیفہ یا گورنر مقررہ رقم سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں لے سکتا تھا۔

اس بے جا فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہ اور اُس کے جانشینوں

کو ہمیشہ روپیہ کی اشد ضرورت رہتی تھی۔ پس وہ گورنروں کو حکم لکھ بھیجتا تھا کہ جس قدر زیادہ سے زیادہ روپیہ وہ بھیج سکیں، بھیج دیا کریں اور وہ اس حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے کیونکہ وہ نہ صرف اس طریقہ سے امیر کو خوش رکھتے تھے بلکہ وہ خود بھی بغیر کسی خوف و خطر کے لُوٹ مار اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتے تھے جو اب بنی اُمیّہ کی معاشرت کا بڑا جزو بن گئی تھی۔

جُوں جُوں وہ اقوام فتح ہوتی گئیں جن کی اکثریت مسیحی مذہب رکھتی تھی تُوں تُوں اسلام کا حلقہ وسیع اور مسیحیت کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ اب اسلام سلطنت کا شاہی مذہب تھا۔ جو مسیحی زمیندار تھے وہ اسلام قبول کر کے جزیہ اور دیگر پابندیوں سے رہائی حاصل کر لیتے تھے۔ بنی اُمیّہ کی فتوحات کے زمانہ میں مسیحی جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ اس کا اثر قدرتاً جزیہ اور خراج کی رقوم پر پڑا۔ چنانچہ مصر کے فاتح عمرو بن العاص کے زمانہ میں ایک کروڑ بیس لاکھ خراج تھا جو اُس کے ظالم جانشینوں کے زمانہ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ ہو گیا۔ لیکن معاویہ کے زمانہ میں یہ خراج صرف پچاس لاکھ رہ گیا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں چالیس لاکھ اور اس کے بعد تیس لاکھ رہ گیا۔ عراق کا خراج خلیفہ عمرؓ کے زمانہ میں دس کروڑ تھا لیکن اس کے پچاس سال بعد عبدالملک کے زمانہ میں صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ رہ گیا۔ اس مالی حالت کو دیکھ کر عراق کے گورنر حجاج نے حکم دے دیا کہ کوئی شخص اپنے گاؤں اور اپنی زمین کو نہ چھوڑے اور جو چھوڑ گئے تھے، اُن کو واپس اپنی زمینوں پر جبراً بھیج دیا گیا اور اُن کے ہاتھوں پر اُن کے ضلعوں کے نام جلتے ہوئے لوہے سے داغ دیئے گئے۔ جو مسیحی مسلمان ہو گئے تھے، اُن سے جزیہ بھی وصول کیا جانے لگا اور جن زمینوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا اُن کا بھی

خراج اُن کو ادا کرنا پڑا۔

چونکہ عیسائی جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور اس سے جزیہ کی رقم پر بُرا اثر پڑتا تھا، لہٰذا یہ فرمانروا اُن کی تبدیلیِ مذہب سے بہت خوش نہ تھے۔ پس ایسے احکام بھی صادر کئے گئے کہ جب مسیحی مسلمان ہو جائیں تو اُن کی جائدادیں ضبط کر لی جائیں اور وہ اپنی غیر منقولہ جائدادوں کے ہی مالک رہیں۔

(۳)

جب معاویہ عالمِ اسلامی کا باضابطہ خلیفہ قرار پایا تو مستقرِ خلافت کوفہ سے دمشق میں منتقل ہو گیا۔ دمشق پہلے شامی بازنطینی مسیحی تہذیب کا مرکز اور دنیائے مسیحیت کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ بنی اُمیّہ کے خلفا نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ اپنی سلطنت کی انتظامیہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مسیحیوں کو بڑے اور چھوٹے انتظامی عہدوں پر مقرر کریں کیونکہ وہ اس علاقہ کے نظم و حکومت کا طویل تجربہ رکھتے تھے۔ یہ اُن کے اصولِ جہانبانی کی وجہ سے تھا۔ ایران میں اُنہوں نے مجوسی عملہ کو برقرار رکھا اور اسی اصول پر چل کر اُنہوں نے دیوانِ خراج پر مسیحی عہدہ دار مقرر کئے۔ بعض علمائے مغرب اس بات کی بنا پر سمجھ بیٹھے ہیں کہ اُموی خلفا مسیحیت سے رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ مثلاً مشہور مستشرق فان کریمر لکھتا ہے "اکثر اموی خلفا نے عیش و عشرت کے شغل کی وجہ سے عیسائیوں اور دیگر غیر مسلم اقوام سے بہت رواداری برتی۔ نہ صرف عیسائیوں کو خلفا کے دربار میں آزادی کے ساتھ داخلہ کی اجازت تھی بلکہ اُن کو اکثر اہم ترین ذمہ داری کے عہدے دیئے جاتے تھے . . . . دربار کا ملک الشعرا عیسائی تھا۔ عیسائی کی حالت ایسی اچھی تھی کہ اُن کو مسجدوں میں بے روک ٹوک جانے کی

اور عام مجمعوں میں طلائی صلیب لگا کر چلنے پھرنے کی اجازت تھی"[1]۔ نکلسن بھی لکھتا ہے "عیسائیوں کو اُموی خلفا کے دربار میں آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کی اجازت تھی۔ عیسائی شاعر اخطل دربار کا ملک الشعرا تھا۔ اُس کے بہت سے ہم مذہب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے"[2]۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ امیر معاویہ سے پہلے نظامِ حکومت سیدھا سادہ تھا جس کو چلانے کے لئے کسی خاص فنی مہارت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن معاویہ کے زمانہ سے سلطنت کی وسعت کی وجہ سے پیچیدگیاں شروع ہو گئیں۔ اس وجہ سے بنی اُمیّہ کے خلفا کو ایک ایسے طبقہ کی ضرورت پڑی جو رُومی قیاصرہ کے زمانہ میں اُن کے انتظامی امُور کو چلاتا تھا یعنی دیوانِ خراج کے عملہ کا طبقہ جو عیسائیوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ امیر معاویہ نے ابن اثال مسیحی کو شہر حمص کے خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔ (ابن واضح یعقوبی)۔ خلفا کے علاوہ ان کے اُمرا کے ہاں بھی عیسائی خراج کے کام پر مامور ہوتے تھے، کیونکہ اُن کے لئے بھی یہ ایک انتظامی ضرورت تھی۔ مسلمان فاتحین کی یہ پالیسی تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے معاشرتی اور انتظامی معاملات میں تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایران کے دیوانِ خراج کی فارسی زبان کو برقرار رہنے دیا اور اس کی تنظیم کے لئے مجوسیوں کو ملازم رکھا۔ جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو اُس نے بدستورِ سابق مالی انتظام کو ہندوؤں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ پس عیسائیوں کو دیوانِ خراج

1. VON KREMERS, CONTRIBUTION TO THE HISTORY OF ISLAMIC CIVILIZATION P. 59

2. NICHOLSON, LITERARY HISTORY OF THE ARABS P. 221

دیوانِ خراج کا منتظمِ اعلیٰ رہا۔ مروان کے بعد اُس کا بیٹا عبدالملک عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر عالمِ اسلام کا خلیفہ ہُوا اور اُس نے بھی سرجیئس کو اس عہدہ پر برقرار رکھا۔ باپ کی وفات کے بعد مقدس یوحنا اسی عہدے پر سرفراز رہے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ رُومی قیصر مقدس یوحنا کی تصنیفات اور خیالات سے ایسا برافروختہ ہُوا کہ اُس نے ایک جعلی خط کسی کے ہاتھ خلیفہ تک پہنچا دیا جس میں لکھا تھا کہ اگر قیصر تیود مشق پر حملہ کر دے تو مَیں (یوحنا) شہر کو آپ کے حوالے کر دُونگا۔ خلیفہ اس جعلی خط کو پا کر غضبناک ہوگیا اور اُس نے یوحنا کو ملازمت سے الگ کر دیا لیکن جب وُہ اصل حالات سے واقف ہُوا تو اُس نے مقدس یوحنا کو بحال کرنا چاہا لیکن اب مقدس یوحنا تارک الدُّنیا ہو کر خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مقدس یوحنا کے باپ کا مختلف مزاجوں کے چار خلفا کے زمانہ میں اپنے عہدہ پر برقرار رہنا ثابت کرتا ہے کہ عہدہ کی اصل وجہ ملک کی انتظامی ضرورت تھی نہ کہ خلفا کی رواداری یا پسندیدگی۔ چنانچہ جب عبدالملک (از ۶۸۵ء تا ۷۰۵ء مطابق ۶۵ھ تا ۸۶ھ) نے دیوان خراج کے تمام حسابات کو عربی زبان میں منتقل کر دیا تو اُس محکمہ کے لئے مسیحی ملازموں کی ضرورت نہ رہی اور اس کے بعد مسیحیوں کا ملازم رکھنا بند ہوگیا۔

(۴)

خلافتِ بنی اُمیّہ کا بانی معاویہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں بازنطائن کی مسیحی سلطنت سے بحری اور بری جنگیں کرتا رہا تھا لیکن ابھی قسطنطنیہ پر پیش قدمی نہیں ہُوئی تھی۔ معاویہ کا بیٹا یزید اُس کا جانشین ہُوا۔ اُس کے زمانۂ خلافت میں فسق و فجُور شروع ہو گیا (مقدمہ ابن خلدون)۔

میں ملازم رکھنے کی وجہ خلفا کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی نہ تھی اور نہ رواداری کے جذبہ سے اس کا تعلق تھا۔ یہ محض ایک انتظامی ضرورت تھی جس کی وجہ سے عیسائی ملازمت میں لئے گئے تھے۔ اس بات کو خلفا کی فرضی بے تعصبی اور رواداری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

فان کریمر، نکلسن اور آرنالڈ وغیرہ نے مسیحی عرب شاعر اخطل کی بابت لکھا ہے کہ وُہ یزید کا درباری شاعر اور اُس کا ندیم خاص تھا اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یزید اور بنی اُمیّہ کے دیگر خلفا مسیحیوں سے ملاطفت اور رواداری اور دوستی کے تعلقات رکھتے تھے لیکن یہ نتیجہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخطل گو مسیحی تھا لیکن یزید کی طرح مے نوشی میں مشغول رہتا تھا اور یزید کی طرح عیش و نشاط اور طرب کا دلدادہ تھا۔ پس بمصداق "کُند ہم جنس با ہم جنس پرواز" یزید اور اخطل دونوں ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے اور اسی وجہ سے وُہ بارگاہِ خلافت کا مقرب بھی تھا۔ اُس کے مذہب کا اِس امر میں مُطلق دخل نہ تھا۔ ڈاکٹر مارگولیتھ درست لکھتے ہیں کہ "بنی اُمیّہ کے عہد میں مُشکل ہم کو کہیں یہ شکایت ملتی ہے (جو بعد کے زمانہ میں عام ہوگئی) کہ مسیحیوں کو سرکاری ملازمت دی جاتی ہے۔ غالباً اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بنی اُمیّہ کے زمانہ میں ابھی سلطنت کے کاروبار سنبھالنے کی اُن میں اہلیت نہ تھی (ص ۱۷)"

مقدس یوحنائے دمشقی کی مثال ہمارے مطلب کو واضح کرتی ہے۔ بعض مسلمان مؤرخوں کے مطابق اُن کا باپ سرجیئس (یا منصور) امیر معاویہ اور یزید بن معاویہ اور معاویہ بن یزید کے عہدِ حکومت میں دیوان خراج کا مُنتظم (کتاب) تھا۔ معاویہ بن یزید کے ایامِ خلافت میں خانہ جنگی کا دَور شروع ہُوا اور مروان خلیفہ ہُوا جس کے زمانہ میں بھی سرجیئس

اس کو موسیقی اور گانے بجانے کا اور عیش و عشرت اور شراب و طرب کا شوق تھا۔ خوبصورت کنیزیں اُس کے گرد و پیش رہتی تھیں۔ چنانچہ مسعودی لکھتا ہے "یزید اپنے وقت کا زیادہ حصہ سیر و شکار میں صرف کرتا تھا۔ شراب کا بھی سخت عادی تھا۔ اسی کے عہد میں موسیقی کا رواج حرمین میں شروع ہوا جس سے اس وقت تک مسلمان نا آشنا تھے"۔ لیکن باوجود ان عادتوں کے قسطنطنیہ کے ساتھ پہلا جہاد یزید ہی نے کیا تھا۔ اس سے پہلے معاویہ کے زمانہ میں جب ایک دفعہ قسطنطنیہ پر چڑھائی ہوئی تھی تو ابو ایوب انصاری اس خونخوار جنگ میں کام آئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ یزید نے قیصر کو لکھا "مجھ کو خبر ملی ہے کہ ابو ایوب انصاری کی قبر کو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یاد رکھو کہ میں ایک عیسائی کو بھی جو عرب کی سرزمین میں ہوگا زندہ نہ چھوڑوں گا اور کسی گرجا کو مسمار کیے بغیر نہ رہنے دوں گا" حالانکہ قیصر نے قبر کی بے حرمتی بھی نہ کی تھی۔ اس کی مدت خلافت قریباً چار سال رہی۔

مروانیوں کے مطلق العنان فرمانروا عبد الملک نے دمشق کی مشہور مسجد جامع کے لئے گرجا کی زمین کو مسجد میں شامل کرنا چاہا۔ اس نے قسیس کو ختنا سے کہا کہ زمین مجھے دے دو لیکن عیسائی مزاحم ہوئے ایسا کہ عبد الملک کو خاموش ہونا پڑا۔ لیکن بعد میں ولید بن عبد الملک نے خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑہ لے کر گرجا کی دیوار پر چلایا اور گرجا کو شہید کر دیا اور اس کی زمین مسجد میں شامل کر لی۔ جب عمرؓ بن عبد العزیز خلیفہ ہوا تو اُس نے عیسائیوں کو گرجا کی زمین واپس دینی چاہی۔ مسلمانوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ عیسائیوں کی خوشامد کر کے اُن کو اس بات پر راضی کر لیں کہ وُہ اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں۔ جب خلیفہ کے پاس یہ راضی نامہ پہنچا

تو وُہ خوش ہو گیا۔

خلیفہ عبد الملک کے زمانہ (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) میں ایڈیسہ کے ایک دولتمند مسیحی اتھاناسیس نے ایک گرجا بنوایا۔ اُس نے مصر کے مختلف مقامات میں گرجے اور خانقاہیں بنوائیں۔ فسطاط کے شہر میں اُس نے دو عالی شان گرجے تعمیر کروائے۔ اس خلیفہ کے بھائی عبد العزیز بن مروان کے ایک مسیحی ملازم نے اجازت حاصل کر کے حلوان میں ایک گرجا تعمیر کیا گو یہ شہر مسلمانوں نے ہی آباد کیا تھا۔ اس کے جانشین ولید اوّل کے حکم سے انطاکیہ میں ایک گرجا ۷۱۱ء میں تعمیر کیا گیا۔

خلیفہ عمرؓ ثانی جس کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں، بنی اُمیہ کے بہترین خلفا میں سے تھا لیکن اُس نے حکم دیا کہ مسیحی تاجر مسلمان تاجروں سے دُگنا محصول ادا کریں۔ اُس نے اپنے گورنر کو حکم دیا کہ پُرانے گرجے منہدم و مسمار نہ کرے لیکن نئے گرجے مسمار کر دے اور اُن کو بنانے کی اجازت نہ دے۔ اس کے عہد میں (از ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) بے شمار مسیحی مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ آرنلڈ تک کو اِس بات کا اقرار ہے کہ اُس نے مفتوحہ ممالک میں ہر قسم کے انعامات اکرام اور دھونس سے عیسائیوں کو اسلام میں داخل کیا اور اُن کو وظائف عطا کیے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر اُس نے ایک مسیحی فوجی افسر کو ایک ہزار درہم عطا کیے تاکہ وُہ اسلام قبول کرے۔ اُس نے گورنروں کو حکم دیا کہ مسیحیوں کو اسلام کی دعوت دیں چنانچہ خراسان کے گورنر الجراح بن عبد اللہ نے چار ہزار عیسائیوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کر لیا۔ ہم نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے کہ ۷۰۰ء میں یہ حکم نافذ کیا گیا تھا کہ اگر کوئی عیسائی مسلمان بھی ہو جائے پھر بھی اُس کو جزیہ ادا کرنا ہوگا تاکہ بیت المال میں روپیہ کی کمی واقع نہ ہو۔ خلیفہ عمرؓ ثانی نے اِس حکم

کو منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ اگر کوئی عیسائی جزیہ کی ادائیگی کے وقت سے پہلے یا ادائیگی کے وقت بھی اسلام قبول کرے تو اُس کا جزیہ معاف کیا جائیگا۔ چونکہ ان احکام کا بیت المال پر اثر پڑا۔ لہٰذا خلیفہ نے حکم دیا کہ عیسائی تاجر مسلمانوں سے دُگنا محصول ادا کریں۔ ایک اور حکم کی رُو سے اُس نے تمام عیسائیوں کو حکومت کی ملازمت سے خارج کر دیا۔ اس کا نتیجہ خود اسلامی حکومت کے کاروبار کے حق میں بُرا ثابت ہُوا۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ اسلامی مملکت کے تمام مسیحی خاص قسم کا لباس پہنیں تاکہ اُن میں اور دیگر مسلمانوں میں فرق اور تمیز برقرار رہے۔

یزید ثانی (از ۷۲۰ء تا ۷۲۴ء) نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں انطاکیہ کے یعقوبی پیٹریارک مارالیاس کو اجازت دی کہ وُہ ایک نیا گرجا تعمیر کرکے اُس کی تقدیس علانیہ جلُوس نکال کر کرے۔ اس کے اگلے سال سرمدا کے گاؤں میں اِس پیٹریارک نے ایک اور گرجا کی تقدیس کی۔ کلیسیا کے لئے یہ جائے عبرت ہے کہ تب اس کی مخالفت کرنے والے مُسلمان نہ تھے بلکہ راسخ الاعتقاد عیسائی تھے!

خلیفہ ہشام کے عہد میں (از ۷۲۴ء تا ۷۴۳ء) عراق کے گورنر خالد القصری (از ۷۲۴ء تا ۷۳۸ء) نے اپنی عیسائی ماں کے لئے ایک گرجا بنوا دیا تاکہ وُہ اس میں عبادت کیا کرے۔ لیکن یہ واقعات استثنائی قسم کے تھے اور خلفا کے مزاج پر موقوف تھے۔ ان کا تعلق اسلامی مملکت کے اصُول سے نہ تھا۔

البلاذری لکھتا ہے کہ بنی اُمیہ کے مشہور عیاش دین باختہ ولید بن یزید نے قبرس کے غیر مُسلم اور مسیحی باشندوں کو جزیرے سے جلا وطن

کر دیا اور اُن کو مجبُور کیا کہ وُہ شام میں سکُونت کریں۔ جب ولید مارا گیا اور یزید بن ولید بن عبد الملک اُس کا جانشین ہُوا تو اُس نے اُن کو واپس قبرس بھیج دیا۔ یہی مصنّف ہم کو بتلاتا ہے کہ "ایک دفعہ کوہِ لبنان کے مسیحیوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلُوک کیا گیا۔ بعض عیسائیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی پس اُن کو اور اُن کے ساتھ دیگر بےگناہ عیسائیوں کو بھی جلا وطن کر دیا گیا۔ تب امام اوزاعی نے علاقہ کے صُوبہ دار کو لکھا کہ "چند خاص لوگوں کے جُرم میں تُم کو کیا حق تھا کہ تم اُن کو بھی سزا دو جو جُرم میں شریک نہ تھے۔ قرآن میں حُکم ہے کہ ایک کا بوجھ دُوسرا نہیں اُٹھاتا"۔ پھر اُس نے رسُولِ عربی کی آخری گفتگو کے الفاظ لکھے کہ "نافع بن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے آخری گفتگو میں کہا تھا کہ میرے ذمہ کی نگرانی کرنا یعنی ذمّیوں کی ذِمّہ داری پُوری کی جائے، اور جن لوگوں سے عہد کیا جا چُکا ہے، اُن پر جو ظلم اور زیادتی کریگا یا اُن پر اُن کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالیگا مَیں قیامت کے روز اُس کے خلاف مدعی بن کر کھڑا ہُونگا" (صفحہ ۱۶۹) اس سے ظاہر ہے کہ اموی دین باختہ خلفا کے زمانہ میں بھی ایسے دلیر مُسلم علماء تھے جو نڈر ہو کر مُطلق العنان خلفا اور اُن کے عمال کو اُن کی ذِمّہ داریاں جتلا دیتے تھے۔

(۵)

ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ بنی اُمیّہ کے مطلق العنان اور ظلم ستم شعار بے باک اور سُنتِ نبوی سے بے اعتنائی برتنے والے مسیحی کلیسیا جیسی بیکس اقلیت کی کیا حالت تھی۔ امیر معاویہ کا اخلاقی کردار جیسا ہم بتلا چکے ہیں بلند نہ تھا لیکن اُس کا بیٹا یزید فاسق و فاجر تھا جس نے بانیٔ اسلام

کے نواسے حسین کو قتل کیا۔ مدینہ پر چڑھائی کر کے اُس کو تین دن تک لُوٹا اور سات سَو اصحاب قتل کر دیئے اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کر دی۔ اُس نے مکّہ پر حملہ کر کے کعبہ پر منجنیق سے سنگ باری کی اور غلافِ کعبہ کو جلا دیا۔ تاریخ الخلفا میں ہے کہ ایک دفعہ کسی خوشامدی نے بنی اُمیّہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے یزید کو "امیرالمومنین" کہہ دیا تو اُس نے اُس کے بیس کوڑے لگوائے۔ ایسے شخص کے زمانہ میں مسیحی کلیسیاؤں کا کیا حال ہوگا جس نے جیسا ہم اُوپر لکھ آئے ہیں محض ایک افواہ کی بنا پر تمام سلطنت کے مسیحیوں کو قتل کر دینے کی دھمکی دی تھی۔

حق تو یہ ہے کہ بنی اُمیّہ کے تمام خلفا باستثنائے عمر بن عبدالعزیز سب کے سب اسی قماش کے لوگ تھے۔ خلیفہ یزید بن عبدالملک کا تو یہ حال تھا کہ وُہ خوبصورت کنیزوں کے جھرمٹ میں ہر وقت شراب پی کر مدہوش رہتا تھا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ ایک روز مخموری کی حالت میں اُس نے اپنی محبوب ترین کنیز کی طرف کھجور کی گٹھلی جو پھینکی تو وُہ اُس کے حلق میں جا پھنسی جس کی وجہ سے وُہ مر گئی۔ اُس کے سوگ میں وُہ سات دن اپنے محل سے باہر نہ نکلا اور تین دن تک اُس کو دفن ہونے نہ دیا اور لاش کا مُنہ چُومتا اور روتا رہا۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے بنی اُمیّہ کے عیش و عشرت کی زندگی کا حال ہے۔ اُن کے ظلم و ستم کی داستان اُن کی عیاشی کی داستان سے بھی زیادہ طویل ہے۔ اُن کا عہد قریباً ایک صدی تک رہا اور اس ایک صدی میں ہر ملک و قوم کی کلیسیائیں جو اُن کی مملکت میں رہتی تھیں ذِلّت کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ اور اُن کے حرص و آز اور ظلم و ستم کا شکار رہیں۔ یہ کلیسیائیں دُور دُور پھیلی ہُوئی تھیں کیونکہ اب اسلامی سلطنت ایشیا اور افریقہ کے ممالک اور بحر متوسط کے ممالک پر مشتمل

تھی اور سوا سَو سالوں کے اندر اندر اسلام دریائے سندھ سے بحرِ اوقیانوس تک اور بحیرۂ رُوم سے کوہ قاف اور قسطنطنیہ کی فصیلوں تک اور کاشغر سے لے کر بالائی مصر تک پھیل گیا تھا۔ اِس اسلامی سلطنت میں آپ مختلف مذاہب و اقوام کے لوگ تھے۔ عرب، یہُودی، عیسائی، مانی، زرتشتی، ایرانی، یُونانی، ہندی، موحد اور بُت پرست سبھی اس میں بستے تھے اور جب تک عربی زبان نے اُن کی مادری زبانوں پر فتح نہ پالی وُہ اپنی اپنی مادری زبانیں بولتے تھے۔ چنانچہ اموی خلفا کے زمانہ میں ارامی، سریانی، فارسی اور قبطی وغیرہ عیسائیوں کی مادری زبانیں تھیں جن کو وُہ گھر بار اور روزانہ کاروبار اور مذہبی عبادات کے لئے استعمال کرتے تھے۔

فصلِ سوم۔ خلافتِ عباسیہ کا زمانہ

(از ۱۳۳ھ تا ۶۵۶ھ مطابق ۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء)

خلفائے بغداد کا خاندان نہایت مشہُور اور نامور خاندان ہے چُونکہ نسباً اِس کا تعلق بانیٔ اسلام کے چچا عباسؓ سے ہے لہٰذا یہ خاندان "عباسیہ" کہلاتا ہے۔ خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانہ میں ------ بنی عباس منتشر کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے بنی اُمیّہ کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور خاندانِ علی کے لوگوں (علویین) کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ۷۵۰ء میں بنی اُمیّہ کو شکست ہُوئی اور اُس کا آخری خلیفہ مروان قتل کر دیا گیا۔ ابو العباس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور بنی اُمیّہ کے افراد کو چُن چُن کر قتل کر دیا۔ اسی وجہ سے اُس نے سفّاح

(خونخوار) کا لقب اختیار بھی کر لیا۔ بنی اُمیّہ کا ایک فرد عبدالرحمٰن بن معاویہ اُس کے ہاتھ سے بچ کر بھاگ گیا اور اُس نے ہسپانیہ پہنچ کر قرطبہ میں پھر خلافت کی بنیاد ڈالی۔ اِس طرح بنی عباس کی خلافت بغداد میں شروع ہو گئی اور ہسپانیہ میں بنو اُمیّہ کا خاندان قرطبہ میں حکمرانی کرتا رہا۔

خلافت کی مذہبی حیثیت خلفائے راشدین کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ ان خلفا کے زمانہ میں خلافت کا منصب خالص مذہبی تھا جس پر وُہ مامور تھے اور جس کے لئے اُنہوں نے قربانیاں کی تھیں۔ وُہ نماز کے وقت امامت کرتے اور دیگر منصبی فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے عُہدہ کے مذہبی مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔ لیکن اُن کے بعد جیسا ہم گذشتہ فصل میں لکھ آئے ہیں خلافت کی مذہبی حیثیت سلطنت میں بدل گئی۔ بنی اُمیّہ نے اپنی بے دینی کی وجہ سے مُسلمانوں کو بیزار کر دیا تھا۔ پس جب بنی عباس مظفر و منصُور ہُوئے تو داؤد ابن علی (سفاح کے چچا) نے مُسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا "ہم اللہ اور اُس کے رسُول اور آلِ عباس کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم اللہ کے احکام کے مطابق حکومت کرینگے۔ اور قرآنِ پاک کے مطابق تم پر قانون جاری کرینگے۔ ہم ادنےٰ اور اعلےٰ سب کے ساتھ ویسا ہی سلُوک کرینگے جو نبی صلعم کرتے تھے"۔ (ابن اثیر جلد ۵۔ صفحہ ۳۱۴)۔

پس عہدِ عباسیہ کے ابتدائی دَور میں مُلک گیری کا دُوسرا دَور شروع ہُوا جس کو مذہبی فتوُحات کا نام دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ **ابو العباس سفاح** (از ۷۵۰ء تا ۷۵۴ء) نے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی احکام صادر کئے کہ جو مسیحی اسلام قبُول کر لینگے اُن سے نہ صرف جزیہ وصُول نہیں کیا جائیگا بلکہ اُن کو دیگر مراعات بھی دی جائینگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس عہد

میں بے شمار مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ ہر چند خلفائے راشدین کے زمانہ میں بہت مسیحی اسلام لے آئے تھے لیکن بنی اُمیّہ کے عہد میں شام کا مُلک بدستُور مسیحیت پر قائم رہا تھا۔ عہدِ عباسیہ میں یہ کمی پُوری ہو گئی۔ عام طور پر یہ کہنا درست ہو گا کہ خلفائے بنی عباس نے اُس عہد و پیمان کو اور اُن شرائط کو جو بانئ اسلام نے عیسائیوں سے کی تھیں پسِ پُشت پھینک دیا۔ اور جُوں جُوں خلفا ہیں اور نبئ عرب کے زمانہ میں بُعد ہوتا گیا اور اُن کی عسکری طاقت اور سلطنت پائدار ہوتی گئی اور اُن کی مطلق العنانی بڑھتی گئی، تُوں تُوں اُن مراعات کو جو مسیحیوں کے لئے جائز قرار دے دی گئی تھیں، ایک ایک کر کے بالائے طاق رکھتے گئے اور مسیحی کلیسیائیں اُن کی مملکت میں پراگندہ اور ذلیل اقلیتیں ہوتی گئیں۔ حضرت محمد کی وفات تک یہی خیال تھا کہ اگر عیسائی جزیہ ادا کر دیں تو اُن کو اُن کے حال پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ ان کی وفات کے بعد کلیسیاؤں کے شرکا اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ پھر بھی خلفائے راشدین کے زمانہ میں مقابلتہً بہت کم مسیحی گروہ در گروہ اسلام میں شامل ہُوئے لیکن خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں مسیحی کلیسیاؤں کا شیرازہ بکھر گیا اور وُہ پراگندہ ہو گئیں۔ لاتعداد مسیحی اسلامی شرلعیت کی پابندیوں اور دیگر مجبُوریوں کے باعث اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ دُنیادار عُلما اور فقہا ایسے فتوے صادر کرتے تھے جو خلیفۂ وقت کے مزاج اور طبیعت کی افتاد کے مطابق ہوتے تھے۔ جھُوٹے محدّثوں کی جماعت پیدا ہو کر روز بروز بڑھتی گئی اور وُہ خلیفہ کی خواہش کے مطابق جھُوٹی روایتیں وضع کرنے سے مطلق نہ جھجکتے تھے۔ قرآنی احکام اور شرح کی نت نئی تاویلیں کی جاتی تھیں جو شارعِ اسلام کے خیال میں بھی نہ آئی تھیں۔ اگر کوئی خلیفہ پابندِ شرلعیت بھی ہوتا

تو بھی فقہا اور علماء کے زیر اثر وہ مسیحی کلیسیاؤں کو ستانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اِن مجبوریوں کے ہاتھوں بے شمار مسیحی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بنی عباس کے زمانہ خلافت میں اسلامی سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی کہ اُن کو دمشق کا صحرائی علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ابوالعباس کے بیٹے منصور (خلیفہ دوم) (از ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) نے بغداد کو دارالخلافہ بنا لیا جو قدیم ساسانی سلطنت کے پایہ تخت سٹیسفون کے قریب تھا۔ یہ انتخاب موزوں بھی تھا کیونکہ کسی زمانہ میں یہ جگہ نوشیرواں عادل کے انصاف کی وجہ سے مشہور تھی۔ اِس کے دونوں طرف چار نہایت زرخیز اور آباد صوبے تھے دجلہ اور فرات کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستان۔ بصرہ۔ واسط۔ مغرب شام۔ مصر۔ آذربائیجان اور دیاربکر وغیرہ کا مشترک تجارت گاہ تھا۔ آب و ہوا بھی معتدل تھی۔ سیاسی حالات اور مصلحتوں کے لحاظ سے بھی بغداد کا دارالخلافت ہونا موزوں تھا۔

اب بنی عباس کے اُمرا میں نہ صرف عرب تھے بلکہ تُرک اور ایرانی بھی شامل تھے اور اُنہوں نے اسلامی افواج کی تشکیل ساسانی شہنشاہوں کے نمونہ پر بنائی۔ اب عرب کے شہر مکہ اور مدینہ صرف زیارت گاہیں ہی ہو گئیں۔ اُن کی وہ سیاسی اہمیت جاتی رہی جو ان کو خلفائے راشدین کے زمانہ میں دُنیائے اسلام میں حاصل تھی۔

خلیفہ سوم مہدی (از ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) بڑا کٹر مسلمان تھا اور دین کا پکا تھا۔ اُس نے عرب قبیلہ بنو تنوخ کے پانچ ہزار عیسائیوں کو حلب میں حکماً اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ہم آگے چل کر باب ششم میں اس

کی تبلیغی مساعی کا ذکر کرینگے۔ اُس نے اُن مسیحی قیدیوں کے لئے بغداد میں ایک گرجا بنانے کی اجازت دے دی جو سلطنت بازنطائن کے ساتھ جنگیں کرنے میں اُس کے ہاتھ آئے تھے۔ اس سے پہلے خلیفہ منصور کے عہد میں ۷۵۹ء میں نسی بس کے شہر میں ایک گرجا کی تقدیس ہوئی تھی جس پر نسطوری بشپ نے چھپن ہزار دینار خرچ کئے تھے۔

بنی اُمیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جو سخت احکام گرجاؤں اور مسیحی کلیسیاؤں کے متعلق دیئے تھے وہ اُس کی موت کے بعد فراموش ہو گئے تھے۔ لیکن عباسی خلیفہ ہارون الرشید (از ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) نے اُن کی قدیم روایات کو پھر تازہ کر دیا۔ اُس نے حکم دیا کہ جو گرجے اسلامی فتوحات کے بعد تعمیر ہوئے ہیں وہ سب کے سب مسمار کر دیئے جائیں۔ عیسائیوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ خصوصی لباس ہی پہنا کریں۔ اُن کو حکومت کے تمام شعبوں کی ملازمت سے نکال دیا گیا۔ ہارون رشید نے مسیحیوں کو اس قدر تنگ کیا کہ بارہ ہزار آرمینی مسیحی اُس کے سلوک سے بیزار ہو کر بازنطائن کی سلطنت میں ہجرت کر کے چلے گئے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسلمان نے (جو مسیحیت اور مسیحیوں کا جانی دُشمن تھا) اُس کے دربار میں آ کر کہا کہ عیسائی مُردوں کی ہڈیوں کی پرستش کرتے ہیں جو اُن کے گرجاؤں میں ہوتی ہیں۔ اِس پر ہارون غضبناک ہو گیا اور اُس نے بصرہ۔ اُبلہ اور دیگر مقامات کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا۔ عیسائیوں نے اُس کو بتلایا کہ ہم مُردوں کی ہڈیوں کی پرستش نہیں کرتے بلکہ مسیحی شہیدوں مقدسوں اور رسولوں کی اُسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح مسلمان اپنے نبی اور بزرگوں اور اماموں کی عزت کرتے ہیں۔ جب ہارون اِس معاملہ کی تہ کو پہنچا تو اُس نے حکم صادر کیا کہ جو گرجے منہدم کئے گئے ہیں،

وہ از سرِ نو تعمیر کر دیئے جائیں۔ بعض اوقات نام نہاد عیسائی خود اسی قسم کے جھوٹے الزام تراش کر خلیفہ کو اپنے ہم مذہبوں کے خلاف اکسا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہارون کے عہد میں ایلیپو کے رُہبانوں نے انطاکیہ کے ـ ـ ـ ـ ـ بر کے پیٹریارک سے درخواست کی کہ وہ وہاں کے رُہبانوں میں سے کسی ایک کی تقدیس کر کے اُس کو بشپ کے عُہدہ پر ممتاز کر دے لیکن پیٹریارک نے اُن رُہبانوں کی درخواست کو غیر معقول سمجھ کر رد کر دیا اور ایک دُوسرے شخص کو بشپ مقرر کر دیا۔ اس پر رُہبان ایسے برافروختہ ہوگئے کہ وہ ہارون کے پاس گئے اور کہا کہ انطاکیہ کا پیٹریارک آپ کے دشمنوں کا جاسوس اور آپ کا بدخواہ ہے۔ یہ سُنتے ہی وہ آگ بگولہ ہوگیا اور حکم دیا کہ تمام نئے گرجے شہید کر دیئے جائیں۔ انطاکیہ کے عیسائیوں کی شامت آگئی۔ یروشلم کے عیسائی بھی اس کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ تمام قدیم گرجے مسمار کر دیئے گئے اور عیسائیوں کو انواع و اقسام کی عقوبتیں دی گئیں۔ ہارون بازنطینی شہنشاہ نسی فورس کی جنگوں سے ایسا تنگ آیا کہ فتح کے بعد اُس نے حکم صادر کیا کہ سرحد کے تمام گرجے مسمار کئے جائیں اور اُس نے عیسائیوں کو خصوصی لباس پہننے پر مجبور کیا۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ قبیلہ بنو تغلب کے مسیحیوں نے خلفائے راشدین کے زمانہ میں اسلامی فتوحات میں عرب افواج کی مدد کی تھی اور وہ باوجود سخت پابندیوں کے پچاس سال سے زائد عرصہ تک مسیحیت پر قائم رہے تھے۔ ہارون رشید نے اس قبیلہ کے عیسائیوں کے حقوق میں دست اندازی کا ارادہ کیا جو خلافتِ راشدہ کے وقت سے اُن کو حاصل تھے۔ اُس نے امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد سے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ بنو تغلب کے عیسائی ان امور کی

پابندی نہیں کرتے جو اُنہوں نے قبول کئے تھے پس میرا خیال ہے کہ ان خلاف ورزیوں کے بعد وہ ان حقوق سے محروم ہوگئے ہیں جو ازراہِ معاہدہ اُن کو حاصل تھے"۔ امام محمد نے کہا "وہ یہ خلاف ورزیاں حضرت عمرؓ کے زمانہ سے (جن سے اُنہوں نے معاہدہ کیا تھا) کرتے چلے آتے ہیں۔ اس کے بعد عثمان اور علی کے عہد میں بھی وہ یہی کرتے تھے جو وہ آج کر رہے ہیں۔ جب اُس زمانہ سے آج تک اُن سے باز پُرس نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب گویا اُن کے ساتھ صلح کی یہی صورت طے ہوگئی ہے اور آپ کو دست اندازی کا کوئی حق نہیں"۔ (تاریخ بغداد خطیب۔ ج ۲۔ ص ۱۷۴)۔

ہارون رشید تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں بہت کوشاں رہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے قسطنطنیہ کے شاہنشاہ کے نام ایک مفصل تبلیغی مراسلہ بھیجا جس سے ظاہر ہے کہ اُس کو دُوسری اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کس قدر شوق تھا۔

جب سماؤ کے مسیحی باشندوں نے ہارون رشید کی متابعت اختیار کر لی تو اُس نے اُن کے لئے بغداد میں ایک گرجا بنانے کی اجازت دے دی۔ اُس نے بصرہ کے نسطوری پیٹریارک کو بھی اجازت دے دی کہ بغداد میں ایک گرجا بنالے۔

جب **خلیفہ مامون رشید** (از ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) مصر میں تھا تو اُس نے اپنے دو مسیحی ملازموں کو اجازت دی کہ وہ قاہرہ کے نزدیک ایک پہاڑی المقطم پر گرجا بنالیں۔ اُس کی اجازت سے ایک دولتمند مسیحی نے بورہ (واقع مصر) میں کئی اچھے اچھے گرجے بنوائے۔ نسطوری پیٹریارک ٹموتھی (تاریخ وفات ۸۲۰ء) نے تکریت میں ایک گرجا اور بغداد میں ایک خانقاہ

بنوائی۔ مامون کے عہد میں بغداد کی آبادی دس لاکھ سے زائد تھی۔ آثار الدول میں لکھا ہے کہ ایک زمانہ میں تیس ہزار مسجدیں اور دس ہزار حمام بغداد میں موجود تھے۔ گبن کے مطابق شہر بغداد میں آٹھ سو ساٹھ طبیب مقرر تھے۔ مامون کے عہد میں جیسا ہم آگے چل کر ذکر کرینگے یہود، مجوس، اور عیسائی مقابلتہً آزادی سے رہتے سہتے تھے۔ لیکن ایسے وسیع الخیال اور روشن دماغ خلیفہ کے زمانہ میں بھی بابک کی بغاوت کی وجہ سے مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک کی جانب بھاگ گئی اور انہوں نے بحیرۂ اسود کے کنارے سنوپی میں بود و باش اختیار کر لی۔

خلیفہ معتصم (از ۸۳۳ء تا ۸۴۲ء) نے اپنے بھائی مامون کے نقشِ قدم پر چل کر مملکت کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا۔ دو مسیحی اس کے مشیر تھے جو اس کے معتمد بھی تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ سالمویہ اس کا وزیر داخلہ تھا جس کے دستخط کے بغیر خلیفہ کوئی قانون صادر نہیں کرتا تھا۔ اس کا بھائی ابراہیم بیت المال کا منتظم تھا۔ خلیفہ کو دونوں سے خلوص اور محبت تھی۔ چنانچہ جب ابراہیم بیمار ہو کر بسترِ مرگ پر تھا تو خلیفہ خود اس کی بیمار پرسی کو گیا۔ جب وہ مر گیا تو خلیفہ غم کے مارے پاگل ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ میت کو پہلے محل میں لایا جائے اور پھر مسیحی رسوم کے مطابق دفن کیا جائے۔

خلیفہ متوکل (از ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) خلفائے اسلام میں بہترین خلفا میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی لکھتا ہے کہ اصل خلیفے تین ہوئے ہیں۔ ایک ابوبکر جس نے مرتدین کو قتل کیا۔ دوسرا عمر بن عبد العزیز جس نے دنیا سے ظلم اٹھا دیا۔ اور تیسرا متوکل جس نے مردہ سنت کو پھر زندہ کیا۔ جب معتزلہ فرقہ (جس کا ہم آگے چل کر ذکر کرینگے) کی طاقت کم ہو گئی اور

اسلام میں عصبیت کا دور پھر عود کر آیا تو اس خلیفہ کے زمانہ میں عیسائیوں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک دفعہ ایک نام نہاد عیسائی ابراہیم بن نوح نے اس کے پاس پیٹر بارک تھیوڈوسیئس اور بخت یشوع پر الزام لگایا کہ پیٹر بارک خلیفہ کا دشمن ہے۔ یہ سنتے ہی وہ غضب میں آ گیا۔ اس نے پیٹر بارک کو معزول کر دیا اور قید کر کے بغداد بھیج دیا۔ اس نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ اس نے سامرا کے گرجاؤں اور خانقاہوں کو تباہ کر دیا اور عیسائیوں پر طرح طرح کی سختیاں کیں۔ اس نے بخت یشوع کو بھی زندان میں ڈال دیا اور دیر کونہ کی خانقاہ کو برباد کر دیا۔ دولتمند عیسائیوں کے گھر مسمار کر دیئے اور گرجاؤں کو شہید کر کے ان کی جگہ مسجدیں بنا دیں۔ طبری (تاریخ پیدائش ۸۳۵ء) ہم کو بتلاتا ہے کہ متوکل نے حکم دیا کہ جو نئے گرجے عیسائیوں کی متابعت کے بعد بنائے گئے ہیں وہ سب مسمار کئے جائیں۔ ان کے مکانات کا دسواں حصہ ان سے چھین لیا جائے اور اگر حاصل کردہ زمین کافی ہو تو اس پر مسجد تعمیر کی جائے ورنہ سفید زمین پڑی رہنے دی جائے۔ یوں صاحبِ ثروت و دولت کے گھر مسجدوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کے گھروں کو عیسائیوں کے گھروں سے تمیز کرنے کے لئے لکڑی کی بنی ہوئی شیاطین کی مورتیں دروازوں پر کیلوں سے جڑ دی جائیں۔ عیسائیوں کی قبروں کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا جائے تاکہ ان قبروں میں اور مسلمانوں کی قبروں میں شناخت ہو سکے۔ عیسائیوں کے بچوں کو تمام مدارس سے خارج کر دیا جائے اور کوئی مسلمان ان بچوں کو نہ پڑھائے۔ اس نے حکم دیا کہ مسیحی ان تمام سرکاری دفتروں سے نکال دیئے جائیں جہاں کوئی مسلمان ان کے ماتحت ہو۔ عیسائیوں کا جزیہ دگنا کر دیا گیا۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ کسی مسلمان کو اپنا غلام نہ رکھیں اور ان حماموں کو استعمال نہ کریں

جن کو مسلمان استعمال کرتے ہیں۔ حکم ہُوا کہ عیسائی زرد رنگ کی عبا پہنیں اور اپنی سواری صرف خچروں اور گدھوں پر ہی کریں جن پر لکڑی کی زین ہو اور جس کے پچھلے حصہ پر انار کی شکل کی دو چوبی گیند ہو۔ وہ گلوبند پہنا کریں اور اپنی قمیضوں پر پیوند لگایا کریں۔ وہ جمعہ کے روز بازاروں میں ہرگز نہ نکلیں ان کے بچے عربی زبان نہ سیکھیں۔ ان کے گھروں پر ٹیکس لگائی جائے جو مسجدوں میں جمع کی جائے۔ ان کی عبادتوں کے لئے کوئی خاص جگہ مقرر نہ ہو اور وہ ایسی دھیمی آواز سے مسیحیوں کو عبادت کے لئے اکٹھا کریں کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اُس نے احیائے سُنّت کی طرف توجہ کی۔ محدثین کی ہر ممکن طور پر مدد کی اور اُن کو ہر طرح سے معزز کیا۔ لیکن اس کے ذاتی چال چلن کا یہ حال تھا کہ وہ لذات اور شراب میں منہمک رہتا تھا۔ اُس کی چار ہزار کنیزیں تھیں اور وہ ان میں سے ہر ایک سے فائدہ اُٹھا چکا تھا۔ (تاریخ الخلفا صفحہ ۲۳۵) اِن باتوں کے باوجود بعض مسلمان اُس کو قطب کا درجہ دیتے ہیں۔

خاندان عباسیہ کے پندرھویں خلیفہ معتمد (از ۸۷۰ء تا ۸۹۲ء) کے زمانہ میں اُس کے بھائی الموفق نے ایک مسیحی اسرائیل کو فوج کا منتظم مقرر کیا کیونکہ سلطنت کا انتظام عیسائیوں کے بغیر خوبی سے نہیں چلتا تھا۔ اُس کے بیٹے معتضد (از ۸۹۲ء تا ۹۰۲ء) کا سیکرٹری ایک مسیحی ملک بن الولید تھا۔ انبار کا گورنر عمر بن یوسف ایک مسیحی تھا۔ خلیفہ نے اُس کو اجازت دی کہ اگر کوئی مسیحی کسی اسامی کا اہل ہو تو وہ اُس کو کام دیدے اور کہا کہ ایک مسیحی کسی مسلم یا یہودی سے کئی درجہ بہتر ہوتا ہے۔

خلیفہ مقتدر (از ۹۰۸ء تا ۹۳۲ء) نے پھر عیسائیوں پر

جبر و تشدد کیا۔ اُس نے دوبارہ سخت احکام جاری کر کے حکم دیا کہ اُن پر سختی سے عمل کیا جائے۔ پس تمام مسیحی سرکاری ملازمتوں سے الگ کر دیئے گئے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ مسلمان عیسائیوں سے خدمت لیا کریں اور مسیحی سواری کے لئے پالان کا استعمال کریں۔ حق تو یہ ہے کہ بچارے مسیحیوں کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ خلفا کے زمانہ میں جہاں کبھی کسی قسم کا فساد اُٹھتا تو غریب مسیحیوں کے لئے مصائب کا زمانہ شروع ہو جاتا۔ چنانچہ مقتدر کے زمانہ میں مسلمانوں نے فساد کر کے عیسائیوں پر حملہ بول دیا اور رملہ میں ملکی عیسائیوں کے دو گرجے شہید کر دیئے اور اسقلون اور قیصریہ کے گرجاؤں کو بھی منہدم کر دیا۔ یہ جمادی الثانی ۳۱۱ھ (۹۲۳ء) کا واقعہ ہے۔ جب عیسائیوں نے خلیفہ سے شکایت کی تو اُس نے حکم دیا کہ اُن گرجاؤں اور عمارتوں کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ ماہِ رجب میں مسلمانوں نے تنیس میں پھر ملکی گرجا کو مسمار کر دیا اور جب عیسائیوں نے اُس کو دوبارہ خود اپنے خرچ سے بنوایا تو مسلمانوں نے اُس کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ جب خلیفہ کے پاس شکایت پہنچی تو اُس نے گرجا کو بنوا دیا۔ دمشق کے خوبصورت گرجا کو جس پر دو لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے مسلمانوں نے تباہ کر دیا اور سب کچھ لوٹ لیا بلکہ انہوں نے خانقاہوں تک کو نہ چھوڑا۔ انہوں نے ملکی فرقہ کے دیگر گرجاؤں کو بھی برباد کرنے کے بعد نسطوری گرجاؤں کو شہید کر دیا۔ یہ ماہ رجب ۳۱۲ھ (۹۲۴ء) کا واقعہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان بازنطائن کی مسیحی سلطنت کے ساتھ برسرِ جنگ تھے اور اُن کو اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینی پڑتی تھیں۔ اِس بناء پر اُن کے دِل اسلامی مملکت کے عیسائیوں کی طرف سے دشمنی سے بھرے رہتے تھے حالانکہ یہ عیسائی اسلامی سلطنت کی

رعایا اور ذمی تھے اور بازنطائن کی سلطنت سے نہ کوئی تعلق رکھتے تھے اور نہ ذمی ہونے کی حیثیت سے کسی طرح کا تعلق رکھ سکتے تھے۔ اسلامی اور مغربی ممالک کی باہمی سیاسی جنگیں مشرقی ممالک کی نہتی اور بے بس کلیسیاؤں کے خرمن امن میں ہمیشہ چنگاری کا کام دیتی تھیں۔

خلیفہ القادر (از ۹۹۱ء تا ۱۰۳۱ء) نے عیسائیوں پر کڑی بندشیں لگا دیں۔ کلیسیاؤں سے ایسی ایسی سختیاں کی گئیں کہ ان کی ایک بڑی تعداد نے تنگ آکر اسلام قبول کر لیا۔ اُس نے مسیحیوں کو نہ صرف خصوصی لباس پہننے پر مجبور کیا بلکہ حکم دیا کہ وہ دن کے وقت اپنے مُردے قبرستان نہ لے جائیں۔ ایک دفعہ ایک مسجد کی دیوار کے پچھلے حصہ کو اتفاقیہ آگ جو لگ گئی تو غریب مسیحیوں کی شامت آ گئی۔ ان پر مسجد جلانے کا الزام لگا دیا گیا جو تفتیش کرنے پر غلط ثابت ہوا۔ حکومت نے بمشکل مسلمان ہجوموں کو عیسائیوں پر حملہ کرنے سے روکا۔ القادر کے عہد میں عیسائی دن کے وقت بھی اپنی عبادتیں نہیں کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ عید صعود کے دن کی عبادت بھی اُن کو رات کے وقت ہی ادا کرنی پڑی۔ اُس نے عیسائیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے غلاموں اور کنیزوں سے بھی خدمت نہ لیں نسطوری کیتھولیکوس یوحنا پنجم (تاریخ وفات ۱۰۰۹ء) کے زمانہ میں بغداد کے مسلمانوں نے یعقوبی کلیسیا کے گرجا پر عبادت کے وقت دھاوا بول دیا اور اُس کو شہید کر کے جلا دیا۔ کئی دنوں تک راکھ کے ڈھیروں میں سے لاشیں نکالی گئیں۔

(۲)

چونکہ ہم مصر کی قبطی کلیسیا کا بعض مقامات میں ضمناً ذکر کر آئے ہیں اور یہ کلیسیا مشرقی کلیسیا شمار کی جاتی ہے پس مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ ہم مختصر طور پر یہاں اُس سلوک کا ذکر کریں جو خلفا کے زمانہ میں اُس کلیسیا کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

جب **عمرو بن العاص** نے ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ کیا تو اسلام پہلی بار افریقہ میں داخل ہوا۔ اس کے تین سال بعد جب بازنطائن کی سلطنت نے اپنے لشکر مصر سے واپس بلوا لئے تو مصر کے عیسائیوں کی بے شمار آبادی مسلم فاتحین کے رحم پر چھوڑ دی گئی۔ اس زمانہ میں اسلامی فتوحات کی تیزی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر جگہ کے مسیحی مسلمان حملہ آوروں کا خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ وہ بازنطائن کی مسیحی سلطنت سے نہ صرف اُس کے انتظام کی خرابی کی وجہ سے بیزار تھے بلکہ وہ خاص طور پر اس ستم شعاری اور جفاکاری سے نالاں تھے جو یہ سلطنت اُن کے خصوصی مذہبی عقائد کی وجہ سے روا رکھتی تھی۔ مصر کی مسیحی آبادی، جیسا ہم بتلا چکے ہیں یعقوبی عقائد رکھتی تھی۔ شہنشاہ جسٹنین نے دو لاکھ قبطی مسیحیوں کو سکندریہ میں قتل کر دیا تھا اور اُس کے جانشینوں کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے قبطی مسیحیوں کو صحرا میں پناہ لینی پڑی بہت سے مسیحی اپنے پیٹریارک کے ساتھ بھاگ گئے۔ بہتوں نے منافقانہ رویہ اختیار کر کے کیلسیڈون کی کونسل کے فیصلوں کو منظور کر لیا۔ چونکہ مسلمان حملہ آوروں نے اُن کے مذہبی عقائد میں دخل نہ دیا اُنھوں نے جزیہ کا ادا کرنا غنیمت سمجھا اور اس طرح امن حاصل کر لیا جو اُن کو ایک صدی سے حاصل نہ ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے نہ تو اُن کے گرجاؤں پر قبضہ کیا اور نہ اُن کے اندرونی کلیسیائی امور اور تادیب وغیرہ میں دخل دیا۔ نہ تو گرجاؤں کی جائداد پر قبضہ ہوا اور نہ غارت گری ہوئی۔ ملکی پیٹریارک سائرس نے سکندریہ کا شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا حالانکہ وہ ایک حصین قلعہ تھا جو آسانی فتح نہیں

ہوسکتا تھا۔ یُوں ایک بین الاقوامی زبردست شہر اسلامی افواج کے ہاتھ آگیا اور وہ ڈیلٹا کے بابلِیون کے مقام پر قابض ہوگئیں جہاں سے اُنہوں نے تمام مصر کو بآسانی فتح کرلیا۔

عمرو بن العاص کے ستر سال بعد تک اُن کی حالت اچھی رہی۔ اس دوران میں قبطی مسیحیوں کی کوئی بڑی تعداد مسلمان نہ ہوئی۔ سکندریہ کی فتح کے بعد وہاں کے مسیحی مسلمان ہونے شروع ہوگئے اور اس واقع کے چند سال بعد مسیحیوں کی زیادہ تعداد اسلام کی حلقہ بگوش ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کی تبدیلیٔ مذہب سے جزیہ کم ہونے لگا۔ چنانچہ عثمان کے عہد میں (از ۶۴۳ء تا ۶۵۵ء) مصر سے ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم وصول ہوتی تھی۔ معاویہ کے زمانہ (از ۶۶۱ء تا ۶۷۹ء) میں یہ رقم پچاس لاکھ رہ گئی۔ عمر بن عبدالعزیز کے عہد (از ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) میں یہ رقم اور بھی کم ہوگئی کیونکہ اس کو اسلام کی تبلیغ واشاعت کا شوق تھا۔ اس صورتِ حالات کو دیکھ کر مصر کے گورنر قرّہ ابن شریک (از ۷۰۹ء تا ۷۱۴ء) نے حکم دیا کہ تمام مسیحی جو مسلمان ہوگئے ہیں جزیہ حسبِ سابق ادا کیا کریں۔ مسیحیوں کے لئے مصیبت برپا ہوگئی۔ نہ جائے ماندن و نہ پائے رفتن۔ اب وہ شریعتِ ارتداد کی وجہ سے واپس اپنے آبائی مذہب کو اختیار نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے بعد کے گورنر اور حکام اور عامل اُن سے جزیہ حسبِ دستور وصول کرتے رہے۔ لیکن جب گورنر حفص بن الولید نے ۷۴۳ء میں وعدہ کیا کہ اگر کوئی شخص اسلام قبول کرے گا تو نو مسلموں سے جزیہ وصول نہیں کیا جائیگا تب چوبیس ہزار مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ یہی احکام بنو عباس کے پہلے خلیفہ سفاح نے تخت نشینی کے بعد ۷۵۰ء میں صادر کئے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا

کہ تمام اسلامی مملکت میں ہزاروں نے مسیحیت کو خیرباد کہہ کر اسلام قبول کرلیا کیونکہ جزیہ اور بھاری ٹیکس اُن پر لگائے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح چوتھی صدی مسیحی میں مصر کے باشندوں نے جوق در جوق مسیحیت کو قبول کرلیا تھا اب وہ آٹھویں صدی میں جوق در جوق اسلام قبول کررہے ہیں۔ اس صدی میں چار خلفا نے اس کمزور اصبے لبس کلیسیا پر ایسی روح فرسا ایذا رسانیاں کیں کہ بعض بشپ اپنے صدر مقام چھوڑ کر بھاگ گئے اور رُوپوش ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کی اسلامی حکومت میں گورنروں اور حکام کی چیرہ دستیوں اور جفاؤں سے اور مسلسل بہ بہت تبدیلوں سے مصر کی قبطی کلیسیا کے شرکا تنگ آچکے تھے اور اُنہوں نے اسی میں سلامتی دیکھی کہ وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہوجائیں۔ چنانچہ مقریزی ہم کو بتلاتا ہے کہ عرب کی حکومت کے پہلے سو سال کے اندر حکام کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مصری مسیحیوں نے پانچ دفعہ بغاوت کی لیکن ہر بار اُن کی سرکوبی کی گئی۔ اس کا اثر قدرتی طور پر قبطی کلیسیاؤں کی تعداد اور اُن کی ذہنیت، انضباط اور اعتمادِ نفس پر پڑا۔ مملوک سلاطین کے عہد میں تو مسیحی کلیسیاؤں کی جان پر آفت بنی رہی چنانچہ ۸۴۶ء میں کسی مخبر نے اطلاع دی کہ معلّقہ کلیسیا کے ایک گرجا کی مرمت کی گئی ہے اور بعض دیگر گرجے بھی مرمت ہوئے ہیں تو حکم صادر ہوا کہ وہ تمام گرجے مسمار کردیئے جائیں اور آئیندہ نہ تو کسی گرجا کی مرمت کی جائے اور نہ گرجے بنانے کی اجازت دی جائے۔ اگر کوئی ان احکام کی خلاف ورزی کرے اور کسی گرجا کی مرمت ہوجائے تو وہ مسمار کردیا جائے۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد جب سُلطان کو خبر ملی کہ ایک اور گرجا کی مرمت کی گئی ہے تو اُس نے گرجا کو شہید کردیا۔ اب یہ ظاہر

ہے کہ اگر کسی گرجا یا عمارت کی مرمت نہ کی جائے تو وہ ایک دن ضرور گر پڑیگا اور اسلامی احکام کی رُو سے کوئی نیا گرجا اس کی جگہ تعمیر بھی نہیں ہو سکیگا۔ ۹۶۳ء میں سلطان کو خبر ملی کہ کوہِ سینا پر کچھ ایسے گرجے ہیں جو وہاں کی مسجد سے اونچے ہیں۔ پس سلطان نے حکم دیا کہ وہ سب گرجے منہدم کر دیئے جائیں۔ ۱۰۰۹ء میں اُس کو یہ خبر پہنچی کہ ایک مَلکی گرجا قریب کی مسجد سے بلندی میں اونچا ہے۔ سلطان نے اُس کو بھی مسمار کرا دیا۔

دسویں صدی میں قبطی مسیحیوں کو سختی سے حکم دیا گیا کہ وہ مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ نہ کریں اور نہ مسلمان عورتوں سے نکاح کریں۔ وہ قرآن اور بانیٔ اسلام پر اعتراضات نہ کریں۔ صلیبوں کا مظاہرہ نہ کریں اور جنازوں کو علانیہ قبرستان لے کر نہ جائیں۔ گرجے کے گھنٹے نہ بجائیں اور گیت گا کے بجانے سے مومنین کے کانوں کو آزار نہ دیں۔ اپنے گھر مسلمانوں کے گھروں سے زیادہ اونچے نہ بنائیں۔ گھوڑوں کی سواری نہ کریں اور خصوصی لباس پہنیں جس سے وہ پہچانے جاسکیں۔ جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا اُن قیود نے غریب مسیحیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ جب دسویں صدی کے شروع میں دو مسلمان عیسائی ہو گئے، اُن کو سخت ایذائیں دے کر شہید کر دیا گیا۔

جب فاطمئین کا چھٹا خلیفہ الحاکم (از ۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء) مصر کا سلطان ہوا تو قبطی کلیسیاؤں پر آفتیں ٹوٹ پڑیں۔ اُس کے گورنر اور عمال قبطی کلیسیا پر ستم رانیاں کرتے تھے۔ ۱۰۰۸ء سے ۱۰۲۰ء کا زمانہ بالخصوص اس کلیسیا کے لئے سخت تنگی اور بدحالی کا زمانہ تھا۔ کلیسیا کو مختلف شہروں اور قصبوں میں طرح طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ مصر کے تمام گرجاؤں کو شہید کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ قمامہ کے گرجا میں (جو بیت المقدس

میں تھا) مسیحیوں کو جانے سے روک دیا گیا۔ یروشلیم کے تمام گرجے مسمار کئے گئے اور اُن کا سب سامان لُوٹ لیا گیا۔ عیسائیوں کو حکم ہوا کہ وہ پانچ رطل (قریباً اڑھائی سیر) کی وزنی صلیب اپنے گلوں میں لٹکائے رکھیں اور کالے عمامے پہنیں۔ یہ ایذا رسانی تیرہ سال تک رہی اور ایسی طویل اور سخت تھی کہ بے شمار کمزور مسیحیوں کا ایمان ڈگمگا گیا اور وہ دھڑا دھڑ مسلمان ہو گئے۔ مصر کے لیٹسپ کی رپورٹ کے مطابق مغربی علاقوں میں ۳۰ ہزار گرجے اور خانقاہیں مسمار کی گئیں اور ایسے غیور مسیحی بہت کم رہ گئے جنہوں نے اپنے ایمان کو تھامے رکھا۔ خلافت کے پہلے سال ۱۰۰۸ء میں گرجاؤں کی جائدادیں ضبط ہونی شروع ہو گئیں۔ صلیبیں شارع عام اور چوکوں میں جلا دی گئیں۔ حکم دیا گیا کہ گرجاؤں کی چھتوں پر چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنا دی جائیں۔ اس کے دو سال بعد عیسائیوں کے مقدس ترین گرجا چرچ آف دی ہولی سیپلکر کو تباہ و برباد کر دینے کا حکم صادر ہوا۔ پھر حکم ہوا کہ تمام گرجاؤں کو منہدم کر دیا جائے اور بشپوں کو قید کر لیا جائے۔ مسیحیوں کی مالی حالت کو تباہ کرنے کے لئے حکم دیا گیا کہ کوئی مسلمان اُن سے نہ سودا سلف خریدے اور نہ اُن سے تجارت کرے۔ اس طویل ایذا رسانی میں ہزارہا عیسائیوں کا اسلام قبول کر لینا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ قرآنی احکام، شریعتِ اسلام اور قانونِ ارتداد وغیرہ پر چار صدیوں کے متواتر اور مسلسل عملدر آمد نے قبطی کلیسیا کے مسیحیوں کے جوش کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا اور اب مسیحیوں میں حالات کے مقابلہ کی وہ رُوح کارفرما نہ تھی جو ساسانی شہنشاہوں کی ایذا رسانیوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا کرتی تھی۔

جس طرح ایران و شام وغیرہ ممالک مسیحیوں کو چار و ناچار ان کی

اہلیت اور قابلیت کی وجہ سے اچھے عُہدے دیئے جاتے تھے اور عوام مُسلمان اُن کی تقرری پر حسد اور غم و غُصّہ سے بھڑک جاتے تھے اسی طرح مصر کے سلاطین مُسلمانوں کے نااہل ہونے کی وجہ سے مجبور ہو کر عیسائیوں کو سلطنت کے اُمور چلانے کی خاطر اچھے عُہدے دے دیا کرتے تھے جس پر عوام کے لیڈر اُن کو اُکسا دیتے تھے اور آئے دِن ہر جگہ قبطی مسیحیوں کی شامت آجاتی تھی۔ لیکن عامۃ المُسلمین کے جذبات کے باوجود شاہانِ مصر کو اس کے بغیر چارہ نہ ہوتا کہ وہ مسیحیوں کو اعلےٰ عُہدوں پر مقرر کریں۔ نام نہاد صلیبی جنگوں نے مصر کی کلیساؤں کی مُصیبتوں میں اضافہ کر رکھا تھا۔ عوام النّاس کے جذبات مصری کلیساؤں کے خلاف برافروختہ رہتے تھے کیونکہ اُن جنگوں کا اثر مصر پر ہوتا تھا۔ مصر کے مُسلمانوں کے غیظ و غضب کی وجہ سے ۱۳۰۱ء میں شاہِ مصر نے حُکم صادر کیا کہ تمام گرجے بند کر دیئے جائیں۔ اس حُکم نے مصر کے عوام کے جذبات کو کچھ مُدّت کے لئے ٹھنڈا کر دیا۔ خُدا خُدا کر کے چار سال کے بعد مسیحیوں کو اجازت ملی کہ وہ گرجاؤں میں عبادت کریں لیکن مصری حکومت کو بار بار عامۃ المُسلمین کے مطالبات کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔

جب منگولی سلاطین نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اُنہوں نے ایشیا کے تمام ممالک میں مسیحیت کی بیخکنی پر کمر باندھی تو مصر کے سلاطین نے بھی یہی وطیرہ اختیار کر لیا۔ ایک شخص سعید بن حسن نے (جو پہلے یہودی تھا) ایک کتاب لکھی جس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ہر سچے مُسلمان کا فرض ہے کہ وہ گرجے مسمار کرے اور عیسائیوں کو دائرۂ اسلام میں لائے۔ اُس کی بڑی بھاری دلیل یہی تھی کہ جب مصر میں گرجاؤں کی عبادت بند کر دی گئی تھی اور مسیحیوں کو

سخت ترین ایذائیں دی گئی تھیں تب خُدا نے خُوش ہو کر اہلِ مصر کو ۱۳۰۱ء میں فتح بخشی تھی۔ اِس کتاب کی اشاعت ہوتے ہی مصر کی تمام کلیساؤں پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔ ایک سال کے اندر اندر ۱۳۲۱ء میں مصر کے طُول و عرض میں مسیحیوں کے خلاف ہر جگہ فساد برپا ہو گئے۔ بے شمار گرجے اور خانقاہیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ مملوک سُلطان النّاصر نے دریائے نیل کے لئے پُشتہ باندھنے کی غرض سے گرجا الظہوری کی بُنیادوں کی مٹی کو چاروں طرف سے کھود نکالا۔ جُمعہ کی نماز کے وقت مُسلمان گرجا پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے نہ صرف اِس گرجا کو بلکہ قاہرہ کے تمام گرجاؤں کو مُنہدم کر دیا۔ جُمعہ کی نماز کے ختم ہونے سے پہلے یہ تمام گرجے مسمار ہو چکے تھے جس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک باقاعدہ سازش کا نتیجہ تھا جس میں سُلطان اور اُس کی حکومت کا ہاتھ تھا۔ اِس ہولناک واقعہ کے ایک ماہ بعد قاہرہ کے ایک علاقہ میں کہیں اتفاقیہ آگ لگ گئی جو بُجھانے کی کوششوں کے باوجود بُجھنے میں نہ آتی تھی۔ اِس کا اِلزام غریب عیسائیوں پر لگایا گیا کہ اُنہوں نے گرجاؤں کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے یہ آگ لگائی ہے۔ اس کے بعد کسی دُشمن نے ایک اور آگ لگا دی اور اس کے لئے بھی بیکس و لاچار عیسائیوں کو ہی ذِمّہ دار گردانا گیا۔ بیس ہزار مُسلمانوں کا ایک زبردست ہجوم دریائے نیل کی بے پناہ موجوں کی مانند سُلطان کی طرف اُمڈا چلا آیا۔ سب کے سب چلا چلا کر یہ مطالبہ کرنے لگے کہ عیسائیوں کو مصر سے نابود کر دیا جائے اور اُن کے قتلِ عام کا حُکم صادر کر دیا جائے۔ سُلطان کو اِس مُطالبہ کے سامنے جُھکنا پڑا اور اُس نے حُکم دے دیا کہ جو مُسلمان جس عیسائی کو چاہے پکڑے اور اُس کو قتل کر کے اُس کے مال و جائداد پر قبضہ کر لے۔ سُلطان نے ایک اور

فرمان صادر کیا کہ تمام مسیحیوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا جائے۔ ان احکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی عیسائی کو یہ حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ بے شمار مسیحی قتل ہو گئے۔ ہزاروں جبراً مسلمان بنا لئے گئے۔ جو اپنے ایمان پر قائم رہے اُن کو بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے قصبہ قلیوب میں ساڑھے چار سو مسیحی خاندانوں نے کلمہ پڑھ کر اپنی جان اور آبرو بچائی۔ تمام مُلکِ مصر کے طول و عرض میں ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبہ اور گاؤں میں قبطی مسیحیوں اور کلیسیاؤں کا یہی حشر ہوا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ مسلمان ہر وقت اور ہر جگہ یہی وعظ کرتے پھرتے تھے کہ خدا نے ہر جگہ اور ہر جنگ میں اور بالخصوص صلیبی جنگوں میں اسلام اور اسلامی افواج کو فتح بخش کر ثابت کر دیا ہے کہ فقط اسلام ہی اللہ کا دین ہے اور مسیحی کلیسیائیں اُس کی مغضوب و مقہور ہیں کیونکہ مسیحیت باطل ہے۔ قبطی کلیسیا روز بروز ایک پست اور ذلیل اقلیت ہوتی گئی اور اس کا انجام حسرتناک ہو گیا۔

(۳)

اس فصل میں ہم نے مُشتے نمونہ از خروارے چند خلفا اور سلاطین کا ذکر کیا ہے۔ ان خلفا کی سلطنت کے روشن اور تاریک پہلو دونوں واضح کئے ہیں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر سکیں کہ مذہبی رواداری اُن کی جہانبانی کی حکمتِ عملی تھی یا کہ نہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ مختلف خلفا نے جو پابندیاں مسیحی دستوروں، عبادتوں اور دینی رسموں پر لگائی تھیں اُن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مبادا مسلمان اُن کو دیکھ کر مسیحیت کی جانب مائل ہو جائیں، جو ایک قہار و جبار خدا کے عوض ایک ایسے خدا کی تعلیم دیتی

تھی جس نے دُنیا کو اس قدر پیار کیا کہ اُس نے مسیح خداوند کو بھیجا تاکہ اہلِ دُنیا پر خدا کی محبت کا اپنی زبان اور شہادت سے اعلان کرے۔ مسیحی اپنے منجی کی پیدائش کے روز عید منایا کرتے تھے۔ خداوند مسیح کی ظفریاب قیامت کا روز خوشی کا دن تھا۔ مبارک جمعہ کے روز وہ اپنے نجات دہندے کی صلیبی موت کی یادگاری کر کے خدا کی محبت کا اعلان کرتے تھے جو ہر گنہگار کو معاف فرماتا ہے۔ ایامِ روزہ میں مسیحی روزے رکھتے تھے۔ کھجوروں کا اتوار خداوند مسیح کے یروشلیم میں شاہانہ ورود کی یادگاری میں منایا جاتا تھا، جب مسیحی کھجوروں کو لے کر جلوس میں بازاروں اور کوچوں میں پھرتے تھے۔ ان تہواروں کے روز اور دیگر مقدسوں کے دنوں میں کلیسیا کے شرکا باقاعدہ جلوس نکالا کرتے تھے۔ صلیبیں سب سے آگے ہوتی تھیں اور مسیحی گیت گاتے، باجے بجاتے بازاروں اور کوچوں میں پھرا کرتے تھے۔ اور غیر مسیحیوں کو خداوند مسیح کی نجات کا جانفزا مژدہ دیا کرتے تھے۔ یہ جلوس حکام کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ جنازہ کے وقت تمام مسیحی جلوس بنا کر میت کے پیچھے پیچھے جایا کرتے تھے۔ صلیبیں حسبِ معمول سب سے آگے ہوتی تھیں اور سب لوگ قبرستان نمازِ جنازہ کے لئے جاتے تھے۔ بچے تک جنازہ کے ساتھ ہوتے تھے اور تمام راہ انجیل کے گیت اور زبور گائے جاتے تھے، گرجا کے گھنٹے بجائے جاتے تھے جن کی آواز سُن کر سب مسیحی جلوس میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ مؤرخین مذکور کا خیال ہے کہ مسلمان علماء اور حکام کو یہ قدرتی خدشہ تھا کہ کہیں اُن جلوسوں کا اثر مسلمان عوام پر نہ ہو اور وہ اُن سے متاثر ہو کر مسیحی عقائد اور مسیحی دینیات اور رسوم وغیرہ کی نسبت سوال کر کے اُن کا موازنہ اور مقابلہ اسلامی عقائد سے نہ کریں۔ پس خلفاء اور حکام

ایذائیں دینے پر اکتفا نہ کرکے یکے بعد دیگرے مسیحی کلیسیا کے دستور، دین رسوم اور عبادتوں پر بھی پابندیاں لگاتے تھے۔ ممکن ہے کہ اُن مؤرخین کے خیالات درست ہوں لیکن ان پابندیوں کا اثر مسیحیت اور مسیحی کلیسیاؤں کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہُوا۔

(۴)

مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کے سامنے اس قسم کے حالات پیش نہیں آئے تھے۔ قیاصرۂ رُوم نے مغربی کلیسیاؤں کو سخت ترین قسم کی ایذائیں دیں۔ اُن کو ناقابلِ بیان مصائب و آلام، ایذاؤں اور جفاؤں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اُن کے بے شمار شرکاء نے صدیوں تک ہر مُلک اور شہر اور قریہ میں جو بُت پرست رُومی سلطنت کے ماتحت تھے، اپنے خُون سے اپنے ایمان پر مُہر کی۔ لیکن ان تمام ستم رانیوں کے باوجود مسیحی کلیسیا اِس سلطنت کے کونہ کونہ میں پھیلتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیاصرۂ رُوم نے انجیل جلیل کی اشاعت و تبلیغ پر کوئی قانونی پابندی نہ لگائی تھی اور نہ شریعتِ ارتداد کا سا قانون کبھی نافذ کیا تھا۔ اُنہوں نے مسیحیت کے مبلغین کو بے دریغ تہِ تیغ کر دیا لیکن اسلام کی طرح اُن سے حقِ تبلیغ و اشاعت نہ چھینا۔ رُومی قیصر عیسائیوں سے صرف یہی ایک بات طلب کرتے تھے کہ جس طرح دیگر بُت پرست رعایا اُن کو معبُود سمجھ کر اُن کی پرستش کرتی ہے ویسا ہی عیسائی بھی اُن کی پرستش کریں۔ اور بس۔ مسیحی اِس واسطے قتل کیے جاتے تھے کیونکہ وُہ قیصر کی پرستش کرنا گناہِ عظیم تصوّر کرکے صاف انکار کر دیتے تھے۔ قیاصرہ ان کے انکار کو غدّاری اور سول نافرمانی پر محمول کرکے اُن کو تلوار، آگ اور درندوں کی نذر کر دیتے تھے۔ رُومی سلطنت اسلام کی طرح اُن کو مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔

رُومی سلطنت کی بُت پرست رعایا کی نظروں میں عیسائی مذہبی مجنُون اور دیوانے ہی تھے جن کے جنُون کی وجہ سے قیصر اور اُن کی رعایا، سب کے سب مسیحیوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے، طعنہ زنی کرتے تھے، اُن کو ٹھٹھوں کا نشانہ بناتے تھے اور حکومت کے حُکم کو نہ ماننے کی وجہ سے اُن کو گردن زنی تصوّر کرتے تھے۔ لیکن خلفائے اسلام کا یہ نظریہ نہ تھا۔ وُہ کلیسیا کی ہستی کو سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کا نقطۂ نگاہ مذہبی اور صرف مذہبی تھا۔ چُونکہ رُومی سلطنت مسیحیت کو صرف سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہی دیکھتی تھی اس لئے سلطنت کے حُکام اور رعایا مسیحی مذہب کی اشاعت اور مسیحی عقائد کی تبلیغ سے کسی قسم کا تعرّض نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اناجیلِ اربعہ اور کتاب اعمال الرّسل سے ثابت ہے کہ رُومی حُکام مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں ڈالتے تھے (یُوحنا ۱۹/۱۳ - لُوقا ۲۳/۵ - اعمال ۲۶/۲۱ - ۲۸/۳۰-۳۱ وغیرہ)۔ رُومی حکومت کے اِس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسیحی شہیدوں کا خُون ہر جگہ کلیسیاؤں کا بیج ثابت ہُوا اور تلوار اور ایذاؤں، زندانوں اور آتش زدگیوں کے باوجود مسیحی کلیسیا رُومی سلطنت کے ہر گاؤں، شہر اور مُلک میں دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ قیصر جولیئن جیسا کٹّر دشمن اور بُت پرست دمِ مرگ بصد حسرت و یاس یہ کہتا مر گیا "اے گلیلی تُو فاتح رہا"۔ بالآخر وُہ گھڑی آگئی جب قیصرِ رُوم خود مسیحی ہو گیا اور مسیحی مذہب سلطنتِ رُوم کا شاہی مذہب قرار دیا گیا۔

علٰی ہٰذا القیاس جیسا ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں سلطنتِ ایران میں بھی شاپور دوم کے عہد سے لے کر قریباً مابعد تین سو سال تک مسیحیوں کو مسلسل ایذا رسانیوں کا سامنا اُس زمانہ میں کرنا پڑا جب قیاصرۂ رُوم

نے کلیسیاؤں کو ایذائیں دینا چھوڑ کر خود مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ایرانی شہنشاہوں شاپور اعظم، بہرام پنجم، یزدجرد دوم وغیرہ نے ایسی ستمرانیاں کیں کہ اُن کو پڑھ کر بدن کے رُوئیں کھڑے ہو جاتے ہیں انسانیت اُن کے مظالم پر نوحہ خواں ہے۔ یہاں تک کہ جب ساسانیوں کی حکومت دم توڑ رہی تھی اُن دِنوں میں بھی ساسانی شہنشاہ اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چل کر مسیحیوں کو سخت ترین قسم کے عذاب دیتے تھے۔ لیکن چونکہ ایرانی سلطنت نے اسلامی قانونِ ارتداد کا سا کوئی قانون نافذ نہیں رکیا تھا ان ایذاؤں اور جفاؤں کے باوجود مسیحی کلیسیائیں دِن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئیں۔ ایک ساسانی شہنشاہ نے یہ کوشش کی تھی کہ انجیل کی تبلیغ پر قید لگائے لیکن یہ حکم کاغذی حکم ہی ثابت ہوا اور مسیحی کلیسیا اپنے مُنجی کی نجات دلیرانہ دیتی رہی۔

(۵)

جب اسلام نے مسیحی کلیسیاؤں پر انجیل کی اشاعت و تبلیغ کو بند کرنے کی پابندی لگا دی اور نسطوری کلیسیا نے دیکھا کہ وُہ اسلامی سلطنت میں خُداوند مسیح کی نجات کا پیغام مُسلمانوں، زرتشتیوں اور بُت پرستوں کو نہیں دے سکتی تو اُس نے اپنی توجہ اُن ممالک کی طرف مبذول کی جو غیر مُسلم تھے۔ ساتویں صدی سے تیرھویں صدی کے درمیان اس کلیسیا کے مبلغین براعظم ایشیا کے تمام مُلکوں میں جا نکلے۔ رُوسی تُرکستان، قبائل منگول، وسط ایشیا کے علاقے اور قبائل، چین، جاپان، تبت وغیرہ ممالک میں نسطوری مبلغین نے ایشیا کے ایک کونے سے دُوسرے کونے تک وسط ایشیا، مشرقی ایشیا۔ برما۔ جنوبی ایشیا۔ لنکا وغیرہ کے تمام بڑے شہروں میں مُنجی عالمین کا جانفزا

پیغام سُنایا۔ ہندوستان میں وُہ شاپور اعظم کے وقت سے ہی جنوب کی اطراف و جوانب میں چھائے ہُوئے تھے۔ شمالی ہندوستان میں ٹیکسلا کے قریب شاہ آباد نسطوری میٹرو پولیٹن کا صدیوں سے صدر مقام تھا۔ یہ جگہ جیسا ہم جلد اوّل میں بتلا چکے ہیں مقدس توما شہید کے زمانہ ہی سے مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز تھی اور یہ میٹرو پولیٹن شمالی ہند میں لاکھوں کو خُداوند مسیح کے حلقہ بگوش کر رہے تھے۔ شمالی ہند کی کلیسیا نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ تیرھویں صدی کے قریب پٹنہ کا شہر ایک اور میٹرو پولیٹن کا صدر مقام بن گیا تھا۔

نسطوری کلیسیا نے غیر مُسلم مشرقی ممالک میں ایسی حیرت انگیز ترقی کر لی کہ اُس کے شُرکا کی تعداد رُومی اور گریک کلیسیاؤں سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ ۶۴۴ء کے قریب جب عرب شمشیر کی نوک سے ایرانیوں کو مُسلمان کر رہے تھے تو مرو کا اُسقفِ اعظم ترکستان کی طرف گیا۔ اُس نے ترکستان کے بادشاہ اور لشکر کو انجیل کا پیغام سُنایا اور وُہ اور اُس کی رعایا بپتسمہ پا کر مسیحی ہو گئے۔ یہ ۷۸۱ء کے قریب ٹموتھی جو بغداد کا کیتھولی کوس تھا اپنے خطوط میں لکھتا ہے۔ "تُرکوں کے بادشاہ اور اُس کی رعایا نے بُت پرستی سے توبہ کر لی ہے اور خُداوند مسیح کو قبُول کر لیا ہے۔ اُنہوں نے ہم سے درخواست کی ہے کہ ایک اُسقفِ اعظم کو مرو بھیجیں تاکہ وُہ اُس کی رعایا کو راہِ ہدایت کی تعلیم دے"۔ پھر وُہ لکھتا ہے "مسیحی راہب فقط ایک عصا اور توشہ دان کے ساتھ دریا اور سمندر عبُور کر کے ہندوستان اور چین گئے ہیں"۔ ایک اور مؤرخ لکھتا ہے کہ اس کیتھولی کوس ٹموتھی نے اسّی (۸۰) راہب کلام اللہ کی بشارت دینے کے لئے بُت پرست اقوام میں جانے کے لئے چُنے۔ اور اُس نے اُن کو دُور مشرقی

ممالک میں بھیجا - ان راہبوں میں ایک شخص لشبوُح SHUBHA-LISHO تھا جو بعد میں ماژندران کا اُسقف اعظم ہُوا - وُہ بے شمار شہروں اور گاؤں میں گیا اور اُس نے ہر جگہ انجیل جلیل کا رُوح پرور پیغام بُت پرستوں کو سُنایا اور بُتوں کو بپتسمہ دے کر اُن کی رُوحانی تربیت اور تعلیم کا انتظام کیا۔ اِس نے متعدد گرجے تعمیر کئے تاکہ ان شہروں کی کلیسیائیں مسیح کی عبادت کر سکیں - اُس نے ہر کلیسیا کے لئے شماس اور قسیس مقرر کئے اور خود بھی مشرق کے دُور دُور مقاموں میں اُس نے انجیل سُنائی" ہم مختصر طور پر جلد دوم کے باب سوم میں چین کے ملک میں اُن تبلیغی مساعی کا جو نسطوری مبلغین نے کیں ذکر کر آئے ہیں - جس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ شہنشاہِ چین یوئن سانگ YUIN TSONG نے ایک شاہی فرمان صادر کیا تھا جس کی رُو سے مسیحیوں کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ وُہ گرجے تعمیر کریں - بلکہ اُن کو پایہ تخت میں بھی ایک عالیشان گرجا بنانے کی اجازت مل گئی تھی - یہ سب ترکستان کے شہر بلخ کے بشپ مار جزد بوزید JAZED BUZID کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سب سے پہلا مبلغ جو چین گیا تھا اَلوپن تھا جو ساتویں صدی میں اس مُلک کو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آٹھویں صدی میں ایک مسیحی ایرانی طبیب نے چین کی ملکہ ژاؤپون کو مسیح کا حلقہ بگوش کر لیا تھا۔ اُس کے بعد کی صدیوں میں بھی نسطوری کلیسیا ایران کے اطراف کے ممالک میں انجیل کے مبشروں کو روانہ کرتی رہی چنانچہ ۱۰۰۹ء کے قریب مَرو کے اُسقفِ اعظم نے بغداد کے کیتھولی کوس کو لکھا کہ مُلکِ ترکستان کے بادشاہوں میں سے ایک خواب میں ہدایت پا کر نہ صرف خود مسیحی ہو گیا ہے، بلکہ اُس کی رعایا کے بائیس ہزار آدمی بھی مسیحی کلیسیا میں شامل ہو گئے ہیں -

رُوسی ترکستان کے پہاڑوں میں اِیسِک کُل کی نمکین جھیل کے قریب دو قبرستان دریافت ہُوئے ہیں - ان کی قبروں کی صلیبیں اور کتبے ثابت کرتے ہیں کہ ان میں نسطوری مسیحی مدفون ہیں - یہ کتبے تیرھویں صدی کے درمیان سے لے کر چودھویں صدی کے نصف تک کے عرصے کے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ مسیحی قبریں تاتاری نسل کے لوگوں کی ہیں - یہ کتبے ترکی اور سریانی میں لکھے ہیں - تاتاری مسیحیوں کی قبروں کے علاوہ ان قبرستانوں میں اُن مردوں اور عورتوں کی بھی قبریں ہیں جو وہاں کسی وقت گئے تھے اور وفات پا گئے تھے - چنانچہ ان میں چینیوں، مونگولوں، ہندوستانیوں اور اُوِگر قبیلہ کے مسیحیوں کی بھی قبریں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی ایشیا کے مختلف ممالک کے مسیحی ایک دُوسرے کے ساتھ مسیحی رفاقت، تعلق اور رابطہ رکھتے تھے - ان کتبوں پر مدفون لوگوں کے ناموں کے ساتھ لفظ "ایمان دار" پایا جاتا ہے اور ان کی قابلیتوں کا اور خدمات کا ذکر کیا گیا ہے - ان پر محبت، اُمید اور ایمان کے الفاظ بھی کندہ ہیں - مثلاً ایک قبر پر لکھا ہے "یہ پاسک کی قبر ہے - زندگی کا واحد مقصد ہمارا مُنجی مسیح ہے" - ایک اور قبر پر لکھا ہے "یہ قبر زوما کی ہے جو قسیس اور سیرتیل تھا - وُہ مشہور اُمرا میں تھا - خُدا کرے کہ اُس کی رُوح اُس کے باپ دادا کی رُوحوں کے ساتھ ابدیت میں سکونت کرے" - ایک اور قبر پر لکھا ہے "یہ قبر سلحا کی ہے - وُہ زبردست مُعلم اور مُفسر تھا - اُس کے علم نے خانقاہوں کو منور کر دیا - اُس کی آواز نقارہ کی مانند تھی - خُدا کرے کہ اُس کی صالح رُوح اُس کے باپ دادا اور تمام راستبازوں کی رُوحوں کے ساتھ آسمانی خوشیوں میں شریک ہو" وغیرہ وغیرہ -

مذکورہ بالا سطور سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ قرآنی احکام - شرعی فرمان

اور اسلامی نظام حکومت نسطوری کلیسیا کے تبلیغی جوش کو سرد نہ کر سکی۔ اور کلیسیا کے مبلغین ہمسایہ ممالک میں اور ایشیا کے دور و بعید مقاموں میں انجیل کا جانفزا پیغام سناتے رہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور کلیسیائیں جفا و ایذا کا شکار بن کر ذلیل اقلیتیں ہوتی گئیں، اُن کے شرکاء کی ہمت بھی قدرتاً پست ہوتی گئی۔ ان کا تبلیغی جوش ٹھنڈا پڑتا گیا۔ وہ ان دور اُفتادہ کلیسیاؤں کو سنبھال نہ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان جگہوں میں رفتہ رفتہ کلیسیائیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی گئیں۔ ان کے زوال کے اسباب کا مفصل ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

Rev Michael Joseph. Cell # 92 300 7233 85
vscaljesus@gmail.com
yesmicheal@yahoo.co.uk
Evenglist Yousaf Masih.
Cell # 92 300 7233 853.

فصل چہارم۔ زمانہ خلفا میں مسیحیوں کی قانونی حیثیت

ہم باب دوم میں بتلا چکے ہیں کہ حضرت محمد نے عرب کے مسیحی قبائل پر جزیہ لگایا اور اس کے عوض اُن کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ اُن کے مذہب میں دخل اندازی نہ کی جائیگی۔ مسیحی عرب ساسانی سلطنت کے زرتشتی بادشاہوں اور بازنطائن کی مسیحی سلطنت کی مذہبی دخل اندازی سے تنگ آئے ہوئے تھے پس اُنہوں نے بخندہ پیشانی اس شرط کو قبول کر لیا اور اسلام کی عرب افواج کا خیر مقدم کیا اور چونکہ وہ بھی عرب تھے وہ اسلامی افواج کے ساتھ قیصر روم کی افواج کو چھوڑ کر آ ملتے تھے۔

لیکن جوں جوں بانیٔ اسلام کے وقت میں اور اموی اور عباسی خلفا کے عہد میں زمانہ کا بُعد بڑھتا گیا توں توں مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا پر پابندیوں کا انبار بھی بڑھتا گیا جن پر خلیفۂ وقت کے مزاج اور طبیعت کے مطابق نرمی یا سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔

(۱)

جزیہ کی نسبت قرآن میں حکم تھا کہ "اہل کتاب میں سے جو دین حق (اسلام) قبول نہیں کرتے، مسلمانو۔ تم اُن سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں" (۹/۲۹)۔ اس ذلت کی نشانی کو مسیحی کلیسیاؤں نے ساسانیوں کی غلامی اور رومی مسیحیوں کے جبر و ظلم پر ترجیح دے کر قبول کر لیا۔ لیکن جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا جزیہ کی رقم میں اضافہ ہوتا گیا، عیسائیوں پر پابندیوں پر پابندیاں لگا دی گئیں اور اُن کے

مذہبی معاملات میں دخل اندازی بڑھتی گئی۔ چنانچہ امام ابو یوسف ۷۸۶ء اور ۸۰۹ء کے درمیان لکھتا ہے کہ "نبی عرب نے نجران کے مسیحیوں کی، اُن کے رشتہ داروں کی اور اُن کی جانوں اور مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ اُن کے مذہب کی حفاظت کی جائیگی۔ اُن کے گرجے محفوظ رہینگے۔ اُن کے اسقفوں اور قسیسوں کو اُن کے عہدوں سے معزول نہ کیا جائیگا اور اُن کے رُہبانوں کو رہبانی زندگی ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا"۔ پھر وہ کہتا ہے "عرب کی سرزمین کا حال غیر عرب ممالک کا سا نہیں ہے۔ عرب سے اس واسطے جنگ کی جاتی ہے تا کہ وہ اسلام قبول کریں۔ اُن سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔ اُن کو صرف اسلام قبول کرنے کی ہی دعوت دی جاتی ہے۔ اور اُن سے صرف قبولیتِ اسلام ہی قبول کیا جاتا ہے ..... عرب اور غیر عرب کے لئے ایک ہی قاعدہ نہیں۔ غیر عرب سے دو باتوں کے لئے جنگ کی جاتی ہے کہ یا تو وہ اسلام کو قبول کر لیں اور یا وہ قتل کر دیئے جائیں۔ ہم کو اس بات کا کہیں پتہ نہیں ملتا کہ رسول نے یا اُن کے اصحاب نے یا خلفائے راشدین نے کسی عرب بُت پرست سے جزیہ لیا ہو۔ اُن کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ یا اسلام قبول کرو یا قتل ہو جاؤ۔ اگر وہ شکست کھائیں تو اُن کی عورتیں اور بچے قید کر لئے جائیں جس طرح رسول اللہ نے حنین کے روز قبیلہ ہوازن کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا تھا، اگرچہ بعد میں اُن کو معاف کر کے آزاد کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ سلوک صرف اُن لوگوں سے کیا گیا تھا جو بُت پرست تھے۔ عرب قبائل میں جو اہلِ کتاب تھے اُن سے وہی سلوک کیا گیا جو غیر عرب سے کیا گیا تھا۔ اُن سے جزیہ قبول کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بنو تغلب کے عیسائی قبیلہ سے خراج کے عوض دُگنا جزیہ لیا۔ رسول اللہ نے یمن کے لوگوں سے ایک دینار یا اس کے عوض کپڑا لیا تھا۔ نجران کے لوگوں سے بھی جزیہ کے عوض

صلح کی گئی۔ غیر عرب جو اہلِ کتاب ہیں، اُن سے جزیہ لیا جاتا ہے" (کتاب الخراج)۔

اس کے دو صدیوں کے بعد الماوردی گیارھویں صدی کے پہلے نصف میں لکھتا ہے کہ جزیہ کے ضروری شرائط ہیں حسب ذیل شرطیں لازمی ہیں:- (۱) ذمی قرآن پر حملہ نہ کریں اور نہ اس کی غلط تاویل کریں (۲) نبی اسلام کو کاذب نبی نہ کہیں اور اُن کے لئے حقارت آمیز الفاظ استعمال نہ کریں (۳) دین اسلام کی عیب جوئی نہ کریں اور نہ اس کے خلاف کوئی تحریر اور تقریر کریں (۴) وہ کسی مسلم عورت سے نکاح یا زنا نہ کریں (۵) کسی مسلمان کو اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں (۶) وہ نہ تو کسی دشمن کی مدد کریں اور نہ اُن کے جاسوسوں کو اپنے گھروں میں رہنے دیں۔ مذکورہ بالا چھ فرائض لازمی ہیں جن پر عمل کرنا ذمی پر لازمی ہے۔ یہ شرائط ایسی ہیں کہ اگر اُن کا کسی عہد نامہ میں ذکر نہ بھی ہو تاہم وہ لازمی سمجھی جائیں گی اور اگر اُن پر عمل نہ کیا جائے تو ذمی عہد شکن تصور کئے جائینگے۔ ان چھ شرائط کے علاوہ چھ اور شرطیں ہیں جو لازمی نہیں لیکن اگر کوئی حکمران، ان کو ذمیوں پر لگانا چاہے تو وہ لگا سکتا ہے۔ اس قسم کی چھ شرطیں یہ ہیں:- (۱) زنار اور غیار کا پہننا جس سے سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ ذمی ہے (۲) ذمی کوئی ایسی عمارت نہیں بنا سکتا جو مسلمانوں کی عمارتوں سے زیادہ اونچی ہو (۳) ناقوس اور گھنٹے بجا کر یا بائبل کو اونچی آواز سے پڑھ کر اور مسیح کے دعوے سُنا کر مومنوں کے آزار کا باعث نہ ہوں۔ (۴) ذمی علانیہ شراب نہ پیا کریں اور خنازیر اور صلیبیں علانیہ دکھائی نہ دیں۔ (۵) مُردوں کے جنازے خاموشی سے عمل میں آئیں اور کسی قسم کے ماتم یا زاری کی آواز نہ آئے۔ (۶) ذمی گھوڑوں کی سواری نہ کریں بلکہ سواری کے لئے خچر اور گدھے استعمال کریں۔ اگرچہ چھ شرطیں کسی عہد نامہ میں

درج ہوں تو وُہ پہلی چھ شرطوں کی طرح لازمی ہونگی۔ لیکن اگر اُن کا ذکر نہ ہو تو ذِمّی سزا کا مستوجب نہ ہوگا۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ساسانی بادشاہوں نے ایرانی کلیسیا کی ایذارسانیوں کے زمانہ میں عیسائیوں پر یہ قید لگانی چاہی تھی کہ وُہ غیر مسیحیوں کو انجیل کی بشارت نہ دیں لیکن مارآبا نے از ۵۴۰ء تا ۵۵۲ء نہایت دلیری سے کام لے کر اس شرط کو رَد کر دیا تھا۔ لیکن اَب یہ شرط لازمی قرار دی گئی جس پر عمل نہ کرنا سزا کا مستوجب ہونا تھا۔

جزیہ کی رقم بھی خلیفۂ وقت اور اُس کے مشیروں اور دربار کے مقتدر علماء کے منشاء کے مطابق بدلتی رہتی تھی جس سے مقامی حکام ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھانے سے نہیں جھجکتے تھے۔ امام یُوسف کی کتاب الخراج سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ ہارُون رشید کے زمانہ میں یہ رقم کیا تھی۔ وُہ لکھتا ہے کہ جو ذِمّی صاحبِ حیثیت ہیں وُہ چالیس درہم سالانہ ادا کریں۔ اوسط درجہ کے لوگ چوبیس درہم دیں اور غریب نادار طبقہ یعنی مزدُوروں اور کاریگروں کا طبقہ بارہ درہم سالانہ ادا کیا کرے۔ یہ جزیہ تندرُست اور بالغ آدمیوں سے لیا جاتا تھا۔ عورتیں، بچّے اور بیمار مرد اس سے مستثنےٰ تھے۔ اگر قسیس یا راہب وغیرہ خود نہ کماتے ہوتے تو اُن کو بھی جزیہ مُعاف تھا۔

خلفا کے زمانہ میں جزیہ اور اُس کی شرائط سے تنگ آ کر بے شمار مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اُن نومُسلموں کی تعداد کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ عُمر بن خطاب کے زمانہ میں جزیہ کی سالانہ رقم دس بارہ کروڑ درہم تھی لیکن پچّاس سال کے اندر خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں یہ رقم چار کروڑ رہ گئی۔ ان سالوں کے دَوران میں خراسان کی مملکت میں بے شمار عیسائی

مُسلمان ہو گئے۔ یہ تعداد اس قدر پریشان کُن تھی کہ نسطوری پیٹر یارک یشُوع یحب سوم نے رِوَردشر کے میٹروپلیٹن اور صوبۂ فارس کے آرچ بشپ کو لکھا ”اَے باپ۔ تیرے بیٹے کہاں گئے؟ تیرے لوگ جو مرد میں تھے کیا ہُوئے؟ جن کو تلوار تک نہ دکھائی گئی، نہ اُن کو عذاب دیئے گئے نہ اُن کو آگ میں پھینکا گیا وُہ صرف اس دُنیا کے مال کے لالچ کی قید میں تھے۔ اور صراطِ مستقیم سے پھر کر بے ایمانی کے گڑھے میں جا گرے اور ہمیشہ کے لئے برباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے صرف دو فقط بس یہی رہ گئے جنہوں نے اپنے ایمان کا انکار نہ کیا۔ ہائے افسوس! صد افسوس!! ہزاروں میں سے جو جہان کے نجات دینے والے کے نام لیوا تھے، ایک بھی ایسا نہ نکلا جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا اور اُس کے لئے اپنا خُون بہانے کو تیار رہتا۔ کرمان اور صُوبۂ فارس کے گرجے کہاں گئے؟ وُہ بادشاہوں کے احکام سے تباہ و برباد نہیں کئے گئے بلکہ صرف شیطان کی ایک پھُونک سے گر گئے۔ تُم اچھی طرح جانتے ہو کہ عرب جو تمہارے درمیان ہیں وُہ تمہارے قسیسوں کی اور تمہارے مذہب کی عزت کرتے ہیں اور گرجاؤں اور خانقاہوں کو بنظرِ وقعت دیکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مرو کے بے شمار مسیحی اپنے ایمان سے مُنحرف اور برگشتہ ہو گئے ہیں اور اُن عربوں کے پیچھے ہو لئے ہیں حالانکہ اُن پر کوئی بڑا جبر و تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے غیر فانی ایمان کو ترک کر دیا ہے اور اس دُنیا کے فانی مال سے محبت کی ہے۔ حالانکہ قوموں کی قوموں نے اس ابدی اور زندہ ایمان پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں اور موت کے ذریعہ ابدی زندگی میں داخل ہو گئی ہیں۔“

(۲)

یہ حالت تو اسلام کے ابتدائی دَور کے پچّاس سال کی تھی لیکن جُوں

جُوں زمانہ گذرتا گیا اور خلفا کی سیاسی طاقت اور شخصی اقتدار بڑھتا گیا مسیحی کلیساؤں پر (جیسا ہم گذشتہ فصل میں بتلا آئے ہیں) زیادہ پابندیاں لگتی چلی گئیں۔ **علم فقہ اور فقہا کا طبقہ** امتدادِ زمانہ کے ساتھ مسیحیوں پر قانونی پابندیاں لگاتا گیا۔ چُونکہ اب زمانہ کے پیچیدہ اور بڑھتے ہُوئے حالات کے لئے قرآنی احکام ناکافی ثابت ہُوتے تھے پس شریعت کے احکام، اخلاق و معاشرت اور دینیات وغیرہ کے لئے قوانین کا وضع کرنا ایک لابدی امر ہو گیا تھا۔ بجائے عرب کی زندگی کے سیدھے سادے تعلقات کے مفتوحہ ممالک میں ایسے رسُوم اور نظام تھے جن کے لئے قرآن و حدیث نے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ ایسی منفرد صُورتیں بڑھتی گئیں جن کا پہلے سے کوئی بندوبست نہ تھا اور جن کا فیصلہ یا تو رسم و رواج کی رُو سے یا ذاتی اختیار کے مطابق ہونے لگا۔ پس مؤرخ ''دولوٹر کہتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کے زیرِ اثر فقہ کی تدوین ہُوئی'' (صفحہ ۲ و ۳)۔ یہاں تک کہ ''کہا جاتا ہے کہ پُرانے رُومی صُوبوں یعنی شام اور عراق میں بُہت دن تک زیادہ تر رُوما کا قانون چلتا رہا'' (صفحہ ۲۷)۔ رفتہ رفتہ اسلامی شرع کے قوانین کا رجُوع اس جانب ہوتا جاتا تھا کہ ہر مسلمان فرمانروا کا یہ فرض ہے کہ وُہ جبر کو کام میں لا کر تلوار کے زور سے غیر مُسلموں کو مُسلمان بنائے گو بعض اوقات مصلحتِ وقت کو دیکھ کر مُسلمان فرمانروا اِس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے لیکن فقہا اُن کو یہی تعلیم دیتے تھے کہ اسلامی سلطنت کے قریب کسی غیر مُسلم حکومت کا ہونا ہی اُس کے ساتھ جنگ کرنے کا معقول سبب ہے۔

فقہ کے چار امام ہیں۔ امام ابُوحنیفہ ۷۰۲ء میں بصرہ میں پیدا ہُوا۔ امام ابن مالک مدینہ میں ۷۱۲ء میں پیدا ہُوا۔ امام شافعی ارضِ مُقدس

میں ۷۶۷ء میں پیدا ہُوا۔ امام ابنِ حنبل بغداد میں ۷۸۰ء میں پیدا ہُوا۔ ان چاروں اماموں کے اصُولوں نے مسیحی کلیسیا کے مستقبل پر ایسا زبردست اثر ڈالا کہ انہوں نے اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر دیا۔

زمانۂ خلفا میں الفاظ ''کُفر''۔ ''کافر''۔ ''شرک''۔ ''مُشرک'' ایسے عام ہو گئے اور اُن کی تعبیر میں ایسی تبدیلیاں واقع ہُوئیں کہ اُن کا اثر ہر جگہ اور ہر مُلک کی کلیسیاؤں پر پڑا۔ قرآن میں لفظ ''کُفر'' معہ اپنے تمام مشتقات کے بکثرت استعمال ہُوا ہے۔ قرآن کی مکّی سُورتوں سے ظاہر ہے کہ پہلے پہل یہ لفظ اُن اہلِ مکّہ کے لئے استعمال ہُوا جو بانیٔ اسلام کو جُھٹلاتے تھے۔ جب حضرت محمد اُن کے اسلام قبُول کرنے کی طرف سے قطعاً مایُوس ہو گئے تو اُنہوں نے کفار کے مقاطعہ کا حُکم دیا (آلِ عمران، ۲۷ آیت)۔ جب تک وُہ زندہ رہے عام طور پر کفار سے مُراد بُت پرست عرب تھے۔ جب خلفا کے عہد میں فتُوحات کا آغاز ہُوا تو اسلام دین و دُنیا دونوں پر حاوی ہو گیا اور نظامِ حکُومت اسلامی اصُول اور شریعت اور فقہ کے قوانین پر چل پڑا تو مصر اور عجم پر حملے کرنے کے لئے ''کُفر'' اور ''شرک'' کو اصلی سبب قرار دے دیا گیا۔ جُوں جُوں نظامِ حکُومت وسیع ہوتا گیا، ان صدیوں کے دَوران میں عوام میں جذبۂ جہاد بڑھانے اور اُس کو تازہ رکھنے کے لئے ''کافر'' اور ''مومن'' کی تفریق نے ایک مسلسل شکل اختیار کر لی۔ ''کافر'' ایک عام اصطلاح ہو گئی جس میں بُت پرست، مسیحی اور دیگر غیر مُسلم سبھی شامل کر لئے گئے۔ کُفر کی متعدد صُورتیں وجُود میں آگئیں۔ مُلحد، مُرتد، منافق، فاسق، فاجر، وغیرہ الفاظ پیدا ہو گئے ''کُفر و انکار''، ''کُفر و جحود''۔ ''کفر المعاندہ''، ''کُفر النفاق'' وغیرہ الفاظ علما کے زبان زد ہو گئے۔ جب فقہی کُتب وجُود میں آئیں تو اہلِ فقہ نے

الفاظ "کفر" اور "شرک" کے معنوں کو بہت توسیع دے دی اور اس قسم کے مسائل پیدا ہو گئے کہ آیا کافر پاک ہے یا ناپاک ہے۔ ناپاک کہنے والے اہلِ شیعہ تھے کافر کو "نجس" قرار دے کر کہا کہ جس طرح پیشاب، پاخانہ وغیرہ نجس ہیں اسی طرح کافر بھی نجس ہے اور عیسائیوں کی چھوٹی ہوئی چیز کو کھانا حرام ہے۔ قرآن نے تو عیسائیوں کے لئے عزت کے الفاظ استعمال کئے تھے لیکن فقہا اس سوال پر بحث کرتے تھے کہ عیسائی کس قسم کے کافر ہیں؟ بعض نے ان کو نجس قرار دے دیا۔ بعض نے کہا کہ گو وہ کافر ہیں لیکن ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اُن کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرنا جائز ہے۔ بہرحال اس لفظ کافر سے مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیوں کی طرف سے نفرت اور عداوت کے جذبات قائم رہے۔ عیسائیوں کے شہروں کو دارالحرب قرار دے کر جہاد فرضِ کفایہ قرار دے دیا گیا۔ ان پر وُہ تمام شرعی قیود اور قوانین عائد ہو گئے جو کفار پر عائد ہیں۔

(۴)

گذشتہ فصلوں میں ہم ان پابندیوں کا مختصراً ذکر کر آئے ہیں جو خلفا کے زمانہ میں مسیحی کلیسیاؤں پر لگائی گئی تھیں جن کی وجہ سے مسیحی ایک پست ہمت، ادنےٰ اور ذلیل اقلیت بن کر رہ گئے تھے۔ ابتدائے اسلام میں دونوں مذہبوں کے مقلدوں میں تعلقات اچھے اور خوشگوار نظر آتے ہیں۔ گورنروں کو حکم تھا کہ وُہ اہلِ ذمہ کے ساتھ انصاف کریں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ گو سخت گیر تھے لیکن انہوں نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میں ذمیوں کو اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں۔ وُہ خدا اور رسول کی حفاظت میں ہیں۔ واجب ہے کہ وُہ میرے عہدناموں کی پیروی کرے اور ان پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالے جس کو وُہ اُٹھا نہ سکیں۔ حضرت علی نے بھی مرتے وقت یہی وصیت کی تھی۔ لیکن

جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا خلفا اس قسم کی پابندیاں مسیحیوں پر لگاتے گئے جن سے وُہ گویا اچھوت ذات ہو گئے۔ مثلاً احکام صادر ہوئے کہ مسیحی مردوں، عورتوں اور اُن کے غلاموں کے لباس پر زرد رنگ کی چوڑی دھاریاں ہوں تاکہ سب مومنین اُن کو بآسانی پہچان سکیں۔ گھوڑوں پر سوار ہونے کی بجائے وُہ صرف خچروں اور گدھوں پر ہی سوار ہوں جن پر کاٹھ کی زین اور رکاب ہو۔ یہ سزا اُن مجرموں کو دی جاتی تھی جن کو شہر کے گلی کوچوں میں تشہیر کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں کی قبریں زمین کے ساتھ ہموار ہوں مسلمان اُستاد اُن کے بچوں کو نہ پڑھائیں۔ سوائے اُن گرجاؤں کے جو فتح کے وقت مسمار ہونے سے بچ رہے ہوں، دُوسرا کوئی گرجا نہ بنایا جائے۔ جو گرجے موجود ہوں ان کی مرمت نہ کی جائے۔ گرجاؤں پر صلیب نصب نہ کی جائے وغیرہ وغیرہ یہ ایسے احکام تھے جن کو کوئی خوددار جماعت گوارا نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ احکام دُوسری صدی ہجری کی اسلامی سپرٹ کے عین مطابق تھے۔ فقہا اسی قسم کے فتوے صادر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم امام مالک کا ذکر کر آئے ہیں کہ اس کے فقہ کے مطابق اگر کوئی مسیحی اپنی زمین کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت بھی کر دے پھر بھی اُس کو فروخت شدہ زمین کا خراج ادا کرنا ہوگا۔ ہاں اگر فروخت کرنے والا خود مسلمان ہو جائے تو خراج مُعاف ہوگا۔ ابوحنیفہ بھی عیسائیوں کی اسباریوں اور زمینوں کے متعلق اور اُن کے گھروں پر شیاطین کی مُورت کی لکڑیاں لگانے کی بابت وُہی حکم دیتا ہے جو اُوپر لکھا گیا ہے حالانکہ وُہ چاروں اماموں میں سب سے زیادہ نرم ہے۔ امام مالک کہتا ہے کہ نئے گرجے بنانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے اور کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وُہ اپنا گھر یا زمین کسی مسیحی کے پاس فروخت کرے اگر وُہ عبادت کے لئے استعمال ہو۔ کسی مسلمان کے لئے

یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا گھر یا زمین کسی مسیحی کے پاس فروخت کرے اگر وہ عبادت کے لئے استعمال ہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے گھر میں مسیحی عبادت ہونے دے۔ کوئی مسلمان اپنا کوئی حیوان کسی مسیحی کے ہاتھ فروخت نہ کرے جو قربانی کے لئے درکار ہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنا کوئی حیوان کسی عیسائی کو کرایہ پر دے جس نے اُس پر سوار ہو کر کسی تہوار کو منانے کے لئے جانا ہو۔ امام شافعی کے مطابق اگر عیسائی کسی عبادت کے لئے جمع ہوں تو لازم ہے کہ وہ کہیں تنہائی کے مقام میں جمع ہوں جہاں اُن کی آواز کسی ایماندار کے کانوں میں نہ پڑے۔ یہ پابندیاں جن کا اس کتاب کے مختلف مقامات میں ذکر کیا گیا ہے نہایت ذلّت آمیز تھیں۔ عیسائیوں کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ اُن کا حقِ ملکیت اور حقِ قبضہ اُن سے چھن جائیگا۔ چنانچہ ابن العباس لکھتا ہے کہ مصر کے سلطان کو ۷۵۹ھ میں معلوم ہُوا کہ پچیّس ہزار مالیّت کی ملکیت خانقاہوں اور گرجاؤں کی وقف ملکیّت ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ یہ ملکیّت اُن سے چھین کر اُس کے اُمراء میں بطور انعام تقسیم کی جائے اور حکم دیا کہ تمام گرجاؤں اور خانقاہوں کو مسمار کر دیا جائے۔ ایک دفعہ سلطان چقمق کسی عیسائی سے ناراض جو ہو گیا تو اُس نے حکم دیا کہ گرجے مسمار کر دیے جائیں۔ مصر میں جب مملوک سلاطین کے عہد میں عموماً مسیحیوں پر آگ لگانے کا بے بنیاد الزام لگایا جاتا تھا تو اُن کو ہر وقت یہی خدشہ لاحق رہتا تھا کہ وہ آگ میں زندہ جلا دیئے جائینگے۔ حکومتِ وقت کے بدخواہ جب کبھی دیکھتے کہ وہ حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو وہ لوگوں کو اُکسا کر فسادات برپا کر وا دیتے اور بچارے مسیحیوں کی شامت آجاتی تھی۔ جب کبھی بیرونی حملہ آور اور مغرب کی مسیحی سلطنتیں اسلامی مملکت سے جنگ کرتیں یا مسلمانوں میں باہم خانہ جنگیاں ہو جاتیں تو مسیحی

کلیسیائیں سب کے لئے آسمان نشد بن جاتیں۔ اور ہر شخص کو اپنے ذاتی عناد کے انتقام کا موقعہ مل جاتا تھا۔ مسیحی تجارت پیشہ تھے اور بعض نے اچھی خاصی دولت جمع کر لی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عامۃ المسلمین اُن کی دولت کی وجہ سے اُن سے حسد کرتے تھے اور فساد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ اور جب کبھی کسی خلیفہ یا حاکم کو روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اُن کے دندانِ آز و حرص مسیحیوں پر تیز ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر ارقہ (ایڈیسہ) کی خانقاہ کے باہر کسی مسلمان کی لاش پڑی دیکھی گئی تو یہ مشہور ہو گیا کہ راہبوں نے اُس کو مار کر باہر پھینک دیا ہے۔ گورنر نے حکم دیا کہ وہاں کے ایک راہب کو قصاص میں قتل کر دیا جائے اور باقی راہبوں کو دُرّے لگائے جائیں۔ بمشکل تمام خانقاہ کے لوگوں نے ایک لاکھ درہم دے کر خلاصی حاصل کی۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ خلفا کے زمانہ میں مسیحی اپنے ایمان کی خاطر نہیں ستائے گئے اور اُن کو ایذائیں نہیں دی گئیں تو وہ ایسا دعویٰ کرتا ہے جو حقیقت کے خلاف ہے اور جس کو تاریخ کے اوراق بار بار جھٹلاتے ہیں۔ بلکہ عام طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ حکومتیں ظالم تھیں اور مسیحی اُن کے آز و حرص اور ستم رانیوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اُن حکومتوں کے ماتحت مسیحی کلیساؤں کی اصل تصویر کی ہولناک تاریخ کا پتہ لگنا ایک دُشوار امر ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مسلمان مؤرخ مسیحیوں اور مسیحی کلیساؤں کا صرف ضمنی طور پر ہی ذکر کریں اور مسیحیوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ بغیر کسی خوف و خطر کے بے باک ہو کر اصل حالات کو قلمبند کریں۔

(۴)

پہلے پہل عام طور پر خلفا اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مسیحی کلیسیا کے

مختلف فرقوں کے بزرگانِ دین ایک دُوسرے کو ایذائیں نہ دیں۔ ان کی حکومت تمام مسیحی فرقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب یہ کلیسیائیں ایرانی سلطنت میں تھیں تو وُہ ایک دُوسرے کو فنا کرنے کی کوششیں کیا کرتی تھیں اور ایرانی سلطنت اُن کی خانہ جنگیوں سے پُورا فائدہ اُٹھاتی تھی۔ مثلاً پانچویں صدی میں ایک نسطوری بشپ بارسوما نے ایرانی شہنشاہ کو کہا کہ آرتھوڈوکس (راسخ العقیدہ) کلیسیا آپ کی دُشمن ہے۔ اُس نے یہ سُنتے ہی ایذا رسانی شروع کر دی جس میں سات ہزار آٹھ سَو قسیس اور شماس شہید ہو گئے۔ خسرو دوم کے زمانہ میں بھی جب قیصر ہرا کلس نے ایران پر حملہ کیا تو یعقوبی مسیحیوں کے کہنے سُننے سے آرتھوڈوکس کلیسیا کو سخت ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اسلامی سلطنت کی پہلے پہل یہی کوشش تھی کہ تمام مسیحی فرقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھے۔ مثلاً جب مصر فتح ہُوا تو یعقوبی کلیسیا کے مسیحیوں نے آرتھوڈوکس کلیسیاؤں کے گرجاؤں پر قبضہ کر لیا لیکن مُسلمان فاتحین نے اُن گرجاؤں کو اُنہیں واپس دلوا دیا۔ اسلامی حملوں سے پہلے ہر فرقہ دُوسرے فرقوں کے خُون کا پیاسا تھا۔ نسطوری، یُونی ٹیرین اور یعقوبی مسیحی ایک دُوسرے پر ستم کرتے رہتے تھے اور زمانہ کی امتداد کے ساتھ یہ مخاصمت بڑھتی چلی جاتی تھی۔ جب اسلام نمُودار ہُوا تو اس کی بجائے کہ سب عیسائی فرقے متحد ہو کر اسلامی عقائد کے خلاف ایک متفقہ محاذ پیش کرتے اور اپنے نجات دہندہ کی خوشخبری دیتے وُہ اپنی تمام کوشش ایک دُوسرے کی بیخکنی پر صرف کرتے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے ۵۳۲ء میں مسیحی عوام کلیسیاؤں اور قیصر رُوم کے باہمی جھگڑوں سے تنگ آ کر قیصر جسٹینئن کے خلاف اُٹھے۔ اس خانہ جنگی میں ۳۵ ہزار آدمی کام آئے۔

وُہ قیصر کے ظُلم و ستم سے تنگ آ کر کہتے تھے کہ ہم مسیحی نہیں رہینگے بلکہ یہُودی اور بُت پرست ہو جائینگے۔ ایک صدی کے گذرنے کے بعد جب اسلام آیا تو ان مسیحی فرقوں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہُوئی تھی۔ ہزاروں مسیحیوں نے ان لامتناہی تنازعوں اور خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر مسیحیت کو خیرباد کہہ دیا اور مُسلمان ہو گئے۔

ابتدا میں اسلامی حکومت (جیسا ہم کہہ چُکے ہیں) مسیحیوں کے باہمی تنازعوں میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔ اُن کے مذہبی رہنما کلیسیائی عدالتوں میں اُن کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ مسیحیوں کے گرجاؤں اور خانقاہوں کے اندرُونی معاملات میں بھی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن چھوٹے بڑے شہروں میں بُہت سے گرجاؤں کو مُنہدم کر دیا گیا تھا اور بعض کو مسجدیں بنا لیا گیا تھا۔ گرجاؤں کے معاملہ میں بھی فقہا میں اختلاف تھا۔ حنفی مذہب کے مطابق شہروں میں گرجے بنانے منع تھے گو موجُودہ گرجاؤں کی مرمّت ہو سکتی تھی۔ مگر چھوٹے گاؤں میں اور اُن بستیوں میں جہاں مُسلمان نہ ہوں وہاں نئے گرجے بنائے جا سکتے تھے۔ امام حنبل کے مطابق کوئی نئے گرجے بنائے نہیں جا سکتے اور نہ پُرانے گرجے مرمّت کئے جا سکتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر عہد نامہ میں واضح طَور پر یہ شرط درج ہو تو صرف اسی حالت میں نئے گرجے بن سکتے ہیں۔

جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا مسیحیوں پر نئی پابندیاں لگائی جانے لگیں۔ پس ایک حد تک مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا کو اسلامی شریعت کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ہم ذکر کر آئے ہیں مسیحیوں کی عدالت میں گواہی کسی مسلمان کے خلاف قابلِ سماعت ہی نہ تھی۔ جب امام مالک سے پُوچھا گیا کہ اسلامی حکومت

چوری کے معاملہ میں تو عیسائیوں کے ہاتھ مسلمانوں کی طرح کاٹ دیتی ہے لیکن زنا کے معاملہ میں عیسائی کو وُہی سزا نہیں دی جاتی جو مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔ اُس نے جواب میں کہا کہ چوری کا تعلق مُلکی معاملات سے ہے جس سے ریاست کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن بالعموم مسیحیوں کے مقدمات میں دخل نہیں دیا جاتا تھا تاوقتیکہ اُن سے ایسے جرائم سرزد نہ ہوں جن سے مُلک کو ضرر پہنچتا ہو۔ اس معاملہ میں ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اسلامی حکومت ذِمّیوں کی عزت و آبرو اور حق و باطل کا اِس حد تک ہی عموماً خیال رکھتی تھی جس حد تک وُہ اسلامی مفاد کے خلاف نہ تھے لیکن جہاں مسیحیوں کے اور اسلامی مفاد میں تصادم ہوتا تھا تو حکومت انصاف کو مدِنظر نہیں رکھتی تھی۔

جُوں جُوں خلفا کی حکومت مطلق العنان ہوتی گئی وُہ مسیحی کلیسیاؤں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگ گئے۔ یہ ایک قُدرتی بات بھی تھی۔ سن ۸۵۰ء اور سن ۱۰۵۰ء کے درمیان مسیحی کلیسیا فرقوں میں بٹی ہُوئی تھی نسطوری، یعقوبی، ملکی، آرمینی وغیرہ کلیسیاؤں کے باہمی تنازعوں سے خلفا اور اُن کے حکام تنگ آئے ہُوئے تھے پس اُن کو موقعہ مِل گیا اور اُنھوں نے نفرتوں سے فائدہ اُٹھا کر مسیحی کلیسیاؤں کو اَور بھی کمزور اور بے بس بنا دیا۔ اُن ایام میں ملکی کلیسیا کا کیتھولی کوس بغداد میں رہتا تھا جو انطاکیہ کے پیٹریارک کے ماتحت تھا۔ اس کلیسیا کا ایک میٹرو پولیٹن مَرو میں رہتا تھا۔ لیکن دریائے فرات کے مشرق کی جانب نسطوری کلیسیا کی اکثریت تھی خلفاء اِس کوشش میں تھے کہ اِن تمام کلیسیاؤں کو مکمل طور پر اپنے قبضہ اختیار میں کرلیں پس ۹۸۷ء کے بعد بغداد کے خلفاء خود نسطوری کلیسیا کے کیتھولی کوس مقرر کرنے

لگ گئے اور یہ تقرر مسیحیوں کی رضامندی کے خلاف ہونے لگا کیونکہ وُہ ایسے کیتھولی کوس مقرر کرنا چاہتے تھے جو اُن کے اشاروں پر چلیں۔ اِس کے تھوڑے سال بعد خلفا نے جبر سے کام لے کر یہ حکم جاری کر دیا کہ یعقوبی اور ملکی کلیسیاؤں کے بشپ نسطوری کیتھولی کوس کے ماتحت کر دیئے گئے ہیں اور واجب ہے کہ وُہ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کریں۔ حالانکہ ان تینوں کلیسیاؤں کے خصوصی عقائد اور نظام ایک دُوسرے سے بالکل الگ تھے۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف خلفا کا کلیسیاؤں کے اندرونی معاملات پر قبضہ ہو گیا بلکہ مختلف کلیسیائی فرقوں میں رقابت، بُغض اور حسد کے جذبات بڑھتے گئے اور ان میں دِلی یگانگت اور رُوحانی رفاقت کا امکان بھی اُٹھ گیا۔ یہ مختلف فرقے باہمی رقابت اور حسد کی وجہ سے بیش از پیش برسرِ پرخاش ہو کر ایک دُوسرے کو زک دینے کی کوشش میں رہنے لگے۔ چنانچہ بغداد میں گریک کلیسیا کے متعدد مسیحی رہائش رکھتے تھے۔ اُنھوں نے انطاکیہ کے کلدی پیٹریارک الیاس اوّل (از ۹۰۷ء تا ۹۳۲ء) سے درخواست کی کہ وُہ اُن کے لئے ایک میٹرو پولیٹن مقرر کر دے۔ پیٹریارک نے بشپ یوحنّا کو بغداد بھیجا لیکن یہ تقرر نسطوری کلیسیا کے کیتھولی کوس ابراہام سوم (از ۹۰۵ء تا ۹۳۶ء) کو نہایت ناگوار معلوم ہُوا پس اُس نے وزیر کے پاس شکایت کی۔ وزیر نے بشپ یوحنّا کو بُلوایا۔ کیتھولی کوس نے کہا "ہم جو نسطوری کلیسیا کے مسیحی ہیں، اسلامی سلطنت کے خیر خواہ ہیں اور اس کی فتح کے لئے ہمیشہ دست بدُعا رہتے ہیں۔ پھر آپ اس غیر شخص کو جو آپ کا بد اندیش ہے ہمارے برابر کیوں گردانتے ہیں"۔ وزیر نے جواب دیا "تم سب مسیحی بابر طور پر ہم مسلمانوں کے بدخواہ ہو۔ تمھاری دوستی محض دکھاوے کی

ہے"۔ اس پر یعقوبی کو بس خاموش ہو گیا لیکن اُس نے وزیر کے طبیب کو ایک بھاری رقم رشوت دے کر اپنا کام نکال لیا۔ کہتے ہیں کہ ابراہام نے سنہ ۹۱۲ء میں دو ہزار سونے کے سکّے رشوت دیئے تاکہ الیاس کو بغداد بُلوایا جائے۔ جب وُہ طلب کیا گیا تو اُس سے جبراً لکھوا لیا گیا کہ وُہ آئندہ نہ تو خود بغداد میں کبھی رہیگا اور نہ اُس کا کوئی میٹروپولیٹن وہاں رہائش اختیار کرے گا بلکہ وُہ مختلف بشپوں کو مختلف اوقات پر صرف وقتِ معیّنہ کے لئے اپنی کلیسیاؤں کی رُوحانی نگہداشت کے لئے بھیجا کریگا جو اپنے فرائض کو ادا کرنے کے بعد واپس اپنے مقام کو چلے جایا کرینگے۔ ایک اور موقعہ پر یعقوبی کلیسیا کے ایک بشپ نے جس کا نام تومآ تھا ایک نسطوری کا نکاح ایک یعقوبی مسیحی سے پڑھ دیا۔ اِس بات پر نسطوری کیتھولِکوس سبر یشوع (از ۱۰۱۱ء تا ۱۰۷۲ء) نے آفت برپا کر دی۔ جب اِس قسم کے خفیف واقعات کی وجہ سے باہمی بُغض کی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی تھیں تو ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصُولی اختلافات کی نہ بُجھنے والی آگ کس طرح کلیسیاؤں کے خرمن کو جلا دیتی ہوگی۔ اندریں حالات خلیفہ کے حُکم سے کہ تمام کلیسیائیں نسطوری کلیسیا کے ماتحت ہو جائیں کلیسیا کو کس طرح تباہ و برباد کر دیا ہوگا۔

(۵)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسلامی شریعت کے مطابق اگر مسیحی ذِمّی بن جائیں اور جزیہ اور خراج ادا کریں تو اُن کی جانیں، اُن کے خاندان اور اُن کا مال محفوظ رہتا ہے، لیکن اُن کی حیثیت ادنیٰ ہوگی۔ اُن کو شہریت کے اصطلاحی حقوق حاصل نہ ہونگے۔ وُہ اسلامی مملکت کے پُورے شہری نہ

ہوں گے۔ اُن کو مُسلمانوں کے مساوی حقُوق حاصل نہ ہوں گے۔ وضع قوانین میں اُن کی کوئی آواز نہ ہوگی۔ قانُون کے نفاذ میں اُن کا کوئی حِصّہ نہ ہوگا۔ قانُون کی تنقید میں اُن کا کوئی حِصّہ نہ ہوگا۔ وُہ فوج اور عدالت کے محکموں میں نہ لیے جا سکینگے۔ وُہ حکومت کے نظم و نسق میں اعتماد کے عُہدے پر فائز نہ ہو سکیں گے اور نہ وزیر مقرّر کئے جا سکیں گے۔ اُن کو سرکاری عُہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق نہ حاصل ہوگا۔ مختصراً مسیحیوں کا موقف خلفا کی سلطنت میں یہ تھا۔

لیکن باوجُود شرعی احکام کے خلفا کو مسیحیوں کو سرکاری ملازمت دینی پڑتی تھی۔ ہم نے گذشتہ فصل میں اس کے چند وجُوہ بھی بیان کئے ہیں۔ چنانچہ اُموی خلفا کے ابتدائی دور میں محکمۂ مال عیسائیوں کے ہاتھوں میں رہا اور عیسائی کاتب ہُوا کرتے تھے۔ مصر میں عیسائی کاتب زیادہ عرصے تک رہے۔ خلفائے عباسیہ کے دَور میں (جیسا ہم آگے چل کر بتلائیں گے) بعض خلفا کے طبیب عیسائی تھے۔ یہ طبیب نسطوری مسیحی تھے اور بڑے دولتمند تھے۔ مثلاً ہارُون رشید کے طبیب خاص جبرئیل کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ درہم اُس کی خاص جائداد سے تھے اور اس کے علاوہ خلیفہ کے علاج کے لئے اس کو دو لاکھ اسّی ہزار درہم سالانہ ملتے تھے۔

بعض خلفا نے اسلامی شریعت کے حُکم کے مطابق بار بار احکام جاری کیے کہ مسیحیوں کو سرکاری ملازمت سے نکال دیا جائے۔ مثلاً خلیفہ عُمر بن عبد العزیز اموی خلیفہ نے اور عباسی خاندان کے دُوسرے خلیفہ منصُور (از ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) نے۔ خلیفہ متوکّل (از ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) نے۔ خلیفہ مقتدر (از ۹۰۸ء تا ۹۳۲ء) نے اور مصر میں العامر (از ۱۱۰۱ء تا

۱۳۰۱ء) نے اور مملوک سلاطین نے چودھویں صدی میں اس قسم کے احکام بار بار جاری کیے۔ ان احکام کے بار بار صادر ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ عیش و عشرت کے عادی مسلمان سرکاری امور کو سنبھالنے کے اہل ثابت نہ ہوتے تھے عیسائیوں کے لئے مصیبت یہ تھی کہ جب خلیفۂ وقت یا حاکم وقت چاہتا ان احکام پر عمل کرنے کا حکم صادر کر دیتا تھا پس مسیحی سرکاری ملازم کبھی چین سے زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی عہدہ داری کی میعاد کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ خلفا مسیحیوں کو ہمیشہ کے لئے سرکاری ملازمتوں سے خارج بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان سلطنت کے کاروبار چلانے کی اوّل اہلیت نہیں رکھتے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ خلفا کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسیحی ملازم شرعی پابندیوں کی وجہ سے ان کے عہدِ خلافت میں ان کے ہوتے ہوئے ان کے نمک حلال وفادار رہینگے۔ لیکن جب کبھی مسیحی کسی اچھے عہدے پر فائز ہوتے تھے تو حاسد ان کے خلاف عوام کو اکسا دیتے یا خلیفہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ پس یا تو وہ اپنی ملازمت سے الگ کر دیے جاتے تھے اور یا عوام فساد کر دیا کرتے تھے۔ پھر گرجاؤں پر ہلّہ بول دیتے تھے اور عیسائیوں کے گھروں کو لوٹ مار کر کے ان کو نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ یہ حاسد اور مسلمان علما عوام کو اکسا کر کہتے تھے کہ یہ مسیحی ملازم اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں اور ان کے عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے خدا سلطنت اور مسلمانوں پر قہر نازل کریگا۔ جب مسلمان فساد کرتے تو مجرموں کو سزا دینا اسلام کی توہین تصور کی جاتی تھی پس بدترین مجرموں کو علما اور فقہا کی ہمدردی اور کمک حاصل تھی جو ان کے حق میں علانیہ مسجدوں میں وعظ کرتے تھے کبھی کبھار جب

کوئی مسیحی سرکاری عہدہ پر فائز ہوتا تو یہ عہدہ اس کے لئے کانٹوں کا بستر ہوتا۔ پس وہ اپنے بچاؤ کی خاطر خلف کا اور حکام بالا کا وفادار ہونے میں ہی اپنی خیریت سمجھتا تھا۔ لیکن اس میں بھی اس کو یہ مشکل درپیش آتی کہ اگر خلیفہ کا جانشین یا کسی حاکم کا جانشین خلیفہ کا مخالف ہوتا تو وہ بعد میں مسیحی ملازم سے بدلہ اور انتقام لئے بغیر نہ چھوڑتا۔ خلفاء کو بھی عامتہ المسلمین کے جذبات اور علماء کے فتووں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ پس وہ عوام کی مجنونانہ حرکتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ اس قسم کی شکایات خلیفہ منصور، مہدی، مامون، متوکل اور مقتدر کے پاس بار بار کی گئیں لیکن سب بے سود۔ تاہم ان باتوں کے باوجود حکومت کے مسیحی ملازم یہی کوشش کرتے تھے کہ سب کے ساتھ عدل و انصاف کریں اور اپنے فرائض کو بطرزِ احسن انجام دیں۔ چنانچہ الجاحظ لکھتا ہے کہ "لوگوں کے دلوں میں ان سرکاری ملازموں کی عزت ہوتی ہے اور ادنیٰ ترین طبقہ کے آدمی ان کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ ان میں سے بعض خلفا اور سلاطین کے دوست ہیں اور ان کے امورِ خانہ داری کے منتظم ہیں۔ مسیحی عموماً امراء کے طبقہ کے طبیب ہیں اور مہاجن صراف بھی ہیں" بعض سرکاری ملازم سیاسی اقتدار کا جائز و ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ چنانچہ آٹھویں صدی میں تقریباً ہر بطریارک کا انتخاب دربار کے مسیحی عہدہ داروں کے ایما پر ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک قدرتی بات تھی کہ وہ اپنے ہم مذہب عیسائیوں کو چھوٹی موٹی اسامیاں بھی دلوا دیا کرتے تھے۔

مسیحی عہدیداروں میں بعض ایسے بھی ہوتے تھے جو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے اپنے ایمان تک کو قربان کر دیتے تھے۔ اور ہر بات میں خلیفۂ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے فرمانوں کی تعمیل کرنے کو تیار رہتے

تھے۔ اس کے باوجود وُہ حاسدوں کی کڑی نگاہ سے محفُوظ نہ رہتے تھے اور خلیفہ بھی خُوب سمجھتا تھا کہ اُن کا اسلام سطحی ہے۔ چنانچہ رسالہ الکندی (جس کا ذکر بعد میں کیا جائیگا) میں ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ مامون نے کہا: "اللہ کی قسم مَیں جانتا ہُوں کہ فلاں فلاں (جو اس کے مصاحب تھے) اسلام کا اقرار کرتے ہیں گو وُہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ اور اسلام سے بیزار ہیں۔ مَیں جانتا ہُوں کہ اُن کا ظاہر اُن کے باطن کے خلاف ہے کیونکہ وُہ ایسے گروہ کے ہیں جو اسلام میں دین کی خاطر نہیں آئے بلکہ ہماری قرابت کی خاطر اور ہم سے دولت و عزت پانے کی خاطر اُنہوں نے اسلام قبُول کیا ہے۔ ان سب پر خُدا کی لعنت ہے۔ مجھے علم ہے کہ فلاں فلاں (جو اُس کے مصاحب تھے) پہلے عیسائی تھے اور اب اُنہوں نے اسلام قبُول کر لیا ہے حالانکہ وُہ اس سے بیزار ہیں۔ وُہ مکار ہیں۔ وُہ نہ تو مسلمان ہیں اور نہ مسیحی ہیں"۔ (صفحہ ۹۵) لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسے لوگ اپنے وقتی مفاد کی خاطر اپنے مُنجی کا انکار کر کے اور اسلام قبُول کر کے نہ صرف اپنی عاقبت برباد کرتے تھے بلکہ اپنے بچّوں کی اور اُن کی آیندہ پُشتوں کی قسمت پر بھی ہمیشہ کے لئے مُہر لگا دیتے تھے کیونکہ شریعت ارتداد کے قانون کی وجہ سے وُہ اور اُس کے بچّے نسل در نسل اسلام کو ترک کر کے مسیحیت کو اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

تمام طور پر یہ نتیجہ درست ہوگا کہ جہاں حکومت کا کام مسیحیوں کے بغیر نہیں چل سکتا تھا وہاں اُن کو ملازمت پر لگایا جاتا تھا۔ خلفا کی حکمتِ جہانبانی یہی تھی کہ مسیحی کلیساؤں کے شُرکا ہر جگہ قلیل اقلیت ہو کر ہی رہیں۔ اُن کو ہر جگہ کُچلا جائے تاکہ وُہ صاغروں سے نہ بڑھ سکیں اور کلیسیائیں ترقی نہ کر سکیں بلکہ وُہ سِسک سِسک کر ختم ہو جائیں۔

اسلامی شرع کی قانُونی بندشوں اور خلفاء کے طریقۂ کار نے دہلی کے سلاطین کے رویّہ پر قدرتی طور پر اثر ڈالا کیونکہ جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے، مختلف وجُوہ کے باعث دہلی کے سلاطین خلیفۂ وقت اور اُن کے علما اور فقہا کا خاص لحاظ رکھتے تھے اور اس بات کے خواہشمند تھے کہ عامۃ المسلمین پر یہ ظاہر کریں کہ اُن کی حکومت کا منبع خلیفۂ بغداد ہے جس کا منشُور حاصل کرنے کی وُہ از حد کوشش کیا کرتے تھے۔ پس جو سلوک بغداد کے خلفائے عباسیہ اپنی مملکت کی مسیحی کلیساؤں سے کرتے تھے وہی سلوک دہلی کے سلاطین شمالی ہندوستان کی کلیساؤں سے روا رکھتے تھے اور اسی کو وُہ اپنی سلطنت دارین سمجھتے تھے۔ انشاءاللہ اس کا مفصّل ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔

(٦)

شریعتِ اسلامی کے مطابق جن لوگوں، مُلکوں یا قوموں کے خلاف جہاد کرنا ہو، اُن کو پہلے قبُولیتِ اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ اگر وُہ اسلام کا حلقہ بگوش ہونا منظُور نہ کریں تو پھر وُہ اسلامی سلطنت کے مطیع ہو کر رہیں اور جزیہ، خراج وغیرہ ادا کریں ورنہ وُہ اسلام کی افواج سے جنگ کریں۔ جب اُن کو شکست ملے تو اُن کے خاندان قید کر لئے جائیں اور اُن کے بیوی بچّوں کو لونڈیاں، غُلام بنایا جائے اور وُہ دیگر قیود کے پابند ہوں گے۔ ہم اس باب کی فصل اوّل میں بتلا چُکے ہیں کہ اس پر خلفائے راشدین کے عہد میں سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلامی فتُوحات کے ساتھ ساتھ خلفاء اور اُمراء کے محلّوں میں غُلاموں کے لشکر ہوتے گئے۔ اُن کے حرموں میں کنیزوں اور لونڈیوں کی ایک کثیر تعداد پہلے مسیحی گھرانوں کے افراد ہوتے

تھے۔ مثال کے طور پر جب اسمٰعیل ۲۹۲ھ میں بخارا میں تخت نشین ہوا تو اُس نے ترزک کے عیسائیوں کے خلاف جہاد کیا اور وہاں کے اُمراء اور رؤساء کو جبراً اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا۔ وہاں کا گرجا مسمار کر دیا گیا اور اُس کی جگہ پر مسجد تعمیر کی گئی۔ اس جہاد میں اُس کو بیش قیمت مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ بیشمار عیسائی قیدی اور غلام بنا لیے گئے۔ اُن کی بیویاں، اور بہو بیٹیاں اور بہنیں مائیں سب لونڈیاں ہو گئیں۔ آغازِ اسلام کے بعد ہی جب فتوحات شروع ہوئیں تو کنیزوں کی کثرت ہو گئی۔ یہ لونڈیاں اکثر شرفاء کے گھروں کی چشم و چراغ تھیں۔ امارت اور حکومت کے ساتھ ساتھ یہ غلام اور لونڈیاں مُسلمانوں کے تمدن و معاشرت کا جزو ہو گئیں اور جُوں جُوں اُن کے جاہ و حشمت اور شوکت و جلال میں ترقی ہوتی گئی اس طبقہ کی وسعت بڑھتی گئی حتیٰ کہ خلفاء اور اُمراء کو غلام اور کنیزیں تحفہ کے طور پر پیش کرنے کا دستور مستقل طور پر قائم ہو گیا۔ اگر تحفہ دینے والوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں خلیفہ یا امیر صناعت کی طرف مائل ہے تو اُس کے حضور صنّاع کنیزیں پیش کی جاتیں۔ اگر کوئی خلیفہ جمال دخت کا عاشق ہوتا تو اُس کے لیے حسین کنیزیں تلاش کی جاتیں اور اُن کی غنا میں خاص تربیت کی جاتی۔ خلفاء کی دیکھا دیکھی اُمرا اور رعایا کا ہر طبقہ غلام رکھتا تھا مثلاً بصرہ کے عالم جاحظ کا ایک دوست تھا جس کی ایک کنیز کو اقلیدس حفظ تھی۔

ہم گذشتہ فصلوں میں بتلا چکے ہیں کہ خاندانِ بنی اُمیّہ کے خلفاء مثلاً یزید بن معاویہ وغیرہ غلاموں اور کنیزوں کے شیدائی تھے۔ ان خلفاء کے زمانہ ہی سے مُسلمان رعایا یہ سمجھنے لگ گئے کہ حکّامِ وقت اور خلفاء و سلاطین کے لیے لازم نہیں کہ وُہ قرآنی احکام اور اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں پر

چلیں۔ عام مُسلمانوں کے لئے تو یہ لازم سمجھا جاتا تھا کہ وُہ شریعت کے تابع رہیں لیکن وُہ یہ خیال کرتے تھے کہ زنا۔ شراب۔ قتل وغیرہ کے احکام کا اطلاق خلیفۂ وقت پر نہیں ہوتا جس طرح اُن کا اطلاق عجم کے شہنشاہوں پر نہیں ہوتا تھا۔ خلافتِ عباسیہ میں ہر خلیفہ مطلق العنان حاکم تھا۔ اس خاندان کے زوال کے بعد یہ بات ہر مُلک کی اسلامی مملکت کے سلاطین کا حق تصوّر کی گئی۔ اُن سے صرف یہی توقّع کی جاتی تھی کہ وُہ ظاہری باتوں میں اسلام کا احترام کریں اور خلفاء اور سلاطین من موجی کارروائیاں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب امین خلیفہ ہُوا تو اُس نے خوجوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خریدا اور اُن سے خلوت کی۔ وُہ اُن کا ایسا شیدا تھا کہ اُس نے اپنی بیویوں اور باندیوں، کنیزوں تک کو چھوڑ دیا (تاریخ الخلفا صفحہ ۲۰۴)۔ خلیفہ ہارُون رشید کے پاس دو ہزار کنیزیں تھیں جن میں سے کئی سَو گانے بجانے میں ماہر تھیں۔ زبیدہ اور جعفر برمکی کی ماں کے پاس ہزاروں کنیزیں تھیں جو بڑی قیمت دے کر خریدی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ہارون نے ایک پری جمال کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار دی تھی۔ خلیفہ معتصم کے دس ہزار غلام تھے جن کی بڑی تعداد تُرک تھی۔ اس کا ایک غلام عجیب نام اُس کو نہایت محبُوب تھا جو حُسن و جمال میں اپنا نظیر آپ تھا اور خلیفہ اُس کے حُسن و جمال کی تعریف میں شعر کہا کرتا تھا۔ خلیفہ واثق زبردست شاعر تھا جو اپنے ایک غلام پر ہزار جان سے فِدا تھا۔ ایک دفعہ وُہ خلیفہ سے بگڑ گیا اور اُس نے دُوسرے غلاموں کو کہا کہ اب میں خلیفہ سے ہرگز کلام نہ کرُونگا خواہ وُہ مجھے کتنا ہی بُلائے میں نہ بولُونگا۔ وُہ کئی روز اُس سے رُوٹھا رہا۔ بالآخر اُس کو منانے کے لئے خلیفہ نے اشعار کہے۔ خلیفہ متوکّل کی چار ہزار

کنیزیں تھیں اور وُہ ہر ایک سے فائدہ اُٹھا چُکا تھا۔ خلیفہ مقتدر کے مزاج پر کنیزیں حاوی تھیں۔ اُس نے رُومی۔ صقالبی اور حبشی غُلام ہزاروں کی تعداد میں رکھے ہُوئے تھے۔ گیارہ ہزار خواجہ سرا تو اُس کی خدمت میں ہر وقت کھڑے رہتے تھے۔ ۳۶۵ھ میں جب عزالدّولہ اور عضدالدّولہ کی کسی خفیف بات پر لڑائی ہوگئی تو عزالدّولہ کا تُرکی غُلام گرفتار ہوگیا جس سے اُس کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اُس نے کھانا پینا ترک کر دیا اور ہر وقت روتا رہتا تھا۔ اس نے عضدالدّولہ کو زاری اور الحاح سے لکھا کہ میرا غلام واپس کر دو لیکن وُہ نہ مانا۔ بالآخر عزالدّولہ نے غُلام کے عوض اُس کو دو کنیزیں دیں جو حُسن و جمال میں لاثانی تھیں اور جن کو اُس نے ایک ایک لاکھ دینار دے کر خریدا تھا۔ تب اُس کا غُلام واپس کیا گیا۔ (تاریخ الخلفا صفحہ ۲۷۱) نمُائش و جلال کی خاطر کنیزوں کو رکھنے کا دستُور عام ہوگیا۔ جب فتُوحات کا سلسلہ محدُود ہوگیا اور کنیزوں کی فراہمی بند ہونے لگی تو مملکت میں بردہ فروشوں کی جماعت پیدا ہوگئی۔ بغداد کے بازار میں سرکیشیا، رُوم، جارجیا، ایران، آرمینیا، حبش وغیرہ ممالک کی عورتیں برسرِ بازار نیلام ہونے لگیں۔

ان کنیزوں کی ایک بڑی تعداد مسیحی عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی تھی۔ رُوم اور ایشیائے کوچک وغیرہ مسیحی ممالک کی لڑکیاں پکڑی جاتی تھیں اور سستے داموں خریدی جاتی تھیں۔ دلال اُن کو موسیقی، شاعری، ادب، خوشنویسی، ظرافت، حاضر جوابی وغیرہ کی تعلیم دلواتے اور نہایت گراں قیمت پر بیچتے تھے۔ خلیفہ مامون کے شبستانِ عیش میں ان لونڈیوں کے جھُرمٹ کے جھُرمٹ ہوتے تھے۔ ایک دن بزمِ عیش آراستہ تھی۔ جام و بادہ کا دور جاری تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رُومی کے لباس میں ملبُوس، گردنوں میں صلیبیں،

کمروں میں زرّیں زنّار، ہاتھوں میں گُلدستے لیے جلوہ دِکھا رہی تھیں۔ اُنھوں نے ناچنا شروع کیا۔ اُن کی مخمُور آنکھوں اور شراب نے مامون کو بدمست کر دیا اور اُس نے حُکم دیا کہ تین ہزار اشرفیاں اُن کے قدموں پر نثار کر دی جائیں۔ غُلاموں اور کنیزوں کی قیمت اور تربیت وغیرہ نے خلفا کے شاہی خزانہ کو زیرِ بار کر رکھا تھا۔ بنو اُمیہ اور بنی عباس کے خلفا کے زمانہ کے نہ صرف اُمراء بلکہ علماء تک نغمہ اور سرود کی چاٹ سے خالی نہ تھے۔ بلکہ خلیفہ عُمر بن عبدالعزیز جیسا خُشک زاہد بھی فنِ نغمہ میں سُروں کا مُوجد تھا۔

ان مسیحی عورتوں کے علاوہ جو کنیزیں بنائی جاتی تھیں بے شمار مسیحی عورتوں کو زبردستی مُسلمانوں کے حرموں میں داخل کر لیا جاتا تھا اور جو بچّے ان عورتوں سے پیدا ہوتے وُہ مسلمان بنا لیے جاتے تھے۔ اُن کے حقُوق دیگر مُسلمانوں کے سے ہوتے تھے۔ جب کبھی کوئی عیسائی غُلام مُسلمان ہو جاتا تو اُس کو آزاد ہونے کا موقعہ مِل جاتا تھا۔ غُلامی کی قسمت سے بچنے کے لئے ہر مُلک و قوم کے بہتیرے مسیحی اپنا دین و ایمان ترک کرنے پر رضامند ہو جاتے تھے۔ اس کا قُدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ کلیسیا کے ہزاروں شخص اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔

غُلامی انسان کے بہترین خصائِل کو زائل کر دیتی ہے۔ بالخصوص جو غُلام خوجے بنائے جاتے ہیں، اُن میں بہترین انسانی صفات مثلاً حِلم، انکساری، ہمدردی، رحم، محبّت وغیرہ کا وُہی حال ہوتا ہے جو بنجر زمین میں اچھے بیج کا ہوتا ہے۔ چُونکہ وُہ فطرتی میلانات سے محرُوم ہوتے ہیں اُن میں غیر فطرتی جذبات اور حرکات پیدا ہو جاتی ہیں اور وُہ انسانیت سوز افعال کے مُرتکب ہو جاتے ہیں۔ اُن کی خُودی خُود پرستی کی صُورت اختیار کر لیتی ہے

اور اُن میں دولت و طاقت کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اُمیہ بنی عباس کے خلفا کے زمانہ میں حکومت اور سلطنت دراصل غلاموں، خوجوں اور کنیزوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ چنانچہ یزید بن عبدالملک کا حبابہ سے عشق اور ہارون رشید کا ذات الخال کے ساتھ عشق تاریخی شہرت رکھتا ہے۔ ہارون کی ماں خیزران خود کنیز تھی۔ خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ الترکیہ لونڈی تھی۔ ان کا جو اثر سیاستِ وقت پر تھا وہ کسی مؤرخ سے مخفی نہیں ہے۔ عہدِ خلفا میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قدرت و اقتدار کا یہ حال تھا کہ کہنے کو تو وہ خلفا کی لونڈیاں تھیں لیکن حقیقت میں خلفا اُن کے غلام ہوتے تھے۔

(۷)

ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب چوتھی صدی میں ساسانی شہنشاہوں نے ایران کی کلیسیا کو قتل و غارت کرنا شروع کیا تھا تو ایرانی مسیحیوں کا ایک بڑا گروہ تاجر توما کی سرکردگی میں جنوبی ہند ہجرت کر گیا تھا جہاں یہ مسیحی ہمیشہ کے لیے بس گئے تھے۔ اور اُن کی ہجرت سے جنوبی ہند کی کلیسیا میں زندگی ازسرِ نو عود کر آئی تھی۔ وہاں کلیسیا کے پاؤں ایسے جم گئے کہ پھر کبھی نہ اُکھڑے۔ اور جنوبی ہند کی کلیسیا کا مستقبل ایسا روشن ہوتا چلا گیا کہ اس کا اثر صدیوں سے آج کے دن تک چلا آیا ہے۔ اس کا مفصل ذکر ہم جلد دوم میں کر آئے ہیں۔ یہ اسلام کی آمد سے قریباً دو صدیاں پہلے کی بات ہے۔

جب اسلامی افواج نے ایران کو فتح کر لیا تو جیسا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں بہت سے زرتشتی خاندان جو اسلام کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے شمالی ہندوستان میں آ بسے جن کی اولاد "پارسی" کہلاتی ہے۔ یہ بات بہت اغلب ہے کہ اُن کی دیکھا دیکھی مسیحی کلیسیا کے شرکا نے بھی ہجرت کا یہی طریقہ اختیار کر لیا جو دو

صدیاں پہلے مسیحیوں نے شاپور اعظم کے دنوں میں کیا تھا۔ ابھی اسلام نے ہندوستان میں اپنے قدم نہیں جمائے تھے اور ہمارے ملک میں کوئی باقاعدہ اسلامی حکومت نے کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پس یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ہمسایہ اسلامی ممالک کے غیور مسیحی قرآنی احکام اور شرعِ اسلام کے قوانین اور پابندیوں سے تنگ آ کر اور اسلامی سلطنت کے نظام اور مسلمان خلفا اور حکام کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہندوستان میں توما تاجر اور زرتشتیوں کی طرح ہجرت کر آئے تھے۔

ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں کہ ان صدیوں کے دوران میں جب اسلام غالب ہو رہا تھا، ہندوستان کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب اور وسط میں بہت سی کلیسیائیں قائم تھیں جو بڑی سُرعت سے ترقی کر رہی تھیں۔ انجیل کے رُوح پرور پیغام نے ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں متلاشیانِ حق کو متاثر کر رکھا تھا۔ ان متلاشیوں میں سے ہزاروں افراد نے منجی پر ایمان لا کر نجاتِ سرمدی حاصل کر لی تھی۔ جو گو ہزارہا ہندو کلیسیا میں باقاعدہ طور پر شامل نہ ہوئے انہوں نے انجیلی تعلیم کی روشنی میں اپنے دھرم کی پستکوں کی نئی تاویل کی اور اپنے مذہبی عقائد کو مسیحیت کے عقائد کے مطابق کیا۔ اُس زمانہ میں ہندو مذہب کی وہی حالت تھی جو اُنیسویں صدی میں تھی جب مسیحیت کے احیاء اور ممالکِ مغرب کے مبلغین کی آمد نے ہندو دھرم میں نئی نئی تحریکیں پیدا کر دیں اور برہمو سماج، آریہ سماج وغیرہ گروہ وجود میں آ گئے۔ اُن صدیوں میں بھگتی کی تحریک زور پکڑ گئی اور پرانے فرسودہ عقائد اور فلسفہ کی تجدید ظہور میں آئی۔ اُس زمانہ میں بھی مذہب ہندوستان میں ایک جیتا جاگتا مذہب تھا جو نسطوری علما اور فضلاء کی لگاتار کوششوں سے دن

بدن مُلک کے مختلف گوشوں میں پھیلتا اور ہندوؤں کے فلسفیانہ خیالات و معتقدات میں تبدیلیاں پیدا کرتا جاتا تھا۔ اس کا مفصل ذکر ہم جلد دوم میں کر آئے ہیں۔

ان جنوبی مسیحی کلیسیاؤں کے شمر کا جو ہندوستان ہجرت کر کے چلے آئے ہونگے، ہندوستان کی کلیسیا کے لئے مستحکم اور مضبوط ہونے کا باعث بنے ہونگے۔ اُن کی آمد سے نہ صرف کلیسیاؤں کی تعداد اور علم و فضل میں اضافہ ہُوا ہوگا بلکہ اُن کے علوم و فنون، اُن کی تجارت اور اُن کی ذہنی قابلیت اور روحانی کمال اور مذہبی تصورات سے ملکِ ہندوستان کو فائدہ پہنچا ہوگا۔ عام طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت مسیحی اقلیت کو بنظرِ استحسان دیکھتی تھی۔ ہمارے مستند مؤرخ ان قدیم صدیوں کی اصلاحی مذہبی تحریکات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن وہ ان تحریکات کے اسباب و علل کو بیان نہیں کرتے۔ لیکن جب ہم ان امور کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ صرف ہندوستان کی تاریخ بلکہ اس کے ہمسایہ ممالک کے تاریخی حالات پر وسیع نظر ڈال لیتے ہیں اور ان کے باہمی تعلقات اور تاثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور تاریخی واقعات کے مختلف اسباب و علل پر اور ان واقعات کے ردِ عمل پر غور کرتے ہیں تو یہ اصلی اسباب ہماری نظروں کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان صدیوں کے دوران میں انجیلی تعلیم اور مسیحی عقائد نے ہمارے وطنِ عزیز کو متاثر کر رکھا تھا گو اس حقیقت کا ذکر کتبِ تاریخ میں نہیں ملتا۔

(۸)

یہ نسطوری مسیحی علماء ہمارے مُلک اور ہندوؤں کے مذہبی عقائد

اور کتب سے پہلے ہی واقف تھے۔ بحیرۂ عرب جو ملکِ عرب اور ہند دونوں کے کناروں کو چھوتا ہے تاریخ کے آغاز ہی سے تجارتی شاہراہ رہا ہے۔ مصر اور شام کے شہروں سے عرب تاجر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی ساحلوں اور ایران کے جنوبی ساحل کا سفر کر کے سندھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات کی بندرگاہوں میں اُترتے تھے اور ہند کے ساحلوں سے ہوتے ہوئے کالی کٹ اور لنکا، بہار اور سیام اور چین جا پہنچتے تھے۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے خلفا کے زمانہ میں عربوں نے مشرق و مغرب کی تجارت پر قبضہ کر لیا تھا۔ بنی عباس کے عہدِ زریں میں (جس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے) متعدد ہندو فضلا بغداد گئے اور یہاں کی کتب اپنے ہمراہ لے گئے۔ خلفاء کے برامکہ وزیر ان ودوانوں کے سرپرست تھے۔ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے پہلے برامکہ بدھ مت کے پیرو تھے پس وہ ہندوستان اور اس کی مذہبی کتب سے عقیدت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی ہمت افزائی سے سنسکرت کی بعض کتابوں خصوصاً فلکیات اور طب کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ برہم سدھانت کا عربی ترجمہ "سند ہند" کہلاتا ہے۔ ہارون رشید کے بیت الحکمت میں سنسکرت کتابیں بھی تھیں۔ ہندوستان کا ایک ماہر خلیفہ کا معالج مقرر ہُوا اور کتبِ طب چرک، دھن شاستر، اشٹانگ وغیرہ کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔ ہندوستان کے ماہرِ فلکیات آریہ بھٹ کی کتب کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ چھٹی صدی میں نوشیرواں کے زمانہ میں پنچ تنتر کا ترجمہ پہلوی زبان میں کلیلہ دمنہ کے نام سے کیا گیا تھا۔ اب اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ پنڈت گنندھیائے کی کتاب برہت کتھا اور سوم دیو کی تصنیف سرت ساگر اور گوتم بدھ کے حالاتِ زندگی لیلت وستار پہلے ہی بغداد پہنچ چکے ہُوئے تھے۔ سنسکرت کی کتاب سہستر رجنی پہلوی زبان میں "ہزار داستان" کے نام سے ترجمہ ہو چکی تھی اور اب وہ الف لیلہ کے نام سے عربی زبان میں ترجمہ کی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس ۵۳ سنسکرت کتابوں کا بغداد میں ترجمہ کیا گیا تھا جن میں مہا بھارت، منطق،

کھنڈکھنڈیا (علم النجوم)، گنت (علم الحساب)۔ استری روگ سرپ چکتسا۔ پشو چکتسا۔ اترے پاتنیا شاستر وغیرہ شامل تھے خلیفہ مامون کے زمانہ میں بیت الحکمت کی کتب میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ وُہ علم دوست خلیفہ تھا۔ خلیفہ متوکل نے بھی ہندوستان سے سنسکرت کی کتابیں منگوائیں یہیں عربی علوم کی توسیع میں جہاں یونانی۔ سریانی وغیرہ زبانوں نے (جیسے ہم آگے چل کر بیان کرینگے) حصہ لیا وہاں ہندوستان نے بھی اس کی وسعت میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور اسلامی ممالک میں ثقافتی تعلقات بھی تھے جن کا ایک دلچسپ ثبوت شطرنج کا کھیل ہے۔ چوسر کے کھیل کو بھی عباسی خلفا کے دور میں عام مقبولیت حاصل تھی۔ عرب سیاح، جغرافیہ دان اور مؤرخ بھی خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہندوستان آتے تھے جن میں سلیمان۔ مسعودی۔ بیرونی اور ابنِ بطوطہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان فضلا نے زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، ہندوستان کی اقوام و مذاہب اور علم ادب وغیرہ سے دُنیائے اسلام کو رُوشناس کرایا تھا۔

پس جب نسطوری کلیسیا کے علما اور فضلا اسلام کے احکام اور نظامِ سلطنت سے تنگ آکر ہندوستان ہجرت کر کے آتے ہونگے تو وُہ کسی اجنبی مُلک میں نہ آتے تھے بلکہ وُہ ہمارے وطن کی کتابوں، مذہبوں اور باشندوں وغیرہ سے واقف تھے۔ اس کے علاوہ وُہ ایسے مُلک میں آتے جہاں اُن کی اپنی کلیسیا کے مبلغین صدیوں سے انجیل کا پیغام سُناتے رہے تھے۔ اور جہاں اُن کے بشپ اور آرچ بشپ اپنے صدر مقام رکھتے تھے اور جہاں کے مسیحی اُنہی عقائد کو مانتے اور مذہب کے اُنہی دستوروں پر عمل کرتے تھے جن کو وُہ خود مانتے تھے۔

باب چہارم

عہدِ خلفاء کے مسیحی اطبا حکما اور فضلا

تاریخ کا مطالعہ ہم پر ظاہر کر دیتا ہے کہ شام کے مسیحی مغربی ممالک میں فرانس تک حاملانِ تمدن کی حیثیت سے پہنچ گئے تھے۔ اہل شام شراب اور ریشم وغیرہ یورپ کے ممالک میں لے گئے۔ اُنہوں نے یُونانی علوم و فلسفہ کو سکندریہ اور انطاکیہ سے لاکر مشرقی ممالک میں مروّج کر دیا۔ چنانچہ اڈاسا، نصیبین، حرّان، نیشاپور وغیرہ کے مدرسوں میں ان کے درس جاری تھے۔ کلیسیاؤں کی زبان شامی اور خانقاہوں کے مدرسوں میں یُونانی سکھائی جاتی تھی۔ یعقوبی کلیسیا کے مرکزِ تعلیم راس عین اور قنسرین تھے۔ ان مدرسوں میں انجیل جلیل اور عقائدِ کلیسیا پر تعلیم دی جاتی تھی، لیکن ان میں طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چُونکہ طبیب مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لہذا شامی اور رومی قانون کے مطابق قسیس اور اطباء دونوں محصول سے بری تھے اور دونوں کو مراعات بھی دی جاتی تھیں۔ لیکن قسیس کو طبیب پر ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ قسیس روح کا اور طبیب بدن کا ہی معالج تھا۔ بلکہ نصیبین کے مدرسہ میں تو کُتبِ مقدسہ اور دُنیاوی فنون کی تعلیم مختلف کمروں میں دی جاتی تھی۔ خانقاہوں میں قدما راہبوں کے مراقبے کی زندگی پر زور دیا جاتا تھا۔

عراق عرب میں اڈاسا کے پاس شہر حرّان ایک مخصوص حیثیت رکھتا

تھا۔ جہاں علمِ ہیئت۔ ریاضی۔ نوفلاطونی اور نوفیثا غورثی فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایران میں نیشاپور کے شہر میں فلسفہ اور طب کی تعلیم کے لئے ایک دارالعلوم تھا۔ اس کی بنا نوشیرواں (از ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) نے ڈالی تھی۔ اِس دارالعلوم کے اُستاذ زیادہ تر نسطوری مسیحی تھے۔

ان مدرسوں میں علم و فلسفہ وغیرہ علومِ دُنیوی کی کتابوں کے ترجمے شامی زبان میں کئے گئے۔ ان ترجموں کا زمانہ چوتھی صدی مسیحی سے آٹھویں صدی مسیحی تک تھا۔ بالفاظِ دیگر یہ ترجمے رسُولِ عربی کی پیدائش سے دو صدیاں پہلے شروع کئے گئے اور خلفاء عباسیہ کے عہد تک جاری رہے۔ چوتھی صدی میں فلسفیانہ اقوال کے مجموعوں کا ترجمہ کیا گیا۔ غالباً پہلا مترجم فروبس تھا۔ یہ بڑا عالم شخص تھا جو افطاکیہ کا طبیب حاذق اور قسیس تھا اور پانچویں صدی کے پہلے نصف میں تھا۔ اُس نے ارسطو کی کُتب کی شرح بھی لکھی تھی۔ لیکن اس عالم سے بھی زیادہ مشہور سرجیئس تھا جو راس عین کا تھا۔ اِس فاضل طبیب اور راہب کو سکندریہ کے علوم پر پُورا عبور حاصل تھا کیونکہ اُس نے اسی شہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس نے نہ صرف اخلاقیات اور دینیات کی کتابوں کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا تھا بلکہ طبیعات۔ طب اور فلسفہ اور علومِ باطن کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ وُہ ۵۳۶ء میں ستر سال کی عُمر پا کر قسطنطنیہ میں فوت ہو گیا۔ چھٹی اور ساتویں صدی کے فضلاء میں یعقوب (از ۶۴۰ء تا ۷۰۸ء) کا نام مسیحی فضلا میں بڑا مشہور ہے۔ اُس نے مسیحی مذہب کی کُتبِ دینیات کا یُونانی سے ترجمہ کیا۔ وُہ بڑا قابل فلسفہ دان تھا جو مرجعِ خلائق تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اُس سے پُوچھا کہ کیا یہ جائز ہے کہ عیسائی پادری مسلمانوں کے لڑکوں کو پڑھائیں تو اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ شامی مسیحیوں کے ترجمے

نہایت صحیح ہوتے تھے۔ اُن کو فلسفیانہ اقوال سے اور فیثا غورثی افلاطونی باطنی حکمت سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اُن کو ارسطو کی منطق سے بھی بہت دلچسپی تھی۔

شام کی کلیسیا کے عالموں کی ہر جگہ بڑی مانگ تھی۔ عرب اور عوام مسلمانوں پر اُن کا ایسا اثر تھا کہ بالفاظِ مؤرخ درہ بوتر "عرب علماء شامی زبان کو سب سے قدیم یا اصلی قدرتی زبان سمجھتے تھے"۔

(۲)

مُلکِ شام کے مردم خیز خطّہ کے مقابلہ میں اسلام ریگستانِ عرب میں پیدا ہوا جس کی فضا علم و فن کے نشو و نما کے لئے بادِ سموم کا سا اثر رکھتی ہے۔ چنانچہ مولانا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں "مصر و شام کے فنونِ اسلامیہ میں بھی ریگستان کی اُداسی، ریگستان کی عُریانیت اور وُہی ریگستان کی شان و شوکت پائی جاتی ہے" (نگار جنوری فروری ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۷)۔ پھر وُہ لکھتے ہیں "عہدِ جاہلیت میں عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے۔ اُن کو اپنے اُمّی ہونے پر ناز تھا۔ . . . وُہ کہتے تھے کہ جو قوم اپنے تیر و کمان، نیزہ اور تلوار سے کام لینا جانتی ہے اُس کو تعلیم کی ضرورت نہیں۔ رسُول اللہ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی عربوں کا یہی حال رہا، اور وُہ مطلق تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ واقدی کے حوالے سے بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قریش کے اُمراء میں سے صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے جن میں حضرت عُمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ تھے" (ایضاً صفحہ ۱۳)۔

فنونِ لطیفہ عموماً چھ قسم کے شمار کئے جاتے ہیں۔ فنِ عمارت۔ فنِ سنگتراشی فنِ مصوّری۔ فنِ رقص۔ فنِ موسیقی۔ اور فنِ نظم گوئی۔ ان فنون میں سے اسلام نے دُوسرے فن کی ہمیشہ ممانعت کی اور سنگتراشی کو ممنوع قرار دیا۔ تیسرے فن کی اکثر ممانعت کی اور چوتھے اور پانچویں فنون کو عموماً اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ چنانچہ

پاکستان کی ۱۹۵۳ء کی تحقیقاتی رپورٹ میں ہے "اسلامی مملکت کے دُوسرے اثرات و نتائج یہ ہونگے کہ ہر قسم کی سنگتراشی، ناخن بازی۔ تصویر کشی، انسانوں کی عکسی تصاویر، موسیقی، رقص، مخلوط اداکاری، سینما۔ تھیٹر۔ سب کچھ بند کر دینا ہوگا"۔ (صفحہ ۲۴۸)۔

فنِ عمارت کے متعلق مولانا نیاز لکھتے ہیں "جب رسُول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکر نے اعلانِ جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے یازنطینی اور قبطی کنائس (گرجاؤں) میں جو بھی اُن کے سامنے آئے، اُن پر اپنے مذہب کے اثرات قائم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ اُن کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وُہ جہاں پہنچے مخلی بالبطن ہو کر پہنچے۔ کنائس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں، اُن پر اُنھوں نے رنگ پھیر کر، قبلہ رُخ دیوار میں ایک محراب کھود لی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مصری، یُونانی یا رُومی کنائس کی محرابوں میں جہاں کہیں اُن کو پُرانے ستون یا فیلپائے ملے، اُنھوں نے جمع کر کے سر اور پایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرُونی صحن میں اردگرد وضُو کے لئے متوازی قطاروں پر منحنی شکل کی محرابیں قائم کر دیں"۔ (ایضاً نگار صفحہ ۱۷۳)۔ بعد کے زمانہ میں اسلامی عمارات کے ماہرین یا عیسائی ہوتے تھے یا دیگر غیر مُسلم ہوتے تھے۔ یا ایسے مُسلمان ہوتے تھے جو غیر مُسلم ادیان سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ جس طرح قسطنطنیہ کا سینٹ صُوفیاہ کا گرجا عثمانی سلطنت کے زمانہ میں مسجدوں کا نمُونہ ہوتا تھا اُسی طرح خلفا کے زمانہ میں غیر مُسلموں کے مُعبدوں کو مسجدوں کا نمُونہ بنا لیا جاتا تھا۔ چُنانچہ مصر کی اسلامی عمارات کا نقشہ قبطی کلیسیا کی عمارتوں کا تھا۔ اور مشرقی خلافت کی عمارتوں کا طرز ایرانی طرز

تھا۔ روایت کے مطابق کعبہ کی عمارت کے لئے بھی ایک قبطی مسیحی ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

(۳)

حضرت محمد کی رحلت کے بعد مُسلمانوں کو مُلک گیری اور مفتوحہ ممالک کے انتظام اور دیگر مسائل سے فرصت ہی نہ ملی کہ وُہ بنی اُمیّہ کے عہد تک مابعد الطبیعاتی اور دیگر مسائل پر غور کر سکیں۔ معاویہ نے ایک مسیحی طبیب ابن اثال کو دربار میں بُلایا اور اس جلیل القدر طبیب کو حُکم دیا کہ طب کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرے۔ اس خاندان کا چھٹا خلیفہ ولید خود بہت کم لکھا پڑھا تھا بلکہ عربی تک غلط بولتا تھا۔ ایسے شخص کو بھلا علم و فن سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہاں اِس کے عہد میں ظالم گورنر حجاج بن یُوسف کے ذریعہ قرآن پر نقطے اور اعراب لگا دیئے گئے کیونکہ وُہ اُس وقت تک (۸۶ھ) بغیر اعراب اور بغیر نقطوں کے تھا۔ جب عُمر بن عبدالعزیز مصر کا گورنر تھا تو اُس نے یُونانی علُوم کی طرف کُچھ توجہ دی تھی لیکن ولید ثانی، یزید ثالث، اور مروان ثانی نے علم کی طرف مُطلق توجہ نہ کی۔ جب اواخر عہدِ بنی اُمیہ میں صرف جبر و قدر کے مسئلہ نے سر اُٹھایا تو ہشام بن عبدالملک (از ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) نے بعض ایرانی النسل قدریوں کو قتل اور بعض کو قید کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ بنی اُمیہ کے خلفاء کو عیش و عشرت سے اور جنگوں سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کی حکومت مذہبی نہ رہی تھی۔ حکومتِ اسلام کا اب رنگ بدل گیا تھا اور دُنیاوی جاہ و جلال کے مناظر ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ اُن کا سیاسی نقطۂ نگاہ قرآنی نہ تھا۔ مثلاً قرآن کے مطابق معاملات شوریٰ سے طے کئے جانے چاہئیں۔ جیسا قرآن میں آیا ہے "امرھم شوریٰ بینھم"۔ "وشاورھم فی الامر"۔

"اطیعو اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"۔ لیکن بنی امیہ نے (جیسا ہم بتلا چکے ہیں) اسلامی سلطنت کے بنیادی اصول بدل دیئے اور وراثت کا اصول اسلامی سیاست میں داخل ہو گیا۔ اب خلفا قوم کے متولی نہ رہے بلکہ شہنشاہ ہو کر مطلق العنان ہو گئے اور انہوں نے سید امیر علی مرحوم کے الفاظ میں "تعلیم و تہذیب کی ترقی کی طرف توجہ نہ دی۔ ان کی حکومت خالص عربی نژاد لوگوں کی حکومت تھی۔ چونکہ عرب کو فطرت نے درشت اور کھردری طبیعت ہی دی تھی لہٰذا ملکی فتوحات کے باوجود ان کی طبیعت نہ بدلی اور اس میں وہ لچک پیدا نہ ہوئی جو تمدن کے لئے لازمی ہے"۔ (سپرٹ آف اسلام)

بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ میں مسیحی کلیسیا علما اور فضلا حکما اور اطبا کی جماعت تھی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ امیر معاویہ نے مسیحی حکیم اور طبیب ابن اثال کو طب کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے کام پر مامور کیا تھا۔ اور عبدالملک کے زمانہ تک مسیحی کتاب ہوا کرتے تھے۔ اس حکومت کے زمانہ میں یوحنائے دمشقی کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے جس نے مشرق و مغرب کی کلیسیاؤں کے علم الٰہیات کو متاثر کیا اور مسیحی عقائد پر متعدد کتابیں لکھیں۔ اس علامۂ عصر کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ اس کے خیالات نے اسلام پر بھی اثر ڈالا۔ اس کے فلسفہ سے متاثر ہو کر اسلام میں "ارجاء اور قدریت" کے عقائد پیدا ہو گئے۔

فلسفہ کا پہلا مرکز جس سے مسلمان واقف ہوئے مسوپوتامیہ میں حران کا مرکز تھا۔ چنانچہ مسعودی یونانی فلسفہ کو حران سے متعلق کر کے افلاطون، ارسطو اور فیثاغورس کے فلسفیانہ عقائد کا ذکر کرتا ہے۔ ایڈیسہ اور نصیبین بھی فلسفہ کے مشہور مرکز تھے۔ ان اور دیگر تمام مرکزوں میں حکمت و فلسفہ

کے استاد اور شاگرد مسیحی ہوا کرتے تھے۔ مسیحی علما اور فضلا نے یونانی حکماء کی تصنیفات کا ایران میں قبل از اسلام پہلوی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ نسطوری کلیسیا کے بیسیوں فاضلوں کی بدولت یونانی فلسفہ اور علوم کا ہر جگہ چرچا ہوتا رہتا تھا۔ بنی امیہ کے عہد میں حران کے مسیحی اپنے ایمان پر قائم رہے اور مسیحی ایمان کا نور ملک شام میں چمکتا رہا۔

(۴)

جب بنی عباس برسر اقتدار آئے تو خلافت کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ بنی امیہ کے خلفا نے تو سیاست کو مذہب اسلام سے الگ کر دیا تھا لیکن بنی عباس نے ایک قدم آگے بڑھ کر تہذیب و تمدن، آداب دربار اور طرز معاشرت وغیرہ کو بھی اسلام کی ہمہ گیری سے علیحدہ کر دیا۔ یہ حکومت درحقیقت ایک صدی تک (از ۷۴۹ء تا ۸۴۶ء) ہی رہی جب عنان خلافت متوکل کے ہاتھ آئی کیونکہ اس زمانہ کے بعد ان کی سلطنت کی وسعت نہ ہوئی۔ اس کا عہد زریں خلیفہ مامون پر ختم ہو جاتا ہے۔

بنی عباس نے اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے ایرانیت کے لئے رعائتیں منظور کیں اور مذہبی اور سیاسی تحریکوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان خلفا کے خیالات عجمی عنصر رکھتے تھے اور ان کی خلافت کے ساتھ ساتھ ایرانی اثر نظام حکومت میں غالب ہو گیا۔ عربوں کا اقتدار کم ہو گیا۔ علوم و فنون کی طرف توجہ ہو گئی۔ تمدن و معاشرت کے لوازم فراہم ہو گئے۔ مذہب میں زیادہ وسعت کی نگاہ پیدا ہو گئی۔ بنی عباس کے پہلے خلیفہ سفاح ہی کے وقت سے ایرانیوں کی روشن خیالی کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ عہد عباسیہ سے پہلے وزیر کا وجود نہیں ہوتا تھا لیکن اس حکومت میں یہ عہدہ قریب

قریب ایرانیوں کے ہاتھوں میں رہا جنھوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیا۔ لیکن ان کو اپنی ذمہ داریاں نہایت حزم و احتیاط سے پوری کرنی پڑتی تھیں کیونکہ حاسد اس تاک میں رہتے تھے کہ اُن پر مجوسی الاصل ہونے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی الزام لگا دیں۔ اُن کو خلیفہ مامُون کے عہد میں عروج حاصل ہُوا کیونکہ اُس کی ماں اور بیوی ایرانی نسل کی تھیں۔ عربوں نے مامُون کے خلاف ایک قسمت آزما جنگ بھی کی تھی جس میں وُہ ناکام رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان خلفا میں ایرانی تہذیب و معاشرت نے گھر کر لیا۔ چنانچہ پہلے مسلمانوں میں جشنِ نوروز کا رواج نہ تھا لیکن عہدِ عباسیہ میں ہر شمسی سال کے پہلے دن جب آفتاب بُرجِ حمل میں جاتا ہے یہ جشن منایا جاتا تھا۔ بغداد میں ایرانی وضع عام ہوتی گئی۔ نوروز، مہرگان (خزاں کا مہینہ) وغیرہ ایرانی تقریبات نہایت اہتمام سے عمل میں آتی تھیں۔ درباری لباس بھی ایرانی ہو گیا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص بغیر قلنسوہ (مخروطی شکل کی ایک لمبی سیاہ ٹوپی) پہنے دربار میں نہ آسکتا تھا۔ ساسانی بادشاہوں کے دربار کے توسط سے آداب خلفا کے دربار میں رواج پا گئے۔

ان سیاسی اور سماجی حالات کا اثر تدریجاً اسلامی اخوت و مساوات پر پڑا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ بانیٔ اسلام کے زمانہ ہی میں بنو ہاشم اور قبائل قریش میں رقابت اور مخاصمت تھی۔ جب مکّہ فتح ہو گیا اور قریش اور بنی اُمیّہ نے مجبور ہو کر اسلام قبول کر لیا تو حضرت محمد کی دُور اندیشی اور حکومت کے مضبوط ہاتھوں کی وجہ سے دو سال تک عرب کے قبائل میں آشتی اور صلح ہو گئی لیکن اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ رقابت اور مخاصمت پھر پھوٹ پڑی اور اگر ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے خلفا نہ ہوتے تو اُمّتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی ہوتی

عثمان کی خلافت میں یہ خفتہ جذبے پھر جاگ پڑے اور علی کے عہد میں تلوار اہلِ قبلہ میں چلتی رہی"۔ اُن کے بعد واقعۂ کربلا پیش آیا۔ بنی اُمیّہ کے عہد میں آلِ رسُول اور بنی عباس مقہور و مغضوب رہے۔ لیکن بنی عباس نے خراسانیوں کی مدد سے خلافت حاصل کر لی اور بنی اُمیّہ کو چُن چُن کر قتل کر دیا۔ عباسی خلفا کے خیالات ایرانی فضا میں سانس لینے لگے۔ عربوں اور ایرانیوں میں رقابت اور عناد پیدا ہو گیا۔ سُنّی اور شیعہ جماعتوں کے جھگڑے پیدا ہو کر بڑھتے ہی گئے۔ سُنّی اور شیعہ عربوں کو ایرانی شیعوں سے نہ صرف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے عربوں کے خلاف شعوبیہ جماعت قائم کر دی تھی جو تقریر و تحریر کے ذریعہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کو غیر مہذب وحشی اور حقیر قوم ثابت کرتے تھے بلکہ وُہ یہاں تک کہتے تھے کہ ایرانی اسلام کے عقائد پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ سُنّی نحوی اصمعی (المتوفی ۲۱۳ھ) نے برامکہ کے خلاف یہ شعر کہے "جب کسی صحبت میں شرک کی گفتگو ہوتی ہے تو برامکہ کے چہرے خوشی سے لال ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب اُن کے سامنے قرآن کی کسی آیت کی تلاوت کی جاتی ہے تو وُہ فوراً مزدک کی روایات پیش کر دیتے ہیں"۔ ایک اور دِل جلے شاعر نے بنی عباس کی نسبت یہ شعر کہا "بھاڑ میں جائے بنی عباس کا نام نہاد انصاف۔ کاش کہ ہم ہمیشہ بنی مروان کا ظلم ہی سہتے رہتے"۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ عرب کو فطرت نے درشت طبیعت دی تھی جس میں کوئی لچک پیدا نہ ہوئی جو تمدن کے لئے لازمی ہے۔ جب ایران فتح ہُوا اور وہاں کے صاحبِ علم و فضل لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے انہی ایرانی النسل فضلا نے عربی زبان کے قواعد مرتب کئے۔ چنانچہ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان فضلا میں اکثر نام اُن ایرانیوں کے ہیں جو جنگی

قیدی ہوکر موالی ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے اسلام کے لئے اعلیٰ ترین خدمات انجام دیں۔ ان فضلا میں متعدد اشخاص ایسے بھی تھے جو مسیحیت کو ترک کر کے اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے تھے۔ قومی اور نسلی اختلافات کی وجہ سے عرب تمام غیر عرب اور بالخصوص ایرانیوں کو اور غیر عرب اور ایرانی عربوں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایرانی اسلام لانے کے صدیوں بعد بھی اپنے قدیم دستورات روایات اور ایرانی سلطنت کی ساسانی ثروت و سطوت کو نہ بھولے۔ چنانچہ فردوسی ایرانیوں کے قبول اسلام کے چار صدیاں بعد عربوں کی فتح ایران کی نسبت لکھتا ہے۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار ✤ عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تاج کیاں را کند آرزو ✤ تفو باد بر چرخ گرداں تفو

(یعنی عرب کے باشندے اُونٹوں کا دودھ پی کر اور گوہ جانور کو کھا کر اب اس نوبت تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ ایران کے شہنشاہوں کے تاج و تخت حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں ایسے گردش کرنے والے آسمان پر تھوکا جائے)

عجم و ایران کے موالی اپنی ذاتی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے عہدِ بنو امیہ میں بھی نمایاں شہرت حاصل کر گئے۔ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد صرف ایرانی النسل مسلمانوں کی مدد سے قائم ہوئی اور اُنہوں نے ہی اس حکومت کو انتہائی عروج دیا۔ وزیر کا عہدہ ایرانیوں کے ہاتھ میں رہا اور گو اُنہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بطرزِ احسن انجام دیا پھر بھی خلفا اپنے ایرانی نژاد وزیروں کو مشکوک نگاہوں سے ہی دیکھتے رہے۔ اور خطروں نے ان وزیروں کا دامن نہ چھوڑا۔ چنانچہ ابو مسلم بُری طرح قتل کیا گیا۔ اسی ابو مسلم نے ابو سلمہ کو خلیفہ سفاح کے حکم سے بُری طرح ہلاک کیا تھا۔ ابو مسلم

کے بعد ابو الجہم وزیر تھا جس کو خلیفہ نے زہر دے دیا۔ پس یہ ایرانی وزیر ہمیشہ ڈرتے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا اُن سے کوئی ایسی حرکت صادر ہو جائے جس سے اُن پر مجوسی الاصل ہونے کا الزام لگ جائے۔ چنانچہ ایک دفعہ خلیفہ منصور نے ابو ایوب سے مشورہ کیا کہ ایوانِ کسریٰ کو منہدم کر کے اس کے سامان سے ایک اور محل تیار کیا جائے۔ لیکن جب خالد بن برمک سے اس کا ذکر آیا تو اُس نے خلیفہ کی رائے کے خلاف کہا۔ منصور نے برہم ہو کر کہا کہ تو جب کوئی بات کہتا ہے تو اس سے ہمیشہ اُن کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے۔ ایک روز خلیفہ ہارون رشید اپنے وزیر جعفر برمکی کے ساتھ بغداد سے باہر جا رہا تھا کہ راستہ میں اُونٹوں کی قطار ملی جن پر خلیفہ کے لئے عاملِ خراسان نے سونا لاد کر بھیجا تھا۔ اس سے پہلے خراسان کا گورنر جعفر کا بھائی فضل برمکی تھا جس کو ہارون نے معزول کر دیا تھا۔ خلیفہ نے جعفر سے طنزیہ پوچھا کہ تیرے بھائی کے زمانہ میں یہ سونا کہاں تھا۔ جعفر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہ سونا اُن لوگوں کے گھروں میں تھا جو اُس کے جائز حقدار تھے۔ ظاہر ہے کہ جب خلفا اپنے دیرینہ خادموں کو (جن کے آباؤ اجداد زرتشت کے مذہب کو چھوڑ کر حلقۂ اسلام میں آئے تھے) اور جو اُن کی سلطنت کے استحکام اور عروج کا باعث تھے، مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اخوتِ اسلامی کے رشتہ میں منسلک ہونے کے باوجود غیر ایرانی اُن سے بغض و عناد رکھتے تھے تو بیچاری مسیحی کلیسیا کس شمار و قطار میں تھی کہ وہ ذلت کی زندگی سے بچی رہتی۔ خلافتِ عباسیہ کا زمانہ مشرق کی مسیحی کلیسیاؤں کی پراگندگی اور انتشار اور انشقاق کا زمانہ ہے۔

دولتِ عباسیہ کا صدر مقام عرب سے باہر اور عجم کے قریب بغداد کا

شہر تھا۔ عباسی حکومت کا مایۂ خمیر پارسی اور عیسائی قومیں تھیں جن کا ہر قسم کا لٹریچر اِس زمانہ میں زندہ لٹریچر تھا۔ اُن کے میل جول سے عباسی ارکانِ حکومت کو خود بخود علومِ عقلیہ کا شوق پیدا ہُوا۔ محکوم قوموں کی آمیزش سے علوم و فنون میں مسیحی فلاسفہ کا رنگ آگیا۔ عباسی خلفا نے عرب کی قدیم سادگی ترک کر دی اور وُہ علوم و فنون کے مربّی بن گئے۔ مُلک میں ایسی درسگاہیں موجود تھیں جو اس انقلاب کے وجود میں آنے میں مددگار تھیں۔ نسطوری مسیحیوں کے متعدّد مدارس ہر طرف پھیلے ہُوئے تھے جہاں افلاطون، ارسطوؔ اور دیگر شارحین ارسطو کی تصنیفات شامی یا عبرانی ترجموں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں۔ مُلک میں خلفا اور اُن کے اُمراء کی طفیل ایک علمی انقلاب پیدا ہو گیا جن کا ذریعہ مسیحی عالم، حکیم اور طبیب تھے۔ لیکن چُونکہ فلسفہ اور سائنس وغیرہ کی کتابوں نے اُمرا اور خلفا کے طبقہ کے زیرِ اثر اشاعت پائی تھی اور فنون کی گرم بازاری صرف خلیفۂ وقت کے دم سے ہی تھی اس بنا پر عوام النّاس کا طبقہ (جو محدّثین کے زیرِ اثر اور مذہب اسلام اور فقہ پر سختی سے پابند تھا) فلسفہ اور علم و حکمت سے محروم ہی رہا۔ اور عباسیوں کی کوشش دیرپا نہ رہی۔ اِسی کوشش کے باعث بنی عباس کی خلافت ممتاز ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کہتے ہیں "عباسیوں کو جس چیز نے دُنیا کی تاریخ میں زیادہ نامور کر دیا وُہ اُن کے علم کی فتوحات ہیں جس کا اقرار ایشیا اور یورپ دونوں کو ہے اور جس کی وجہ سے یورپ کی اُستادی کا مُردہ فخر آج بھی مسلمانوں کے دماغ کو مختل رکھتا ہے" (المامون حصّہ ۲)

لیکن فی الحقیقت اِس کوشش کی مُدت بیس پچیس سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ مامون نے ہر چند کوشش کی کہ عام مسلمان فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات کی طرف رجُوع کریں لیکن یہ مامون کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے بعد بیت الحکمت

حکومت کی سرپرستی سے محرُوم ہو گیا۔ ۱۰۶۵ء میں پہلی جامعہ بغداد میں قائم کی گئی۔ اُس وقت سے اسلامی علوم بندھے ٹکے اصُولوں پر چلے آ رہے ہیں۔ اُستاد وُہی پڑھاتا ہے جو اُس نے اپنے اُستادوں سے پڑھا ہے۔ اور کسی نئی کتاب میں ایک لفظ بھی اِس سے زیادہ نہیں ہوتا جو پرانی کتابوں میں پہلے سے موجود ہے۔ فلسفہ محض بیکار سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ دسویں صدی میں ایک مُسلمان لکھتا ہے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان چیزوں سے کیا فائدہ ہے اور پھر ان سے عقائد میں خلل پڑتا ہے اور وُہ نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے خُدا پناہ میں رکھے" (دولونہ صفحہ ۲۶)۔ خلفاء بھی اب فلسفہ اور علم کے مربّی ہونے کی بجائے اُن کی تخریب کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ مولوی محمد یونس لکھتے ہیں "چھٹی صدی ہجری میں چاروں طرف مُلک میں یہ خبریں برابر پھیلتی رہتی تھیں کہ آج فلاں مقام پر فلسفہ کی کتابیں نذرِ آتش کی گئیں آج فلاں فلسفی کا اثاثہ کُتب برباد کر دیا گیا۔ آج فلاں فلسفی کو حکومت کے عُہدہ سے معزُول کر دیا گیا۔ چنانچہ خلیفہ مستنجد (از ۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۰ء) کے حُکم سے بغداد میں ایک مشہور قاضی کا کُتب خانہ برباد کیا گیا کیونکہ اس میں فلسفہ کی کتابیں خاص کر ابن سینا کی تصنیفات اور رسائل اخوان الصفا کی جلدیں موجود تھیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے بیٹے الرکن عبدالسلام ایک صُوفی منش اور فلسفیانہ مذاق بزرگ تھے جنہوں نے اپنے مذاق کی کتابیں بے حد جمع کر رکھی تھیں۔ دشمنوں نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ بے دین ہیں اور صفاتِ باری کے منکر ہیں۔ ان کی کتابوں کی جانچ ہُوئی اور فردِ قرار دادِ جُرم ثابت ہو گئی کیونکہ ان کے ہاں فلسفہ کی گمراہ کُن کتابوں کا انبار لگا تھا۔ خلیفہ ناصر (از ۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۵ء) نے حکم دیا کہ اُن کتابوں کا ڈھیر لگا کر اس میں آگ لگا دی جائے"۔

(ابنِ رشد مصنفہ محمد یونس انصاری صفحہ ۲۶)۔ مسیحی فضلاء اور مترجمین نے جو کتابیں عربی زبان سے تالیف و تصنیف کی تھیں اور اپنا خون پانی ایک کر کے غیر زبانوں سے ترجمہ کی تھیں ان کا یہ حشر ہوا۔ بنی عباس کے اواخر عہد میں علم و فلسفہ کا جنازہ نکل گیا اور مسیحی کلیسیاؤں کی پراگندگی کے ساتھ ہی علم و فلسفہ اسلامی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈی بوئر اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں لکھتا ہے کہ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جوں جوں مسیحی کلیسیائیں کمزور ہوتی گئیں توں توں مسلمانوں کی کلچر اور فاتحین کی تہذیب میں فرق آنے لگا اور جب بعض ممالک سے مسیحی کلیسیائیں ختم ہو گئیں اور اسلام غالب ہو گیا اسلام کے غلبہ کے ساتھ ہی ملک کا کلچر بھی رخصت ہوتا گیا کیونکہ عرب کا خالص اسلام کسی قسم کی ترقی یافتہ کلچر کا حامل نہ تھا" (باب ہشتم) دو بوئر بھی کہتا ہے "اصلی معنی میں تو "اسلامی فلسفہ" کا نام ہی لینا بے جا ہے۔ نہ تو نئے مسائل سمجھائے تھے، اس نے کوئی خاص نمود حاصل کیا اور نہ پرانے مسائل کے حل کرنے میں۔ مختصر یہ کہ اس نے سادہ خیال میں کوئی بڑی ترقی نہیں کی" (صفحہ ۲۱-۲۲)۔

(۴)

خاندان عباسیہ کے عروج کا بنیادی پتھر ابو جعفر منصور نے رکھا جو بنی عباس کا (از ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) دوسرا خلیفہ تھا۔ وہ علم نجوم اور فلسفہ میں دسترس رکھتا تھا اور ان علوم کے ماہرین کا قدردان تھا۔ اس نے قسطنطنیہ کے شاہنشاہ سے براہِ راست درخواست کی کہ وہ اس کو علم ریاضی کی کتابیں بھیجے۔ اس کے علاوہ آرمینیا۔ مصر۔ شام۔ قبرس اور دیگر ممالک کو بھی اسی غرض کے لئے قاصد بھیجے گئے۔ اس نے حکم دیا کہ اس معاملہ میں خرچ کا

خیال نہ کیا جائے اور ہر ممکن کوشش کر کے فلسفیانہ تصنیفات بہم پہنچائی جائیں۔ اس کے وقت سے خلفائے عباسیہ اور اُن کی رعایا کو عیسائی حکومت بازنطین کے زیرِ اثر یونانی اور رومی فلاسفہ سے تبادلۂ خیالات کے اکثر موقع ملے۔ انطاکیہ اور موصل کے درمیان سریانی کلیسیاؤں کے گروہ خانقاہوں کے اندر یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے لگے۔ یوں یونانی علوم کے ساتھ ساتھ مسیحی خیالات، مسیحی تصورات اور معتقدات اسلامی ملکوں کے خطوں میں پھیلنے لگے۔ حران کے رہنے والے مسیحی جو مسیحیت پر قائم تھے وہ خاص ذریعہ تھے جن کے وسیلے عربوں اور دیگر مسلمانوں نے یونانی تہذیب کو حاصل کیا۔ چونکہ اہلِ حران کامل طور پر عربی زبان پر حاوی تھے اس لئے اُن کے ترجمے نہایت مکمل ہوتے تھے۔

جس تحریک کو منصور نے شروع کیا وہ مامون رشید کے زمانہ میں کمال تک پہنچی۔ خلفائے عباسیہ کے درباری سب مسیحی حکما اور اطبا کی اُن کے علم کی وجہ سے عزت کرتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی پھیلتی پھولتی سلطنت کے لئے اُن کا وجود ناگزیر تھا۔ جو لوگ تاریخِ فلسفہ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ طب اور فلسفہ میں ارسطو کے وقت ہی سے چولی دامن کا ساتھ تھا۔ طب کی تعلیم کے لئے فلسفہ کا مطالعہ لازمی تھا، اور شام کے مسیحی اس میں پشت در پشت کامل دسترس رکھتے چلے آئے تھے۔ ہم آگے چل کر بتلائیں گے کہ مسلمان علمِ طب میں شام کے مسیحی اطبا کے شاگرد تھے اور یونانی طب کو اسلامی طب بنا دینے کا سہرا مسیحی کلیسیا کے فضلا کے سر پر ہے۔

حران کے مسیحیوں کی طفیل خلیفہ منصور کے عہد میں عربی زبان کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ یہ خلیفہ علم دوست تھا۔ جب وہ ۱۴۸ھ میں بیمار ہوا

اور اس کے درباری طبیبوں نے جواب دے دیا تو اس نے بہار جیس کو جو جندیشاپور کی مجلس علمیہ کا مہتمم تھا طلب کیا۔ اس فاضل مسیحی طبیب کے علاج سے وہ شفا پا گیا، درتب سے خلفا کے دربار میں اس اکیڈمی کے متعلقین کا اثر قائم ہو گیا۔ اسی خلیفہ کے عہد میں (۱۴۳ھ) میں علمائے اسلام نے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں مدون کرنا شروع کیں۔

عباسیہ خاندان کے تیسرے خلیفہ مہدی (از ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) کے عہد سے علم فقہ شروع ہو گیا۔ عہد منصور میں امام ابوحنیفہ، عہد ہارون میں امام مالک اور امام شافعی اور عہد مامون میں امام احمد بن حنبل تھے۔ خلیفہ مہدی کے زمانہ میں نسطوری پیٹریارک مار تموتھی اول (از ۷۸۰ء تا ۸۲۳ء) نہایت جوشیلا اور عالم شخص تھا جس سے خلیفہ مہدی نے مذہبی مناظرہ بھی کیا جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ خلیفہ مہدی علوم عقلیہ کا مخالف تھا۔

گو مہدی علوم عقلیہ کا مخالف تھا لیکن اس کے بعد ہارون رشید (از ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) علم پرور خلیفہ تھا۔ اس نے بیت الحکمت بنوایا جس میں پارسی، عیسائی، یہودی اور ہندو مترجمین تھے اور فنون حکمت کے متعلق تصنیف اور ترجمے کرتے رہتے تھے۔ اس کو جو کتابیں یونانی میں ایشیائے کوچک سے ملیں وہ اس نے یوحنا ابن ماسویہ کے سپرد کر دیں۔ لیکن ہارون معقولات اور منقولات کی تطبیق کا سخت مخالف تھا۔

ہارون کے عہد میں یوحنا ابن ماسویہ ایک بے نظیر علامۂ دہر شخص تھا جس کی شاگردی کا فخر بڑے بڑے حکیموں اور طبیبوں کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ حکیم جارجیس کا بیٹا بخت یشوع اپنے

باپ کے انتقال کے بعد جندیشاپور کے شفاخانہ کا مہتمم رہا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ایک یگانۂ روزگار عالم اور حاذق معالج ہونے کے علاوہ متعدد کتب کا مصنف بھی تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون نے اس کی طبی قابلیت کی آزمائش کرنے کے لئے اپنے درباری اطبا ابو قریش عیسیٰ، عبداللہ، داؤد بن سرابیون اور سرجیس کو طلب کیا لیکن جب انہوں نے بخت یشوع کو دیکھا تو سب نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا کہ ہم میں سے کسی میں یہ تاب نہیں کہ بخت یشوع کے ساتھ طب و فلسفہ پر کلام کر سکیں۔ خلیفہ نے اس کو رئیس الاطبا کے عہدہ پر سرفراز کیا۔ مذکورہ بالا درباری طبیب مسیحی تھے جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں خدا نے شفا عطا کی ہوئی تھی۔

جبرئیل بن بخت یشوع۔ ہارون، امین اور مامون رشید کے عہد میں اعلیٰ ترین پایہ کا حکیم اور طبیب تھا۔ حق تو یہ ہے کہ جارجیس اور اس کا بیٹا بخت یشوع اور اس کا پوتا جبرئیل بن بخت یشوع تاریخ وفات ۸۳۰ء) اور پڑپوتا بخت یشوع بن جبرئیل ایسے پایہ کے فاضل حکیم طبیب اور مصنف تھے کہ وہ جس عہد میں بھی ہوتے وہ زمانہ زرین عہد ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک وحید العصر تھا اور اپنے بلند اخلاقی کردار کی وجہ سے ممتاز تھا۔ چنانچہ مامون جبرئیل بن بخت یشوع کی اس قدر توقیر کرتا تھا کہ اس نے عام حکم دے رکھا تھا کہ ہر شخص ملکی عہدہ پانے سے پہلے جبرئیل کی خدمت میں حاضر ہو۔ جبرئیل اعلیٰ پایہ کا مترجم بھی تھا جس نے یونانی حکما کی کتابوں کا ترجمہ کر کے شہرت دوامی حاصل کی۔ وہ ایسا یکتائے زمانہ طبیب تھا کہ ہارون نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا ہوا تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا دے رکھی تھی اور خلیفہ بھی فیاض طبیعت کا

تھا۔ چنانچہ علامہ ابن ابی صیبعہ اپنی تاریخ میں جبرئیل کی آمدنی اور خرچ کی نسبت لکھتا ہے کہ اُس کو عام صیغہ سے دس ہزار درہم ماہوار، خاص صیغہ سے پچاس ہزار درہم ماہوار۔ لباس کے لئے پچاس ہزار درہم ماہوار خوراک کے لئے پانچ ہزار درہم ماہوار ملتے تھے۔ علاوہ ازیں روزہ کے آغاز میں پچاس ہزار درہم۔ فطر کے دن پچاس ہزار درہم۔ خلیفہ کی فصد کے دن ہر دفعہ پچاس ہزار درہم۔ دوا پلانے کے لئے ایک لاکھ درہم سالانہ ملتے تھے۔ ان کے علاوہ شاہی خاندان اور دربارِ وزارت سے بھی روزینے ملتے تھے چنانچہ زبیدہ خاتون سے پچاس ہزار درہم سالانہ۔ یحییٰ بن خالد برمکی سے چھ لاکھ درہم سالانہ۔ جعفر برمکی سے بارہ لاکھ درہم سالانہ۔ فضل بن یحییٰ سے چھ لاکھ درہم۔ فضل بن الربیع سے پچاس ہزار درہم۔ عیسیٰ بن جعفر سے پچاس ہزار درہم۔ - - - - - - - - - عباسیہ سے پچاس ہزار درہم۔ فاطمہ سے ستر ہزار درہم۔ ابراہیم بن عثمان سے تیس ہزار درہم ملتے تھے۔ اس کے ساتھ اس کے مصارف اور خرچ بھی شاہانہ تھے۔ اس کے بلند اخلاق اور علم و فضل کی وجہ سے سب اس کی عزت اور توقیر کرتے تھے۔ مثلاً ابراہیم جس کو فنِ طب میں بھی درک تھا جبرئیل سے اکثر طب اور اطباء کے متعلق مشورہ اور سوالات کیا کرتا تھا اور مخلص دوست تھا۔ وُہ نہ صرف ہارُون رشید کا معالج خصُوصی تھا بلکہ اس کے بعد خلیفہ امین اور خلیفہ مامُون کے دَور میں قریباً ۲۳ سال تک شاہی طبابت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہارُون اور مامون دونوں اس کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ الطافِ خسروانہ کی وجہ سے وُہ دولتمند تھا لیکن اپنے اسلاف کی طرح نہایت رحمدل اور فیاض تھا اور مسیحی چال چلن سے آراستہ تھا۔ غربا کی طرف خاص توجہ کرتا تھا اور

ہر کس و ناکس کا علاج مُفت کرتا تھا۔ جب وُہ ۲۳۵ھ میں مرگیا تو اس کا جنازہ شاہانہ تزک و شان کے ساتھ اُٹھایا گیا۔ وُہ شہر مدائن کے مار سرجیس گرجا میں دفن کیا گیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا بخت یشوع بن جبرئیل نہایت بلند پایہ حاذق اور فاضل طبیب تھا جس کے علم و فضل، فیاضی اور غربا پروری کی شہرت عام تھی۔ وُہ خلیفہ مامُون متوکّل مستعین۔ مہتدی باللہ کا شاہی طبیب تھا۔ جاہ و منزلت میں اس پایہ کا تھا کہ لباس اور آرائش میں خلیفہ متوکل کا ہمسر شمار کیا جاتا تھا۔ خلیفہ متوکّل کو وُہ اس قدر عزیز تھا کہ ایک دن اس نے اپنے وزیر سے کہا "بخت یشوع کا نقصان میرا اور میری مملکت کا نقصان ہے کیونکہ اس کا مرتبہ ہمارے جسم کے لئے بمنزلہ رُوح کے ہے" (عیون الانباء فی طبقات الاطبا جلد ۱ صفحہ ۱۴۳)۔ ایک مرتبہ جب بخت یشوع بیمار ہوگیا تو متوکّل نے اپنے ولی عہد معتز کو عیادت کے لئے بھیجا۔ یہ باتیں بعض اُمراء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھیں۔ علامہ ابن ابی صیبعہ لکھتا ہے کہ اُس نے جالینوس کی متعدد کتابیں سریانی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کیں۔ جب وُہ ماہِ صفر ۲۵۶ھ یا ۲۶۰ھ میں فوت ہوگیا تو غربا کے طبقہ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

ان مشہور و معرُوف طبیبوں کے علاوہ مامون کے دربار میں بیسیوں اور طبیب، مترجم اور حکیم تھے مثلاً خراسان کے مدرسہ کا مہتمم ایک عیسائی عیسوع تھا۔ عبد المسیح بن اسحٰق کندی (جس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے) ایک عیسائی عالم تھا جو ایک معزز ملکی عہدے پر ممتاز تھا اور مامُون کے ایک عزیز کا دلی دوست تھا۔ عبد المسیح بن عبد اللہ ناعمۃ الحمصی ایک اور زبردست مسیحی فاضل تھا جس نے ارسطو کی کتابوں کا سریانی میں ترجمہ کیا تھا۔

قسطا بن لُوقا مامون رشید کے عہد میں ایک زبردست عیسائی فاضل تھا۔ اُس نے افلاطون کی تصنیفات کا عربی میں ترجمہ کیا اور حنین بن اسحٰق (جس کا ہم ابھی ذکر کرینگے) کے ترجموں کو عربی میں منتقل کیا۔ وہ نہ صرف ایک مشہور مترجم تھا بلکہ بیت الحکمت کا مہتمم بھی تھا۔ وہ خود علم فلسفہ میں ماہر تھا اور اس کو علم کا اس قدر شوق تھا کہ وہ رُوم گیا اور وہاں سے بہت سی کتابیں بہم پہنچا کر شام واپس آیا۔ جب مامون کو اس کا پتہ لگا تو اُس نے اس کو بیت الحکمت میں کام دے دیا۔ مامون کی توجّہ دیکھ کر اس کے درباری اور ندیم بھی اُس طرف متوجّہ ہوئے اور اُنہوں نے بھی فنون و حکمت کی کتابیں منگوائیں اور دُور دراز جگہوں سے عیسائی عالموں اور مترجموں کو بُلوا کر اُن کو ملازم رکھا۔

قسطا ابن لُوقا بعلبکی ایک نہایت نامور فاضل اور مختلف زبانوں کا ماہر تھا۔ چنانچہ ابن الندیم لکھتا ہے کہ "وہ طب، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، اعداد اور موسیقی میں مہارت کامل رکھتا تھا۔ سریانی اور یونانی زبانوں کا ادیب تھا اور ان کو نہایت فصاحت سے بولتا تھا اور عربی میں کامل تھا"۔ اس نے نہ صرف یونانی کی بہت سی کتابوں کا خود ترجمہ کیا بلکہ اکثر پہلے ترجموں کی اصلاح کی"۔ اُس نے یونانیوں کے مذہب کے متعلق بھی ایک مستقل کتاب لکھی۔ کتاب "طبقات الاطبا" میں اُس کی بہت سی تصنیفات کے نام لکھے ہیں کیونکہ وہ کثیر علوم میں کمال رکھتا تھا۔ وہ ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی کا ہم عصر تھا۔

خلیفہ مامون فلسفہ کا دلدادہ تھا۔ اُس نے قیصرِ رُوم کو لکھا کہ ارسطو کی جس قدر تصنیفات مل سکیں وہ روانہ کردے چنانچہ قیصر نے

پانچ اُونٹ لاد کر خاص فلسفہ کی کتابیں مامون کے پاس روانہ کیں جس نے ارسطو کے ترجمہ پر یعقوب بن اسحٰق کِندی کو مامور کیا جو مختلف زبانوں کے جاننے میں اور علمی تحقیقات میں عموماً بے نظیر مانا جاتا تھا۔ یہ وُہ الکندی نہ تھا جو مسلمانوں کا زبردست فلاسفر ہو چکا ہے کیونکہ ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی کے علاوہ تمام عالم اسلام میں کوئی فلاسفر پیدا ہی نہیں ہُوا چنانچہ وُہ مسلمانوں میں ارسطو کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ سلیمان بن حسّان نے لکھا ہے کہ اسلام میں کندی کے سوا اور کوئی شخص فلاسفر کے لقب سے ممتاز نہیں ہُوا۔ یہ مسلمان فلاسفر اپنے یہودی اور عیسائی رفقا کی طرح ارسطو کی تصانیف نو افلاطونی شروح کے ساتھ عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔

یُوحنّا ابن البطریق مامون کے عہد میں افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کا مشہور مترجم تھا۔ وہ ان ممتاز ہستیوں میں سے تھا جو بیت الحکمت میں ترجمہ کے کام پر مامور تھے۔ اُس کی نظرِ انتخاب پر مامون اس قدر بھروسا کرتا تھا کہ اس نے اُس کو رُوم بھیجا تاکہ اپنی پسند کی کتابیں انتخاب کر کے لائے۔ اس کے ساتھ ایک اور مشہور مسیحی فاضل سلما بھی گیا تھا۔

ابو زید حُنین بن اسحاق (از ۸۰۹ء تا ۸۷۳ء) مامون، واثق اور متوکل کے عہدِ خلافت کا درخشاں فلاسفر درباری طبیب اور مترجم تھا۔ وہ خاندان بنی عباد کا چشم و چراغ اور نسطوری مسیحی قسیس تھا۔ اس کو فصاحت اور ادب میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اُس نے فاضل حکیم یُوحنّا بن ماسویہ سے علم طب حاصل کیا تھا اور اپنے اُستاد کے لئے بہت سی کتابیں خصوصاً بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کا ترجمہ کیا اور نوّے (۹۰) سے زیادہ کتابیں سریانی اور عربی زبانوں میں لکھیں یا ترجمہ کیں۔ وہ اپنے وقت کا

یُونانی۔ سُریانی۔ فارسی اور عربی زبانوں کا ممتاز ترین عالم تھا۔ کتابوں کی جستجو اور اُن کو نقل کرنے کا شوق اُس کو ارضِ رُوم میں اور دیگر ممالک میں کشاں کشاں لے گیا۔ مامون اُس کی ایسی قدر کرتا تھا کہ کہتے ہیں کہ وُہ اُجرت کے طور پر اُس کی ہر کتاب کے ہم وزن سونا تول کر دیا کرتا تھا۔ (ملاحظہ ابن ابی اصیبعہ)۔

جب پادری حنین پہلی دفعہ مامُون کے پاس گیا تو خلیفہ نے اُس سے پہلی فرمائش یہ کی کہ مجھے ایسا مؤثّر اور قاتل زہر تیار کر کے دو جو میں اپنے دُشمنوں کے لئے استعمال کر سکوں۔ حنین نے تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر مامُون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ میں تم کو قتل کر دُونگا۔ حنین نے متبسم ہو کر کہا کہ مجھے منظور ہے کیونکہ میں آپ کے حُکم کی تعمیل کر کے خُدا کے حُکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ مامُون حیران رہ گیا اور خُوش ہو کر اُس کو خلعت عطا کی اور اپنا طبیبِ خاص بنا لیا۔

حنین کی سرگذشت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو عِلم اور کُتب کا کس قدر شوق تھا۔ چنانچہ وُہ لکھتا ہے کہ کتاب "البرہان" کی تلاش میں جزیرہ فلسطین، مصر، سکندریہ اور تمام ممالکِ شام میں پھرا لیکن صرف نصف مقالہ دمشق میں دستیاب ہُوا۔ اُس نے کثرت سے کتابیں تصنیف کیں چنانچہ "طبقات الاطبا" میں اُس کی تصنیفات کی فہرست تین صفحوں پر مشتمل ہے۔

حنین کے زمانہ کے خلفا اِس پر اِس قدر اعتماد رکھتے تھے کہ وُہ جسمِ انسانی کی تشریح کی اجازت نہ دیتے تھے جب تک بخت یشوع اور حنین کی رائے نہ طلب کی جاتی۔ ابن القفطی اِس مسیحی عالم کی بابت لکھتا ہے۔

"عیسائی طبیب حنین بن اسحاق طبابت اور حکمت کی کُتب کو سُریانی اور عربی میں ترجمہ کرنے والی ممتاز ہستیوں میں سے تھا۔ وُہ یُونانی زبان کا فصیح اور عربی زبان کا ادیب تھا۔ اُس نے براہِ راست یُونانی زبان کو تحصیل کیا جس کے ترجمہ میں وُہ بڑا پایہ رکھتا تھا۔ وُہ حکمت کی کتابوں کے جواہر پاروں کو غیر ممالک سے انتہائی کوشش سے تلاش کر کے اُن جواہر پاروں کے ساتھ واپس لوٹا اور اُن کا عربی میں ترجمہ کیا۔ حنین نے یُوحنّا بن ماسویہ سے عِلم طب حاصل کیا۔ ایک روز یُوحنّا نے کسی بات سے ناراض ہو کر اُس کو طعنہ دیا جس کو بُرا مان کر وُہ اپنے اُستاد کے پاس سے چلا گیا۔ وُہ پہلے سکندریہ گیا جو یُونانی علوم کا گہوارہ ہے اور وہاں یُونانی زبان سیکھی۔ اُس نے بقراط اور جالینوس کی کتابوں کے معانی اور مطالب کی وضاحت کی اور اُن کی مشکلات کو حل کر دیا۔ حنین نے یُونانی زبان میں ایسا کمال حاصل کیا کہ جبرئیل بن بخت یشوع اُس کو اُستادِ زمانہ کہتا ہے۔ جبرئیل نے اُس کی تعریف کر کے کہا خُدا کی قسم، اگر اُس کو خُدا نے عُمر کی درازی عطا کی تو وُہ سرجیس کو بھی مات کر دیگا جو یُونانی سے سُریانی میں ترجمہ کرنے والوں کا گُلِ سر سبد ہے۔ جب حنین نے یہ سُنا تو اُس نے جبرئیل کے ہاتھ اپنی ایک تصنیف یُوحنّا کو دکھانے کے لئے بھیجی۔ یُوحنّا نے اُس کو پڑھ کر کہا کہ یہ تصنیف صرف ایسے شخص کی ہی ہو سکتی ہے جس کو رُوح القدس کی تائید حاصل ہو۔ جب اُس کو معلوم ہُوا کہ یہ حنین کی تصنیف ہے تو اُس نے حنین سے معذرت کی اور پھر واپس اپنے پاس بُلا لیا۔

حنین نے یُوحنّا بن ماسویہ کے لئے بہتیری کتابوں کا ترجمہ کیا۔ بعض کا سُریانی زبان میں اور بعض کا عربی میں۔ ابن القفطی لکھتا ہے کہ

"عیسائی طبیب حنین بن اسحٰق حکمت و فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں میں صفِ اوّلین میں تھا۔ وہ یونانی زبان کا فصیح اور عربی زبان کا ادیب تھا۔" وہ تفریح کے وقت نہ صرف سُریانی اور عربی گیت گاتا تھا بلکہ ہومر کی کتاب ایلیڈ اور اوڈیسی کے اشعار گنگنایا کرتا تھا۔ اُس نے یونانی گرامر پر ایک مستند کتاب بھی تصنیف کی اور ارسطو کے فلسفہ کی کتابوں اور اُن کی شروح کا عربی میں ترجمہ کیا۔

حنین کا بیٹا ابو یوسف اسحاق بن حنین اپنے باپ کی طرح علامۂ دہر تھا۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دونوں باپ بیٹے عہدِ ماموں کے گل سرسبد ہیں جنہوں نے براہِ راست یونانی اور سُریانی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر کے اس زبان کو خزینۃ العلوم بنا دیا۔ اسحاق بن حنین (سالِ وفات ۹۱۰ء) فضل و کمال میں اپنے باپ سے کم نہ تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح مترجمین کی صفِ اوّل میں تھا اور فضل و کمال اور یونانی اور سُریانی کتابوں کے ترجمہ میں باپ کی سی قابلیت رکھتا تھا۔

حنین کا بھانجا حبیش بھی خلیفہ ماموں کے زمانہ کا نامور مترجم تھا جس نے ترجمہ کے کام کو وسعت دی تھی۔ اُس نے بغداد میں ایک مدرسہ جاری کیا جس میں ترجمہ کا کام کیا جاتا تھا۔ اس مدرسہ میں حنین اور اُس کا بیٹا اسحاق بھی کام کرتے تھے۔ چنانچہ اسلامی مصنفین کی کتابوں میں اکثر آیا ہے کہ فلاں فلاں کتاب کا حنین نے سُریانی میں ترجمہ کیا اور اسحاق نے اُس کو عربی میں ترجمہ کیا۔

ماموں کا زمانہ خلفائے عباسیہ میں گلِ سرسبد ہے۔ اُس کے دربار میں ہر علم و فن کے اُستادانِ زمانہ تھے جن میں ہندو بھی تھے عیسائی اور یہودی

فاضل بھی تھے۔ ان مسیحی فضلاء کے علاوہ جن کا ہم سطورِ بالا میں ذکر کر آئے ہیں، بیسیوں دیگر مسیحی خلیفہ ماموں کے دربار کے رتن تھے۔ مثلاً جبرئیل کمالی اُس کے زمانہ کا نامور فاضل تھا۔ زبردست مسیحی فلاسفر ابو البشر عبید المسیح بن اسحاق کندی۔ تھیوڈور ابو قرہ (جن کا ذکر ہم آگے ذیل کے باب ششم میں کریں گے)، دار یشوع۔ ایوب۔ نصر بن ہارون عیسیٰ بن یحییٰ۔ متی بن یونانہ وغیرہ خلفائے عباسیہ کے عہدِ حکومت میں ایسی نامور ہستیاں تھیں جن پر ہر زمانہ فخر کر سکتا ہے۔ پادری نطیف ایک رومی پادری تھا جو متعدد زبانوں میں کامل تھا۔ اُس نے بھی یونانی سے عربی میں ترجمے کئے۔ ایک اور قسیس یوحنا اُن چند اشخاص میں سے تھا جن سے طلبا اقلیدس اور ہندسہ پڑھتے تھے۔ وہ بھی اپنے زمانہ کا فاضل تھا اور یونانی زبان سے کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔

خلیفہ معتصم باللہ مسیحی طبیب سلمویہ بن بنان سے بڑی محبت رکھتا تھا۔ ہم اُوپر بتا چکے ہیں کہ وہ اس خلیفہ کا معتمد مشیر تھا اور جب وہ مرض الموت میں گرفتار ہوا تو خلیفہ خود اُس کی عیادت کو گیا اور جب وہ فوت ہو گیا تو خلیفہ نے محل شاہی میں اُس کا جنازہ منگوایا اور تمام مسیحی رسوم اپنے رُو برو ادا کروائیں۔

جب مشہور مسلمان فلاسفر فارابی بغداد گیا تو اُس نے مسیحی فاضل ابو البشر کے قدموں میں بیٹھ کر فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہ زبردست مسیحی فاضل فلسفہ پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ فارابی نے ابو یوحنا ابن خیلان سے بھی حران جا کر فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ ابو البشر کا مسقط الراس بغداد تھا اور اس کو علمِ منطق میں تبحر حاصل تھا اور اس علم میں اُستادِ زمانہ مانا جاتا تھا۔

فارابی کے دِنوں میں کوئی ایسا مُسلمان فاضل نہیں رہا تھا جو اُس کو علومِ منطق و فلسفہ کا درس دینے کا اہل ہوتا۔ خود فارابی کے بہترین شاگرد مسلمان نہیں تھے بلکہ اُس کے تلامذہ عیسائی تھے جن میں ابوزکریاہ یحییٰ بن عدی یعقوبی مسیحی ارسطو کی تصانیف کا مشہور مترجم تھا۔ طبقات الحکما میں ابوالبشر کی تصانیف کی طویل فہرست دی گئی ہے۔ ان مسیحی فضلاء کی شُہرت قابلیت اور فضل و کمال کی طفیل ممالک اسلامیہ کے شہروں میں کُتب خانے اور دارالعلوم قائم ہو گئے۔

ابوزکریاہ یحییٰ بن عدی المنطقی (سالِ وفات ۹۷۴ء) (جس کے نامِ نامی کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) بڑا فاضل شخص تھا۔ اُس نے حنین کے سُریانی ترجموں کو عربی لباس پہنایا۔ اور تھیوفلس کی سُریانی کُتب تراجم کو بھی عربی زبان میں منتقل کیا۔

ایک اور مسیحی فاضل ابوعلی عیسیٰ ابن اسحٰق ابن زرعہ (سنِ وفات ۱۰۰۸ء) نے ترجمہ کے کام میں امتیاز اور ناموری حاصل کی۔

ابوالخیر الحسن۔ (سالِ ولادت ۹۴۲ء) نے اپنی قلمی خدمات سے اپنے اُستاد یُوحنّا ابنِ عدی المنطقی کا نام روشن کر دیا۔

ہم سطورِ بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ مشہور حکیم فارابی مُسلمان تھا لیکن اُس نے مسیحی فلاسفر ابوالبشر اور ابو یُوحنّا بن خیلان کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ فلاسفہ اور معتزلہ خلیفہ متوکل کے زمانہ ہی سے حکومتِ وقت کی سرپرستی سے محرُوم ہو چُکے تھے مُسلمانوں میں علمی ذوق کا فقدان ہو گیا تھا۔ چنانچہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں خود فارابی کا بھی کوئی مسلمان شاگرد نہ تھا۔ اب علم و فلسفہ کا ذوق صرف مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا تک ہی محدُود رہ گیا کیونکہ

ان کا علمی شوق کسی حکومت کی سرپرستی پر موقوف نہ تھا۔

مذکورہ بالا مسیحی علما اور اطبا کے علاوہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بیسیوں مسیحی فیسس اور شماس ایسے تھے جو مختلف علوم و فنون میں اپنے زمانہ کے یکتا فاضل تھے۔ چنانچہ لاہور کے حکیم علی احمد نیر واسطی صاحب لکھتے ہیں "تاریخ طب میں ہمیں تقریباً پانچ صد ایسے اطبا کے نام ملتے ہیں جو مسیحی تھے اور جنہوں نے بغداد۔ شام۔ دمشق اور مختلف عربی ممالک میں طب یُونانی کی خدمت کی ہے۔ ان میں سے بعض راہب تھے جو آبادی سے دُور دراز مقامات پر اپنے تلامذہ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھتے تھے گو ان کے نام کسی کتاب میں نہیں آتے لیکن وُہ آسمان پر کتابِ حیات میں درج ہیں۔ ان کے ذریعہ مسیحی کلیسیا اپنے نجات دہندہ کے نمُونہ پر چل کر ہر ملک و زمانہ کے لوگوں کو شفا دیتی رہی۔

دیگر مشہُور مسیحی طبیبوں میں جبرئیل سلطانِ خراسان کے طبّی مشیروں کا افسر تھا۔ سنان بن ثابت ایک جید عالم اور فاضل طبیب تھا جو اپنے زمانہ کے تمام اطبا کا حکومت کی طرف سے ممتحن تھا۔ اُس نے بغداد میں چند ایک شاہی ہسپتال قائم کروائے۔ ابنِ بطلان بغداد کا ایک نہایت بلند پایہ طبیب تھا جس نے راہبانہ زندگی بسر کی اور مخلوقِ خُدا کی خدمت میں مصرُوف رہا۔ اُس نے ادب۔ فلسفہ۔ نجُوم طبیعیات اور طب پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

زاہد العلما۔ یُونانی طب کا ایک نہایت جید مسیحی عالم تھا۔ وُہ نصیبین کے مطران (بشپ) کا بھائی تھا۔ حلب کا والی امیر نصیر الدولہ اس کی جلالتِ علم کا بڑا معترف تھا۔ اُس نے امیر کے لئے کتاب دعوت الاطبا لکھی۔ وُہ

بڑا عابد تھا جس کی وجہ سے اُس کا لقب زاہد العلما پڑ گیا۔ اُس نے غربا کے لئے ایک خیراتی شفاخانہ کھول رکھا تھا۔

ابوالفرج بن الطیّب نہایت جلیل القدر عالم فلسفی اور فاضل مسیحی الطبیب تھا جس نے انجیل مقدس کی ایک شرح بھی لکھی تھی وُہ متعدد کتابوں کا مصنّف تھا اور فلسفیانہ مسائل میں ہی منہمک رہتا تھا۔ طب کے بے شمار طلبا نے اُس سے فیض حاصل کیا۔ تمام حکمائے عرب بالخصوص بُو علی سینا اُس کی طبّی فضیلت کے معترف تھے۔ وُہ سلطان عضد والدولہ کے ہسپتال میں معالج خصوصی تھا۔

ابوالخیر الحسن جس کا ذکر ہم اُوپر کر آئے ہیں بڑا زبردست مسیحی فاضل تھا۔ اُس نے مسیحیت اور فلسفہ کی مطابقت پر ایک زبردست کتاب تصنیف کی۔ اسی طرح متی بن یُونا ہ اور عیسیٰ بن یحییٰ بھی مسیحیت کے زبردست عالم تھے۔ پادری نظیف۔ پادری یُوحنّا اور سرجیئس جیسے بیسیوں علما تھے جن کا ہم تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ اپنے عہد کے فاضل تھے۔ اُن کے حالات ابن ندیم کی کتاب الفہرست۔ ابن القفطی کی کتاب العلما باخبار الحکما اور طبقات الاطبا ابن اصیبعہ میں پائے جاتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مامُون کے بیس سالہ عہدِ خلافت میں ہی علم و فن، حکمت اور فلسفہ کو رونق حاصل ہُوئی۔ وُہ خود حافظِ قرآن تھا اور ذی علم شخص تھا جس نے اسلامی کُتب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس کے عہد میں جیسا ہم لکھ چکے ہیں یُونانی، پہلوی، کالڈی قبطی اور سریانی وغیرہ کتابوں کے عربی میں ترجمہ ہُوئے اور ترجمہ کرنے والے مشہور مسیحی عالم تھے۔ بیت الحکمت کے اکثر ترجمہ کرنے والوں کی تنخواہیں آجکل کے حساب سے

$2\frac{1}{2}$ ہزار روپیہ ماہوار کے قریب تھیں۔ علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں " یہ کہنا قریباً صحیح ہے کہ یُونان۔ اٹلی۔ سسلی اور سکندریہ کا کوئی اعلیٰ سرمایہ ایسا باقی نہ رہا جو ترجمہ کے ذریعہ عربی زبان میں منتقل نہ ہُوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماموُنی عہد کے مترجم زبان دان ہونے کے علاوہ حکیم اور مجتہد الفن بھی تھے "۔ پھر لکھتے ہیں " اِس عہد میں خیالات کی وُسعت اور متعدد بانیانِ مذہب کا پیدا ہونا زیادہ تر اِس آزادی کا اثر تھا جو مامون نے مذہبی خیالات کے ظاہر کرنے میں عام لوگوں کو دے رکھی تھی "۔ اس کے دربار میں عیسائی۔ یہُودی۔ مجُوسی ہر ایک مذہب کے عالم تھے اور وُہ سب سے اچھا برتاؤ کرتا تھا اور اُن کے عقائد اور مذہبی خیالات کی وجہ سے اُن کو مُلک کا دُشمن خیال نہیں کرتا تھا۔ اس کا ابتدائی زمانہ مرو میں گذرا تھا جہاں مسیحی تہذیب کے مناظر ہر جانب تھے۔

خلفائے عباسیہ کے عہد کے مسیحی عُلما اور فضلا اِس پایہ کے جیّد عالم اور فاضل تھے کہ وُہ انشا، ادب، طِب، فلسفہ وغیرہ میں ہر مُلک و قوم پر سبقت رکھتے تھے مُسلم مُصنّفین خود اقبال کرتے ہیں کہ اُنہوں نے یُونانی فلسفہ اور طب کی دولت مسیحی فضلاء کی بدولت حاصل کی۔ حتّٰی کہ وُہ بعض مسیحی فضلاء کو بھی مُسلمان بتلاتے ہیں۔ مثلاً شہرستانی کے پایہ کا مُصنّف کہتا ہے کہ حنین بن اسحاق اور یحییٰ بن عدی مُسلمان فلاسفر تھے! مسیحی فضلاء اور اطبا ہر خلیفہ کے زمانہ میں تھے اگرچہ خلیفۂ وقت مامُون کی طرح علم دوست نہ ہوتا تھا۔ مثلاً خلیفہ متوکّل کے پاس ہر وقت چھپّن (۵۶) مسیحی اطبا موجود رہتے تھے اور مقتدر کے زمانہ میں ۸۶۰ اطبا موجود تھے۔ پس حکومت کی سرپرستی ان کے علم و فضل کا سبب نہ تھی بلکہ اس کے برعکس ان کا علم و فضل حکومت کی سرپرستی

کا باعث تھا۔

ہم کو یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ گو اسلامی دُنیا میں یُونانی فلسفہ اس زمانہ میں مروّج ہُوا جب ممالک یورپ اس کی جانب سے بے نیاز تھے لیکن مُسلمانوں نے یُونانی فلسفہ سے (جیسا ہم آگے چل کر بتلائیں گے) کوئی دوامی فائدہ نہ اُٹھایا اور نہ اس میں کوئی نئی بات ایزاد کی علمائے شریعت علم و فلسفہ کے مخالف ہی رہے۔ اور یہ مخالفت اسلامی صدیوں کے دوران میں بڑھتی گئی۔

ہم نے مختصر طور پر چند نامور مسیحی فضلا کا بطور مُشتے نمونہ از خروارے ذکر کیا ہے تاکہ ناظرین پر ان کلیسیاؤں کی عظمت اور جلالت ظاہر ہو جائے اور ان کو معلوم ہو سکے کہ یہ مشرقی کلیسیائیں کس قسم کے دل و دماغ کی اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیتیں پیدا کرتی تھیں جن کو قرآنی احکام اور شریعت اسلام نے کچل کر ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ خلفائے عباسیہ کا "سنہری زمانہ" جس پر آج دُنیائے اسلام کو بجا طور پر ناز ہے انہی مسیحی کلیسیاؤں کی ممتاز ہستیوں کا رہینِ منت ہے۔ ان مسیحی طبیبوں نے افادۂ عام کے لئے خیراتی ہسپتال کھول رکھے تھے جہاں وُہ بیکس و لاچار غربا کا نہایت تندہی سے علاج کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُن کی مسیحی طبیعت اور محبت پر عوام فدا ہوتے تھے لیکن یہ بات علما اور فقہا کو ایک نظر نہیں بھاتی تھی۔ اُن کی نظر میں یہ طبیب اعزازِ اصل عالم مقہُور ہستیاں تھے اور وُہ حقارت اور نفرت کی نگاہ سے ہی اُن کو دیکھتے تھے۔ مسیحی طبیب عامتہ المسلمین کے لئے مُفید بھی تھے تو بھی وُہ خدا اور رسُول کے دُشمن تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ خلیفہ المقتضی نے امام ابو منصور کو اپنا پیش امام بنانے کے لئے بلوایا۔ جب وُہ حاضر دربار ہُوا جب

خلیفہ کا مسیحی طبیب ابنِ تلمیذ خلیفہ کے پاس کھڑا تھا۔ امام سے نہ رہا گیا اور کہنے لگا "یا امیر المومنین۔ اللہ نے نصرانیوں کے دِلوں پر مُہر کر دی ہے اور یہ مُہر نہیں ٹُوٹتی تا وقتیکہ یہ لوگ اللہ اور رسُول پر ایمان نہ لائیں"۔ خلفا کے درباروں میں اِس قسم کے کٹر علما کی کمی نہ تھی۔ درباری علما مسیحی فضلا کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ اُن کے علم و فضل کے سامنے اُن کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ پست لوگ اُن کے رسُوخ، اقتدار اور دولت کی وجہ سے اُن سے دِلوں میں حسد رکھتے تھے اور خلیفۂ وقت کے کان، اُن کے خلاف بھرتے رہتے تھے۔ چنانچہ بخت یشُوع بن جبرئیل کو خلفا ایسے لوگوں کے کہنے سُننے سے متعدد مرتبہ زیرِ عتاب کر کے اُس کی جائداد اور اموال کو ضبط کرتے رہے۔ لیکن جب کبھی یہی خلفا بیمار ہُوئے اور اُن کو اُس کی ضرورت پڑی تو پشیمان ہو کر اُنہیں اُس کو واپس بُلانا پڑا۔ واقعات کو زیرِ نظر رکھ کر کوئی مؤرخ ایک دو خلفا کی وسیع النظری سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ خلفائے عباسیہ وسیع الخیال اور روشن دماغ تھے جو مسیحی کلیسیاؤں سے رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ یہ خلفا کسی بیسویں صدی کی سیکیولر سٹیٹ کے جمہُوریہ صدر نہیں تھے بلکہ وُہ خلفائے دُنیائے اسلام تھے اور عام طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وُہ قرآن و شریعتِ اسلام کے پابند تھے جس کی وُہ خلاف ورزی نہ کر سکتے تھے اور نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسیحی کلیسیائیں باوجود علم و فضل، دولت و سخاوت اور اخلاقی اور رُوحانی بلندیوں کے ہمیشہ مقہور و مغضوب ہی رہیں۔

باب پنجم

زمانہ خلفاء میں اسلام پر مسیحی معتقدات کا اثر

اس کتاب کے شروع میں ہم بتلا چکے ہیں کہ قبل از اسلام عرب کے متعدد شعرا یا تو خود مسیحی تھے اور یا مسیحی تعلیم سے متاثر تھے۔ انہی شعرا کی طفیل عربی ادبی زبان بنی۔ عرب کے مغرب میں ایک قدیم تجارتی شاہراہ تھی جس پر مکہ اور مدینہ واقع تھے۔ بالخصوص مکہ کا بازار بہت گرم کاروبار کا مرکز تھا جہاں مسیحی اور یہودی تاجر اہل مکہ سے اکثر ملاقات کیا کرتے تھے۔ عرب کے جنوب میں تمدن اونچے درجے پر تھی جہاں ملکہ سبا کی قدیم سلطنت شاہانِ حبش اور ایران کی جاگیر رہی تھی۔ شمال میں دو نیم خود مختار مسیحی سلطنتیں مسیحی عرب امیروں کے ماتحت قائم تھیں۔ ایران کی جانب حیرہ میں اور بازنطائن کی طرف غسانیوں کی مسیحی سلطنتیں تھیں۔ پس رسول عربی کی پیدائش کے وقت عرب میں مختلف مسیحی کلیسیائیں اور مسیحی سلطنتیں تھیں اور آنحضرت ایسے ماحول میں رہتے تھے کہ مسیحی خیالات اور معتقدات آپ کے چاروں طرف مروج تھے جنہوں نے قدرتی طور پر آپ کی ذہنی اور روحانی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ اُن کا ایک رشتہ دار ورقہ بن نوفل مسیحی عالم تھا جو انجیل کا مترجم بھی تھا۔ اُن کے مشہور صحابہ میں بلال حبشی تھا۔ سلمان فارسی تھا۔ صہیب رومی تھا۔ اُن کا اثر آپ پر ایسا تھا کہ قرآن میں آیا

ہے کہ اہل مکہ "کہتے ہیں کہ محمد کو ایک آدمی (سلمان) سکھلاتا ہے جس کی طرف وُہ (قرآن کو) نسبت کرتے ہیں (کہ فلاں شخص سکھلاتا ہے) لیکن اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان میں ہے" (سورۂ نحل آیت ۱۰۵)

بانیٔ اسلام کی وفات کے بعد جو ممالک اسلامی افواج نے فتح کئے اُن میں عموماً مخلوط آبادیاں بستی تھیں اور مفتوحہ شہر اور مُلک قدیم زمانہ سے مختلف تہذیبوں اور بالخصوص مسیحی تہذیب کا گہوارہ رہ چکے تھے بصرہ اور کوفہ اسلامی افواج کی قیام گاہ بنائے گئے تھے کیونکہ عراق کی آب و ہوا دیگر ممالک کی نسبت عربوں کے زیادہ موافق تھی۔ عربی قبائل زیادہ تر ملک شام میں سکونت کرتے تھے کیونکہ شام کا جنوبی حصہ اُن کے مُلک کے زیادہ قریب تھا۔ لوگ زیادہ تر مخلوط عربی اور ارامی زبانیں بولتے تھے شام کے مُلک پر رُومی تہذیب کا زیادہ اثر تھا جہاں کے باشندے سب کے سب عیسائی تھے مصر کا مُلک بھی قدیم زمانہ ہی سے رُومی یُونانی تہذیب کا گہوارہ تھا خصُوصاً سکندریہ کا شہر مختلف فلسفیانہ مسلکوں اور دینی گروہوں کا مرکز اور مشرقی اور مغربی خیالات کی جولانگاہ اختلاط تھا۔ سکندریہ کے شہر کا مسیحی مدرسہ جیسا ہم باب اوّل میں بتلا چکے ہیں مشرقی اور مغربی ممالک میں علم و فضل کے لئے مشہور تھا اور اس کی کلیسیا کا بشپ "کلیسیائے جامع کا پوپ" کہلاتا تھا۔

اسلامی فتوحات سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ولید ابن عبدالملک کے زمانہ (۸۶ھ) تک سندھ۔ بخارا۔ خوارزم اور سمرقند سے لے کر کاشغر تک اسلامی مملکت پھیل گئی تھی اور اسلامی افواج پیش قدمی کرتی چلی جارہی تھیں۔ انہوں نے مسیحی ممالک اور مسیحی شہروں کو

فتح کر لیا۔ لیکن شہروں اور ملکوں کو فتح کرنے کے بعد فاتحین نے علوم کی تحصیل کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اُن کو غیر عرب اور مخلوط النسل لوگوں کے لئے چھوڑ دیا۔ شام کے مسیحی ملک میں لوگ عیسائی مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے۔ تعلیم کے خاص مرکز کوفہ اور بصرہ تھے جہاں عرب۔ ایرانی نو مسلم عیسائی اور یہودی ایک دوسرے سے ملتے تھے اور قدرتاً ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ جو مقامات صنعت اور حرفت کے مرکز تھے وہاں بھی ایرانی۔ مسیحی اور یونانی تاثرات کے ماتحت مسلمان علوم دنیا حاصل کرتے تھے۔

جب بے شمار مسیحی مسلمان ہو گئے تو وہ اپنے ساتھ اسلام کے حلقہ میں قدرتاً مسیحی خیالات اور معتقدات لے آئے۔ یہ نو مسلم مسیحی اپنے فاتحین سے زیادہ مہذب اور عقیل تھے۔ اس کے علاوہ فاتحین کے حصّہ میں لونڈیاں غلام بھی آئے جو پہلے مسیحی تھے۔ لونڈیوں سے اولادیں بھی ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی گھرانوں میں رومی۔ شامی مصری وغیرہ عناصر داخل ہو گئے اور خالص عربی نژاد شاذ و نادر ہی رہ گئے۔ اسیرانِ جنگ میں اچھے سے اچھے خاندانوں کی عورتیں اور بہو بیٹیاں ہوتی تھیں چنانچہ زمخشری اپنی کتاب ربیع الابرار میں لکھتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں فارس کے اسیرانِ جنگ میں شہنشاہ یزدجرد کی بیٹیاں بھی تھیں جن میں سے ایک (شہر بانو) امام حسینؓ کو دی گئی جس کے بطن سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔

مختلف وجوہ کے باعث (جن کا ذکر گذشتہ ابواب میں کیا گیا ہے) مسیحیوں اور دیگر غیر مسلموں نے اپنی بہبودی اسی میں سمجھی کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ آنحضرت کی وفات کے چھ سال کے اندر یروشلم ۶۳۶ء میں۔ قیصریہ ۶۴۰ء میں۔ سکندریہ ۶۴۲ء میں۔ مسوپوتامیہ ۶۴۲ء

میں۔ فارس ۶۵۰ء میں۔ کارتھیج ۶۹۷ء میں فتح ہو گئے۔ ۷۱۵ء میں عربوں نے وسط ایشیا اور پنجاب کو تاخت و تاراج کر لیا۔ ان فتوحات کا رجو یکے بعد دیگرے بڑی سُرعت کے ساتھ ہوئیں) قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی صدی ہجری میں ہی عربوں کا اختلاط دوسری اقوام اور بالخصوص مسیحی ملکوں اور کلیسیاؤں سے ہوا۔ مسیحی کلیسیاؤں کے جو شرکا حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے وہ اپنے ساتھ اسلام میں اپنے خیالات۔ رسومات و معتقدات لے آئے۔ اب دائرۂ اسلام میں ہر ملک اور نسل کے مسیحی آ گئے تھے نو مسلموں میں ایرانی مسیحی تھے۔ ارامی بھی تھے مصری بھی تھے۔ غرضیکہ ہر ملک نسل اور کلیسیا کی شاخ کے شرکاء تھے۔ ان نو مسلموں کی تعداد عربوں سے شمار میں کہیں زیادہ تھی۔ وقت کے ساتھ یہ اختلاط بھی بڑھتا گیا۔ علاوہ ازیں ہر سال اسلامی سلطنت کے مختلف شہروں اور ملکوں سے زائرین مکہ اور مدینہ آنے لگے۔ اور زمانہ کی امتداد کے ساتھ عربوں کی سیاسی۔ اجتماعی ذہنی اور روحانی زندگی پر اِس اختلاط کے تاثرات زیادہ نمایاں ہونے لگے۔ ایرانی اور رومی طرزِ معاشرت کا اثر ہونے لگا۔ یونانی فلسفہ اور مسیحی عقائد نمودار ہونے لگے۔ جب مفتوحہ اقوام کو اسلام قبول کرنے کے بعد سکون حاصل ہوا تو اُنہوں نے قرآنی عقائد کو اپنے پرانے عقائد کے ساتھ تطبیق دے کر اسلامی عقائد کی اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تدوین کی کیونکہ قدرتی طور پر یہ نو مسلم مسیحی اپنے آباد اجداد کی رسوم اور عقائد کو فراموش نہیں کر سکتے تھے اموی خلفا کے دربار میں مسیحی اچھے عہدوں پر ممتاز تھے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ مذہبی معاملات میں دوستانہ گفتگو اور بعض اوقات مناظرے بھی کیا کرتے تھے۔ یوں خیالات کا اختلاط ہوتا گیا۔ رسولِ عربی کے صحابہ نے دیگر اقوام و

ممالک کے اچھے قوانین کو اپنا لیا تھا۔ خلفا کے زمانہ میں باہمی اخذ و استفادہ کا سلسلہ جاری ہوگیا کیونکہ آنحضرت نے کہا تھا کہ "اچھی اور عمدہ بات (کلمتہ الحکمت) مومن کا گم شدہ مال ہے۔ وہ جہاں بھی اس کو پائے حاصل کرے کیونکہ وہ اس کو حاصل کرنے کا سب سے زیادہ مستحق ہے"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوحہ ممالک کی زبان، کلچر، فلسفہ وغیرہ نے اسلام میں دخل پا لیا۔

(۲)

مسیحیت نے اسلام پر چار اطراف سے اثر کیا:۔

اوّل۔ پہلی صدی ہجری میں اور دوسری صدی کے اوائل میں مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ وہ اپنے ساتھ مسیحی رسومات، خیالات، تصورات اور مسیحی عقائد کو بھی لے گئے! اگرچہ جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں مامون کے عہد میں یونان کی کتبِ فلسفہ کا ترجمہ ہوا تھا لیکن اس سے پہلے منصور اور ہارون کے زمانہ میں طب اور منطق کی کتابوں کا ترجمہ بھی ہوا تھا۔ اور ان خلفا سے بھی پہلے بنی امیّہ کے اواخر عہد میں طب، علم کیمیا اور چند منطق کی کتب کا ترجمہ ہوگیا تھا۔ ان کتابوں کے ترجموں کا اثر اسلامی افکار پر ہوا۔ چنانچہ علم فقہ میں بہت سی ایسی باتیں ہم کو ملتی ہیں جو یہودیت اور مسیحیت سے ماخوذ ہیں۔

ان کے علاوہ مسیحی معتقدات نے ان نو مسلموں کے ذریعہ عوام کے خیالات اور تصورات کو متاثر کیا۔ جب مسیحی جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو بائبل کی حکایات، یہودی انبیاء کے اقوال اور خداوند مسیح کے مبارک کلمات احادیث میں داخل ہونے شروع ہوگئے۔ بنی امیّہ کے خلفا کو تبلیغِ

اسلام کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ مسلمانوں نے سن ہجری کی پہلی صدیوں میں حدیثوں میں بائبل کی باتیں اور قصصِ انبیا کو داخل کرنا شروع کیا۔ اور ان کو سلسلہ وار آنحضرت تک پہنچا دیا۔ جب ان روایتوں اور حدیثوں کی تنقیح و تنقید کی جاتی ہے تو ان کی جانچ پڑتال صاف ظاہر کر دیتی ہے کہ ان کا اصلی منبع اور سرچشمہ وہ مسیحی تھے جنہوں نے گو مسیحیت کو ترک کر دیا تھا لیکن وہ اپنے مذہبی خیالات، دلائل، ثقافت اور روایات اپنے ساتھ دائرہ اسلام میں لے آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو صدیوں کے اندر اندر اسلام کے معتقدات میں زبردست تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ اور اسلامی علم اخلاق کی تعلیم کا عام معیار بھی بلند ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی کتاب مقدس کا مطالعہ کیا اور جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے انہوں نے عیسائیوں سے مناظرے اور شخصی مباحثے بھی کئے اور یوں وہ بائبل کے مضامین اور قصصِ انبیا سے واقف ہوتے چلے گئے۔ انجیل جلیل کی تعلیم اور خداوند مسیح کے اقوال بھی کتبِ احادیث میں داخل ہوتے گئے۔ لیکن یہ اقوال رسول عربی کے منہ میں ڈالے گئے۔ مثلاً "جو شخص پوشیدہ نیکی کرتا ہے اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو اس کا دایاں ہاتھ کرتا ہے"۔ (متی ۶/۳) "میرے اصحاب نمک کی مانند ہیں۔ نمک کے بغیر کھانا بے ذائقہ ہوتا ہے"۔ (متی ۵/۱۳) "جو شخص نااہلوں کے سامنے علم کی باتیں کہتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو سؤروں کے آگے موتی ڈالتا ہے"۔ (متی ۷/۶)۔ طبری جو پہلے مسیحی تھا کہتا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں چلنے والے وہ لوگ ہیں جو غریب، محتاج اور مسکین ہیں۔ لیکن وہ لوگ دوزخ میں ہیں جو اس دنیا میں دولت والے تھے کیونکہ دنیا کی دولت اس زندگی میں ان کے

حصہ میں آچکی تھی" (لوقا ۱۶/۲۵)۔ یہاں تک کہ دعائے ربانی کی طرح کی ایک دعا رسول عربی کے منہ میں ڈال دی گئی" اے خداوند خدا جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری قدرت آسمان اور زمین پر ہے۔ تیرا رحم جس طرح آسمانیوں پر ہے اہل زمین پر بھی ہو۔ ہمارے گناہوں اور تقصیروں کو معاف کر۔ تو ہی نیکوں کا خداوند ہے۔ اپنا رحم ہم پر نازل کر اور ہم کو شفا بخش تاکہ ہمارے دردوں کا علاج ہو۔ آمین" (متی ۶/۹)۔ اس دعا سے خدا کی ابوت کا تصور خارج ہے کیونکہ یہ تصور اسلام کے منافی ہے۔ فقرہ "تیری بادشاہی آئے" خارج ہے کیونکہ حکومت اسلامی ہی خدا کی حکومت تصور کی جاتی تھی جو زمین پر مسلط تھی۔ اس دعا میں خدا کی مغفرت کو انسانی محبت اور دشمنوں کو معاف کرنے سے متعلق نہیں کیا گیا کیونکہ اس قسم کے تصور کو اسلام میں جگہ نہیں ملتی۔ پادری سلطان محمد خان صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "عربستان میں مسیحیت" میں متعدد ..، سے زیادہ ایسی انجیلی آیات کا اقتباس ، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی۔ ابن ماجہ، جامع الصغیر اور مناوی سے کئے ہیں (از صفحہ ۱۷۷ تا ۲۲۹)۔ ان کو پڑھ کر ہر عاقل شخص معلوم کر سکتا ہے کہ ان احادیث کا اصلی منبع وہ مسیحی فاضل تھے جو طبری کی طرح اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ انجیلی آیات کے علاوہ مرحوم پادری صاحب نے ساٹھ سے زائد ایسی احادیث کو نقل کیا ہے جن کا سرچشمہ تورات، زبور، صحف انبیاء اور دیگر یہودی الہامی کتابیں ہیں۔ علاوہ ازیں مرحوم پادری ٹزڈل صاحب نے ینابیع القرآن اور ینابیع الاسلام میں مسیحی کتب مقدسہ کی آیات وغیرہ کے اقتباسات دیئے ہیں جو کتب احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ مرحوم مسٹر اکبر مسیح نے بھی اس سلسلہ میں رسالہ تالیف القرآن

لکھا ہے۔ ان اور دیگر کتب کا مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ جن لوگوں نے یہودیت اور مسیحیت کو خیرباد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا، انہوں نے حدیثیں وضع کر کے اسلام میں ایسی تعلیم کو داخل کر دیا جو غیر عرب نو مسلموں کو مرغوب نہیں۔ ابو ہریرہ وغیرہ سے بہت سی موضوع احادیث منقول ہیں جو اناجیل کی آیات پر مبنی ہیں یا لفظ بہ لفظ اخذ کی گئی ہیں۔ بعض احادیث میں خدا کے رحم و کرم اور فضل پر زور دیا گیا ہے تاکہ مسیحیت اس لحاظ سے اسلام پر سبقت نہ لے جائے۔ چنانچہ لوقا ۱۵: ۳ تا الخ اور خداوند مسیح کی دیگر تمثیلوں کو کتب احادیث میں جگہ مل گئی ہے جب مسلمان علماء نے بائبل کی کتب کا مطالعہ کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ انبیاء سے معجزات صادر ہوئے تھے تب ان کو خیال آیا کہ جب انبیائے یہود و نصاریٰ سے معجزات صادر ہوئے تو آنحضرت سے جو خاتم المرسلین تھے معجزات ضرور صادر ہوئے ہونگے پس بانی اسلام کے معجزات بھی احادیث میں داخل ہو گئے چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اور ابن ماجہ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ حالانکہ قرآن صاف کہتا ہے کہ حضرت محمد سے معجزات صادر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کی نظر میں وہ خاتم الانبیاء تھے پس معراج جسمانی اور دیگر معجزات ان کی طرف منسوب کئے گئے۔ جو خیالات مسیحی کلیسیاؤں میں دنیا کے آخر ہونے اور قیامت کے متعلق تھے وہ مسیحیوں کے ساتھ اسلام میں آ گئے۔ دجال کا قصہ بھی مسیحیوں کی طفیل اسلام میں آ گیا۔ خود لفظ "دجال" ایک ارامی لفظ ہے اور سریانی زبان کے الفاظ "مسیحا دجالا" (متی ۲۴/۲۴) کا مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دجال کی حدیث میں ہے کہ مسیح دمشق کی مسجد کے منارے پر آئیگا اور دجال کو قتل کریگا۔ اس قصہ میں مسیح کی

آمدِ ثانی کا ذکر ہی اُس کے اصلی منبع کو ظاہر کر دیتا ہے۔ تاریخ اسلام سے ظاہر ہے کہ ان اور دیگر خیالات نے موالیوں کی بغاوت میں بڑا حصہ لیا جس سے بنی اُمیہ کی خلافت ختم ہو گئی اور بنی عباس کی خلافت شروع ہوئی۔ مسیحی مصنف اِس تعلیم پر زور دیتے تھے کہ اہلِ یہود کی کُتبِ سابقہ میں خداوند مسیح کی نسبت پیشین گوئیاں موجود ہیں پس مسلمانوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر کے کتابِ مقدس میں سے حضرت محمد کی نسبت پیشین گوئیاں ڈھونڈ ڈھونڈھ نکالیں۔ چنانچہ علی طبری جو پہلے مسیحی تھا لکھتا ہے "جب ہم نصاریٰ سے پُوچھتے ہیں کہ تم محمد کو رسول اللہ کیوں نہیں مانتے تو وُہ تین سبب بتلاتے ہیں۔ اوّل۔ یہ کہ محمد کی نسبت بائبل میں کوئی پیشین گوئی نہیں پائی جاتی۔ دوم۔ یہ کہ قرآن میں محمد کے کسی معجزہ کا ثبوت نہیں۔ سوم۔ یہ کہ مسیح نے پہلے ہی سے خبردار کر دیا ہے کہ میرے بعد جھوٹے نبی آئینگے۔ لیکن اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ تینوں باتیں سراسر غلط ہیں تو اُن کو اسلام قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے"۔ طبری کُتبِ مقدسہ سے واقف تھا لیکن اُس نے کتابِ مقدس کے سریانی ترجمہ میں جہاں ایسا لفظ پایا جس کا تعلق لفظ "احمد" سے تھا یا لفظ "حمد" سے مشتق تھا اُس کو ماوّل کر کے لفظی تحریف کے ساتھ رسولِ عربی کی پیشین گوئی قرار دے دیا مثلاً زبور ۴۸ کے الفاظ یا زبور ۴۸ کی آیت "یروشلیم کے شہر میں خداوند بزرگ ہے اور بے حد محمُود ہے۔ ہمارے خُدا کا شہر اور بڑے بادشاہ کا شہر ہے جو بلندی میں خُوشنما محمد ہے اور تمام زمین کا فخر ہے" وغیرہ وغیرہ (کتاب الدین والدولۃ)۔ ایک اور یہودی سعید بن حسن مسلمان ہو گیا۔ اُس نے عہدِ عتیق کی عبرانی کو توڑ مروڑ کر ایسی مضحکہ خیز پیشین گوئیاں نکالیں کہ جو شخص عبرانی نہیں جانتے تھے

وُہ اِس سے خُوش ہو گئے۔ یہ شخص کتابِ مقدس کی آیات کو محرف کرنے سے بھی نہ جھجکا بلکہ نہایت بے باکی سے بددیانتی سے کام لے کر جس مقام میں حضرتِ موسیٰ نے عمالیقیوں سے جنگ کرتے وقت دُعا کی تھی وہاں اُس نے "اضحٰق اور یعقُوب" کی بجائے لفظ "اسمٰعیل" کا نام جڑ دیا (کتاب مسالک النظر) لیکن واقفکار اِس بات کی تہ کو پہنچ گئے۔ چنانچہ ابن تیمیہ (تاریخ وفات ۱۳۲۸ء) نے تمام پیشین گوئیوں کو فضُول ہرزہ گوئی اور لا یعنی تاویلات قرار دے کر کہا "یہ لوگ ایسے الفاظ پر اپنے دلائل قائم کرتے ہیں جن کے مطالب مُبہم ہوتے ہیں اور بالکل واضح نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نبی کے لئے پیشین گوئیوں کا ہونا لازم نہیں ہے" (الجواب الصحیح)۔ جن اصحاب نے اس موضُوع پر پادری ٹامس ہاول صاحب مرحُوم کا رسالہ "بائبل میں محمد" اور ہمارا رسالہ "تورات موسوی اور محمدِ عربی" پڑھا ہے اُن پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ابنِ تیمیہ کے الفاظ موجُودہ عُلمائے اسلام کی دلائل پر بھی عائد ہوتے ہیں۔

دوم۔ مسیحیت نے اسلامی علم الکلام اور دینیات پر بڑا زبردست اثر ڈالا۔ اِس سلسلہ میں مقدس یُوحنائے دمشقی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے مسیحیوں کو اسلام اور مُسلمانوں کے خلاف آگاہ کرنے کی خاطر ایک "مُکالمہ" تصنیف کیا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مُسلمان کس قسم کے دلائل مسیحیت کے خلاف پیش کرتے ہیں اور کہ اُن کو کس قسم کے جواب ملتے تھے۔ اس "مکالمہ" میں خُداوند مسیح کی الوہیت اور جبر و قدر کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ بنی اُمیہ کے زمانہ میں مُسلمانوں میں مسئلہ جبر و قدر پر بحث شروع ہُوئی تھی۔ قدریہ کہتے تھے کہ خُدا نے انسان کو "قدر" یعنی اختیار دیا ہے کہ

وُہ بھلائی اور بُرائی میں سے کسی کو پسند کرے۔ انہوں نے اِس عقیدہ کو کہ بندہ اپنے افعال کا مختار ہے مسیحیت سے اخذ کیا اور اس کے ثبوت میں وُہی عقلیہ دلائل پیش کرتے تھے جو مسیحی علمِ کلام کے فاضل پیش کیا کرتے تھے۔

پھر انجیلی عقیدہ اُلوہیتِ مسیح کو مسلمان شرک خیال کرتے تھے مقدس یُوحنّا دمشقی عیسائیوں کو کہتا ہے کہ اگر تم سے کوئی خُداوند مسیح کی ذات کی نسبت پُوچھے تو جواب دو کہ وُہ کلمۃ اللہ ہے کیونکہ قرآن بھی خُداوند کو رُوح اللہ اور کلمۃ اللہ قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے پُوچھو کہ خُدا کا کلمہ قدیم ہے یا حادث اور مخلوق ہے۔ اگر وُہ جواب دے کہ حادث ہے تو اُس سے سوال کرو کہ پھر دُنیا کی خلقت سے پہلے نہ خُدا کا کلام ہُوا اور نہ خُدا کی رُوح ہُوئی یعنی خُدا ذی عقل بھی نہ ہُوا۔ اگر وُہ کہے کہ اس حالت میں خُدا کا کلام یعنی بائبل مقدس بھی قدیم ہوگی تو اُس کو جواب دو کہ کتابِ مقدس کے الفاظ "کلام" نہیں ہیں بلکہ Rhemata (ریماٹہ بمعنی الفاظ) ہیں مُسلمانوں نے اِسی دلیل کی بِنا پر قرآن کو قدیم مانا ہے۔ اس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔

مقدس یُوحنّائے دمشقی کا شاگرد تھیوڈور ابُو قرہ ایک اور اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ مسیحی کہتے تھے کہ مُوسےٰ سے پہلے کے مذاہب کو تورات نے باطل کر دیا ہے اور مسیحیت کی آمد سے تورات غیر مکمل ثابت ہو گئی ہے۔ مُسلمانوں نے اسی بات کو پکڑ لیا اور اس کو آگے بڑھا کر کہا کہ جس طرح تورات کی آمد سے پہلے مذاہب باطل ہو گئے اور انجیل کی آمد سے تورات ناکارہ ہو گئی اسی طرح اسلام کی آمد سے مسیحیت کی ضرورت نہیں رہی۔ تھیوڈور جواب میں کہتا ہے کہ مدعیٔ نبوّت کے لئے محض دعوےٰ کرنا کافی نہیں بلکہ

اس کی نبوّت معجزات کے صادر ہونے سے ثابت ہوتی ہے۔ پس اسلامی مناظرین وغیرہ نے بانیٔ اسلام کی نبوّت ثابت کرنے کے لئے معجزات گھڑے اور اس کا اثر اسلامی علم الکلام پر پڑا۔ مُسلمان متکلّمین نے مسیحیوں کے حملوں سے عاجز آ کر طرح طرح کے دلائل تراشنے اور تلاش کرنے شروع کئے جو مسیحی متکلمین کی دلائل کے طرز پر مبنی تھے اور جن کا تعلق یُونانی فلسفہ اور یُونانی طرزِ استدلال کے ساتھ تھا۔

پھر مسیحی کلیسیا اناجیل اربعہ کی بِنا پر خُداوند مسیح کو کامل انسان مانتی تھی۔ اسلامی فلاسفہ نے بھی اِس موضُوع پر بحث کی۔ چنانچہ مولانا جامی علیہ الرحمۃ فصوص الحکم کی شرح میں کہتے ہیں کہ "شیخ الکبیر کتاب الفلوک میں لکھتے ہیں کہ حقیقی انسان کامل وُہ ہے جو وجُوب اور امکان میں برزخ ہو اور صفاتِ قدیمہ اور حادثہ کا آئینہ ہو۔ یہی خُدا اور خلقت کے درمیان واسطہ ہے۔ اسی لئے اس آئینہ ہی سے خُدا کا فیض تمام مخلُوقات پر، علوی ہو یا سفلی پہنچتا ہے اور یہی بجز ذاتِ حق کے تمام مخلوقات کی بقا کا سبب ہے۔ یہ برزخ وجُوب اور امکان کا مغائر نہیں۔ اس کے بغیر دُنیا کو خُدا کی مدد حاصل نہ ہوتی"۔ صُوفی عبدالکریم جیلانی اپنی کتاب الانسان الکامل کے دُوسرے حصہ میں لکھتا ہے "۔ انسان کامل وُہ ہے جو اسمائے ذاتیہ اور صفاتِ الٰہیہ کا اصلی اور ملک کے طور پر مقتضائے ذاتی کے حکم سے مستحق ہو کیونکہ وُہ اِن عبارات کے ساتھ اپنی حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان اشارات کے ساتھ اپنے لطیفہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے وجُود میں سوائے انسانِ کامل کے کوئی مستند نہیں۔ پس اس کی مثال حق کے لئے ایسی ہی ہے جیسے ایک آئینہ جس میں کوئی شخص اپنی صُورت بغیر

اس آئینہ کے نہیں دیکھ سکتا۔ ورنہ بغیر اللہ کے اسم کے اپنے نفس کی صورت دیکھنا اس کو غیر ممکن ہے۔ پس وہ اس کا آئینہ ہے اور انسان کامل بھی حق کا آئینہ ہے یعنی وہ خدا کا مظہر ہے کیونکہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے نفس پر یہ امر واجب کر لیا ہے کہ اپنے اسماء وصفات کو بغیر انسانِ کامل کے نہیں دکھاتا ہے" (اردو ترجمہ مولوی ظہیر احمد سہوانی حصہ دوم صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶)۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ مسیحی کلیسیا انجیل کی بناء پر انہی معنوں میں خداوند مسیح کو انسانِ کامل مانتی ہے۔ بالخصوص انجیل یوحنا اور مقدس پولوس کے خطوط ان دعاوی اور دلائل کو تفصیلی طور پر واضح کر دیتے ہیں۔ جن دلائل کی طرز سے مسلمان علما اور فلاسفہ نے اس تصور کو واضح کیا ہے، ان سے ظاہر ہے کہ مسیحی تعلیم نے اسلامی علم الکلام پر کس قدر اثر کیا ہے۔

مسیحی کلیسیا کا یہ عقیدہ ہے کہ خداوند مسیح کا جلال دنیا کی پیدائش سے پہلے عالم میں موجود تھا (یوحنا ۱۷/۵)، پس مسلمانوں نے "نورِ محمدی" کا عقیدہ وضع کر لیا تاکہ حضرت محمد "سرورِ انبیا" اور "خاتم النبیین" ہوں۔ اسلامی تصوف میں بالخصوص حقیقتِ محمدی، یا "نورِ محمدی" کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ چنانچہ انسان الکامل کا مصنف لکھتا ہے "محمد کا ایک نام" امر اللہ" (خدا کا کلمہ) ہے وہ تمام مخلوقات میں اعلیٰ وافضل ہے۔ اس کا درجہ سب سے بڑا ہے۔ وہ فرشتوں سے بھی بڑا ہے بلکہ رئیس الملائکہ سے بھی بزرگتر ہے اور مخلوقات کا محور ہے۔ خدا نے محمد کی مختلف شکلوں کو اپنے نام "البدیع القادر" کے نور سے بنایا اور پھر اپنے نام "المنان القاہر" سے ان میں مستغرق ہو گیا۔ پھر ان پر اپنے نام "اللطیف الغافر" سے چمکا۔ ابن سینا (سالِ پیدائش ۹۸۰ء)، اپنی کتاب "الاشارات" میں کہتا ہے کہ ارسطو کے فلسفہ میں عقلِ اولین درحقیقت اللہ کا نور

ہے (سورۃ نور آیت ۳۵)۔ انجیل یوحنا کی آیت (۱۴/۹) "جس نے مجھے (مسیح کو) دیکھا اس نے باپ کو دیکھا" رسولِ عربی کی جانب منسوب کیا گیا ہے "جس نے مجھے (محمد کو) دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا"۔ پس صوفیہ حضرت محمد کو خدا کا مظہرِ کامل مانتے ہیں جو دنیا سے پہلے موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ انجیلی عقیدہ ہے کہ "ابتدا میں کلام تھا اور کلام . . . . خدا تھا"۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے کہا "اولین شے جو خدا نے بنائی وہ نبی کا نور تھا"۔ "جب آدم کی مٹی میں ابھی پانی نہ تھا میں اس وقت نبی تھا"۔ "میں خدا کا نور ہوں اور سب چیزیں میرے نور سے ہیں" (دیکھو یوحنا ۱/۱-۴)۔

نقشبندی خانوادہ کا صوفی ملا عبدالرحمٰن جامی جو خراسان کے شہر جام میں ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوا کہتا ہے کہ خدا ازل سے ہی جمال ہے اور جمال کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرے پس اس نے مخلوقات پیدا کی جو خدا کے جمال کا ظہور ہے اور جمالی ہے۔

اہل یہود کے اولین انبیا خدا کی نسبت ایک ایسا نظریہ رکھتے تھے جس کو نہ صرف عرب کے اہلِ یہود نے بلکہ عیسائیوں نے بھی اپنا لیا تھا۔ حالانکہ یہودی انبیاء اکثر مثلاً یرمیاہ نبی وغیرہ اس کے مخالف تھے۔ اس نظریہ کے مطابق خدا رب الافواج ہے جو اپنے برگزیدہ عبادت کرنے والے پرستاروں کے لشکروں کا سپہ سالار ہو کر ایسے لوگوں سے جنگ کرتا ہے جو ناراستی پر ہیں۔ وہ نیکوں کو فتح بخشتا ہے اور بدوں کو شکست دیتا ہے جن سے وہ ناراض ہوتا ہے (الیشوع ۵/۱۳-۱۵ وغیرہ)۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ طرفین میں سے جس لشکر کی فتح ہوتی ہے وہ مقبولِ خدا ہوتا ہے اور جس کو شکست ملتی ہے وہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہوتا ہے جو لوگ جنگوں میں فتح پر فتح کرتے چلے جائیں ان کی مسلسل فتوحات اس بات

کا بیّن ثبوت ہیں کہ وُہ خُدا کے پیارے ہیں جو اُن کو فتح بخشتا ہے اور جو لوگ شکست پر شکست کھا کر زیر ہو جاتے ہیں، اور فاتحین کے پاؤں تلے روندے جاتے اور ذلیل ہو جاتے ہیں وُہ خُدا کے مقہور و مغضوب ہوتے ہیں۔ اُن کی فتوحات سے ایک نتیجہ یہ بھی نکالا گیا کہ جن لوگوں کو فتح پر فتح حاصل ہوتی ہے، اُن کا مذہب برحق ہوتا ہے، اور جو لوگ شکست پر شکست کھا کر خوار و لاچار اور حقیر و ذلیل ہو کر اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں اُن کا دین باطل ہوتا ہے۔ پس حق کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ جنگوں کے زبردست مظاہروں سے فتح حاصل ہو اور بطالت کا معیار یہ ہے کہ اُس کو ماننے والوں کو مسلسل شکستیں ملیں۔ یہ نظریہ درحقیقت ایک غلط نظریہ ہے کیونکہ فتح اور شکست کسی کے دین کی حقانیت یا بطالت ثابت نہیں کرتی۔ یہودی انبیائے اکبر نے خود اس کا پول کھول دیا تھا، اور خُداوند مسیح نے جو تصورِ خُدا انجیل میں پیش کیا ہے وُہ اِس نظریہ کے متضاد ہے۔ ہر انجیل خوان جانتا ہے کہ آنخُداوند کا خُدا کی نسبت یہ تصوّر نہ تھا کہ وُہ ربّ الافواج ہے جو سپہ سالار بن کر اپنے برگزیدہ بندوں کے لشکروں کے آگے آگے چل کر اُن کے لئے جنگ کر کے فتح حاصل کرتا ہے بلکہ خُداوند کی تعلیم کا بُنیادی اصُول ہی یہ تھا کہ خُدا بنی نوعِ انسان کا باپ ہے جس کی ذات ہی محبّت ہے اور اُس کی تمام صفات اس ایک محبّت کے محور کے گرد گھومتی ہیں اور اس تصوّر کی روشنی میں ہی معنی خیز ہوتی ہیں۔ خُداوند نے علانیہ فرمایا تھا کہ "میری بادشاہی اِس دُنیا کی نہیں۔ مَیں اسواسطے دُنیا میں آیا ہُوں کہ حق کی گواہی دُوں۔ جو کوئی حق کی آواز سُنتا ہے وُہ میرا شاگرد ہے" (یُوحنا ۱۸: ۳۷)۔ "ابن آدم (مسیح) لوگوں کی جانیں برباد کرنے کو نہیں بلکہ بچانے آیا ہے" (لُوقا ۹/۵۶)۔ "خُدا نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا

اکلوتا بیٹا، بخش دیا تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے (یُوحنا ۳/۱۶)۔ "تم خُدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"۔ "اپنی تلوار میان میں رکھ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وُہ تلوار سے مارے جائیں گے"۔ (متّی ۲۶/۵۲)۔ خُداوند مسیح دُنیوی سلطنت کے حاصل کرنے کے مقصد کو ہی القائے شیطانی تصوّر کرتے تھے (متّی ۴/۸)۔ انجیل جلیل کو ایک سرے سے دُوسرے سرے تک پڑھ جاؤ تُم کو کسی ایک مقام میں بھی یہ نظریّہ نہیں ملیگا کہ خُدا کے پیاروں کو اِس دُنیا میں شوکت و حشمت، دولت و جاہ نصیب ہوں گے۔ یہ مفرُوضہ تمام سامراجی سلطنتوں کا ہوتا ہے۔ ناظرین کو علم ہے کہ گذشتہ عالمگیر جنگوں میں یہ نظریّہ ہر مُلک کے منبر پر سے سُنا جاتا تھا۔

ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ نظریّہ عیسائیوں نے یہودیوں سے اپنا لیا تھا جو مُسلمان عُلما کے بڑے کام کا تھا۔ اور وُہ اُسی دلیل کو پیش کرنے لگے جو یہودی اور عیسائی علما پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابو یُوسف کہتا ہے "خُدا کو نیکی سے زیادہ کوئی شے پسند نہیں ہے اور وُہ بدی سے زیادہ کسی چیز سے نفرت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اُس کے شکر گذار بندے نہیں ہوتے اور اُس کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے خُدا اُن سے سلطنت اور قوّت و طاقت چھین لیتا ہے اور ایسوں کو اُن کے دُشمنوں کے محکوم بنا دیتا ہے" (کتاب الخراج)۔ یہ نظریّہ قرآن و اسلام کے مطابق بھی تھا (احزاب آیت ۲۵ وغیرہ)۔ چنانچہ رسُولِ عربی نے مدعیِ نبوّت مسیلمہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد رسُول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کو۔ واضح ہو کہ زمین کا مالک خُدا ہے وُہ جس کو چاہتا ہے اُس کو عطا فرماتا ہے اور اُس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخرت میں صرف خُدا ترس ہی سرخرُو ہونگے"۔ پس اہلِ اسلام کو اِس یہودی نظریّہ

سے تقویت ملی کہ خدا سچے دین کو فتح بخشتا ہے بلکہ سید امیر علی جیسا روشن دماغ شخص بھی کہتا ہے کہ کامیابی اور فتح حق اور سچائی کو جانچنے کا سب سے بڑا اصول ہے (سپرٹ آف اسلام ایڈیشن ثانی صفحہ ۱۷۶)۔

انجیل کی تعلیم کے عین خلاف یہی نظریہ مشرقی کلیسیاؤں میں مروج تھا۔ مثلاً نسطوری پیٹر یارک ٹموتھی رسول عربی کی نسبت لکھتا ہے کہ "خدا نے محمد کو عزت اور طاقت، سلطنت اور قوت عطا کی اور بادشاہوں کو اُس کے پاؤں تلے کر دیا کیونکہ وہ خدائے برحق کی پرستش کرتا تھا"۔ انطاکیہ کا یعقوبی فرقہ کا پیٹر یارک مائیکل بارھویں صدی کے دوسرے نصف میں کہتا ہے کہ مسلمانوں کو جو دنیوی عظمت اور سلطنت حاصل ہے وہ اِس وجہ سے ہے کہ خدا اُن سے خوش ہے۔ یہ دلیل جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے مسیحی کلیسیا کے حق میں مہلک ثابت ہوئی کیونکہ اِس قسم کی دلیلوں سے متاثر ہو کر بہت مسیحی اپنے ایمان سے منحرف ہو کر دائرہ اسلام میں چلے گئے۔ چنانچہ مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن اسمٰعیل ہاشمی نے عبدالمسیح بن اسحٰق کندی کو اس دلیل سے بھی قائل کرنا چاہا تھا۔ اِس کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔

سوم۔ جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں اسلام سے پہلے مشرقی ممالک میں علم وفضل کے تین مرکز تھے:-

پہلا مرکز حران تھا جو چاروں طرف مسیحی کلیسیاؤں سے گھرا ہوا تھا یہاں یونانی علوم نے بہت ترقی حاصل کی۔ دوسرا مرکز نصیبین کا شہر تھا جس میں نسطوری کلیسیا کا مشہور مدرسہ تھا جہاں یونانی فلسفہ کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ یونانی فلسفہ مسیحی دینیات اور مسیحی علم الکلام کا بنیادی پتھر تھا۔ تیسرا مرکز جندِ نشاپور تھا جو خاص ایران میں تھا اور جس کو انطاکیہ کے سکول

کے مقابلہ پر ایرانی شہنشاہوں نے قائم کیا تھا۔ اِس سکول میں وہ علما بھی آ بسے تھے جو رومی سلطنت سے نسطوری ہونے کی وجہ سے ایڈیسہ سے نکال دیئے گئے تھے۔ پس اس میں زیادہ تعداد مسیحیوں کی تھی۔ خلفا کے زمانہ میں یہ مرکز بڑا زبردست طبی مدرسہ تھا جس میں سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ عباسی خلفا کے شاہی طبیب اِسی مدرسہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طب کا علم یہودیوں اور مسیحیوں ہی سے مخصوص تھا اور اُن تک ہی محدود تھا۔ متعدد عباسی خلفاء یا تو خالص حبِ علم کی خاطر یا محض اپنے دربار کی زینت و آرائش کی خاطر علوم و فلسفہ کے قدردان تھے۔ جب یونانی علوم و فلسفہ کے ترجمے عربی میں ہونے شروع ہوگئے تو پہلے پہل اُن کو سریانی زبان سے ہی عربی میں منتقل کیا جاتا تھا۔ خلیفہ مامون کے زمانہ میں جا کر عربی ترجمے براہِ راست یونانی زبان سے کیے جانے لگے۔ یہ مترجمین جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں باستثنائے چند افراد مسیحی کلیسیاؤں کے ممبر ہوتے تھے۔ پس مشرق کی کلیسیاؤں نے یونانی علم و فلسفہ کو مسلمانوں تک پہنچایا اور مسلمانوں کی عقلی موشگافیوں میں شام کے مسیحی تو افلاطونی فلاسفہ اور متکلمین نے رہنمائی کی اور جن کو منظم اور منضبط فکر مسیحی اہلِ علم سے حاصل ہوا۔ اور اسلامی متکلمین کو فلسفہ کا چسکا مسیحی اہلِ علم سے لگا جو اُمراء اور رؤسا کی خلوت و جلوت کے ندیم تھے۔ چونکہ یہ علوم مسلمانوں کو مسیحی لباس اور مسیحی نقطۂ نظر سے رنگے ملے تھے پس قدرتی طور پر مسلمان طالبانِ علم نے مسیحی تصورات کو اپنا لیا اور اس کو مسلمانوں اور مسیحیوں کے باہمی میل جول اور تبادلۂ خیالات سے تقویت پہنچی۔ اور مسیحیت نے مسلمان متلاشیانِ حق کے اذہان پر اثر کیا۔ اور یوں اسلامی طریقۂ استدلال مسیحی علماء اور فضلاء کا مرہون ہو گیا۔ اور

اسلامی متکلمین ان مسیحی متکلمین اور مسیحی علم کلام سے متاثر ہو گئے۔

چہارم۔ قرآن و حدیث سے مسلمانوں کو شریعت ملی تھی لیکن علم العقائد نہیں ملا تھا۔ جوں جوں مسلمان حکمت و فلسفہ سے واقف ہونے لگے اُن کے دماغ مابعد الطبیعاتی مسائل پر غور کرنے لگے۔ اسلام میں خدا اور کائنات کے متعلق اس قسم کے سوال پیدا ہونے لگے کہ خدا کیا ہے اُس کی ہستی اور وجود کا کیا مطلب ہے؟ اُس کی صفات کا اُس کی ذات سے کیا تعلق ہے۔ رسالت کیا ہے۔ اس کی ضرورت۔ حقیقت اور مفہوم کیا ہے۔ قرآن کس طرح اور کن معنوں میں کلام الٰہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اوپر چند ایک باتوں کا ذکر کر آئے ہیں جن کے لئے مسلمان عیسائیوں کے ممنونِ احسان ہیں۔ لیکن غالباً سب سے زیادہ اثر مسیحی خیالات اور معتقدات کا تھا جو اسلامی علم العقائد پر پڑا۔ دمشق۔ بصرہ اور بغداد میں مسیحی کلیساؤں کی مختلف شاخوں نے اسلامی عقائد کے نشوونما پر اپنے عقائد کا اثر ڈالا۔ اُس زمانہ میں مسلمان مسیحی مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ قدرتاً طالب علم کتابوں سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا اُستاد کے مُنہ سے سیکھتا ہے پس اُن کے خیالات اور معتقدات اُن کے مسیحی اُستادوں کے خیالات اور معتقدات کے سانچوں میں ڈھلتے گئے۔ اس فکری طبیعت سے قدرتاً اسلام میں مختلف خیالات رکھنے والے فرقے نمودار ہو گئے۔ کلیسیا کے شرکاء عقلی موشگافیوں میں سب پر سبقت رکھتے تھے پس مسلم مفکر اور فرقوں کے بانی مسیحی فضلاء اور مسیحی فلسفہ اور عقائد سے متاثر تھے۔ یہ ایک بڑا وسیع موضوع ہے لیکن یہاں ہم چند ایک عقائد کے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) **معتزلہ فرقہ**۔ پہلا مسئلہ جس پر مسلم علماء میں سخت نزاع بڑی

وُہ جبر و اختیار کا مسئلہ تھا۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ کسی زمانہ میں بھی جبر و اختیار کے مسئلہ پر اس قدر بحث نہیں ہوئی جتنی اسلامی فتوحات کے بعد ہوئی۔ مشرقی کلیسیائیں عموماً اختیار کی قائل تھیں۔ اوّلین خلفا کے زمانہ میں جو لوگ مسلمانوں کو اختیار کا سبق سکھاتے تھے ان میں سے متعدد اشخاص کے اُستاد مسیحی تھے۔

استدلال کا اسلام میں دخل پانا بجائے خود ایک زبردست تجدید تھی۔ قرآن و حدیث کے ماننے والوں نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ وُہ "قال اللہ" اور "قال الرسول" پر اکتفا کرتے تھے اور جو کچھ علم الفرائض کے باہر تھا اُس کو بدعت اور کفر سمجھتے تھے۔ ان علماء کے خلاف معتزلہ غور و فکر کو اہلِ ایمان کا فرض گردانتے تھے کیونکہ خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے تاکہ وُہ نیک و بد میں تمیز کر کے نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے مُنہ موڑے۔

معتزلہ کے حریف اہلِ حدیث تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنے علم العقائد کی تدوین شروع کی۔ معتزلی خیالات کے مقابل یہ گروہ الوہیت کے باب میں تشبیہی اور کائنات کے بارے میں مادی رنگ رکھتے تھے۔ وُہ رُوح کو جسمی یا جسم کا عرض سمجھتے تھے اور ذاتِ الٰہی کے تصور کی تشریح جسمِ انسانی کی صُورت میں کرتے تھے۔ وُہ عیسائیوں کے آسمانی باپ کے استعارہ کے خلاف تھے اور کہتے تھے کہ چونکہ خدا کی بیوی نہیں ہے لہٰذا اُس کا نہ کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور نہ وُہ باپ ہو سکتا ہے لیکن وُہ بڑی جرأت سے کام لے کر خدا کی صورت کے متعلق بال کی کھال نکال کر نہایت بیہودہ گوئی سے کام لیتے تھے یہاں تک کہ ذاتِ احدیت کی طرف سوائے داڑھی اور عضوِ مخصوص کے تمام اعضائے جسمانی منسوب کرتے تھے۔ ہم اس کا ذکر اپنی کتاب "ابوتِ الٰہی کا مفہوم" میں

کر چکے ہیں۔

معتزلین الوہیت کا تصور اس قسم کا نہ رکھتے تھے۔ اہلِ حدیث کے نزدیک خدا کا مفہوم بے مغز تھا۔ اس سوال کے جواب کہ خدا کی ذات و صفات میں کیا تعلق ہے، مختلف تھے۔ ذاتِ الٰہی کی وحدتِ مطلق کسی قسم کے ازلی صفات کی کثرت کی روادار نہ تھی کیونکہ پھر اس میں اور مسیحی عقیدۂ تثلیث میں فرق نہ رہتا۔ اس ناگوار پہلو سے بچنے کی خاطر بعض کسی ایک صفت کو دوسری صفات کا ماخذ قرار دیتے تھے اور بعض ان کو عین ذات قرار دیتے تھے جس سے ان صفات کے گویا کوئی معنی ہی نہ رہے۔ معتزلی متکلمین کہتے تھے کہ خدا عالم ہے مگر اس طرح کہ وہ آپ ہی اپنا علم ہے اور شاذ و نادر ہی منفیانہ اقوال سے آگے بڑھتے تھے مثلاً خدا اس جہان کی چیزوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ زمان و مکان اور حرکت وغیرہ کے ماورا ہے وغیرہ وغیرہ۔

معتزلہ فرقہ اسلام میں بڑا زبردست فرقہ ہوا ہے۔ یہ فرقہ یونانی علمائے دینیات بالخصوص مُقدس یوحنائے دمشقی اور اُن کے شاگرد تھیوڈور ابو قرہ اسقفِ حران کے زیر اثر پیدا ہوا۔ ان مسیحی فضلاء کے خیالات سے متاثر ہو کر اسلام میں "ارجاء" اور "قدریت" کے عقائد پیدا ہو گئے۔ اعتزال کا سب سے پہلا مسئلہ جس سے اس مذہب کی تاریخ شروع ہوتی ہے یہ تھا کہ انسان جو بھلائیاں کرتا ہے وہ خود کرتا ہے۔ خدا مجبور نہیں کرتا۔ اس مسئلہ کو لفظ "قدر" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے معتزلیوں کا دوسرا نام "قدریہ" ہے گو وہ اپنے آپ کو "عدلیہ" کہتے تھے کیونکہ خدا تب ہی عادل مانا جا سکتا ہے جب انسان کو اپنے افعال کا مختار تسلیم کیا جائے۔

مسیحی کلیسیا خداوند مسیح کو کلمۃ اللہ مانتی تھی۔ اور مسیحی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ خدا قدیم سے ہے اس لئے اُس کا کلمہ بھی قدیم سے ہے اور اس کی تائید میں وہ یوحنا کی انجیل کی پہلی آیت کی تفسیر اور تاویل پیش کرتے تھے۔ چونکہ مسلمان علماء خداوند مسیح کو قدیم نہیں مانتے تھے پس وہ قرآن کو (جس کو کلام اللہ مانتے تھے) قدیم ماننے لگے۔ وہ خداوند مسیح کی قدامت کے مقابل قدامتِ قرآن پیش کرتے تھے۔ اس مسئلہ کی تاریخ دلچسپ ہے پس مختصر طور پر ہم اس کو پیشِ ناظرین کرتے ہیں۔

نبیؐ عرب کے زمانہ میں مدینہ کا ایک یہودی لبید بن اعصم تھا جس نے رسُول پر جادو کیا تھا۔ وہ مسئلہ "خلق توریت" کا قائل تھا۔ اُس کے بھانجے طالوت نے جو اُس کا شاگرد تھا خلق توریت پر ایک مستقل رسالہ لکھا۔ جب بانیٔ اسلام نے خیبر کو فتح کیا اور یہودی عراق اور شام کے ممالک میں جلاوطن کر دیئے گئے تو ابان بن سمعان نے خلقِ تورات کا مسئلہ یہودی فضلاء سے لیا اور "نفیٔ صفات باری" کی تعلیم جعد بن درہم حرانی سے حاصل کر کے ان دونوں مسئلوں کو اسلام میں داخل کر لیا۔ چنانچہ ابن تیمیہ نے عقیدہ حمویہ میں لکھا ہے کہ خلقِ قرآن اور نفیٔ صفات کی اصل یہودی اور مشرکوں سے ماخوذ ہے۔ حران کے بعض فلاسفہ خدا کی صفات کے متعلق کہتے تھے کہ خدا کی صفات یا سلبی ہیں یا اضافی ہیں یا وہ ہیں جو ان دونوں سے مرکّب ہیں۔ ان کے سوائے خدا کی کوئی اور صفت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ خلقِ تورات کے تصور کو قرآن پر حاوی کیا گیا۔ یوں جعد بن درہم نے خلقِ قرآن کی بدعت شروع کی۔ خلیفہ ہشام بن عبد الملک (از ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) کے حکم سے عراق کے والی خالد بن عبد اللہ نے اس کو قتل کر دیا۔

معتزلہ خلقِ قرآن کے قائل تھے۔ وُہ یہ دلیل لاتے تھے کہ اگر اللہ کی صفت کلام ہے تو لازمی طور پر قرآن کو جو کلام اللہ ہے ازلی، قدیم اور تمام زمانوں سے اور عالموں سے پہلے موجود ہونا چاہیئے۔ ورنہ اگر خُدا نے زمان میں کلام کیا تو اس سے خُدا کی ذات میں تغیّر لازم آئیگا کیونکہ خُدا وُہ کچھ ہو جائیگا جو وُہ اُس کلام کے زمانہ سے پہلے نہ تھا اور خدا اس طرح کا انفعال خُدا سے منسُوب نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر کلام، اللہ کی صفت ہے اور قرآن یہی کلام ہے تو قرآن کو بھی خُدا کا کلام ہونے کی بِنا پر قدیم ہونا چاہیئے لیکن یہ امر خلافِ قیاس ہے کیونکہ قرآن زمان و مکان میں جمع کیا گیا تھا اور احاطۂ تحریر میں لایا گیا تھا پس وُہ صریحاً ایک حادث چیز ہے اور مخلُوق ہے۔

خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے تو معتزلہ عالم کو قتل کر دیا تھا لیکن جب یزید بن ولید بن عبدالملک تختِ خلافت پر بیٹھا تو اُس نے علانیہ مذہب اعتزال کو اختیار کر لیا۔ جب اُس کے بھتیجے ولید بن یزید (از ۱۲۵ھ) نے حد سے زیادہ عیاشی شروع کر دی تو یزید ناقص نے اعتزال کے پانچویں اصُول "امر بالمعرُوف" پر عمل کر کے اُس کے خلاف جنگ کر دی۔ بہت سے معتزلیوں نے اُس کا ساتھ دیا اور یُوں حکوُمت کی اعانت سے مُعتزلہ ترقی کرتے گئے۔

جب عہد عباسیہ کا دَور شروع ہُوا تو خلیفہ منصُور کے عہد میں اعتزال ترقی کر گیا۔ اِس خلیفہ نے (جیسا ہم بتلا چُکے ہیں) پہلوی، سریانی اور یُونانی حکمت و فلسفہ کی چند کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا جس کی وجہ سے اسلام کے مسائل پر نکتہ چینیاں شروع ہو گئیں۔ ان کا جواب دینے کے لئے عُلماء نے معتزلہ نے میدانِ مناظرہ میں آ کر عقلی دلائل سے اپنے حریفوں کو شکست دی اور ہزاروں اشخاص نے اُن کا مذہب اختیار کر لیا۔

خلیفہ مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا لیکن جب اِس کے بیٹے ہارون رشید کا وقت آیا تو چُونکہ وُہ خود فلسفہ سے بے بہرہ تھا اُس نے بھی اعتزال کو روکنا چاہا لیکن اِس کے دربار پر برمکی خاندان کا اثر چھایا ہُوا تھا جو نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال خاندان تھا پس اُن کی سرپرستی میں اعتزال ترقی کرنے لگا۔ لیکن فقہا سے رہا نہ گیا۔ اُنہوں نے زور دے کر ہارُون سے مناظرہ کی مجلسیں بند کروا دیں اور اعتزال کی ترقی روک دی۔ ہارُون کی روک ٹوک سے غیر مسلموں اور خصُوصاً مسیحیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام عقل کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتا۔

خلیفہ مامُون نے خود اعتزال قبُول کر لیا تھا پس اُس نے یہ صُورتِ حالات دیکھ کر ایک عظیم الشّان مجلسِ مناظرہ قائم کی اور مملکت کے مختلف اضلاع میں بھی مناظرے کروائے۔ ان مناظروں میں معتزلہ نے دُوسرے مسُلمان فرقوں پر فتح پائی اور ہزاروں نے مذہبِ اعتزال قبُول کر لیا۔ بڑے بڑے معتزلی درباری ہو گئے۔ مامُون نے حُکم دیا کہ قرآن کو "مخلُوق" یعنی کلام انسانی مانا جائے۔ اُس نے ہر قاضی کو جو اس عقیدہ کا مخالف تھا عہدہ سے برطرف کر دیا اور محکمۂ "احتساب و تعزیر" قائم کر دیا۔ اُس کے دربار کے معتزلہ نے بے شمار مسُلمانوں کو مُبتلائے ضرب و قتل اور دار و رسن سے کام لیا۔ امام احمد بن حنبل نے خلقِ قرآن کی مخالفت کی تھی۔ اُس کو قید کیا گیا اور عذاب دیا گیا۔ اُس کو اس شدّت سے کوڑے لگائے گئے کہ وُہ بے ہوش ہو گیا۔ ۲۱۲ھ سے ۲۳۲ھ تک تمام اسلامی مملکت میں علماء کا قتال ہوتا رہا۔ خلقِ قرآن کی تاریخ میں امام عبدالعزیز مکی اور بشر بن غیاث المریسی کا جو معرکۃ الآرا مناظرہ خلیفہ مامُون کے سامنے ہُوا وُہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

مامُون کے بعد اُس کا بھائی معتصم اور اُس کا بھتیجا واثق تختِ خلافت پر بیٹھے۔ یہ دونوں بھی معتزلی تھے پس معتزلی علما دربار کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان خلفا کے زمانہ میں بہت مسلمان علما قتل کیے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خلفا نے خلقِ قرآن کے مسئلہ کو خلافت کے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

جب واثق ۲۲۷ھ میں خلیفہ ہُوا تو علمی بیداری پھر شروع ہو گئی۔ کیونکہ یُوحنّا ابن ماسویہ اُس کا دستِ راست تھا چنانچہ مسعُودی کا بیان ہے کہ اُس نے ایک دفعہ یُوحنّا کو اُس کی تصنیف پر تین لاکھ درہم دیئے۔ خلیفہ واثق خلقِ قرآن کا قائل تھا اور اُس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وُہ اُس کو مانیں۔ واثق نے ۲۳۱ھ میں بصرہ کے علما کو شکنجہ میں کسنے کا حکم دیا معتزلی فقہا کا فتویٰ حاصل کر کے اس نے نصر بن احمد خزاعی کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور اُس کے سر کو بغداد میں اور دھڑ کو سامرا میں بابک خرامی کے برابر صلیب دی گئی۔ اس کا قصُور یہ تھا کہ وُہ آخرت کے روز دیدارِ الٰہی کا قائل تھا اور قرآن کو غیر مخلوق سمجھتا تھا پس اس پر شرک کا جرم لگایا گیا تھا۔ لیکن ہر کمالے را زوالے۔ فلسفہ اور اعتزال کو صرف پندرہ سال فروغ حاصل ہُوا۔ کیونکہ ۲۳۲ھ میں واثق کے انتقال کے بعد اُس کے بھائی اور جانشین خلیفہ متوکل نے فلسفہ اور اعتزال دونوں کو مردُود قرار دے دیا۔ اس نے حکم دیا کہ قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے مضمون پر کوئی مناظرہ نہ کیا جائے۔ اُس نے اسلامی فقہا اور محدثین کو بُلوا کر اُن کی عزت و تکریم کی۔ اور احیائے سُنّت کی طرف توجّہ کی۔ جب قاضی احمد بن داؤد نے ۲۴۰ھ میں وفات پائی تو معتزلی تشدد اور تعصب کا دَور بھی ختم ہو گیا۔

گو خلیفہ متوکل نے ہر ممکن کوشش کی کہ عقل و فلسفہ کی ترقی کو روک دیا جائے لیکن اب یہ اُس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اعتزال کا مذہب تمام اسلامی ممالک میں پھیل چُکا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک عرب۔ عراق۔ مصر۔ خراسان۔ فارس۔ کرمان۔ خوزستان تک معتزلہ بکثرت پائے جاتے تھے۔ جب سلجوقیوں کا زمانہ آیا تو مذہبی آزادی مٹ گئی۔ معتزلیوں پر ہر قسم کا جبر و ستم اور ظلم روا رکھا جاتا تھا۔ کسی کو معتزلی خیالات کے اظہار کی جُرأت نہ تھی۔ چنانچہ محمد بن احمد (تاریخ وفات ۴۷۸ھ) جو بڑے پایہ کا معتزلی عالم تھا پچاس برس تک اپنے گھر سے نہ نکل سکا۔ تُرک تلوار سے ہی کام لینا جانتے تھے۔ اور چُونکہ چھٹی صدی ہجری کے بعد اسلامی دُنیا میں ہر جگہ تُرک ہی تُرک تھے اس لئے اعتزال زندہ نہ رہ سکا۔

مذہبِ اعتزال کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ معتزلہ مسیحیّت سے عملاً متاثّر تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نویں صدی کے مشہُور متکلم ابوالہذیل العلّاف کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ مسلمان عالم اُن میں سے ہے جنہوں نے اسلامی عقائد پر فلسفیانہ نظر ڈالنے میں ابتدا کی تھی۔ وُہ کہتا ہے کہ یہ بات قیاس میں بھی نہیں آ سکتی کہ الٰہی صفات کسی طرح الٰہی ذات کی طرف محمُول ہو سکتی ہوں۔ یا تو وُہ عینِ ذات ہیں یا اس سے مختلف ہیں لیکن تاہم اس کے خیال میں خُدا عالم ہے اور قادر اور زندہ ہے مسیحیوں کی تثلیث کے مقابل وُہ خُدا کے علم اور قُدرت اور زندگی کو (جو اُس کی عینِ ذات ہیں) ذاتِ الٰہی کی کیفیّات بتلاتا ہے۔ وُہ مسیحیوں کی طرح قیامت کے روز دیدارِ الٰہی حاصل ہوگا اس کی تاویل رُوحانی معنوں میں کرتا ہے۔ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ ابوالہذیل یہ نہیں مانتا کہ ارادہ الٰہی ابدی ہے۔ بلکہ وُہ

مُطلق اظہارِ ارادہ کرنے والی ذات اور اس چیز سے جس کا ارادہ کیا جائے جُدا کر کے اُس کو الگ ایک تیسری چیز مانتا ہے چُنانچہ مطلق لفظ "کُن" اُس کے مُطابق قدیم خالق اور حادث کائنات کے مابین ایک اوسط درجہ رکھتا ہے جس طرح انجیل میں آیا ہے کہ "کلام کے ذریعہ سب چیزیں پیدا ہوئیں"۔ مسیحی فضلاء کی طرح وہ مُطلق "لفظ کُن" میں اور "عارضی" کلام وحی (یعنی قرآنی عبارت) میں تمیز کرتا ہے مسیحی دینیات کے علماء کی طرح وُہ انسانی افعال کی دو قسمیں بتلاتا ہے یعنی قُدرتی اور اخلاقی۔ اخلاقی عمل صرف وُہی ہے جس کو انسان خود اختیاری کی حالت میں کرے۔ اِس مختصر بیان سے ظاہر ہے کہ انجیل اور مسیحی عقائد نے ابوالہذیل کو کس قدر متاثر کر رکھا تھا۔

اِس سلسلہ میں نظّام (سالِ وفات ۸۴۵ء) کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ جو ابوالہذیل کا ہم عصر تھا۔ یہ دونوں حکیم مامُون۔ واثق اور متوکل کی خلافت میں زندہ تھے۔ نظام کے عقائدِ فقہ کے دو اصُول اجماع اور قیاس کے مخالف تھے۔ وُہ کہتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ تمام اسلامی دُنیا کسی غلط مسئلہ کو اجماع کے ذریعہ جائز قرار دے دے مثلاً یہ کہ صرف رسُولِ عربی ہی تمام بنی نوعِ انسان کے لئے خُدا سے پیغام لائے تھے۔ کیونکہ خُدا ہر پیغمبر کو تمام بنی نوعِ انسان کے لئے بھیجتا ہے۔ وُہ قرآن کی لاثانی فضیلت کا بھی قائل نہ تھا۔ اسلامی عقیدہ عذاب و ثواب کو بھی وُہ کوئی خاص اہمیّت نہیں دیتا اور عذابِ جہنم کو وُہ صرف ایک سوزش کا عمل قرار دیتا ہے۔

ابو یعقوب ابنِ اسحٰق الکندی جس کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کر آئے ہیں معتزلی عالمِ دین اور نو فلاطُونی فلسفی تھا جو فیثا غورثی خیالات

بھی رکھتا تھا۔ اُس کا باپ شہر کُوفہ کا عامل تھا جہاں وُہ پیدا ہُوا۔ جب متوکل کے زمانہ میں کٹر اسلام کا دَور دَورہ ہُوا تو وُہ دربار سے نکال دیا گیا۔ اسلام کے اس واحد فلاسفر کا کُتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ اس کی وفات اس حالت میں ہُوئی جب وُہ دربارِ خلافت سے معتوب تھا۔ ایسا کہ اُس کے سالِ وفات کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ وُہ ہمہ گیر طبیعت رکھتا تھا اور اُس کو اپنے وقت کے تمام علم و فضل پر عبُور تھا۔ وُہ یہ کوشش کرتا ہے کہ قرآن کو قرینِ عقل ثابت کرے۔ اُس نے مسیحیت اور مسیحی عقائد کی تردید میں بھی ایک کتاب لکھی تھی۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بعض معتزلہ ثنویت کے قائل تھے۔ بعض فاضل ایسے بھی دلیر تھے جو بے خوف ہو کر کہتے تھے کہ مسیح عیسٰی کو محمد پر فوقیت حاصل ہے۔ مثلاً فضل اور ابنِ حایط۔ چنانچہ شہرستانی لکھتا ہے کہ یہ دونوں نظام کے شاگرد تھے جو معتزلہ تھا۔ وُہ دو خُداؤں کے وجُود کے قائل تھے۔ ایک اللہ اور دُوسرا کلمتہ اللہ یعنی حضرت عیسٰی (الملل والنحل)۔ وُہ عیسائیوں کی طرح اُلوہیتِ مسیح کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ قیامت کے دن حضرت مسیح مُردوں کا حساب کریگا۔ احمد بن حایط کہتا تھا کہ مسیح نے انسانیت کا جامہ پہن لیا تھا اور کہ وُہ ازلی کلام تھا جو مجسّم ہُوا۔ ہر انجیل خواں جانتا ہے کہ عیسائیوں کا ایمان بھی یہی ہے فضل اور وُہ دونوں یہ تعلیم دیتے تھے کہ ایک تو خُدا ہے جو ازل سے خالق ہے اور دُوسرا عیسٰی بن مریم ہے جو خالق بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح ابن اللہ ہے جو خُدا سے پیدا نہیں ہُوا تھا بلکہ اُس کا لے پالک بیٹا تھا۔ وُہ جیسا قرآن میں ہے (۸۹ : ۲۳ و ۲۰ : ۱۲) قیامت کے روز حساب لیگا۔ وُہ بادلوں پر

آئیگا۔ اُسی مسیح نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا (کتاب الفرق بین الفرق) شہرستانی ہم کو بتلاتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں (از ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) منصور کہتا تھا کہ خدا نے پہلے پہل عیسیٰ بن مریم کو خلق کیا اور پھر علی بن ابی طالب کو خلق کیا۔ جب حلاج کو ۹۲۱ء میں قتل کرنے لگے تو اُس کے آخری الفاظ تھے "میں دُکھوں کا وُہ پیالہ پینے لگا ہُوں جو مسیح نے پیا تھا"۔ ابن العربی (تاریخ وفات ۱۱۶۵ء) کہتا ہے "مسیح تمام مقدسوں کی خاتم اور مُہر ہے۔ دُنیا میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ رُوح اللہ ہے اور ابنِ مریم ہے" (فتوحات المکیہ)۔

سطورِ بالا سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مسلمان اہلِ علم و فکر کے خیالات میں اور مسیحی اہلِ فضل کے معتقدات میں منضبط اور منظم فکر کا تعلق ہے اور مسیحی تصورات بمناسبتِ ظروف مسلمان صوفیا کو متاثر کر رہے تھے۔ جب حکومتِ وقت کی ہمت افزائی سے امام احمد بن حنبل کی مسند اور بُخاری کی صحیح کی تدوین ہو رہی تھی تب معتزلہ بھی مسیحیت اور مسیحی فلسفہ سے متاثر ہو کر مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور و فکر کر کے کبھی نو افلاطونیت کے جانی فلاطینس کی طرح نفیِ صفات کے عقیدہ کا اظہار کرتے تھے اور کبھی خدا پر مُتصف واجب قرار دیتے تھے اور کبھی نو افلاطونی شارحینِ ارسطو کی پیروی کر کے خدا کی صفاتِ ثبوتیہ کی بجائے صفاتِ سلبیہ پر زور دیتے تھے۔

ان فلسفیانہ تصورات سے عباسیہ خلفا گھبرا اُٹھے۔ اُنہوں نے عقل و فلسفہ کی ترقی کو ہر ممکن طور سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ بیت الحکمت کے قیام کے صرف پچاس سالوں کے اندر اندر المعتمد علی اللہ (۲۵۶ھ تا ۲۷۹ھ) نے کُتب فروشوں سے اس بات کا حلف اُٹھوایا کہ وُہ علم الکلام اور فلسفہ کی کتابوں کو فروخت نہ کرینگے۔

اِس ممانعت سے ۵۰ سال قبل اہلِ سُنت کا جو تھا اور آخری امام فوت ہو گیا تھا۔ اور تیس برس قبل اہلِ شیعہ کے بارھویں اور آخری امام کی غیبت واقع ہو چکی تھی۔ ان ایّام میں ایک طرف تو معتزلہ اور فلاسفہ اہلِ سُنت میں اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے اور دُوسری طرف اثنا عشریوں کے آخری امام کی غیبت صغریٰ شروع ہوتے ہی ۲۶۰ھ میں اسمٰعیلی شیعوں نے اثنا عشری شیعوں میں اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی۔ ان گروہوں کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ گو ناقص فلسفیانہ نظریات ختم ہو چکے تھے لیکن شیعہ اور سُنی بنی عباس کے شیعوں کی پیروی کر کے نبی اور امام کو فوق البشر ہستی تصور کرنے لگے۔ اور چوتھی صدی ہجری میں عقل کے متعلق یہ کہا جانے لگا کہ اوّل ما خلق اللہ العقل۔ ان تصورات پر مسیحی معتقدات کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں جو تصوف کا عہدِ زرین ہے حضرت محمد کو عقلِ اوّل بنا لیا گیا تاکہ اُن کو خداوند مسیح کے مقابل پیش کیا جا سکے۔

بنو عباس کے ایرانی شیعوں کی وجہ سے اسلامی فرقہ راوندیہ میں یہ عقیدہ رائج تھا کہ جو رُوح حضرت عیسیٰ بن مریم میں تھی وُہی رُوح علی بن ابی طالب میں جلوہ گر ہوئی اور پھر آئمہ میں منتقل ہوتی آئی اور ابراہیم بن محمد تا علی بن عبداللہ بن عباس میں آ گئی۔ اور کہ یہ سب امام خدا تھے۔ ۱۳۶ھ میں راوندیہ جماعت کی بیخکنی ہو گئی لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ کسی نہ کسی صورت میں شیعانِ بنی عباس میں جاری رہا اور ان کا امتیازی نشان رہا۔ جب خلیفہ معتصم کے دربار میں ترک دخیل ہونے لگے تو شیعانِ بنی عباس نے خلفائے عباسیہ سے مایوس ہو کر آئمہ بنی فاطمہ کی طرف رجوع کیا۔ اور ابن باباقی نے اور فارس بن حاتم قزوینی نے اور محمد بن نصیر نے امام علی نقی کو خدا کہنا شروع کر دیا۔ جب امام صاحب نے

ان نبیوں کو ملعون قرار دے دیا اور شیعانِ بنی عباس کو اثنا عشری امام کی طرف سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے اسمٰعیلی شیعوں کی جانب رُخ کیا۔ یہاں وُہ کامیاب ثابت ہوئے اور اب ہمارے زمانہ تک خوجہ لوگ ۴۹ ویں امام آغاخاں کو خدا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرحوم ہز ہائینس سر آغاخاں کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر کتاب "نورِ مبین حبل اللہ المتین"، شائع ہوئی جس میں لکھا ہے کہ اسمٰعیلی فرقہ اپنے امام کے جامہ میں خدا کو جلوہ گر مانتا ہے اور علی کا دیدار اللہ کا دیدار جانتا ہے اور الفاظ یداللہ ۔ وجہ اللہ ۔ لسان اللہ اور عین اللہ کا مطلب امام ہی سے لیتا ہے ۔ اور کہ خدا کا پاک نور امام کے سینہ میں سمایا ہوا ہے پس وُہ اس کی اطاعت کرتا ہے۔

جو شخص مسیحی فلسفیانہ اصطلاحات سے واقف ہے وُہ خود اس اثر کو بھانپ لیگا جو مسیحی فضلا کے کلام نے ان مختلف اسلامی فرقوں پر ڈالا تھا۔ لیکن اس اثر کا ایک بڑا نتیجہ مسیحی کلیسیا کے حق میں یہ نکلا کہ اعتزال کے مذہب اور دیگر عقل پرست آزاد فرقوں کے خیالات سے متاثر ہو کر بہت سے آزاد خیال مسلمان مسیحی ہونے سے باز رہے۔

(۲) تصوُّف اور صُوفیہ۔

رسُولِ عربی کے زمانہ سے بہت پہلے مسیحی کلیسیا میں رُہبانیت کا زور تھا اور عرب کے عوام الناس پر رُہبانوں کی زندگی کا بڑا اثر تھا چنانچہ ایامِ جاہلیت کے شعرا ان کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے اشعار میں رُہبانوں کی نمازوں ۔ عبادتوں ۔ گرجاؤں کے گھنٹوں ۔ تصویروں ۔ کھجور کے اتوار کی رسموں وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان شعرا میں سے بعض مسیحی قبائل عرب کے تھے ۔

حضرت محمد پر ان مسیحی درویشوں کی زندگی نے بڑا اثر کیا تھا ۔ چنانچہ

قرآن میں آیا ہے "یہ لوگ توبہ کرنے والے ۔ عبادت گزار ۔ تعریف کرنے والے ۔ سفر کرنے والے ۔ رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے ۔ نیک باتوں کا حکم دینے والے ۔ بُری باتوں سے روکنے والے اور حدودِ الٰہی کے محافظ ہیں" (۹: ۱۱۲)۔ آنحضرت بُت پرستوں سے کہیں زیادہ مسیحیوں کو اور مسیحی کلیسیاؤں کو پسند کرتے تھے۔ (۳/۱ ۔ ۲: ۵۹ + ۵/۴۳ ۔ وغیرہ)۔ نبی ہونے سے پہلے آپ خدا کی تلاش میں رہتے تھے (۹۳/۷)۔ آپ کی ملاقات مسیحی راہب بحیرہ سے ہوئی تھی۔ عرب کے صحرا میں بہت عرب مسیحی رُہبان بادیہ نشین تھے۔ خود آنحضرت ریاضت کی خاطر غاروں میں چلے جایا کرتے تھے چنانچہ طبری جو پہلے عیسائی تھا لکھتا ہے "اب میں رسُول اللہ کی ریاضت اور تپسیا کا ذکر کرتا ہوں جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ آپ دُنیا کی کشش اور اس کے فریب کی طرف سے مطلقاً بے نیاز تھے ۔ کوئی انسان اس قسم کی ریاضت کرنے والے شخص کو کاذب اور فریبی قرار نہیں دے سکتا۔ چنانچہ آپ کبھی روٹی کو ہاتھ نہ لگاتے تاوقتیکہ آپ بھوک کے مارے بے حال نہ ہو جاتے"۔ بعض صوفیہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آنحضرت نمازِ معکوس ادا کیا کرتے تھے اور اسی بنا پر قطب الدین بختیار نے بابا فرید کو حکم دیا تھا کہ چلہ معکوس کرے لیکن صحیح حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی تو صاف کہتا ہے کہ "میں نے علمِ ظاہر کی کتابوں میں یہ کہیں نہیں پایا"۔ غالباً اصل حقیقت یہ تھی کہ حضرت غارِ حرا میں خلوت نشینی کرتے تھے اور عبادت کے وقت آپ پر مراقبے کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔

حضرت محمد کے صحابہ پر بھی مسیحی رُہبانوں کا بڑا اثر تھا۔ چنانچہ تمیم الدین داری جو آنحضرت کے صحابہ میں سے تھا اور پہلے مسیحی رہ چکا تھا تمام رات

قرآنی آیت (۳۵/۲۴) وردِ زبان کرتا رہا یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ عثمان بن مظعون نے آنحضرت سے کہا "یا رسول اللہ۔ میرا جی کرتا ہے کہ میں درویش ہو جاؤں۔ پہاڑوں کو نکل جاؤں اور راہبانہ زندگی بسر کروں۔ اپنی دولت خیرات میں دے دوں اور اپنی بیوی خولہ کو طلاق دے دوں۔ گوشت کھانا ترک کر دوں اور خوشبوؤں کے استعمال سے پرہیز کروں" (ابن سعد طبقات جلد سوم حصہ اوّل صفحہ ۲۸۷)۔ ابنِ خلدون بھی لکھتا ہے کہ صوفیہ کا راستہ وُہی ہے جو صحابہ اور تابعین کا تھا اور یہی راستہ حق اور نجات کا راستہ ہے (مقدمہ صفحہ ۴۶۷)۔ صوفی حضرات نے مبالغہ سے کام لے کر (جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے) اپنا سلسلہ حضرت محمد، حضرت علی اور حضرت ابوبکر تک پہنچا کر کہتے ہیں کہ آنحضرت نے ان صحابہ کو اور خصوصاً علی کو پوشیدہ تعلیمات دی تھیں۔ قرآن میں ہے "اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (۲۴/۳۵)۔ "خدا تمہارے اندر ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو"۔ اللہ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن ہے (۵۷/۳)۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ حدیث میں آیا ہے۔ یہ تصوّرات تصوّف کے ہر مسئلہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہی خیالات مسیحی عارفوں اور درویشوں کے دل و دماغ میں بستے تھے۔

(۲)

خلفائے راشدین کے بعد خلفائے بنی اُمیہ کے ظلم اور استبداد، فسق و فجور کو دیکھ کر وُہ اشخاص جو صدقِ دل سے اسلام لائے تھے اور جو طالبانِ حق تھے وُہ اس قدر متنفر ہو گئے کہ وُہ دُنیائے دُوں کو ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں یہ گوشہ نشین حالتِ استغراق میں ہو کر وجد میں آنے لگے اور ان پر حالتِ کشف طاری ہونے لگی۔ اس منزل پر نفس کشی

اور ترکِ دُنیا نہ صرف کارِ ثواب سمجھے جاتے تھے بلکہ خُدا کی خلوصِ دل کی عبادت کا اظہار خیال کیے جانے لگے۔ اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ حصُولِ جنّت کے لئے لازم ہے کہ دُنیا کا کم سے کم مال ہی ان کے پاس ہو لیکن بعد کے زمانہ میں یہ گوشہ نشین مال کی حرص بھی دل سے نکال دیتے تھے تاکہ دل اور ہاتھ دونوں دُنیوی مال سے خالی رہیں۔ اور یہی صوفیہ کا نشان تھا چنانچہ مس انڈرہل لکھتی ہے کہ "مسیحی عارف کی مُراد لفظ "ناداری" سے یہ ہوتی تھی کہ خانی دولت اور خواہشِ دولت دونوں کو ترک کر کے تمام دُنیوی اشیا سے بے تعلقی حاصل ہو"۔

علّامہ ابنِ خلدون (از ۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) کہتا ہے کہ لفظ تصوّف کا مادہ "صوف" ہے جس کے معنی اُون کے ہیں۔ کیونکہ صُوفی عموماً اُونی کمبل اوڑھا کرتے تھے۔ فارسی میں اس لفظ کے معنی پشم اور پشمینہ ہیں۔ ایران میں ریاضت کرنے والے تارک الدنیا مسیحیوں کو "پشمینہ پوش" کہتے تھے۔ مسلمان درویشوں اور گوشہ نشینوں نے وُہی لباس اختیار کر لیا تھا جو مسیحی کلیسیا کے زاہد استعمال کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب حماد بن سلمہ (۷۸۳ء) بغداد آیا تو اُس نے فرقد السنجی کو (جو اُس کے سامنے کُھردرے اُون کا لبادہ پہن کر آیا تھا) کہا کہ "یہ مسیحیت کا نشان ہے۔ اس کو اُتار پھینک"۔ اس لباس کو "زی الرہبان" یعنی مسیحی راہبوں کا لباس کہا جاتا تھا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اسی قسم کا لباس پہنا کرتے تھے۔ غالباً اسی واسطے حضرت محمد بھی کمبل اوڑھتے تھے چنانچہ قرآن میں آپ کو "مزمّل" اور "مدثّر" کہا گیا ہے (۷۳/۱ - ۷۴/۱)۔ رسُولِ عربی کے بعد قریباً دو سو سال تک مسلمان صوفیہ مسیحی راہبوں کا سا لباس پہنتے رہے۔

ابتدائی زمانہ کے یہ صوفیہ اپنے ایمان و عمل میں پکے اور مخلص مسلمان ہوتے تھے اور قرآن و حدیث پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ ابھی فلسفیانہ تصورات کے نزدیک بھی نہ پھٹکے تھے۔ وہ صرف یہی چاہتے تھے کہ خودی کو ترک کرکے ریاضت اور عبادت میں ہی اپنا تمام وقت صرف کریں۔ ۸۲۰ھ تک مسلم صوفیہ نے اپنے خصوصی عقائد کو قرآنی آیات کی تاویل سے وضع کر لیا تھا۔ یہ قدیم صوفیہ واعظ جن کے کلام سے عوام مسلمان وجد میں آجاتے تھے ٹھیک اسی قسم کے وعظ کرتے تھے جس طرح کے وعظ مسیحی واعظ اپنے منبروں پر سے کیا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات یہ مسلمان صوفیہ انجیل کے کلمات بھی دہرایا کرتے تھے۔ ان کے وعظ پُرجوش ہوتے تھے۔ ان کے اخلاق بلند تھے۔ ان کے وعظوں میں نہ کوئی نمود تھی اور نہ مرصع کاری۔ وہ فنی اصطلاحات سے پاک ہوتے تھے۔ ان کی تقریروں میں مسیحی کتابوں کے جملوں کے جملے پائے جاتے تھے جس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کی زندگی کے اصلی سرچشمے مسیحی تھے۔ بعض اوقات ان کی کتابوں میں ہم کو صرف انجیل کے جملے ملتے ہیں بلکہ مقامات کے مقامات ملتے ہیں۔ مثلاً اولین صوفی مصنف بیج بونے والے کی تمثیل (متی ۱۳/۴-۹) کا استعمال کرتا ہے۔ ابوطالب متی ۲۵: ۳۱-۴۵ کے زرین اقوال کو نقل کرتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس انجیلی مبارکبادیاں بھی ان میں نقل کی گئی ہیں۔ بعض اوقات مسیحی واعظوں کے وعظ بغیر کسی ردو بدل کے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ابوطالب مقدس توما رسول کے اعمال کی کتاب کے قصہ (جس کا مفصل ذکر ہم جلد اول میں کر آئے ہیں) کی جانب اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے "جو شخص کسی محتاج کو خیرات دیتا ہے وہ فردوس میں اپنے لئے محل بناتا ہے"۔

تصوف مشرقی کلیسیاؤں کے درمیان بڑھا اور پھولا پھلا۔

اس مسلک کے نظام کے عناصر ہی ایسے ہیں جو مشرقی کلیسیاؤں سے مخصوص ہیں۔ یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ اولین درویش اور ریاضت کش مسلمان (جو صوفیہ کے پیش رو تھے) اپنی زندگیوں کو مسیحی راہبوں کی زندگیوں کے نمونہ پر ڈھالتے تھے۔ مسیحی صوفیہ اور درویشوں نے اسلامی تصوف کو ڈھالنے اور اس کے خیالات کے نشوونما میں بڑا اور نمایاں حصہ لیا ہے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ رہبانیت خداوند مسیح سے مدتوں پہلے اہل یہود میں موجود تھی۔ لیکن مشرقی کلیسیا میں دنیا کو ترک کرنے کا خیال چوتھی صدی مسیحی کے نصف سے پھیلتا چلا گیا۔ نسطوری کلیسیا میں تارک الدنیا ہونے کے خلاف ایک تحریک پانچویں صدی میں شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بشپوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ ایک دفعہ شادی کر لیں قسیسوں کو بھی پہلی بیوی کی موت کے بعد نکاح ثانی کی اجازت دی گئی۔ لیکن اگلی صدی میں پھر اس کا ردعمل شروع ہوگیا، اور شادی شدہ اشخاص کو بشپ اور پیٹریارک کے عہدہ پر ممتاز نہیں کیا جاتا تھا۔ شمالی سوپوتامیہ کے عربی قبائل (جن کو جاثلیق پیٹریارک احودمہ نے چھٹی صدی کے دوسرے نصف میں مسیحی کیا تھا) تارک الدنیا ہونے کے اصول کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ انہوں نے ایام روزہ میں ایک ہفتہ کا اضافہ کر رکھا تھا۔ مرگہ کے تھامس نے اپنی کتاب میں خانقاہوں کے ان مختلف مقدسوں کی بڑی تعریف کی ہے جو تارک الدنیا ہو چکے تھے کیونکہ ترک دنیا تقدس اور زہد کی بڑی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مسیحی طبیب حنین بن اسحاق اور یعقوبی کلیسیا کا فلاسفر یحییٰ بن عدی (جن کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کر آئے ہیں) اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ نصیبین کا نسطوری میٹرو پولیٹن ایلیا (۱۰۰۸ء تا ۱۰۴۹ء) اور نسطوری پیٹریارک الیشوع بب بن ملکون

(تاریخ وفات ۱۲۵۶ھ) بھی تارک الدنیا ہونے والوں کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان خیالات کے برعکس انجیل جلیل دنیا کو ترک کرنے کی تعلیم نہیں دیتی۔ وہ اس نظریہ کے بنیادی اصول کو کہ مادہ فی نفسہ ایک بُری شے ہے نہ صرف بدعت اور دجالی تصور قرار دیتی ہے (۲-یوحنا ۷ + کلسیوں ۲: ۲۳ - ۱-تیم ۴: ۱-۵ - ۱-کر ۷: ۳۱ - ۲-پطر ۲ وغیرہ)۔ کلیسیائے جامع بھی اس نظریہ کو بدعت سمجھ کر مردود گردانتی ہے۔ انہی خیالات کے زیر اثر معتزلی ادیب الجاحظ (المتوفی ۸۶۹ء) کہتا ہے کہ جو تارک الدنیا ہونے کے خیال کو پسند کرتے ہیں وہ درحقیقت زندیق مانی کے پیرو (Manichaeans) ہیں کیونکہ وہ یہ مانتے ہیں کہ مادہ کوئی بُری شے ہے۔ ہم پچھلے باب میں بتلا چکے ہیں کہ معتزلی خیالات مسیحیت سے متاثر تھے۔

ابتدائی زمانہ کے صوفیہ میں ابراہیم بن ادہم (المتوفی ۷۸۲ء) نے ہندوستان کے بدھ کی طرح شاہزادگی کو ترک کر کے فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی۔ بالآخر وہ شام کو چلا گیا جو تصوف کا خاص مرکز تھا اور یہاں ہاتھوں کی محنت سے روزی کماتا تھا۔ لیکن رابعہ العدویہ (المتوفی ۸۰۲ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں تھی۔ رابعہ نے اپنی تمام زندگی توکل میں ہی گذاری۔ وہ اُن لوگوں کو جو اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے یہ کہتی تھی کہ "مجھے خدا سے جو دنیا کا مالک ہے دنیا کی چیزیں مانگتے شرم آتی ہے پھر میں ایسے لوگوں سے کیوں مانگوں جو دنیا کے مالک بھی نہیں ہیں؟ جب خدا اپنے دشمنوں کی پرورش کرتا ہے تو کیا وہ اُن کی پرورش نہیں کریگا جو اس سے محبت رکھتے ہیں" (مقابلہ کرو متی ۵: ۴۳ تا ۴۸ و ۷: ۱۱-۱۲ وغیرہ)۔ اُس نے صوفیہ کو یہ سکھا دیا کہ دعا نام ہے

اُس ذاتی تعلق کا جو انسان خدا سے رکھتا ہے۔ اور جو آزادانہ، دلی اور بے تکلف قلبی تعلق ہے۔ حتیٰ کہ وہ پنجوقتی نماز کو بھی ذریعہ ثواب نہیں سمجھتی تھی۔ اُس کی دعائیں خود بخود اُس کے دل سے بغیر کسی تکلف یا جزا و سزا کے خیال کے نکلتی تھیں۔ اُس کی یہ دعائیں مشہور ہیں: "اے میرے خدا۔ اس دنیا کا جو حصہ تو مجھے دینا چاہتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو بخش دے اور اگلی دنیا کا جو حصہ تو مجھے دینا چاہتا ہے وہ اپنے محبت کرنے والوں کو دے دے۔ مجھے تو بس تو ہی کافی ہے"۔ "اے میرے خدا۔ اگر میں دوزخ کے عذاب سے ڈر کر تیری عبادت کروں تو مجھے جہنم کی آگ میں جلا دینا۔ اگر میں جنت کی آرزو سے تیری عبادت کروں تو مجھے جنت سے نکال دینا۔ لیکن اگر میں صرف تیری ذات سے محبت رکھنے کی خاطر ہی تیری عبادت کروں تو مجھ کو اپنی حضوری سے دُور نہ رکھنا"۔

صوفیہ کے لئے اسلام کی پنجوقتی نمازیں کافی نہ تھیں۔ وہ دن رات خدا کے ذکر میں اپنا وقت کاٹنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مختلف طریقے وضع کر لئے تھے۔ خدا کی یاد ہر دم کرنے کے لئے حدیثیں وضع کی گئیں۔ صوفیہ نے پنجوقتی نماز کے علاوہ دیگر عبادتیں شروع کر دیں جو مسیحی گوشہ نشین کیا کرتے تھے۔ مثلاً ابو طالب المکی نے ایسی دعائیں تجویز کیں جو مسیحی راہبوں کی کتب میں موجود تھیں۔ ابتدا میں اسلام میں سبحہ کا استعمال بالکل نہ تھا۔ یہ رواج مشرقی مسیحی راہبوں سے اخذ کیا گیا اور جنید البغدادی نے اس کا استعمال شروع کیا۔

تصوف میں عبادت کے متعلق جو خیالات پائے جاتے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ انجیلی تعلیم نے ان صوفیہ کو بیحد متاثر کر رکھا تھا۔ عبادت بغیر

کسی توقع یا خوف کے محض خدا کی محبت کی خاطر کی جائے (مقابلہ کرو ۱- یوحنا ۴/۱۹) "ارباب ظاہر" (یعنی علمائے شریعت) عبادت کے معینہ اوقات کے پابند ہیں لیکن "اہل اللہ اور اہل دل" (یعنی صوفیہ) کے لئے ہر وقت عبادت کا وقت ہے (مقابلہ کرو لوقا ۱/۱۸ - افسی ۶/۱۸ وغیرہ)۔ احکام و شرائط عبادت میں علمائے ظاہر صرف ظاہری الفاظ اور اوپرے معنوں کو لیتے ہیں لیکن علمائے باطن کا نقطۂ نگاہ الگ ہے (دیکھو یوحنا ۴: ۲۳-۲۴ وغیرہ)۔ علمائے ظاہر طہارت سے مراد طہارت جسم و لباس لیتے ہیں لیکن صوفیہ کے نزدیک اس کا مقصد دل کی پاکیزگی اور باطن کی صفائی ہے (مرقس ۷: ۱-۲۳ وغیرہ)۔ عبادت کی شرائط سے بھی انجیلی اثر ظاہر ہے کیونکہ ان کا منبع قرآن نہیں ہے مثلاً عبادت خاطر پر گراں نہ گذرے کیونکہ اصل عبادت وہ ہے جس میں کیف و شوق ہو۔ دوم تکلیف مالا یطاق نہ ہو۔ سوم۔ بیوی۔ اولاد وغیرہ کا حق نگاہ رکھا جائے (۱- کر ۷/۵)۔ چہارم۔ عبادت گزار رخصت شرعی کو باطل خیال نہ کرے اور جو اس رخصت پر عامل ہو، اس کو بے عمل نہ جانے (رومیوں ۱۴/۳ وغیرہ)۔ پنجم جو چیز غیر واجب ہے اس کو واجب تصور نہ کیا جائے اور جو چیز حرام نہیں ہے اس کو حرام نہ جانے (دیکھو متی ۱۵/۱: ۱ تا ۲۰ و ۲۳: ۱۶ تا ۲۶ وغیرہ)۔ ششم عبادت کرنے والا اپنی عبادت پر غرور نہ کرے اور اس میں فضیلت کا احساس پیدا نہ ہو (لوقا ۱۸: ۹-۱۴ وغیرہ)۔ ہفتم۔ عبادت دوسروں کے لئے تکلیف، ملال و رنج کا باعث نہ ہو (۱- کر ۱۰/۳۲ و ۲ کر ۶/۳ وغیرہ)۔

صوفیہ روزہ کو محض ایک دینی فرض نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ اس کو خدا کی قربت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ پس انہوں نے ماہ رمضان کے روزوں پر قناعت نہ کی بلکہ وہ ہر ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کے دن روزے رکھتے تھے۔ اس

میں انہوں نے مسیحی راہبوں کی نقل کی۔ بعض ہر تیسرے دن بھی اور بعض تین دنوں کے بعد ایک دن روزہ رکھتے تھے۔ بعض پانچ دن اور بعض چھ چھ دن روزہ رکھتے تھے اور چالیس دن کا روزہ بہترین روزہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس بات میں وہ مسیحی ریاضت کشوں کی پیروی کرتے تھے کیونکہ خداوند مسیح نے چالیس دن رات روزہ رکھا تھا۔

صوفیہ سادہ خوراک پر زور دیتے تھے۔ بعض گوشت اور شکار سے پرہیز کرتے تھے۔ انجیل کی "مبارکبادی" "مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں"، پر زور دے کر وہ روزہ کی اہمیت واضح کرتے تھے۔ علمائے ظاہر کے نزدیک روزہ درحقیقت فاقہ کے برابر ہوتا ہے لیکن اہل اللہ کے نزدیک روزہ توجہ الی اللہ ہے تاکہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ کریں (دیکھو متی ۶: ۱۶-۱۸ وغیرہ)۔

خیرات کے متعلق بھی صوفیہ وہی کہتے تھے جو انجیل میں مرقوم ہے (متی ۶: ۱۶-۱۸) اور خداوند مسیح کے ان کلمات کے الفاظ کو نقل کر کے ان پر نکتہ پر زور دیتے تھے اور قرآنی احکام کا بھی ذکر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جو خیرات سب کے سامنے دی جائے اس سے ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ صوفیہ کے تمام معمولات اور دستورات اور مشقیں تقریباً سب کی سب ایک لفظ "ناداری"، "افلاس"، یا "کنگالی" کے تحت آجاتی ہیں جن پر مسیحی راہبوں کی زندگیاں ڈھالی جاتی تھیں۔ مسیحی راہب اس بات پر زور دیتے تھے کہ یہ عسرت برضا و رغبت خود اختیار کرنی چاہیے اور یہ تقدس کا بڑا نشان سمجھا جاتا تھا۔

صوفیہ (بالخصوص چشتیہ سلسلہ کے صوفیہ) سماع پر زور دیتے

تھے اور یہ دستور اُنہوں نے مسیحی راہبوں اور درویشوں سے حاصل کیا تھا جو اُن کی زندگی کا اہم جزو سمجھا جاتا تھا علمائے شریعت اِس دستور کے مخالف تھے کیونکہ رسُولِ عرب گانے بجانے کو ناپسند کرتے تھے۔

مسیحی راہبوں اور درویشوں کی طرح صُوفیہ بھی تعمائے بہشت اور عذابِ دوزخ کی جانب سے بے نیاز تھے۔ ہم سطُورِ بالا میں رابعہ کی دُعا کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایک اور صُوفی لکھتا ہے کہ مسیح نے تین قسم کے درویشوں کو دیکھا۔ ایک وُہ تھے جو عذابِ دوزخ سے دہشت کھا کر شیطانی افعال سے باز رہتے تھے دُوسرے وُہ تھے جو جنّت حاصل کرنے کی خاطر اعمالِ صالح کرتے تھے۔ لیکن تیسری قسم کے درویش محض خُدا کی محبت کی خاطر نیک خیالی و اعمال کو مرغُوب رکھتے تھے۔ مسیح نے پہلی اور دُوسری قسم کے درویشوں کو ملامت کر کے کہا تم خُدا کی مخلوق چیزوں کی محبت اور خوف میں ہو اور اُن کی تمنّا میں خالق کو بھُول بیٹھے ہو اور اُس نے تیسری قسم کے درویشوں کے ساتھ اپنی رہائش رکھی۔

صُوفیہ نے دُشمنوں سے محبت رکھنے کی تعلیم بھی انجیل اور مسیحی رُہبانوں سے حاصل کی۔ خُدا رسیدہ اہل اللہ کو خُداوند مسیح کے الفاظ یاد تھے "اپنے دُشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا کرو۔ جو تم پر لعنت کریں اُن کے لئے برکت چاہو۔ جو تمہاری بے عزّتی کریں اُن کے لئے دُعا کرو" (لوقا ۶ باب)۔ یہ تعلیم قرآن و اسلامی شریعت سے تعلق نہیں رکھتی کیونکہ قرآن کے مطابق اسلام کے دُشمن کافر ہیں جو "اللہ کے دُشمن ہیں" (البقرا ۹۱) جن پر اللہ فرشتوں، اور سب انسانوں کی لعنت ہے (البقر ۱۵۶) جن کے ساتھ محبت رکھنا منع ہے (۳ : ۲۷)۔ وُہ نجس ہیں (۹ : ۲۸) جن کے لئے دُعائے مغفرت بھی جائز نہیں (۹ : ۱۱۴) اور جن سے خُدا اور اُس کا رسُول بیزار ہے (۹ : ۱-۳)۔

یہ تعلیم نہ قرآن میں تھی اور نہ کُتبِ یہود میں تھی (استثنا ۲۳ : ۶ وغیرہ) اس کا سرچشمہ انجیل اور صرف انجیل ہے۔ صُوفیہ کے وُہ نظریئے جو وُہ خُدا۔ کائنات اور انسان کی نسبت رکھتے تھے، سب مسیحی عقائد سے اخذ کئے گئے تھے وُہ کہتے تھے کہ خُدا محبت ہے اور خُدا اور انسان کا باہمی رشتہ عشقِ حقیقی کا ہے۔ یہ نظریہ ثابت کر دیتا ہے کہ قرآنی تعلیم اور اسلامی شریعت اُن کے خیالات کی رُوحِ رواں نہ تھی بلکہ یہ سبق اُنہوں نے انجیل سے سیکھا تھا (۱۔ یوحنا ۴ : ۷ تا ۱۶ وغیرہ)۔ اور مسیحی درویشوں اور رُہبانوں نے اُن کو پڑھایا تھا اور یہ سبق اسلامی تصوف کا بُنیادی اصُول ہے۔ صرف عشقِ حقیقی کے ذریعہ ہی اور اس کے نُور سے اولیاء اللہ کے قلوب میں خُدا کا علم جگمگا اُٹھتا ہے۔ جہاں علمائے ظاہر شریعت اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں وہاں اہلِ باطن اپنے کشف و ذوق سے کام لے کر اُن نتائج پر پہنچتے ہیں جو عقل سے زیادہ محکم اور استوار ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ رسُولِ عربی کی وفات کے بعد اہلِ باطن ہی درحقیقت "ورثۃ الانبیاء" ہیں۔ اور صُوفیہ ہی مسندِ نبوّت کے اصلی اور صحیح وارث ہیں۔

(۳)

ہم باب چہارم میں بتلا چکے ہیں کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں اسلامی ممالک میں یُونانی علم و فلسفہ کی اشاعت ہو گئی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ مُسلمانوں کے دِلوں میں مذہب اور اسلام کی طرف سے طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور نئے نئے فرقے بننے شروع ہو گئے عامتہ المسلمین کے عقائد میں تزلزل واقع ہو گیا اور علمائے اسلام سادہ عقائد سے ہٹ کر فلسفہ کی گتھیوں میں اُلجھ گئے۔ تصوّف اِس عقل پرستی کا ردِّ عمل تھا۔ لیکن

دُوسری صدی ہجری میں مسیحی اور یُونانی اثرات نے تصوف میں بھی ایک باطنی کیفیت پیدا کر دی یعنی تزکیۂ رُوح و صفائی باطن کے ذریعہ معرفت الٰہی کا حصُول ۔ اس کے بعد یہ عقیدہ چلا کہ خُدا کی معرفت محض وجد سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ پھر وحدت الوجُود یا فنافی اللہ کا عقیدہ رائج ہُوا ۔ یُوں آٹھویں صدی کے اواخر میں صُوفیہ میں غناسطیّت اور نیو سوفی کے قیاسات اور نظریئے زُہد اور پارسائی پر غالب ہونے شروع ہو گئے ۔ اُس زمانہ کے صُوفیہ میں معارُوف الکرخی ۔ ابُو سلیمان الدارانی اور ذوالنُّون مصری خاص طَور پر قابل ذکر ہیں ۔ وُہ خلفائے عباسیہ ہارون کے عہد سے متوکّل تک کے زمانہ (از ۷۸۶ء تا ۸۶۱ء) کے ہیں ۔ ان پچھتر سالوں میں یُونانی علوم و فلسفہ اسلام پر چھا دی ہو گئے تھے ۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ مسیحی فضلا بالخصُوص حنین اور اُس کے بیٹے نے افلاطُون ۔ ارسطو اور پارفری کی تصنیفات کو اسلامی دُنیا پر روشن کر دیا تھا ۔ فلسفہ کی اس رَو نے تصوّف پر بھی اثر کیا اور نیو سوفی غناسطیت وجد اور ہمہ اوستی عناصر نے صُوفیہ کے عقائد میں دخل حاصل کر لیا ۔

معارف الکرخی (م ۸۱۵ء) اور ابُو سلیمان الدارانی (م ۸۳۰ء) دونوں مسوپوتامیہ کے رہنے والے تھے جو مسیحیّت کا گڑھ تھا ۔ ابُو سلیمان کے یہ اقوال مشہُور ہیں کہ "صرف وُہی شخص اس دُنیا کی خواہشات سے پرہیز کر سکتا ہے جس کے دِل میں آئندہ زندگی کا نُور بستا ہے" ۔ "جب انسان اپنے اعمال کے ذریعہ گلی دُنیا کو حاصل کرنے کی طرف سے نااُمید ہو جاتا ہے تو اُس کو حقیقی نجات کا راستہ دکھائی دینے لگتا ہے ۔ تب وُہ خُدا کے رحم اور حقیقی خُوشی کا علم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے ۔ اور اُس کے لئے خُوشی کا دروازہ کھُل جاتا ہے ۔ اُس کا دِل نفسانی اور شہواتی بدیوں سے پاک ہو جاتا ہے اور اُس پر باطنی

حقائق روشن ہو جاتے ہیں" ۔

ذوالنُّون مصری کی طفیل تصوّف میں غناسطیت اور وجد کے عناصر نے دخل پا لیا ۔ ذوالنُّون نے صحرا کے مسیحی گوشہ نشینوں اور رُہبانوں سے مُلاقات کی جس کے بعد وُہ تارک الدُّنیا ہو گیا ۔ اُسی کی طفیل نو افلاطُونی فلسفہ کے عناصر نے بھی اسلام میں جگہ حاصل کر لی ۔ اُس کے معتقدات سے ظاہر ہے کہ سکندریہ کے مسیحی سکوُل نے اُس کے خیالات کو ڈھالا تھا ۔ وُہ خود ایسا عالم اور فاضل شخص تھا کہ گو خلیفہ متوکل نے پہلے پہل اُس کو اُس کے بدعتی خیالات کی وجہ سے زندان میں ڈال دیا تھا لیکن بعد میں اُس نے نہ صرف اُس کو رہا کر دیا بلکہ اُس کی بہت عزّت و تکریم بھی کرتا رہا ۔ اُس کی زندگی کے بعض واقعات ہم کو مصر کے تھیبیس کے علاقہ کے مسیحی گوشہ نشینوں کے واقعات کی یاد دلاتے ہیں ۔ اُس کا یہ قول مشہُور ہے کہ "توبہ دو قسم کی ہوتی ہے ۔ پہلی قسم کی توبہ عذاب جہنم کے خوف کی وجہ سے ہوتی ہے ۔ دُوسری قسم کی توبہ اُس شرم سے پیدا ہوتی ہے جو خُدا کی مغفرت اور رحم کے خیال سے ہمارے دِلوں کو تبدیل کر دیتی ہے" ۔

اسی صدی کے آخر میں ابُو یزید بسطامی (بایزید) نے تصوّف کی تاریخ میں نام پیدا کیا ۔ وُہ بحرِ کیسپیئن کے جنُوب مشرقی گوشہ کی طرف صُوبہ قُومس کے شہر بسطام کا رہنے والا تھا ۔ وُہ پہلا شخص تھا جس کی وجہ سے فنا کے عقیدہ نے تصوّف میں دخل پایا ۔ اور تصوّف ہمہ اوستی فلسفہ ہو گیا ۔ اس طرح وحدانیّت وحدت ہو گئی اور "ہمہ از وست" کا عقیدہ "ہمہ اوست" بن گیا ۔ چنانچہ وُہ کہا کرتا تھا "سبحان میری شان ۔ مَیں ہی درحقیقت خُدا ہُوں ۔ میرے سوائے کوئی دُوسرا خُدا

نہیں۔ میری عبادت کرنا خدا کی عبادت کرنا ہے"۔

ابتدائی زمانہ کے ہمہ اوستیوں میں سب سے زیادہ مشہور نام حسین بن منصور کا ہے جس کو حلاج کہتے ہیں۔ اُس کا باپ منصور ایرانی تھا جو زرتشتی مذہب سے مسلمان ہوا تھا۔ وہ ۸۵۸ء میں خلیفہ متوکل کے عہد میں پیدا ہوا خراسان ایران۔ ہندوستان۔ ترکستان وغیرہ ممالک کی سیاحت کے بعد اُس نے بغداد میں بود و باش اختیار کر لی۔ وہ بڑا فاضل اور زبردست فلسفی تھا جس کو اُس کے دشمن بدعتی اور عیسائی کہتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کی وجہ سے قید کر لیا گیا اور آٹھ سال کی قید کے بعد ۹۲۲ء میں خلیفہ مقتدر کے زمانہ میں اُس کو ایذائیں اور عذاب دے کر سولی دی گئی۔ پھر اُس کا سر کاٹ کر اُس کا جسم آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ اُس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اُس نے کہا تھا انا الحق (یعنی میں خدا ہوں)

جب حلاج کو صلیب دینے لگے تو اُس نے ان لوگوں کو جو اُس کے آس پاس کھڑے تھے مخاطب کر کے کہا "میرے عذابوں کی وجہ سے خدا کی نیکی میں رتی بھر شک نہ کرو کیونکہ خدا میرے ساتھ اپنے حبیب کا سا سلوک کر رہا ہے۔ وہ مجھے بھی دکھ کا وہی پیالہ پلا رہا ہے جو اُس نے (مسیح نے) خود پیا تھا"۔ ابراہیم بن فاتک ہمیں بتلاتا ہے کہ جب اُس کو عذاب دیا جا رہا تھا تو وہ اپنے عذاب دینے والوں کے لیے حضرت عیسیٰ کی طرح دعا کرتا رہا (لوقا ۲۳: ۳۴ وغیرہ)۔ اُس نے کہا "اے میرے خدا مجھے اس فضل کے لیے شکر گزار دل عطا فرما۔ تو نے اپنا جلالی چہرہ مجھ پر چمکایا ہے جو دوسروں کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ان اپنے خادموں کو جو تیری خوشنودی کی طلب میں مجھے ایذا اور عقوبت دے رہے ہیں اور مجھے مار ڈالنے کے درپے ہیں، معاف فرما۔ ان پر رحم کر کیونکہ ان سے وہ باتیں چھپی ہیں جو تو نے اپنے کرم و فضل سے مجھ پر ظاہر کی ہیں۔ تیری رضا کے لئے تیری

تعریف اور حمد ہو"۔ (مقابلہ کرو متی ۱۱: ۲۵-۳۰)۔

حلاج خداوند مسیح کو اعلیٰ ترین درجہ دیتا تھا پس اُس پر مسیحی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ "رسول عربی تو صرف انبیا کی ہی مہر ہے لیکن مسیح کل دنیا کے مقدسوں اور نبیوں کی مہر ہے۔ عیسیٰ ایک واحد کامل شہید ہے جو حق (خدا) کا مثل ہے۔ وہی ایک واحد انسان ہے جس میں شان ایزدی ہے۔ اُس کا وجود خدا میں ہے۔ سبحانہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت کا راز آدم کی انسانیت میں ظاہر کیا اور پھر مجسم ہو کر اپنی مخلوقات میں عیسیٰ بن کر آیا تاکہ کل مخلوقات آنکھ کی ایک جھپک میں اُس کو دیکھ لیں"۔ ابن العربی بھی خداوند مسیح کی نسبت کہتا ہے کہ عیسیٰ خالق ہے جو اپنی مخلوق کو بحال کرتا ہے اور اُن کو زندگی بخشتا ہے۔

حلاج کا عقیدہ لاہوت و ناسوت خداوند مسیح کی دو ذاتوں کا ہی عقیدہ ہے۔ یہ امر نہایت معنی خیز ہے کہ شامی کلیسیا ان ہر دو اصطلاحات کو خداوند مسیح کی الٰہی ذات اور انسانی ذات کے لئے استعمال کرتی تھی۔

صوفیہ تصوف کے قیاسات اور ہمہ اوستی خیالات کی وجہ سے اہل بدعت شمار ہونے لگے۔ تب حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد غزالی خراسان کے صوبہ میں مشہد کے نزدیک طوس میں ۱۰۵۹ء میں پیدا ہوا۔ باپ کے انتقال کے بعد اس کی تعلیم ایک صوفی کی نگرانی میں ہوئی جس کے زیر اثر علم فقہ کے موشگافانہ قیل و قال سے اُس کی طبیعت گھبرا اُٹھی۔ اس کے بعد اُس نے نیشاپور میں ایک صوفی استاد امام الحرمین سے علم دین حاصل کیا۔ ان ایام میں اُس کو علم کی حقیقت پر شک ہونے لگا۔ وہ تقلید اور اعتزال دونوں سے بیزار تھا۔ اُس کے علم و فضل کی وجہ سے سلجوقی وزیر نظام الملک نے اُس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور وہ ۱۰۹۲ء میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں اُستاد ہو گیا۔ اُس زمانہ میں اُس کو فلسفہ کا بڑا

شوق تھا کیونکہ وُہ اپنے عقلی شکوک کو حل کرنا چاہتا تھا تاکہ اُس کو اطمینانِ قلب حاصل ہو۔ اُس کے درس و تدریس کا سلسلہ بڑا کامیاب تھا لیکن اُس نے ۱۰۹۵ء میں یہ سلسلہ موقوف کر دیا اور درویشی زندگی اختیار کر کے دس سال تک سفر کرتا رہا اور تمام وقت کبھی زاہدانہ ریاضت میں اور کبھی ادبی جدوجہد میں گزارتا رہا۔ سفر کے دوران میں وُہ دمشق۔ بیت المقدس یروشلیم سکندریہ مکہ اور مدینہ گیا۔ واپسی پر وُہ نیشاپور میں درس دیتا رہا اور بالآخر ۱۱۱۱ء میں اپنے وطن طوس میں فوت ہو گیا۔

اُس کی کتاب "احیاء العلوم الدین" نہایت مشہور کتاب ہے جس میں وُہ متکلمین کے خلاف علم الکلام ہی کے ذریعہ ثابت کرتا ہے کہ دینیات کی اصل بُنیاد انسان کا وُہ رُوحانی تجربہ ہے جو کشف سے حاصل ہوتا ہے اور جس کے بغیر عقل ناکارہ ہے۔ غالباً تاریخِ اسلام میں غزالی سے بڑا عالمِ دینیات پیدا نہیں ہُوا۔ اِس کے علم و فضل نے تصوّف کو اسلام میں از سرِ نو جگہ دیدی۔

علمِ کلام جس چیز کو ثابت کرنا چاہتا ہے وُہی عقیدہ غزالی کا بھی ہے لیکن متکلمین کے دلائل اُس کی نظر میں نہ جچے۔ چنانچہ جس چیز کا ثبوت متکلمین معقولات سے دینے کی کوشش کرتے ہیں غزالی اُسی کو باطنی کیفیت کی حیثیت سے بلا ثبوت قبول کر لیتا ہے۔ اُس زمانہ کے فلسفہ کے طبعی اور مافوق الطبعی مسائل میں سے وُہ بالخصوص تین مسئلوں پر حملہ کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ دُنیا قدیم اور ازلی ہے۔ دوم یہ کہ خُدا صرف کُلی علم رکھتا ہے اُس کو جزویات کا علم پہلے سے نہیں ہو سکتا اور سوم یہ کہ رُوح لافانی ہے اور جسمانی حیثیت سے بازخاست ناممکن ہے۔ وُہ ثابت کرتا ہے کہ دُنیا حادث ہے اور خُدا قادرِ مطلق فعالِ ذات ہے اور ارادہ میں آزاد ہے۔ اُس کی فعالی کی مکانی حدود نہیں

ہیں۔ اُس کی یہ فعالی محض اوّل مخلوق تک محدود نہیں ہے اِس کے برخلاف وُہ اپنی کسی مخلوق کو زمانی اور مکانی حیثیت سے محدود کر سکتا ہے۔ پھر وُہ اس اعتراض کا جواب دیتا ہے کہ اگر خُدا کو ہر جُزوی چیز کا علم ہے تو انسان صاحبِ اختیار نہ رہا بلکہ کائنات جبر کی بُنیاد پر قائم ہو گی۔ اِس اعتراض کا غزالی وُہی جواب دیتا ہے جو اس سے پہلے مقدس آگسٹین نے دیا تھا کہ خُدا کا علم زمانہ کے فرق سے بالا ہے۔ تیسرا مسئلہ جسمانی بازخاست (جسم کی قیامت) کا ہے غزالی کہتا ہے کہ جسمانی بازخاست سے انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ رُوح کا جسم سے دوبارہ ملنا اِس کے پہلی بار جسم میں آنے سے زیادہ حیرت ناک نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بازخاست کے وقت رُوح ایک ایسا نیا جسم پائے جو اُس کے لئے موزوں ہو۔

مسیحی عقائد کی تاریخ کا ہر طالبِ علم دیکھ سکتا ہے کہ غزالی نے آبائے کلیسیا کے سے دلائل دیئے ہیں۔ اُس کی خُدا۔ کائنات اور رُوحِ انسانی کی نسبت جو تعلیم ہے اُس میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو قدیم اسلام میں نہ تھے۔ یہ عناصر بڑی حد تک مسیحی فلاسفہ کے خیالات سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض ثنوی فلسفہ کے مرہُون ہیں۔

غزالی کہتا ہے الٰہی صفات کی کثرت سے خُدا کی وحدت میں خلل نہیں پڑتا اور اس کی مثال مادی چیزوں سے دیتا ہے مثلاً ایک شے ایک ہی وقت میں سرد اور تر ہو سکتی ہے۔ وُہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ جب ہم انسانی صفات کو خُدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تو اُن کے نئے اور برتر معنی ہوتے ہیں۔ کیونکہ خُدا خالص رُوح ہے اور وُہ نہ صرف قادرِ مطلق اور عالمِ کُل ہے بلکہ خبیرِ مطلق اور حاضر و ناظر بھی ہے جس کی وجہ سے عالمِ بالا اور یہ دُنیا دونوں ایک

دُوسرے کے نزدیک زیادہ ہوجاتے ہیں۔

امام غزالی کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ مسیحیت نے اُس کے دِل و دماغ کو کس قدر متاثر کر رکھا ہے۔ وُہ خُداوند مسیح کے اقوال، اور اناجیل اربعہ کی آیات کو بار بار اپنی تائید میں پیش کرتا ہے۔ خُداوند کے مُبارک کلمات جو انجیل میں اور غیر مُستند کُتب میں پائے جاتے ہیں اُس کی نوکِ زبان تھے۔ اس کی کتاب مشکوٰۃ الانوار میں سُورۂ نُور کی آیت اللہ نور السمٰوات والارض (آیت ۳۵) کی جو تفسیر ہے اور نُور اور تاریکی کی جو وضاحت اس میں کی گئی ہے وُہ بار بار ہم کو مقدس یُوحنا کی انجیل اور خطُوط کی یاد دلاتی ہے۔ کتاب میں لوگوس (کلام) کا بھی ذکر ہے جس پر افلاطونی نُقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔

تیسری صدی ہجری کے دَوران میں مروّجہ مذہب فلسفہ نے اسلامی تصوّف کو ڈھالا۔ اس فلسفہ میں افلاطُونی تصوّرات اور مشرقی باطنیّت کی آمیزش تھی۔ اس زمانہ میں یہ باتیں گویا فضا میں موجُود تھیں اور ان کے زیرِ اثر اسلامی توحید۔ مسیحی تصوّف۔ رُہبانیت۔ غناسطیّت اور یُونانی اور ہندی فلسفہ کے مختلف عناصر سے اسلامی تصوّف ایک طُرفہ معجُون مرکّب بن گیا۔ زمانہ کے سیاسی۔ سماجی۔ ذہنی اور رُوحانی تصوّرات نے اس کی نشو و نما میں مدد دی۔ لیکن ان سب سے زیادہ مسیحیّت اور مسیحی دینیات اور راہبانہ دستُورات نے اسلامی تصوّف پر اثر کیا۔ چُنانچہ بعض صُوفیہ کے فلسفیانہ نظریئے جو اُنہوں نے فلسفۂ مذہب۔ کلام اللہ۔ خُدا۔ کائنات اور انسان کے متعلّق قائم کئے تھے صاف طَور پر واضح کر دیتے ہیں کہ وُہ مسیحی تعلیم و عقائد کے مرہُون ہیں مثلاً حلّاج اپنی "کتاب الطواسین" میں خُدا کے متعلّق جو نظریہ قائم کرتا ہے وُہ (جیسا ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں) وُہی ہے جو کلیسیا میں مسیح کی دو ذاتوں کے متعلّق

مروّج تھا۔ وُہ صاف کہتا ہے کہ خُدائے واحد کی ذات محبّت ہے اور کائنات کو خلق کرنے سے پہلے وُہ اپنی ذات سے محبّت کرتا تھا۔ (دیکھو ۱۔ یُوحنا ۴/۸)۔ وُہ خود ہی ظاہر کرنے والا تھا اور خود ہی مظہر بھی تھا (یُوحنا ۱/۱)۔ پھر اُس نے عدم سے اپنی صُورت پر آدم کو بنایا (پیدا ۱/۲۷)۔ اور اُس کو اپنے اسما اور صفات سے متّصف کیا جس کے ذریعہ اُس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا (کلسی ۱/۳)۔ لاہُوت اور ناسُوت کا باہمی تعلّق حلُول کا سا ہے جیسا مَے اور پانی کا۔ اس رشتہ کی وجہ سے انسان انا الحق (مَیں خُدا ہُوں) بول اُٹھتا ہے (دیکھو گلتی ۲/۲۰)۔ مابعد کے صُوفی اس نظریہ کو رَدّ کر کے اِس رشتہ کی توحیدی تاویل کرتے ہیں چُنانچہ ابن العربی لاہُوت اور ناسُوت کو نسبتی اور اضافی قرار دے کر کہتا ہے کہ دونوں ایک ہی ذات کے دو رُخ ہیں۔ خُدا محبّت اور حُسن و جمال کا سرچشمہ ہے جس کی وجہ سے کائنات وجُود میں آئی۔ عشقِ حقیقی اصل گوہرِ مقصُود ہے اور عشقِ مجازی محض اُس کا پرتو ہے۔ یہ خیالات ہر دلعزیز ہو گئے جس کی وجہ سے فریدالدّین عطّار۔ ابوسعید بن ابوالخیر۔ جلال الدین رُومی اور جامی جیسے صُوفیہ شاعروں کی نظمیں زبان زدِ خلائق ہیں۔

صُوفیہ کی اصطلاحات سے بھی ظاہر ہے کہ وُہ مسیحی درویشوں، گوشہ نشینوں اور راہبوں کے تصورات اور دستُورات سے اخذ کی گئی ہیں چنانچہ صُوفیہ کے تصوّف اور "سلُوک" (راستہ۔ طریقہ) کے اہم مقامات مثلاً فنا بقا۔ فنا الفنا۔ فِکر۔ حیرت۔ جہد۔ توکّل۔ طریقت۔ مقامات۔ عبُودیت عشق۔ زُہد۔ علم باطن۔ معرفت۔ حقیقت۔ وجد۔ وصل وغیرہ تمام اصطلاحات اور دستُورات مسیحی راہبوں کے تھے۔ اصطلاح علمِ باطنی یا Gnosis کا اُردو

انجیل میں ترجمہ "حکمت" کیا گیا ہے۔ مثلاً پولوس رسول فرماتا ہے "ہم کاملوں میں حکمت کی باتیں کہتے ہیں"۔ اس علم باطن کی غایت یہ ہے کہ عاشق و معشوق میں جدائی نہ رہے اور خدا اور انسان ایک ہو جائے۔ (گلتی ۲/۲)۔ فنا کی یہ حقیقت ہے کہ "سالک" اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے اور ذاتِ الٰہی میں فنا ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جس میں منصور حلاج اور بایزید بسطامی وغیرہ نے انا الحق کہا تھا۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جھاڑی میں نور دیکھا اور اس سے آواز آئی انا ربک (میں تیرا رب ہوں۔ مقابلہ کرو خروج ۳ باب)۔ جب ایک بے جان درخت خدا کا مظہر ہو سکتا ہے کیونکہ وہ خدا کے نور سے منور ہو گیا تھا تو انسان جو خدا کی قدرت کا سب سے بڑا مظہر ہے، ضرور انا الحق کہہ سکتا ہے۔ (یوحنا ۱۰: ۳۳ تا ۳۹ + ۱۴: ۱۰ و ۲۰ وغیرہ)۔ ایک اور مثال دے کر صوفیہ فنا فی اللہ کی توضیح کرتے ہیں۔ جس طرح لوہا آگ میں گرم ہو کر آگ بن جاتا ہے حالانکہ وہ آگ نہیں ہوتا اسی طرح انسان گو انسان ہوتا ہے لیکن فنا فی اللہ کے مقام پر اس میں ربانی صفتیں آ جاتی ہیں۔ محی الدین ابن عربی نے اس عقیدہ کی بڑی اشاعت کی کہ ہر چیز خدا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کو "ہمہ اوستیت" کہتے ہیں جو بعد کے صوفیہ میں بڑی مقبول ہوئی۔

(۴)

جب ہم صوفیہ کے خانوادوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اسلامی تصوف مسیحیت اور مسیحی گوشہ نشینوں اور راہبوں کا مرہون ہے۔ ابتدا میں تصوف رہبانیت کی طرح بالکل ایک انفرادی چیز تھی اور اس نے اجتماعی رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ پھر کہیں کہیں بعض جماعتیں پیدا ہو گئیں جو کسی مشہور صوفی کے نام سے اپنے آپ کو منسوب کرتی تھیں۔

لیکن یہ محض مقامی بات تھی۔ بارھویں صدی مسیحی میں صوفیہ کے مختلف خانوادے باقاعدہ طور پر منظم ہو گئے۔ پھر ان خانوادوں کے سلسلے چلے۔ یہ خانوادے اپنے سلسلہ کو حضرت محمد تک حضرت علی یا حضرت ابوبکر کے ذریعہ لے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے کہا کہ علم کا گھر میں ہوں اور علی اس گھر کا دروازہ ہے پس صوفیہ علی کو معرفت الٰہی کا وسیلہ جانتے ہیں حضرت علی کے بعد بصرہ کے حسن کا نام آتا ہے جو قادریہ۔ چشتیہ اور سہروردیہ خانوادوں کا سر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ماں آنحضرت کی بیوی امِ سلمہ کی لونڈی تھی حسن خود بصرہ کی رابعہ کا ہمعصر تھا۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت کی وفات کے وقت حسن لڑکا ہی تھا لیکن علی نے اس کو مخفی اصول کی تعلیم دے کر اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

صوفیہ کے ۱۴ سلسلوں میں سے عیاضیہ۔ ادہمیہ۔ ہجبیریہ۔ اور چشتیہ سلسلے زیادیہ خانوادوں کی شاخیں ہیں جس کا بانی عبدالواحد بن یاد تھا۔ باقی سلسلے کرخیہ۔ سقاطیہ۔ طیفوریہ۔ جنیدیہ۔ گازرونیہ۔ طرطوسیہ۔ سہروردیہ اور فردوسیہ یا کبرادیہ سلسلے حبیبیہ خانوادہ کی شاخیں ہیں جس کا بانی حبیب عجمی ۷۲۲ء میں فوت ہو گیا تھا۔ کرخیہ سلسلہ کا بانی معارق الکرخی تھا۔ (کرخ بغداد کے صوبہ کا ایک شہر ہے) وہ ۸۱۵ء میں مر گیا۔ سقاطیہ کا بانی ۸۶۷ء میں مر گیا۔ طیفوریہ کا بانی ابویزید تھا جس کو بایزید بسطامی بھی کہتے ہیں۔ جنیدیہ کا بانی ابوالقاسم الجنید تھا جس کو "سید الطائفہ" اور "طاؤس العلما" کہتے ہیں۔ وہ ۹۰۹ء میں فوت ہو گیا۔ گازرونیہ سلسلہ کا بانی خواجہ ابو اسحاق گازرونی (المتوفی ۱۰۳۶ء) تھا۔ طرطوسیہ سلسلہ کا بانی ابوالفرج (المتوفی ۱۰۵۵ء) تھا۔ سہروردیہ سلسلہ کا بانی ابوالنجیب (المتوفی ۱۲۳۴ء) تھا۔ فردوسیہ یا کبرادیہ سلسلہ کا بانی

ابو المجتاب احمد بن عمر الخواتی تھا جو خیوہ کا رہنے والا تھا وُہ ۱۲۲۱ء میں مر گیا۔ مذکورہ بالا تاریخیں اور جگہیں ہم پر ظاہر کر دیتی ہیں کہ یہ سلسلے اور ان کی شاخیں خلفائے بنو عباس کے زمانہ میں چلے بالخصوص اُن خلفا کے وقت جب مسیحی علما اور فضلا کا علم و فضل خمیر کی طرح اپنا کام کر رہا تھا۔ اُن کے بانیوں کی جائے رہائش بھی وُہ جگہیں تھیں جو مسیحیت کے گڑھ تھے۔

ان چودہ سلسلوں میں سے ہندوستان میں صرف چار سلسلے زیادہ تر پائے جاتے ہیں یعنی چشتیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ۔ اور نقشبندیہ۔ پہلا اور دُوسرا سلسلہ حبیبیہ خانوادہ کی شاخیں ہیں۔ قادریہ سلسلہ طرطوسیہ کی شاخ ہے۔ گو نقشبندیہ سلسلہ جنیدیہ کی شاخ ہے لیکن نقشبندی اپنا سلسلہ جنید سے آگے حضرت ابوبکر تک لے جاتے ہیں۔ ہم آگے چل کر ان سلسلوں کا مختصر حال لکھینگے جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ مسیحیت اور رُہبانیت نے ان سلسلوں کے بانیوں اور بزرگوں پر بڑا زبردست اثر کیا تھا۔

۳۔ بصرہ کے اخوان الصفا:۔

جب ایرانی خاندان بُویہ کے فاتح احمد نے ۹۴۵ء میں بغداد کو فتح کر لیا تو خلیفہ مستکفی باللہ نے اُس کو معزالدولہ کا خطاب دے کر امیر الامراء بنا دیا۔ اس کے چند ہفتے کے بعد ۹۴۶ء میں معزالدولہ نے خلیفہ کو اندھا کر کے المقتدر کے بیٹے مطیع کو خلیفہ بنا دیا۔ معزالدولہ کے انتقال کے بعد عضدالدولہ طاقت پکڑ کر پُوری سلطنت پر قابض ہو گیا۔ عضدالدولہ کی وفات (۹۸۳ء) کے بعد یہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بُویہ خاندان میں صرف عضدالدولہ ہی ایسا امیر گزرا ہے جس نے مُلک کی بہبود و فلاح کی طرف توجہ کی۔ وُہ کٹر مسلمان تھا۔ اُس نے مسجدیں تعمیر کیں۔ شفا خانے بنوائے

محتاج خانے قائم کئے۔ یہ خاندان مذہباً شیعہ تھا۔ ان ایام میں شیعہ سُنّیوں کی لڑائی چھڑی رہتی تھی۔

اس پُر آشوب زمانہ میں اخوان الصفا کی جماعت نمودار ہوئی۔ یہ اُن نیم سیاسی پارٹیوں میں سے تھی جو مذہبی فرقہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کا عام طور پر یہ مذہبی فرض ہوتا تھا کہ اس دُنیا میں ایسی سلطنت قائم کریں جس کی بنا عدل پر ہو۔ ان میں سے بعض پارٹیاں اِس بات کی قائل بھی تھیں کہ جس طرح ابتدائی مسیحیوں میں سب کی ملکیت مشترکہ ہوتی تھی (اعمال ۲: ۴۴) سب اہلِ جماعت میں سب کی ملکیتیں مشترک ہوں۔ وُہ اِس بات پر زور دیتے تھے کہ برادری والے مرتے دم تک وفادار رہیں (مکا ۲: ۱۰ وغیرہ)۔ وُہ کہتے تھے کہ دُوسروں کی بھلائی کے لئے جان دینا ہی سچا جہاد ہے اور اس زندگی کا سفر حج ہے۔ امیروں کو اپنے زر و دولت میں سے اور اہلِ عقل کو اپنی حکمت و علم میں سے دُوسروں کو حصّہ دینا چاہئے۔

بصرہ کے اخوان الصفا اور اُن کی شاخ جو بغداد میں تھی بالعموم اپنی زندگی امن و امان سے بسر کرتے تھے۔ چونکہ اُن کی تعلیم میں شیعوں اور معتزلیوں کی تعلیمات اور فلسفہ موجود تھا لہٰذا بُویہ خاندان کے زمانہ میں یہ عام پسند تحریک ہو گئی۔ اخوان الصفا نے تمام مذاہب و اقوام کی دانش کو اپنی تعلیم میں جمع کر دیا۔ چنانچہ نُوح اور ابراہام۔ سقراط اور افلاطُون۔ زرتشت اور عیسیٰ۔ نلی اور محمد اُن کے پیغمبر تھے۔ وُہ خُداوند مسیح اور اُن کے حواریوں کو اور مسیحی شہیدوں کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وُہ سچائی عقلیت اور عقیدہ کی خاطر شہید کئے گئے تھے۔ وُہ کہتے تھے کہ شرع کے لفظی احکام عوام کے لئے اچھے ہیں پر وُہ دوا کی طرح ہیں جو کمزور اور مریض رُوحوں کو ہی

تسکین دے سکتی ہے۔ لیکن طاقتوروں کے لئے فلسفیانہ تصورات ہی ہیں جو اُن کی رُوحوں کی غذا ہو سکتے ہیں۔ موت کے معنی خالص رُوحانی زندگی کے لئے دوبارہ جی اُٹھنا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وُہ بار بار انجیل کی آیات اور مسیحی واعظوں کے وعظ پیش کرتے تھے۔ وُہ خود اپنی زبان سے انتخابیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اُن کے منطقی خیالات کا سرچشمہ پارفری اور ارسطوُ ہیں۔

اخوان الصفا مسیحیت کو اسلام پر ترجیح دے کر انجیل کو قرآن سے زیادہ مکمل وحی مانتے تھے۔ وُہ کہتے تھے کہ رسُولِ عربی ایک صحرا نشین قوم کے لئے مبعوث ہو کر آئے تھے اور قرآن ایسوں ہی کے لئے نازل ہُوا تھا جن کے ذہنوں میں نہ تو دُنیا کے حُسن و جمال کا اور نہ آخرت کی رُوحانی حالت کا صحیح تصوّر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، ایسے الفاظ اور بیانات میں اُن کو ادا کرتا ہے جن کو یہ جاہل قوم سمجھ سکتی تھی اور بمصداق "فعلموا النّاس علیٰ قدرِ عقولہم" اس قوم کی سمجھ کے اندازے کے مطابق تھے۔ لیکن اہلِ عقل کو ان کی رُوحانی تاویل کرنی لازم ہے۔ اخوان الصفا کہتے تھے کہ سب سے بالا ایک عقلی عقیدہ ہے جس کو وُہ مافوق الطبیعی پہلو سے ثابت کر کے کہتے تھے کہ خُدا اور اُس کے اوّلین مخلُوق عقلِ فعال کے درمیان ایک برزخ ہے جس کو "لوگوس" یا ناموسِ الٰہی کا نام دیا گیا ہے۔ (مقابلہ کرو یوحنا ۱: ۱-۲۔ امثال ۸: ۲۔ حکمت ۷: ۶ و ۹: ۵)۔ وُہ ایک ایسے خُدا کو جو قہار ہو اور عذابِ دوزخ وغیرہ کو خلافِ عقل قرار دے کر رَدّ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسے عقائد رُوح فرسا ہیں۔ جاہل گنہگار رُوح کا جسم ہی اس زندگی میں اُس کا دوزخ ہے۔ قیامت اور بازخاست کا مطلب وُہ یہ لیتے تھے کہ جسم اور رُوح میں مفارقت

ہو جاتی ہے اور روزِ قیامت کی عظیم بازخاست سے مراد یہ ہے کہ رُوح مُطلق سے مجُدا ہو کر خُدا کی طرف رجُوع کرتی ہے۔ وُہ یہ بھی کہتے تھے کہ تمام مذاہب کا مقصد ایک ہی ہے یعنی خُدا تک پہنچنا۔

اخوانُ الصفا کے علم الاخلاق پر مسیحیت اور انجیل کا اثر نہایت نمایاں ہے۔ اس کے مطابق انسانی افعال صرف اِس حالت میں نیک کہلائے جا سکتے ہیں جب وُہ انسان کی اصلی اور قُدرتی طبیعت سے صادر ہوتے ہیں۔ ناموسِ الٰہی (لوگوس) کی پابندی کرنے سے ہی انسان جزا کا مستحق ہوتا ہے اور اُس کے لئے ضروری ہے کہ عالمِ بالا کی آرزو اُس میں ہو۔ سب سے افضل نیکی محبت ہے جو محبُوب سے وصل کی طالب ہے۔ محبت کی بدولت ہم کو قلبی اطمینان، حقیقی آزادی اور صلحِ کُل نصیب ہوتا ہے اور آخرت میں ہم کو دائمی نُور کا دیدار حاصل ہوتا ہے پس ہماری زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسیح کی طرح محبت کے اصُول کو اپنی زندگی کا دستُورُ العمل بنا لیں۔

اخوان الصفا نے مسُلمانوں کی زندگیوں کو بڑی حد تک متاثر کیا اگرچہ کٹر علما اُن کی قرآنی تفسیر کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے اور امام غزالی خود اُن کی حکمت میں جو باتیں اچھی تھیں اُن کو قبُول کرنے اور اپنانے میں تامّل نہیں کرتا۔

ہم نے اس باب میں صرف مختصر طَور پر ہی اُن تاثرات کا بیان کیا ہے جو مسیحیت اور مسیحی عقائد نے اسلام پر زمانہ خلفا کے اسلام میں کئے تھے۔ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ تاثرات عارضی اور وقتی نہیں تھے بلکہ مستقل اور دائمی تھے۔ چنانچہ گو معتزلہ بطور ایک فرقہ کے اسلام سے نابُود کر دیئے گئے تھے لیکن اُن کے عقائد اسلام میں مروّج ہیں اور ہر مسلمان جو عقل کو دین د

مذہب میں عقل دیتا ہے اور علما و فقہا کے طبقہ کی کورانہ تقلید نہیں کرتا ابتدائی معتزلہ کا روحانی پیرو ہے۔ فی زمانہ ایسے مسلمانوں کی تعداد دنیائے اسلام میں روز افزوں ہے جو نقل کو عقل کے مطابق کرنا چاہتے ہیں اور اگر ان میں مطابقت نہ ہو سکے تو نقل کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ صوفیہ کا گروہ بھی دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پایا جاتا ہے اور مسیحیت کے خاموش خمیر کی تاثیر کا زندہ گواہ ہے ہم انشاء اللہ آگے چل کر ہندوستان کے صوفیہ کا ذکر کر کے ثابت کر دیں گے کہ انجیل نے ان کی تعلیم پر بھی زبردست اور دائمی اثر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فلسفہ اور تصوف نے اسلامی علم فرائض اور علم العقائد کا خاتمہ کر دیا ہے۔

اسلام نے دس صدیوں کے طویل عرصہ (از ۵۰۰ء تا ۱۵۰۰ء) میں مسیحی عقائد پر اثر نہ کیا۔ چنانچہ مؤرخ لاٹوریٹ کہتا ہے "عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصہ میں مسیحیت کے عقائد میں کوئی خاص فرق نمودار نہ ہوا اور یہ عقائد وہی رہے جو ۵۰۰ء سے پہلے کلیسیائے جامع کے عقائد تھے کلیسیاؤں کے گرد و پیش کے حالات نے ان کے عقائد پر کوئی اثر نہ کیا حالانکہ مسیحی کلیسیا اب ایک اقلیت ہو گئی تھی۔ اس میں پہلی سی روحانیت بھی نہ رہی تھی اور بار بار کے حملوں اور پے در پے کی ایذا رسانیوں نے اس کو کمزور اور مضمحل کر دیا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ ایسی بے حس اور نیم جان ہو گئی تھی کہ اس میں ہمت سکت نہ تھی"

باب ششم

مذہبی تحقیق اور مناظرے

بانی اسلام کے زمانہ ہی سے عرب کے مسلمانوں اور مسیحیوں میں تبادلہ خیالات اور مذہبی جستجو کا ذوق شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے (اور ابن جریر نے خود حضرت مغیرہ سے ایک صحیح روایت لکھی ہے) کہ حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ صلعم نے اہل نجران کی طرف بھیجا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم قرآن میں مریم کی بابت یا اختِ ھارون نہیں پڑھتے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ ہم یہی پڑھتے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ حضرت عیسٰی اور حضرت موسٰی کے درمیان کتنا زمانہ گذرا ہے؟ میں نہ جان سکا کہ ان کے اس سوال کا کیا جواب دوں۔ جب میں رسول اللہ صلعم کے پاس واپس آیا تو میں نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ انہوں نے کہا تو نے کیوں یہ جواب نہ دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نبیوں اور صالحین کے نام پر جو ان سے پہلے گذرے ہیں نام رکھتے ہیں"۔ مطلب یہ کہ بی بی مریم کو قرآن میں اس لئے "ہارون کی بہن" کہا گیا ہے کیونکہ ان کے بھائی کا نام ہارون تھا۔ بہ ظاہر ہے کہ یہ جواب عیسائیوں کے سوال کا درحقیقت جواب نہیں کیونکہ یہ بنا علی الفاسد ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت مریم کا کوئی

بھائی تھا چہ جائیکہ اُس کا نام ہارُون ہو! علاوہ ازیں یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ بی بی مریم کے والد بزرگوار کا نام بھی عمران ہو جو مُوسیٰ اور ہارُون کے باپ کا نام تھا!! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب کسی یہودی نومُسلم نے گھڑا تھا اور پھر حضرت محمد کے مُنہ میں ڈالا گیا ہے کیونکہ تفسیروں میں بھی نہ صرف یہی جواب پایا جاتا ہے بلکہ ان ناموں کی پُوری تفصیل موجُود ہے!!!

فتح مکّہ کے بعد آنحضرت نے نجران کے بشپ ابُوحارثہ کو لکھا کہ اگر تُم اسلام قبُول نہیں کرنا چاہتے تو تُم کو ہماری اطاعت قبُول کرنا ہوگی اور جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ پس بشپ ابُوحارثہ معہ ساٹھ قسیسوں اور قیقوں کے آنحضرت کے پاس مدینہ گیا۔ اِس وفد کے چودہ اشخاص کے ہاتھ میں کُل اختیارات دے دیئے گئے تھے جن میں عبد المسیح جیسا جیّد شخص تھا جس کی رائے سب پر مقدّم سمجھی جاتی تھی۔ بشپ ابُوحارثہ بڑا زاہد اور عابد شخص تھا جو نہ صرف عرب کی مسیحی کلیسیا میں بلکہ عرب کے باہر بھی قابلِ قدر ہستی شمار کیا جاتا تھا۔ یہ سب اپنے قسیسی لباس پہنے مسجد میں آئے۔ آنحضرت نے اُن کو نہایت عزّت و توقیر کے ساتھ مسجد میں اُتارا۔ جب اُن کی نماز کا وقت آیا اور اُنہوں نے نماز ادا کرنی چاہی تو صحابہ مزاحم ہوئے لیکن آپ نے اجازت دی اور اُنہوں نے مسجد میں اپنی نماز ادا کی۔ آنحضرت نے بشپ ابُوحارثہ اور عبد المسیح اور ایہم کے ساتھ عبادت کے بعد گفتگو کرنی شروع کی۔ پہلے آپ نے اُن کو خُدائے واحد کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "ہم تو پہلے ہی خُدا کو واحد۔ اکیلا اور لاشریک مانتے ہیں"۔ آپ نے سوال کیا کہ پھر "تُم مسیح کو خُدا کا بیٹا کیوں کہتے ہو"؟ اُنہوں نے جواب دیا "اَے محمد۔ تُم ہی بتاؤ کہ عیسیٰ کا باپ کون تھا"؟ یہ سُن کر حضرت

خاموش ہوگئے اور آپ نے سُورہ آل عمران کی (اسّی ۸۰) آیات پڑھیں اور کہا "اَے اہلِ کتاب۔ ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم خُدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کریں اور خُدا کو چھوڑ کر ہم کسی دُوسرے کو معبُود نہ بنائیں"۔

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے مُشرکین بُت پرست یہ مانتے تھے کہ اُن کے دیوتاؤں اور دیویوں کی اولاد اور بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں۔ پس قرآن اِن بُت پرستوں کے خلاف یہ دلیل لاتا ہے کہ خُدا کے بیٹے بیٹیاں کیسے ہو سکتی ہیں جب اُس کی کوئی بیوی ہی نہیں۔ اِس دلیل کا تعلق جسمانی اولاد سے ہے لیکن عیسائی اِن معنوں میں مسیح کو خُدا کا بیٹا نہیں مانتے تھے بلکہ اِس خطاب سے اُن کا مطلب محبُوبِ ربّانی تھا (متی ۳/۱۷)۔ پس اِس قسم کی دلیل عیسائیوں کے لئے بیکار تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن ایسی دلیل کو عیسائیوں کے مقابل پیش بھی نہیں کرتا۔ اِس دلیل کے مخاطب صرف بُت پرست کفّار تھے۔

پھر آنحضرت نے عیسائیوں کو مباہلہ کرنے کی دعوت دی۔ قرآن میں اِس کا ذکر یُوں آیا ہے "جو شخص تجھ سے علم آنے کے بعد جھگڑا کرتا ہے اُس سے (اَے رسُول) کہہ کہ آؤ۔ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور اپنے آپ کو لاؤ۔ پھر ہم مباہلہ کریں اور دُعا کریں کہ ہم میں سے جو جھُوٹا ہے اُس پر خُدا کی لعنت ہو" (سورہ آل عمران آیت ۵۴)۔ پس آنحضرت بی بی فاطمہ اور امام حسن اور امام حسین کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلے۔ بشپ ابُوحارثہ نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا "اَے محمد۔ انجیل میں وارد ہُوا ہے کہ تُم دُشمن کا مقابلہ نہ کرو جو تمہارے دہنے رخسار پر طمانچہ مارے اُس کی طرف دُوسرا بھی پھیر دو۔ تُم

اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور جو تم کو ایذائیں دیں اُن کو برکت دو۔ اُن کے حق میں دعائے خیر کرو تاکہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے ٹھہرو جو بدوں اور نیکوں دونوں پر اپنا سورج چمکاتا ہے اور بارش برساتا ہے۔ پس تم کامل ہو جس طرح تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔ اِس مذہبی گفتگو کے بعد بشپ ابوحارثہ اور اس کے رفقا نے سالانہ جزیہ ادا کرنا منظور کر لیا اور اپنے شہر کو واپس چلے گئے۔

جب اہل یہود کو معلوم ہوا کہ نجران کے عیسائی مدینہ آئے ہیں تو وہ بھی اُن کے پاس آئے اور خداوند مسیح اور انجیل پر رسولِ عرب کے سامنے سوال کرنے لگے۔ بالآخر انہوں نے کہا "اے ابوحارثہ۔ تم کسی چیز پر نہیں اور تمہارا ایمان بیکار ہے"۔ اِس پر بشپ کے ایک رفیق نے اُن کو کہا کہ اگر تم اپنے مسیح موعود کو جس کی خدا نے تمہاری کتابوں میں خبر دی ہے نہیں مانو گے اور انجیل پر ایمان نہیں لاؤ گے تو تم کو تورات کوئی نفع نہیں پہنچائے گی اور تمہاری آخرت برباد ہوگی۔ جس طرح تم سے دنیا کی حکومت چھین لی گئی ہے تمہاری عاقبت بھی بُری ہوگی۔ یہ مناظرہ سن کر آنحضرت نے کہا "یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی چیز پر نہیں حالانکہ دونوں الکتاب (بائبل) پڑھتے ہیں۔ ان کے قول کی طرح اُن سے پہلے لوگوں نے بھی کہا تھا۔ اللہ قیامت کے دن ان کے اختلافات کا خود ہی فیصلہ کرے گا" (سورۂ بقر آیت ۱۰۷)۔

عرب کے یہود آنحضرت کو کہا کرتے تھے کہ اگر تم یہودی کتب مقدسہ اور انبیائے یہود پر ایمان لے آؤ تو تم ہدایت پاؤ گے۔ مسیحی قسیس اُن کو کہتے تھے کہ منجیٔ عالمین یسوع مسیح ابن اللہ پر ایمان لاؤ تو تم نجات حاصل کرو گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "یہودی کہتے ہیں کہ تم یہودی ہو جاؤ اور نصاریٰ

کہتے ہیں کہ تم عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت یافتوں میں ہو گے۔ تو اے محمد کہہ دے کہ ہم تو ابراہیم کی ملت پر ہیں جو حنیف تھا اور مشرک نہ تھا" (سورہ بقر آیت ۱۲۹)۔

مذکورہ بالا واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ مسیحی قسیس اور بشپ ابتدائے اسلام ہی سے قرآن کی تعلیم سے واقف تھے اور متلاشیانِ حق کو انجیل اور مسیح کی نجات کی طرف دعوت دیا کرتے تھے۔ اور براہین و دلائل سے اُن پر مسیحیت کے حقائق کو روشن کیا کرتے تھے۔

(۲)

جب عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کیا تو اُس نے انطاکیہ کے پیٹریارک سے مسیحیت اور مسیحی عقائد پر مذہبی گفتگو کی۔ یہ گفتگو مناظرہ نہ تھا بلکہ تبادلۂ خیالات تھا۔ فاتح مصر نے چند سوال کئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسیحی عقائد و رسوم کی نسبت چند باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا اور پیٹریارک نے اُس کو جواب دینے پر ہی کفایت کی تھی۔

خلافت کے ابتدائی زمانہ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی کلیسیا کے شرکا اپنے تہواروں اور عیدوں کے موقعہ پر باقاعدہ اپنے مسلمان دوستوں کو دعوتیں دیا کرتے تھے اور لوگ دونوں مذہبوں کے پیروؤں میں کسی حد تک اختلاط بڑھ گیا تھا کیونکہ ہم کہیں یہ نہیں پڑھتے کہ مسلمانوں نے اپنی عید کے موقعہ پر مسیحیوں کو مساوات کا درجہ دے کر اُن کو دعوتیں دی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات اسلامی مطلق العنان حکومت مسیحی تہواروں کو ناگہاں روک بھی دیتی تھی۔ یہ اختلاط گو یک طرفہ ہی سہی تاہم غنیمت تھا۔

لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ مسلمان یونانی فلسفہ اور حکمت سے

اُس سرزمین ہیں آشنا ہوں جہاں نسطوری کلیسیا پھیلی ہُوئی تھی۔ بنی اُمیّہ کا دارالخلافہ شام میں تھا لیکن اُن کے زمانہ میں فلسفہ کی طرف دھیان نہ کیا گیا کیونکہ اُن خلفا کے زمانہ میں مسلمان جنگوں میں ہی مشغول رہتے تھے جن سے ان کو فرصت ہی نہ ملی۔ اور بیشتر وُہ نسلاً عرب تھے جن کا طبعی میلان اس طرف نہ تھا لیکن اس زمانہ میں بھی عیسائی مسلمانوں سے مذہبی تبادلۂ خیالات کرنے کی ہمّت رکھتے تھے[1]۔

جب ۱۳۲ھ میں بنو عباس کی خلافت شروع ہُوئی تو انہوں نے مفتوحہ ممالک کی کلچر کو اسلام میں جذب کرنا شروع کیا۔ بغداد اسلامی دُنیا کا مرکز تھا جس میں علم و ادب اور حکمت و فلسفہ پھل پھول رہا تھا۔ یونانی علمائے دینیات کی صُحبت میں (جو مسیحی تھے اور فنِ مناظرہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے) عربوں نے پہلی مرتبہ فلسفیانہ استدلال کرنا سیکھا اور انہی علما سے انہوں نے علم الکلام کی تدقیقات کا پہلا سبق سیکھا۔ یہ ایسا فن تھا جس میں جیسا فان کریمر کہتا ہے "بازنطینی ذہانت یدِطولیٰ رکھتی تھی"[2]۔ کلیسیائی عقائد کی تاریخ فان کریمر کے اس فقرہ کی تصدیق کرتی ہے۔

جب اسلامی مملکت کی سرکاری زبان عربی ہوگئی تو دو صدیوں کے اندر اندر مسیحی اور مسلمان ایک دُوسرے کے اطوار، رسُوم، تہذیب، تمدّن، مذہب اور عقائد سے بخُوبی واقف ہوگئے۔ گو عیسائیوں کو قرآن پڑھنے اور پڑھانے

[1] Nicholson, Literary History of the Arabs. pp. 221.

[2] Von Kremer, History of Islamic Civilisation. Page 59.

کے معاملہ میں فقہا کا اختلاف تھا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ امام شافعی ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ عیسائیوں کو چاہیئے کہ قرآن کو پڑھیں تاکہ وُہ اسلام سے واقف ہوں لیکن دُوسری طرف وُہ یہ بھی کہتا ہے کہ کافر کو قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے مبادا کہ وُہ اس کی نکتہ چینی کرے کیونکہ وُہ اللہ اور رسُول کا دُشمن ہوتا ہے۔ لیکن جب دو مذاہب کے پیرو ایک دُوسرے کے صدیوں سے ہمسایہ رہیں اور ان کے بنیادی عقائد ایک ہی قسم کے ہوں اور اُن میں سے ایک کے علما سالہا سال تک دُوسرے کے اُستاد رہے ہوں تو یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اُن میں اختلاط ہو اور یہ اختلاط بعض حالتوں میں محبّت اور عقیدت کی صُورت اختیار کرے۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں رہتی کہ وُہ ایک دُوسرے کے مذہبی اعتقادات اور کُتب مقدسہ اور دینی روایات سے بخُوبی واقف ہو جائیں۔ دُنیا کی کوئی طاقت اُن کو ایسا جُدا نہیں کر سکتی کہ وُہ الگ الگ دُنیا میں رہیں۔

یہ بات اَور بھی ناممکن ہو جاتی ہے جب مسلمانوں کی مسجدیں اور عیسائیوں کے گرجے (جو منہدم ہونے سے بچ گئے تھے) ایک ہی شہر میں ہوں۔ چنانچہ دارالخلافت (بغداد) میں جہاں ہیسیوں عالی نشان اور فلک شگاف مسجدوں کے منارے تھے وہاں بہت سے گرجے بھی موجود تھے مثلاً دیر الروم۔ دیر اشمعونی۔ دیر الثعالب۔ دیر درزنا۔ دیر درمالس۔ دیر سمالو۔ دیر عذاری۔ دیر اعاصیہ۔ دیر الزریقیہ۔ دیر الزندر وغیرہ جن کے حالات معجم البلدان میں لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں نسطوریوں کا مرکز مسوپوتامیہ میں تھا جس کے بڑے بڑے شہر کلیسیا کے مضبُوط گڑھ تھے۔ بغداد مشرق و مغرب کے تجارتی راستہ

میں "تنگٹ" کا شہر تھا جن کو نسطوری مسیحی تاجر استعمال کرتے تھے۔ شام کے یعقوبی مسیحیوں کی کلیسیائیں بھی ایڈلیسہ اور انطاکیہ جیسے شہروں میں تھیں جو تجارتی راستوں میں بڑے پایہ کے شہر تھے۔ ان مرکزوں سے نسطوری اور یعقوبی مسیحی مبلغین جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے دُور و دراز ممالک، وسط ایشیا، ہندوستان اور چین۔ برما۔ تبت تک جارہے تھے۔ پس یہ ناممکن امر تھا کہ مسلمان اور مسیحی ایک دُوسرے کے مذہبی عقائد اور دینی رسُوم اور معاشرت وغیرہ سے ناواقف رہتے۔

گو مسلم عُلماء اور فقہا اِس بات سے ہچکچاتے تھے کہ مسیحی قرآن کا مطالعہ کریں لیکن مسیحی کلیسیا کے قسیس اور فضلا کو شوق تھا کہ اہل اسلام انجیل جلیل کو پڑھیں اور نجات حاصل کریں۔ اُن کی کُتبِ مقدسہ یُونانی، سریانی، قبطی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی تھیں جس کا ہم مفصل ذکر اپنی کتاب "صحتِ کُتبِ مقدسہ" میں کر چکے ہیں۔ خلفا کے زمانہ میں یُونانی زبان اور سریانی زبان کی کتابیں عربی میں منتقل ہو رہی تھیں اور یہ ناممکن امر تھا کہ یہ فاضل مسیحی مترجمین حکمت فلسفہ اور طب وغیرہ علُوم کا ترجمہ کرتے لیکن مقدس انجیل کا عربی میں ترجمہ نہ کرتے بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مترجمین میں سے بعض قسیس اور راہب تھے۔ جب اسلامی ممالک مصر۔ کنعان۔ شام اور مسوپوٹامیہ وغیرہ میں عربی زبان ہر جگہ جاری ہو گئی تو مسیحی کلیسیا کے فضلاء نے ہر ملک میں عربی میں مسیحی لٹریچر کا اضافہ کر لیا۔ چنانچہ آٹھویں صدی میں زبُور کا عربی میں ترجمہ ہو گیا اور پھر بائبل کے دُوسرے حِصص کا ترجمہ کیا گیا۔ اِس ایک مقصد کو حاصل کرنے پر یعقوبی۔ نسطوری اور قبطی وغیرہ تمام مسیحی فرقے تُلے ہُوئے تھے۔ مسلمان عُلماء کتابِ مقدس کے مضامین سے جیسا ہم آگے چل کر بتلائینگے بخُوبی واقف تھے کیونکہ

ابتدائی مسیحی صدیوں ہی سے (جیسا ہم اپنی کتاب "صحتِ کُتبِ مقدسہ" میں بتلا چکے ہیں)، کلیسیا کے جا بجا کی مختلف شاخوں نے بائبل کا ترجمہ افریقہ اور مغربی ایشیا کے تمام ممالک کی زبانوں میں کر دیا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں زبُور کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں موجود تھا کیونکہ اس ترجمہ کی ایک نقل ویکا انتی (Vecchietti) نے بہزار دقت ایک یہودی سے حاصل کی تھی۔ یہ ترجمہ فارسی میں تھا گو وُہ عبرانی رسم الخط میں لکھا تھا اور اس کا مترجم ایران کا ایک یہُودی تھا۔ اناجیل اربعہ کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا تھا[1]۔ پس خلفا کی اسلامی مملکت کی تمام زبانوں میں مسیحی کُتبِ مقدسہ کا ترجمہ عہدِ عباسیہ میں موجود تھا جس کو اہلِ اسلام اپنی مادری زبان میں پڑھ سکتے تھے۔

(۳)

عہدِ خلفا میں مسیحی کلیسیا میں ایک سے ایک بڑھ کر عالم تھے جن میں سے بعض نے مشرق و مغرب کی کلیسیاؤں میں دوامی نام پایا ہے۔ چنانچہ بنی اُمیہ کے خلفا کے زمانہ میں مقدس یُوحنائے دمشقی ہو گزرے ہیں جن کا ذکر ہم پہلے بھی کر آئے ہیں۔ یہ بزرگ اپنے زمانہ کا وحید العصر تھا جس کی تصنیفات نے نہ صرف مشرقی فضلاء بلکہ مغربی مسیحی علماء کے خیالات کی کایا پلٹ دی تھی۔ اسلامی اور مسیحی دینیات کا مقابلہ کرنے کے لئے یُوحنائے دمشقی کی تصنیفات بڑے کام کی ہیں۔ اس کا زمانہ اسلام کی ابتدا کا زمانہ تھا کیونکہ وُہ آٹھویں صدی کے درمیان سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اور اس نے اپنی کتابوں کو اسلام کے ابتدائی زمانہ کی فضا میں لکھا تھا۔ وُہ قرآن سے

[1] Jerome Xavier S.J. and the Muslims of the Moghul Empire PP 24-25.

کیا حقہ واقف تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اُس کی کُتب قرآن کے قدیم متن کا پتہ دیتی ہیں اور اِس لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

یُوحنائے دمشقی اسلام کو مسیحیت کی مسخ صُورت سمجھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص قرآن کے مضامین سے ہی واقف ہو تو اُس پر قرآن و اسلام کی بطالت ظاہر کرنے کے لئے کسی اَور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ کیونکہ انجیل و قرآن کا مطالعہ اُس پر ظاہر کر دیگا کہ انجیلی خُدا کا تصوّر قرآن کے اللہ سے بہت برتر و بالا ہے اور انجیل کی اخلاقی اور رُوحانی تعلیم قرآنی تعلیم سے بلند ہے۔

مُقدّس یُوحنائے دمشقی اپنی بحث کو خُداوند مسیح کے اُن القاب سے شروع کرتا ہے جو انجیل و قرآن میں مُشترک ہیں۔ یعنی کلمتہ اللہ اور رُوح اللہ۔ وُہ کہتا ہے کہ اگر کوئی مُسلمان تُم سے سوال کرے کہ تُمہارا مسیح کون تھا تو جواب دو کہ وُہ کلمتہ اللہ تھا اور اُس سے پُوچھو کہ قرآن مسیح کی نسبت کیا کہتا ہے۔ وُہ یہی جواب دیگا کہ حضرت مسیح کلمتہ اللہ اور رُوح اللہ ہیں۔ پھر تُم یہ سوال کرو کہ کیا خُدا کا یہ کلمہ اور رُوح مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اگر وُہ جواب دے کہ غیر مخلوق تو تُم کہو کہ اس حالت میں وُہ خُدا ثابت ہو گیا کیونکہ از رُوئے قرآن صرف خُدا کی ذات ہی غیر مخلوق ہے۔ اگر وُہ جواب دے کہ وُہ مخلوق ہے تو تُم یہ سوال کرو کہ اِس مخلوق کلمہ اور رُوح کو کس نے خلق کیا؟ وُہ یہی جواب دے سکتا ہے کہ خُدا نے خلق کیا ہے۔ تب تُم پُوچھو کہ اس سے پہلے کہ یہ مخلوق ہوئے کیا خُدا کی رُوح نہ تھی اور کیا خُدا کا کلمہ نہ تھا؟ اگر وُہ نفی میں جواب دے تو یہ جواب اسلام کے اُصُول کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ تب ان کی خلقت سے پہلے خُدا کا نہ کلمہ ہوگا اور نہ خُدا کی رُوح ہوگی! اور ان کی خلقت کے بعد خُدا وُہ ہوگا جو وُہ پہلے نہ تھا!!

انجیل کی تعلیم کے مطابق خُداوند مسیح خُدا کا ازلی کلمہ ہے جو خلقت سے پہلے موجود تھا (یُوحنا ۱ باب)۔ پس مُسلمانوں نے اس عقیدہ کی جگہ (جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا آئے ہیں) قرآن کو خُدا کا ازلی کلام قرار دے دیا۔ معتزلہ نے اس عقیدہ کی سخت مخالفت کی اور یہ دلیل پیش کی کہ یہ عقیدہ خُدا کی وحدت اور اُس کی قدامت کے منافی ہے کیونکہ اس طرح خُدا کی قدیم ذاتِ واحد کے ساتھ ساتھ اُس کا کلام بھی ازلی ہو جاتا ہے پس وُہ خلقِ قرآن اور حدوثِ قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ یُوحنائے دمشقی کہتا ہے کہ مُسلمان ہم کو مُشرک سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے نبی مسیح کو خُدا اور ابن اللہ قرار دے کر اُس کو خُدا کے ساتھ شریک کرتے ہیں لیکن جب مُسلمان خود مسیح کو خُدا کا کلمہ اور رُوح مانتے ہیں تو ہم مُشرک کیسے ہُوئے؟ کیونکہ خُدا کا کلمہ اور خُدا کی رُوح خُدا سے ہرگز جُدا نہیں ہو سکتے۔ اور نہ جُدا کئے جا سکتے ہیں۔ پس اگر کلمہ خُدا کی ذات ہے تو کلمتہ اللہ خُدا ہے لیکن اگر وُہ خُدا کی ذات سے جُدا ہے تو خُدا کا وجود بغیر کلمہ اور رُوح کے ہُوا جو ناممکنات میں سے ہے۔ اگر مُسلمان خُدا کا شریک نہیں ٹھہراتے تو وُہ اُس کی ذات کو تقسیم کرتے ہیں گویا وُہ پتھر یا لکڑی کی طرح کوئی مادی شے ہے اور رُوح نہیں ہے۔ ہم کو مُسلمان بغیر کسی قسم کی دلیل کے مُشرک قرار دیتے ہیں لیکن وُہ خود اپنی ہی دلیل سے خُدا کو تقسیم کر دیتے ہیں۔

یُوحنائے دمشقی کے جواب میں بعض مسلم متکلمین خُداوند مسیح کے کلمتہ اللہ ہونے اور کلام اللہ (قرآن) میں تمیز کر کے کہتے تھے کہ کلام اللہ (قرآن) ازلی ہے اور کلمتہ اللہ حادث ہے۔ اس کے جواب میں مسیحی فضلاء کہتے تھے کہ خُدا مسیح کلمتہ اللہ میں ظہور کر سکتا ہے کیونکہ مسیح ذی رُوح ہے اور خُدا بھی رُوح ہے لیکن خُدا قرآن میں ظہور نہیں کر سکتا کیونکہ وُہ ایک کتاب

ہے جو ادراک پر مشتمل ہے اور غیر ذی رُوح ہونے کے علاوہ حادث ہے۔

اگر کوئی مُسلمان تُم کو کہے کہ تُم بھی کتابِ مقدس کو کلام اللہ مانتے ہو تو تُم یہ جواب دو کہ مسیح کلمتہ اللہ ہے لیکن کلام اللہ (کتابِ مقدس) "دری میٹا" یعنی الفاظ پر مشتمل ہے۔ وُہ کلمتہ اللہ نہیں ہے "لوگوس" (کلمہ)، اور "دری میٹا" کُتبِ مقدسہ نے تمیز کی ہے "لوگوس" صرف مسیح کے لئے آیا ہے اور لکھے ہوئے مادی الفاظ کے لئے کبھی استعمال نہیں ہُوا جن کے لئے لفظ "دریما" اور دُوسرے مُشتق الفاظ کتابِ مقدس میں تقریباً دو صد دفعہ استعمال ہوئے ہیں۔ پس کتابِ مقدس قدیم نہیں بلکہ حادث اور مخلوق ہے کیونکہ وُہ زمان و مکان میں احاطۂ تحریر میں آئی ہے لیکن مسیح کلمتہ اللہ خُدا کا لوگوس قدیم ہے "ابتدا میں کلمہ تھا۔ کلمہ خُدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خُدا تھا" (یُوحنا ۱:۱)۔

مقدس یُوحنائے دمشقی کہتا ہے۔ اگر کوئی مُسلمان تُم سے پُوچھے کہ کیا خُدا مصلوب ہُوا تھا تو اُس کو فوراً جواب دو کہ ہرگز نہیں بلکہ مسیح یسُوع جو مجسم کلمہ تھا وُہ مصلوب ہُوا تھا کیونکہ "مدکلمہ مجسم ہُوا اور ہمارے درمیان رہا" اور یہ مجسم مصلوب ہُوا تھا۔ اقانیم کو مخلوط نہیں کرنا چاہیئے مجسم اقنوم ثانی مصلوب ہُوا تھا۔ اگر کوئی مُسلمان تُم سے کہے کہ اگر مسیح کے مصلوب ہونے سے خُدا کا مقصدِ نجات پُورا ہُوا ہے تو تُم کو چاہیئے کہ تُم خُدا کی بجائے یہود کے شکر گذار رہو جنہوں نے اُس کو مصلوب کر کے خُدا کے ارادہ کو پُورا کیا تو تُم اُس کو جواب دو کہ خُدا کا حکم ہے کہ تُم گناہ نہ کرو لیکن کیا تُم گناہ کا یہ عُذر پیش کرتے ہو کہ خُدا تُم سے گُناہ کرواتا ہے کیونکہ اُسی نے تُم کو ہاتھ پاؤں وغیرہ دیئے ہیں جن کے ذریعہ تُم گناہ کرتے ہو اور اگر وُہ تُم کو یہ اعضا نہ دیتا تو تُم گناہ نہ کرتے؟ خُدا کا مقصد ایک ہے اور وُہ مقصد نیک ہوتا ہے لیکن اس

مقصد کے انجام کا ذریعہ بالکل دُوسری بات ہے۔ اگر کوئی مُسلمان تُم کو صلیب کو بوسہ دینے اور اُس کے سامنے جُھکنے کے لئے طعنہ دے تو تُم اُس سے کہو کہ تُم خود حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہو جو محض ایک پتھر ہے اور جو کسی زمانہ میں ایک معبُود اور بُت تھا اور جس پر ابھی تک نقش موجود ہیں۔ صلیب خُداوند کی نجات کی ہمیں یاد دلاتی ہے۔ ہم اپنے منجی کی یاد میں اُس کو بوسہ دیتے ہیں جس طرح ہم خلیفہ کے تخت کو تعظیماً بوسہ دیتے ہیں۔

(۴)

ناظرین نے ان اقتباسات سے خود ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ مقدس یُوحنائے دمشقی کا طرزِ تحریر ظاہر کر دیتا ہے کہ اُس نے اسلام اور مسیحیت پر جو کچھ لکھا ہے اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسیحی کلیسیا کے شُرکا اسلام قبُول کرنے سے باز رہیں یعنی اُس کا مقصد محض مدافعانہ تھا اور جارحانہ نہ تھا۔ اُس زمانہ میں جب مسیحی کلیسیا سال بسال اقلیت بنتی چلی جا رہی تھی اور اسلامی مملکت اور اسلام دونوں ہر طرف پھیلتے جا رہے تھے اور خطرہ یہ تھا کہ مسیحی کلیسیا کے شُرکا اپنے ایمان پر ثابت قدم نہ رہ سکیں گے مقدس یُوحنائے دمشقی اور دیگر مسیحی فضلاء نے کتابیں لکھیں تاکہ عیسائی اپنے مذہب سے واقف ہو جائیں اور اندھا دُھند اسلام کو اختیار کرنے سے پرہیز کریں۔ پس وُہ اسلامی حملوں کے اعتراضات کو رفع کرتے اور ان کا تسلّی بخش جواب دینے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

ہم گذشتہ ابواب میں بتلا چکے ہیں کہ خلفا کے زمانہ میں مسیحیوں کے لئے یہ لازمی شرط تھی کہ وُہ نہ تو قرآن پر حملے کریں اور نہ دینِ اسلام کے خلاف کچھ کہیں یا لکھیں۔ وُہ کسی مُسلمان کو مسیحیت کی دعوت نہ دیں۔ اندریں حالات مسیحی علماء کتابیں لکھ کر اسلام اور مسیحیت کا نہ تو موازنہ کر سکتے تھے اور نہ اسلام

کے اُن پہلوؤں کی جارحانہ تنقید کر سکتے تھے جو اُن کے عقیدہ کے مطابق غلط تھے۔ وُہ میدانِ مناظرہ میں پہل بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس عام طور پر جب کبھی علمائے اسلام اُن سے مذہبی گفتگو کرتے تھے تو وُہ یہ سمجھ کر کہ یہ اُن کو پھنسانے کی غرض سے کیا جاتا ہے سہم جاتے تھے اور اپنا پہلو بچا جاتے تھے تاکہ مُسلمان حرف گیری کر کے فساد برپا نہ کر دیں۔ اگر وُہ کبھی مدافعانہ جواب دیتے بھی تھے تو نہایت محتاط ہو کر دیتے تھے تاکہ اُن کے کسی لفظ سے کسی مُسلمان کو رنج اور صدمہ نہ پہنچے۔ یہ خدشہ ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا کہ مسلمان فساد برپا کر دینگے مثلاً ۲۸۶ھ میں خلیفہ معتضد کے زمانہ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ خلیفہ کے مسیحی طبیب کے کسی ملازم نے رسُول عربی کی شان میں بے ادبی کی ہے۔ اس پر بغداد میں سخت فساد برپا ہو گیا اور حکام نے بمشکل تمام حالات پر قابو پایا۔

عہدِ خلفا میں مُسلمان علما اور عوام مسیحیت اور مسیحی عقائد پر نہایت دریدہ دہنی سے بے باکانہ حملے کرتے تھے لیکن عیسائی عُلما جب اُن کا جواب دیتے تھے تو ایک ایک لفظ تول کر نہایت متانت سے دیتے تھے۔ عام طور پر تو وُہ مُسلمانوں سے اپنا پیچھا چھڑانے کی ہی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس پہلوتہی کا اثر قدرتی طور پر اُن کے تبلیغی جوش پر پڑا۔ مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کی تاریخ ہم کو یہ سبق سکھلاتی ہے کہ جو کلیسیا اپنے شرکا کو ہی مسیحی تعلیم میں مستحکم کرنے پر اکتفا کرتی ہے اور انجیل کی علانیہ تبلیغ کرنے کی بجائے وُہ خاموش مسیحی زندگی سے ہی غیر مسیحیوں کو انجیل کا پیغام سُنانا چاہتی ہے اور صرف مدافعانہ پہلو ہی اختیار کرتی ہے وُہ کلیسیا رفتہ رفتہ کمزور ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انجیل کی تبلیغ کلیسیا کی رُوحِ رواں ہے جس کے بغیر وُہ مر جاتی ہے۔

ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں کہ عہدِ خلفا میں بیسیوں مسیحی فاضل موجود تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ ہر اموی اور عباسی خلیفہ کے عہد میں کوئی نہ کوئی سربرآوردہ مسیحی عالم گذرا ہے جس نے اس طوفانی سمندر میں کلیسیاؤں کے شرکا کے ڈگمگاتے ایمان کی کشتی کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اموی خلفا کے زمانہ میں مقدس یوحنائے دمشقی تھے۔ نویں صدی میں تھیوڈور ابو قرہ تھا جو حران کا بشپ تھا۔ عبدالمسیح بن اسحاق الکندی نویں صدی میں خلیفہ مامون کے زمانہ میں تھا۔ یحییٰ بن عدی (تاریخ وفات ۹۷۴ء) یعقوبی فرقہ کا زبردست عالم تھا۔ حنین ابن اسحٰق (سال وفات ۸۷۳ء) نسطوری کلیسیا کا فاضل تھا۔ نسطوری کیتھولیکوس تموتھی (از ۷۸۰ء تا ۸۲۳ء) انطاکیہ کا پیٹریارک سائریاکس (Cyriacus) (از ۷۹۳ء تا ۸۱۷ء)۔ یعقوبی فرقہ کا ابوعلی عیسیٰ بن اسحاق بن زرعہ (سال وفات ۱۰۰۸ء)۔ نصیبس کا نسطوری میٹروپولیٹن ایلیاہ (از ۱۰۰۸ء تا ۱۰۴۹ء) وغیرہ ایسے زبردست عالم تھے جو کلیسیائے جامع کے ہر زمانہ کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ ان مسیحی فضلا نے اسلام اور مسیحیت پر کتابیں تصنیف کیں تاکہ مسیحیوں کے ایمان کو مستحکم اور مضبوط کریں اور کلیسیاؤں کو اسلام کے عقائد کے خلاف خبردار کریں۔ تاکہ مسیحی اسلام کی زد سے محفوظ رہ کر اس کے حلقہ بگوش ہونے سے بچے رہیں۔ مثلاً آٹھویں صدی کے آخر میں ابو نوح الانباری ایک مسیحی فاضل گذرا ہے جو ابو موسیٰ بن مصعب کا سکریٹری تھا۔ اس نے ایک کتاب اسلامی تعلیم و عقائد کے خلاف تصنیف کی اس نے مسیحیت کو برحق ثابت کرنے کے لئے دیگر متعدد کتابیں لکھیں۔

خلفائے عباسیہ کا زمانہ اور بالخصوص مامون کا زمانہ مُسلمان اہلِ

کمال کے لئے بھی مشہور ہے۔ چنانچہ امام بخاری اسی زمانہ میں تھے فقہا اور محدثین میں سے یحییٰ ابنِ معین۔ محمد بن سعد کاتب واقدی۔ ابو مطیع البلخی شاگردِ امام ابوحنیفہ۔ قاضی حسن ابنِ زیاد۔ حافظ ابن ہشام۔ غازی بن قیس شاگردِ امام مالک اور امام واقدی جیسے عظیم مرتبہ کے علما خلافتِ عباسیہ کے زمانہ کے ہیں۔ جن کی کتابوں پر اسلام کی دُنیا آج تک قائم ہے خصوصاً امام شافعی اور امام احمد حنبل جیسے فاضل جن کے خیالات اور اجتہادات موجودہ زمانہ میں بھی مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں۔ قدیم مسلمان مؤرخ بھی خلفاء کے عہد میں ہی ہوئے ہیں۔ مؤرخ ابنِ ہشام سے لے کر (جو خلیفہ منصور کے عہد میں تھا) ابنِ خلدون کے زمانہ تک (جو امیر تیمور کا ہم عصر تھا) تاریخی کُتب مرتب ہوتی رہیں۔ ان مسلمان مؤرخوں میں طبری۔ ابنِ اثیر مسعودی۔ بلاذری ابنِ خلدون اور ابنِ خلکان (از ۱۲۱۱ء تا ۱۲۸۲ء) نہایت مشہور ہیں علاوہ ازیں جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں، اسلامی فرقوں کے متعدد بانی بھی اسی عہد میں تھے جو خیالات کی وسعت اور آزادی کی وجہ سے قدرتی طور پر اِس عہد میں پیدا ہو گئے۔ خلفا کے عہد میں ایسے مسلمان علما بھی تھے جو بائبل اور مسیحیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ مثلاً بصرہ کا جاحظ اسلامی مصنفین میں ایک قابلِ فخر ہستی تھا اُس کی تصنیفات سے ظاہر ہے کہ نہ صرف وُہ بلکہ دیگر مسلمان بھی مسیحیوں کی کتابوں اور اُن کے عقائد سے واقف تھے اور قرآن کو بائبل سے افضل ثابت کیا کرتے تھے۔ پس عہدِ خلافت میں مسیحی کلیسیاؤں میں اور اسلامی حلقوں میں یعنی دونوں جماعتوں میں چوٹی کے علما اور فضلا تھے پس کسر یہ تھی کہ مسلمان مصنفین اپنے خیالات بے باکانہ ظاہر کر دیتے تھے لیکن مسیحی علما قانون کی بندشوں کی وجہ سے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ پس زمانہ کی

نیرنگی کی وجہ سے اسلامی علما کے نام زبان زدِ خاص و عام ہیں لیکن مسیحی فضلا کے نام تک فراموش ہو چکے ہیں اور اُن کی تصنیفات جو بچی کھچی رہ گئی ہیں وُہ اوراقِ پارینہ میں ہی محفوظ ہیں۔

(۵۱)

آٹھویں صدی کے نصف میں دُوسرے عباسی خلیفہ منصور (از ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) نے مسیحی فاضل ابن جبرئیل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اُس نے خلیفہ کو یہ جواب دے کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ میں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر ہی مرونگا۔ جہاں وُہ ہیں میں بھی وہیں جانا چاہتا ہوں خواہ وُہ بہشت ہو یا دوزخ۔ اِس جواب سے مسیحی علما کی ہراسانی ظاہر ہو جاتی ہے۔ خلیفہ متوکل کے زمانہ میں اور اُس کے بعد مسلمانوں نے اپنی کتابوں میں مسیحیت پر باقاعدہ حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اُن میں سے بعض قابل اور اہلِ علم شخص تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو پہلے مسیحی رہ چکے تھے مسلم علما میں سے ابو یوسف بن اسحٰق الکندی (از ۸۱۳ء تا ۸۷۳ء) مسعودی المتوفی ۹۵۵ء۔ ابنِ حزم (از ۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء) مشہور ہیں۔ اُن لوگوں میں سے جو خداوند مسیح کا انکار کر کے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے علی طبری (۸۲۵ء)۔ ابن جزلہ (گیارھویں صدی)۔ یوسف لبنانی (تیرھویں صدی)۔ شیخ یحییٰ زیاد بن یحییٰ۔ عبداللہ بن عبداللہ (پندرھویں صدی) اور درویش علی (سولھویں صدی) قابلِ ذکر ہیں مسلمان فلاسفر الکندی (جس کا ہم گذشتہ باب میں ذکر کر آئے ہیں) نے بھی تثلیث کے خلاف ایک کتاب لکھی ہے۔ وُہ مسیح کی ابنیت پر اعتراض کر کے لکھتا ہے کہ جب خدا کی کوئی بیوی نہیں تو اُس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ دُنیائے اسلام کا واحد فلاسفر جسمانی اور رُوحانی ابنیت میں تمیز نہیں کر سکتا!

نسطوری فضلا میں نسطوری کلیسیا کا پیٹریارک طموتھی (از ۷۸۰ء تا ۸۲۳ء) خلیفہ مہدی ۔ ہادی اور ہارون کے عہد خلافت میں ایسا زبردست عالم گزرا ہے کہ وہ خلفا کے دربار میں برسرِعام مسلمان علما سے بحث کیا کرتا تھا۔ ان مناظروں کی کیفیت ایک کتاب میں محفوظ تھی جو اب نہیں ملتی۔

خلیفہ مہدی نے طموتھی سے پوچھا کہ مسیح نے دعا کیوں کی؟ اگر اس کو عبادت کی ضرورت تھی تو پھر وہ خدا نہ ہوا ۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ مسیح بے گناہ نبی تھا اور یہ آپ بھی مانتے ہیں پس مسیح نے خدا سے گناہوں کی مغفرت حاصل کرنے کے لئے دعا نہ کی تھی کیونکہ وہ معصوم تھا اور اس کو گناہوں سے رہائی حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس کی دعا خدا کی قربت کے مترادف تھی اور حواریین نے مسیح سے عبادت کی تعلیم اور نمونہ حاصل کیا ۔ مہدی نے پیٹریارک سے متی $\frac{۹}{۱۲}$ کی بابت سوال کیا جس کے جواب میں اس نے یوحنا $\frac{۱}{۱۱}$ پیش کی۔ مہدی نے سوال کیا کہ کیا انبیائے سابقین نے مسیح کو "بندہ" اور "عبد" کہا ہے؟ اگر وہ خدا کا عبد اور بندہ ہے تو وہ اس کا بیٹا کیسے ہوا ۔ طموتھی نے جواب دیا کہ مسیح کا عبد ہونا اس کی ابنیت کے منافی نہیں ۔ کیونکہ بندہ فرمانبردار ہوتا ہے جس طرح خلیفہ کا بیٹا فرمانبردار ہے اور خلیفہ کے حکم کے مطابق اس وقت جنگ میں مشغول ہے ۔ خلیفہ نے اعتراض کیا کہ تم تین خداؤں کے قائل ہو ۔ طموتھی نے جواب دیا کہ مسیحی تثلیث فی التوحید کے قائل ہیں اور تین خداؤں کو کفر سمجھتے ہیں ۔ پھر مثال دے کر اس نے سمجھایا کہ جس طرح خلیفہ، اس کا کلام اور اس کی روح تین مختلف ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہے ۔ یا جس طرح آفتاب اور اس کی گرمی اور روشنی تین مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ سورج ایک ہی ہے ۔ خلیفہ نے پھر سوال کیا کہ کیا خدا کا کلام اور اس کی روح اس سے جدا ہے یا کہ

نہیں ۔ طموتھی نے جواب دیا کہ اگر خدا کا کلام اور اس کی روح اس سے جدا ہو تو خدا نہ تو حی القیوم زندہ خدا ہوا اور نہ وہ ذی عقل ہستی رہا ۔ چونکہ وہ دانش کا سرچشمہ ہے پس وہ اپنے کلام کے ذریعہ دانش عطا کرتا ہے اور چونکہ وہ زندگی کا منبع ہے پس وہ تمام زندہ مخلوقات کو اپنے کلام اور روح کے ذریعہ زندگی بخشتا ہے ۔ مہدی نے پوچھا کہ کتاب مقدس کے کن مقامات میں لکھا ہے کہ خدا کے ساتھ کلام اور روح ازلی ہیں ۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ زبور ۔ صحفِ انبیا اور انجیل مقدس تینوں میں آیا ہے اور زبور $\frac{۳۳}{۶}$ ۔ $\frac{۵۶}{۱۰}$ ۔ $\frac{۱۰۴}{۵}$ ۔ $\frac{۱۱۹}{۸۹}$ ۔ یسعیاہ $\frac{۸}{۴۰}$ ۔ یوحنا $\frac{۱}{۱}$ ۔ $\frac{۱}{۴}$ ۔ $\frac{۱۷}{۵}$ ۔ متی $\frac{۲۸}{۱۹}$ کا حوالہ دیا ۔ مناظرہ کے دوران میں پیٹریارک بار بار اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ کلیسیا خدائے واحد کو مانتی ہے اور تین خداؤں کی قائل نہیں ۔ پھر وہ الوہیت کے تین اقانیم پر اور ان کی تمیز پر بحث کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ ابن مولود ہے لیکن روح صادر ہے ۔ باپ غیر مولود ہے ۔ اور کہ اس کے علاوہ اقانیم میں کوئی فرق نہیں پس وہ کے نہ تو حصے ہیں اور نہ وہ اجزا میں تقسیم ہو سکتا ہے کیونکہ خدا کوئی جسم نہیں رکھتا ۔ خلیفہ نے پوچھا کہ اگر اقانیم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں تو تینوں اقانیم مجسم کیوں نہ ہوئے؟ اگر باپ اور روح ابن کے ساتھ مجسم نہیں ہوئے تو وہ زمان ومکان کے ذریعہ کس طرح الگ اور جدا ہو سکتے ہیں؟ طموتھی نے کہا کہ آپ کے ہاتھ میں سیب ہے ۔ سیب میں ذائقہ ہوتا ہے ۔ اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے ۔ لیکن ذائقہ کبھی خوشبو نہیں ہوتا اور خوشبو کبھی ذائقہ نہیں ہوتی ۔ یہ مثال ہے لیکن اس مثال سے ہم کچھ کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ گو ذاتِ باری کے تینوں اقانیم میں تمیز ہے لیکن وہ الگ الگ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں ۔ کلیسیا تینوں اقانیم کو مخلوط نہیں کرتی اور نہ تینوں کو الگ الگ ہستیاں

قرار دیتی ہے۔ وہ ذاتِ الٰہی میں ایک ہیں اور الگ ہوئے بغیر اُن میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ خلیفہ کا کلام کاغذ پر لکھا جا سکتا ہے لیکن خلیفہ کی رُوح اور فہم کی کیفیت قرطاس پر نہیں لکھے جا سکتے۔ لیکن جو الفاظ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں وہ خلیفہ کا مافی الضمیر ظاہر کرتے ہیں اسی طرح کلمۃ اللہ نے جسم اختیار کیا اور مجسّم یسوع کا کلام اور کلام خُدا کے ظہور ہیں اور کلمہ باپ اور رُوح سے کسی حالت میں بھی الگ اور جُدا نہیں ہوتا اور نہ جُدا کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ مہدی نے کہا کہ عدد تین یا دو خُدا کی طرف منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ خُدا کی طرف عدد ایک بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خُدا کی ذات میں اعداد و شمار نہیں ہوتے۔ جب مسیحی کلیسیا خُدا کو ایک کہتی ہے تو علم ریاضی کے عدد کے حساب سے اُس کو ایک نہیں کہتی۔ اسی طرح جب ہم تین کا عدد خُدا کے لئے استعمال کرتے ہیں تو ہم ضرب جمع یا تقسیم کے لحاظ سے استعمال نہیں کرتے کیونکہ ضرب اور جمع اور تقسیم کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلیفہ نے اعتراض کیا کہ کُتبِ مقدسہ میں خُدا کی وحدت کا ذکر آیا ہے؟ ٹموتھی نے جواب دیا کہ کثرت کا صیغہ بھی کُتبِ مُقدسہ اور قرآن دونوں میں وارد ہُوا ہے اور پیدائش ۱/۲۶ ۔ یسعیاہ ۶/۸ و ۴۸/۱۶ ۔ زبور ۳۰/۴ وغیرہ کا اور قرآنی سورت ۱۹/۱۷ و ۲۱/۹۱ وغیرہ کا حوالہ دیا۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ ان تمام آیات میں خُدا کی عظمت و شان کی وجہ سے جمع کا صیغہ استعمال ہُوا ہے۔ ٹموتھی نے کہا کہ ریاضی کے اعداد اور وحدت و جمع کے صیغوں سے نہ تو عظمت بڑھتی ہے اور نہ اُس کی شان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ پھر پیٹریارک تثلیث پر فلسفیانہ بحث کر کے کہتا ہے۔ اگر خُدا ازل سے عالمِ کُل ہے تو اُس کو

ازل سے علم تھا۔ اب وہ کیا تھا جس کا اُس کو علم تھا اور جو ازل سے وجود میں تھا۔ کوئی مخلوق ازل سے موجود نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ غیر مخلوق وجود ازل سے موجود نہ تھا تو خُدا ازل سے عالمِ کُل اور خبیر و علیم نہ ہُوا۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ خُدا کو ازل سے اپنی ذات کا علم تھا۔ ٹموتھی نے جواب دیا کہ اس حال میں خُدا کی ذات میں تمیز کا ہونا لازم ہے جب تک ذات میں تمیز نہ ہو خُدا کو یہ علم کس طرح ہو سکتا ہے؟ خلیفہ نے کہا کہ مفصل بات کرو۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ خُدا کو ازل سے اپنے کلام کا اور رُوح کا علم تھا۔ جب اُس نے ابھی مخلوقات کو پیدا نہیں کیا تھا۔ خُدا کی ذات تقسیم نہیں کی جا سکتی ایسا کہ ایک حصہ تو عالم ہو اور دوسرا حصہ معلوم ہو۔ لیکن ذاتِ الٰہی میں تمیز کی جا سکتی ہے ایسا کہ باپ کو بیٹے کا علم ہو۔ لیکن وہ جُدا نہیں بلکہ باپ بیٹے میں ہے اور بیٹا رُوح میں ہے۔ نہ ان میں کوئی جُدائی ہے نہ فاصلہ ہے اور نہ ان کو خلط ملط کیا جا سکتا ہے جس طرح رُوح ہماری عقل میں ہے اور عقل ہمارے فہم میں ہے۔ اُن میں نہ کوئی فاصلہ کی جُدائی ہے اور نہ وہ باہم خلط ملط کئے جا سکتے ہیں پھر پیٹریارک نے کہا کہ اگر میری دلیل درست نہیں تو آپ ہی بتلائیں کہ خُدا نے کس وسیلہ سے خلقت کو خلق کیا۔ انجیل تو صاف کہتی ہے کہ خُدا نے کلمہ کے ذریعہ خلقت کو خلق کیا اور اس کے بغیر کوئی شے ہست نہیں ہوئی۔ خلیفہ نے پھر یہ سوال کیا کہ اگر مسیح خُدا تھا تو خُدا صلیب پر مر گیا۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ خُدا مصلوب نہیں ہُوا تھا بلکہ مجسّم کلمہ یسوع مسیح یہود کے ہاتھوں مصلوب کیا گیا تھا۔

خلیفہ مہدی نے ایک اور سوال کیا کہ اگر مسیح نے شریعت کو منسوخ کر دیا تھا تو وہ شریعت کا دُشمن ٹھہرا۔ پیٹریارک نے جواب دیا کہ میں

اِس بات کو ایک مثال کے ذریعہ آپ کو سمجھاتا ہُوں۔ جب دن کے وقت آفتابِ عالمتاب چمکتا ہے تو ستاروں کی روشنی نہیں رہتی لیکن آفتاب ستاروں کا دشمن نہیں ہوتا۔ اسی طرح مسیح کے کامل دین کے سامنے شریعت کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ خلیفہ نے پُوچھا کیا قرآن نے انجیل کو منسوخ نہیں کیا؟ پیٹر پارک نے جواب دیا کہ خُدا نے یہودی شریعت کی نسبت اپنے انبیاء کے ذریعہ خبر دی تھی (یرمیاہ ۳۱: ۳۲-۳۴ + یُوئیل ۲: ۲۸-۳۰ وغیرہ) اور اُس نے اپنے ارادہ کی معجزات کے ذریعہ تائید بھی فرمائی۔ لیکن انجیل کے منسُوخ ہونے کا کہیں ذکر نہیں آیا بلکہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے اور قرآن سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خُدا نے معجزات کے ذریعہ بانیِ اسلام کی رسالت کی تائید نہیں کی۔ مہدی نے سوال پُوچھا کہ تم کو یہ انجیل کس سے مِلی۔ کیا وُہ صعُودِ آسمانی سے پہلے تُم کو دی گئی تھی؟ اگر انجیل تُم کو مسیح کے آسمان پر جانے کے بعد مِلی تو اس کی اصلیت کا کیا ثبُوت ہے؟ ظاہر ہے کہ وُہ اصل انجیل نہیں تھی۔ پیٹر پارک نے جواب دیا کہ انجیل صعُودِ آسمانی کے واقعہ سے بُہت پیشتر دی گئی تھی۔ کیونکہ انجیلی واقعات کے بیان اور کلمتہ اللہ کی تعلیم کے الفاظ اور معجزات وغیرہ سب کے سب واقعہ صعُود سے پہلے ہمارے ہاتھوں میں موجُود تھے۔ انجیل خُدا کی بادشاہی کی منادی ہے پس وُہ صعُود سے پہلے کی ہے۔ خلیفہ نے پُوچھا کہ یہ انجیلیں جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں متّی مرقس لُوقا اور یُوحنّا نے لکھی ہیں۔ پیٹر پارک نے جواب دیا کہ انجیل نویسوں نے خُداوند مسیح کے اُن الفاظ، معجزات اور واقعات کو صرف قلمبند کیا تھا جو اُن کی آنکھوں نے خود دیکھے تھے اور اُن کے کانوں نے سُنے تھے اور جن کو رُوح القدس نے اُن کو یاد دلایا تھا۔ خلیفہ نے کہا کہ انجیل مروّجہ میں سے حضرت محمد کی پیشینگوئیاں خارج کی گئی ہیں پس وُہ اصلی انجیل نہیں بلکہ محرّف ہے۔ پیٹر پارک نے پُوچھا کہ

اگر آپ کا قول دُرست ہے تو وُہ غیر محرّف نُسخہ کہاں ہے جس سے مقابلہ کر کے آپ کو یا کسی اور کو معلوم ہو گیا کہ مروّجہ انجیل مقدّس محرّف قرار دی جا سکتی ہے۔ کیا اِس نُسخہ کا کہیں ذکر پایا جاتا ہے۔ پھر آپ یہ بھی بتلائیں کہ مسیحیوں کو حضرت کی پیشینگوئیاں انجیل سے خارج کرنے سے کیا فائدہ ہُوا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مختلف کلیسیائی فرقے ایک دُوسرے کے مُخالف ہیں لیکن تمام کلیسیائے جامع کے عقائد ایک متفقہ انجیل مقدّس پر ہی مبنی ہیں پس وُہ کس طرح اُن کو تحریف کر سکتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ تورات اور صحفِ انبیائے یہُود میں مسیح کی پیشین گوئیاں موجُود ہیں لیکن یہُودیوں نے اُن کو خارج نہ کیا اور نہ کر سکتے تھے۔ بفرضِ محال اگر مسیحی اپنی کُتبِ مقدّسہ کو محرّف کرنے کی جُرأت بھی کرتے تو آپ یہ بتلائیں کہ وُہ اُن نُسخوں کو جو اہلِ یہُود کے ہاتھوں میں ہیں کس طرح محرّف کر سکتے تھے۔ ایک اور بات پر آپ غور کریں۔ اگر مسیحی اصل انجیل کو بدلتے تو وُہ اُن مقامات کو بدلتے جن پر غیر مسیحی اعتراض کرتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسیح قد و قامت میں بڑھتا گیا۔ وُہ کھاؤ اور شرابی تھا۔ وُہ تھک کر چُور ہو گیا اُس نے غصّہ سے نظر کی۔ اُس کو روزِ قیامت کا علم نہ تھا۔ اُس نے خُدا سے رو رو کر اور آنسو بہا بہا کر دُعا کی۔ وُہ مصلُوب کیا گیا۔ اور دفن ہُوا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب باتیں موجُودہ انجیل میں بجنسہٖ پائی جاتی ہیں۔ ان کو خارج نہیں کیا گیا۔ خلیفہ نے استثنا ۱۸ کو اور انجیل یُوحنّا کی آیت کو جس میں فارقلیط کا ذکر ہے پیش کیا اور کہا کہ یہ تمہاری کتابِ مقدّس میں موجُود ہیں۔ پیٹر پارک نے جواب دیا کہ اگر یہ آیات فی الحقیقت حضرت محمد کی پیشین گوئیاں ہیں تو آپ کو پہلا دعوے غلط ہُوا کہ مسیحیوں نے وُہ مقامات اپنی کتبِ مقدّسہ سے نکال دیئے ہیں جن میں آنحضرت کی پیشین گوئیاں ہیں۔ پھر کہا کہ اگر

آنحضرت فارقلیط ہوتے تو وہ روح اللہ ہوتے اُن کا نہ جسم ہوتا اور نہ وہ کسی کو نظر آسکتے کیونکہ انجیل یوحنا کے الفاظ کے مطابق فارقلیط کا ایسا ہونا ضرور ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ روح والوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہوتا ہے لیکن حضرت محمد باطن کا حال نہیں جانتے تھے کیونکہ یہ قرآن میں لکھا ہے (۶/۵)۔ فارقلیط نے مسیح کے رسولوں کے ذریعہ معجزے کئے لیکن حضرت سے ایک معجزہ بھی صادر نہیں ہوا جس کا قرآن کو بھی اقبال ہے۔ زبور میں حضرت داؤد فرماتا ہے کہ روح کے ذریعہ تمام چیزیں پیدا ہوئیں اگر حضرت محمد فارقلیط ہیں تو وہ خالق ہوئے۔

(۴)

خلیفہ مامون ۱۷۰ھ (۷۸۶ء) میں پیدا ہوا۔ اُس کی پیدائش کا روز عہدِ عباسیہ میں تاریخی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اُس روز خلیفہ ہادی فوت ہوا۔ خلیفہ ہارون رشید تخت نشین ہوا تھا (تاریخ الخلفا صفحہ ۲۴)۔ تاریخ اسلام میں بھی اس کا عہد بڑا اہم ہے کیونکہ جیسا ہم بتلا چکے ہیں اسلام کے بہترین علماء و فضلا اور محدثین و فقہا اس کے عہد میں زندہ تھے۔۔ وہ نہایت آزاد خیال شخص تھا کیونکہ خاندان برامکہ کے فاضل افراد اُس کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار تھے فضل بن سہل نے جو شیعہ خیالات کا تھا اس پر اپنا رنگ جما لیا ہوا تھا۔ پھر معتزلی علما نے اپنے فضل و کمال کی وجہ سے اُس پر ایسا اثر کیا کہ اُس نے اُن کے عقائد کو اختیار کر لیا۔ جس کی وجہ سے وہ قرآن کے حادث ہونے کا قائل تھا۔ ۲۱۸ھ میں اُس نے بغداد کے گورنر کے نام حکم بھیجا کہ سب قاضیوں کو جمع کر کے اُن کو یہ فرمان سُنا دو کہ وہ قرآن کے قدیم ہونے کا انکار کریں اور جو نہ مانے وہ ساقط العدالت قرار

دے دیا جائے۔ اُس نے سات بڑے بڑے علما کو جن کا عوام میں مذہبی اقتدار تھا طلب کیا اور اُن سے قرآن کے حادث ہونے کا اظہار لیا اور حکم دیا کہ تمام اسلامی ممالک میں جو علما قدیم قرآن کے قائل رہیں اُن کو پابہ زنجیر دربار میں حاضر کیا جائے تاکہ وہ خود اُن سے بحث کر کے اُن پر اتمام حجت کرے اور اُن کی زندگی اور موت کا فیصلہ صادر کرے۔ مامون خود ایک نہایت قابل اور صاحبِ علم و فضل شخص تھا۔ وہ قرآن کا حافظ تھا اور حدیث و فقہ کا بھی وسیع علم رکھتا تھا۔ امام مالک اُس کے اُستادوں میں سے ایک تھا۔ وہ مصنف بھی تھا چنانچہ ابن ندیم نے اُس کی مصنفات میں تین کا ذکر کیا ہے۔

چونکہ خلیفہ مامون خود عالم شخص تھا جس وہ علم پرور تھا اور ہر مذہب و ملت کے علما کا قدر دان تھا۔ وہ روشن خیال شخص واقع ہوا تھا جس اُس نے یہود، مجوس، صابی اور لا مذہب لوگوں تک کو مناسب آزادی دے رکھی تھی۔ اُس کے دربار میں ہر مذہب و ملت کے فضلا موجود تھے۔ اور وہ سب سے فیاضانہ سلوک کرتا تھا اور کسی غیر مسلم مذہب کے عبادات کے اظہار میں کا روک نہیں ڈالتا تھا اگرچہ وہ معتزلہ خیال کے اندر رہتے۔ جس اُس کے عہد میں مسیحی کلیسیاؤں کو اُس کے پیشرؤوں کے عہد کی نسبت زیادہ آزادی حاصل تھی۔

مامون کو تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا بڑا شوق تھا لیکن وہ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تلوار سے زیادہ زبان اور قلم سے کام لیتا تھا۔ پس اُس نے اپنے تبلیغی جذبہ کے ماتحت اپنے دربار میں دیگر غیر مسلم مذاہب کے علما کو دعوت دی کہ وہ علمائے اسلام سے تحقیقِ حق کے لئے مناظرے کریں۔ اُس کو ان مناظروں سے بڑی دلچسپی تھی اور اس بات کے لئے منگل سہ شنبہ کا دن مخصوص کر رکھا تھا۔ اُس روز دن چڑھے مختلف مذاہب کے علما اور

ماہرین دار المناظرۃ" میں آتے تھے اور یہ انجمن دوپہر تک قائم رہتی تھی۔ مامون خود مناظروں میں حصہ لیتا تھا اور گفتگو حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتی تھی اور اگر کبھی کبھار دلائل کے جوش میں ایسا ہو بھی جاتا تو خلیفہ بڑی متانت اور صبر سے کام لے کر اُن کی دلائل کو سُنتا تھا۔

مسیحی فضلا قُدرتی طور پر اس نادر موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر مناظروں میں شریک ہوتے تھے۔ اس عہد کے مسیحی علما میں حران کے بشپ تھیوڈور ابُو قُرّہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ بشپ مقدس یُوحنا دمشقی کے خیالات اور دینیات سے ایسا متاثر تھا کہ اُس کو یُوحنا کا شاگرد رشید کہا جاسکتا ہے۔ اِس زبردست فاضل نے مسیحیت اور اسلام پر کتابیں بھی تصنیف کیں تاکہ عیسائی اپنے مذہب کی تعلیم سے واقف ہو کر اندھا دُھند اسلام کو قبول نہ کریں۔ اُس کا مقصد بھی جارحانہ نہ تھا بلکہ وہ اسلام پر حملے کرنے کی بجائے مسیحی تعلیم کو مُسلمانوں کی زد سے بچانے پر ہی کفایت کرتا ہے۔

تھیوڈور خلیفہ مامُون کے دربار میں مُسلمان فاضل ہاشمی سے بحث کیا کرتا تھا۔ یہاں ہم نمُونہ کے طور پر چند مثالیں مختصر طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ جب تھیوڈور سے سوال کیا گیا کہ خُداوند مسیح خُدا کے برابر ازلی کیسے ہو سکتا ہے تو اُس نے قرآن کی آیات ($\frac{3}{52}$ اور $\frac{4}{169}$) پیش کیں۔ طرفین نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ خُدا کا کلمہ اور رُوح اللہ ہے۔ تھیوڈور کا مُدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ مسیح مخلُوق نہ تھا بلکہ خلق کرنے والا تھا اور کہ کلمۃ اللہ کُل خلقت اور کائنات کو پیدا کرنے کا وسیلہ تھا۔ چنانچہ قرآن بھی کہتا ہے کہ مسیح "خالق" تھا اور "باذن اللہ" خالق تھا (عمران ۳ ۴۹)۔ اور کہ مسیح بحیثیت خُدا کا کلمہ ہونے کے خلقت کا وسیلہ تھا۔ اس کے بعد اُس نے قرآن کی آیت

($\frac{5}{116}$) کو لے کر سوال کیا کہ اگر خُدا پہلے سے جانتا تھا تو اُس نے عیسیٰ سے کیوں سوال کر کے پُوچھا۔ اسلامی مناظر نے ایک اور اعتراض کیا کہ اگر مسیح خُدا تھا تو خُدا صلیب پر مر گیا۔ اس کے جواب میں تھیوڈور قرآنی آیت $\frac{3}{48}$ کو پیش کرتا ہے۔ پھر اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب مسیح زمین پر تھا اور اس دُنیا میں انسان کی طرح زندگی بسر کرتا تھا تو کیا خُدا رُوح اور کلمہ کے بغیر موجُود تھا۔ اس کے جواب میں تھیوڈور نے کہا کہ خُدا زمان و مکان کی قیُود سے بلند و بالا ہے اِس واسطے کلمۃ اللہ آسمان و زمین پر ہر جگہ اور ہر وقت حاضر تھا۔

مامُون کے عہد میں ایک اور عالم تھا جس کی کتاب "رسالہ الکندی" اَب بھی موجود ہے اور اس کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ یہ رسالہ ۸۳۰ء میں لکھا گیا تھا اور مشہور مُصنّف البیرُونی ۱۰۰۰ء (۳۹۰ھ) کے قریب اس کا ذکر کرتا ہے۔ البیرُونی کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ تصنیف کے بعد صدیوں تک یہ رسالہ مُسلمانوں اور مسیحیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اور کہ یہ مصنّف اس کو ایسا مُستند سمجھتا ہے کہ اِس رسالہ میں سے مذہب صابئہ کا حوالہ دیتا ہے۔ جب ہم اِس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ اِس قسم کا رسالہ ایک مُسلمان خلیفہ کے عہد میں لکھا جا سکا اور کہ خلیفہ مامُون کے بعد بھی صدیوں تک وُہ محفُوظ رہا اور اسلامی ممالک میں نقل ہوتا رہا۔ حق تو یہ ہے کہ تمام قدیم مسیحی لٹریچر میں جو اسلامی ممالک میں لکھی گئی یہ رسالہ اِس لحاظ سے آپ ہی اپنی نظیر ہے۔

اِس زبردست رسالہ کا مصنّف عبد المسیح بن اسحاق الکندی تھا وُہ عرب قبیلہ بنی کندہ کا ایک ممتاز فرد تھا۔ یہ قبیلہ پانچویں اور چھٹی صدی

یمن قبل از اسلام عرب کے جنوب سے آکر عرب کے وسط اور شمال میں بس گیا تھا۔ اسلام کی آمد پر اس قبیلہ کا ایک بڑا حصہ اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا لیکن اس کی ایک اقلیت مسیحی مذہب پر قائم رہی۔ خلیفہ مامون کے زمانہ میں اس اقلیت کے افراد اپنی حسن لیاقت کے باعث اچھے عہدوں پر متعین تھے۔ رسالہ کا مصنف عبد المسیح بن اسحاق الکندی نسطوری کلیسیا کا ایک زبردست عالم تھا۔

خلیفہ مامون کا ایک عزیز عبد اللہ بن اسمٰعیل ہاشمی عبد المسیح کا جگری دوست تھا۔ اس دوستی کی بنا پر اس نے خلیفہ کے ایما پر عبد المسیح کو اسلام کی دعوت دی اور لکھا کہ تو جو دلیل چاہتا ہے اس سے اپنی حجت تمام کرلے۔ اور تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ ڈال۔ جو تیری مرضی ہے وہ تو لکھ کر بیان کر دے اور جو حجت تیرے گمان میں تیری کسی دلیل کو مضبوط کرتی ہے اس کو بغیر کسی خوف و خطر کے واضح کر کے کھول کر لکھ دے۔ ہم نے تجھ کو جان کی امان دی ہے اور یہ امان نہایت صحیح ہے اور ہم تیرے ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نے تجھے لکھنے میں بالکل آزادی دے دی ہے۔ ہم کوئی قید اور کسی طرح کی پابندی نہیں لگاتے۔ ہم نے تیری زبان کو ہر طرح کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے تاکہ تیرے اور ہمارے درمیان صرف عقل ہی منصف ہو جو کسی کی طرفداری نہیں کرتی اور تعصب سے بالا ہو کر غیر حق کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ ہم نے بالتحقیق تجھ کو کھلی اجازت دے دی ہے اور ساتھ ہی تجھ کو صحیح امان دے دیا ہے۔ جو کچھ عقل فیصلہ کرے گی وہ ہم کو منظور ہوگا کیونکہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے۔ ہم تجھ کو اسلام لانے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ ہم اس دین کو جس پر تو ہے حق نہیں سمجھتے۔ سلام علیک و رحمتہ و برکاتہ۔

رسالۃ الکندی کا مصنف یوحنا دمشقی، نسطوری کیتھولی کوس ٹموتھی

اور تھیوڈور ابو قرہ اور دیگر مسیحی مناظرین کی طرح نہ تو مدافعانہ طرز تحریر کو استعمال کرتا ہے اور نہ کسی قسم کی مداہنت پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ جان کی امان کے وعدہ کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر صاف گوئی سے کام لیتا ہے اور کھری کھری سناتا ہے۔ اور اپنے دوست عبد اللہ ہاشمی کو جواب میں لکھتا ہے "تو نے خود لکھا ہے کہ اطمینان سے بے خوف و خطر جو کچھ تیرے دل میں آئے لکھ۔ جہان کے منجی نے بھی انجیل میں فرمایا ہے کہ "ان سے جو بدن کو قتل کرتے ہیں پر روح کو قتل نہیں کر سکتے مت ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ڈال سکتا ہے"۔ اس فرمان سے مجھے یہ اطمینان ہے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا میری جان پر قادر نہیں ہے پس اللہ تعالےٰ نے اور ہمارے امیر المومنین (مامون) کے عدل و انصاف اور دانش نے مجھ ضعیف کو آزادی عطا کی ہے۔ میں اللہ کی بخشش کا امیدوار ہوں اور امیر المومنین کے ظل حمایت میں زندگی بسر کرتا ہوں جس کے عدل کا فیض عام ہے اور جس کی رحمت وسیع ہے۔ خدا اس کو جزائے خیر دے اور اپنے احسان سے میری یہ دعا قبول فرمائے۔"

عبد المسیح تمام متنازعہ فیہ مسائل پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ ہم ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس مدلل رسالہ کو پی۔ آر۔ بی۔ ایس لاہور سے منگوا کر اس کا بغور مطالعہ کریں اور فائدہ حاصل کریں۔ آخر میں عبد المسیح لکھتا ہے "میرے دلائل کو تجھے ہرگز نہیں ماننا چاہیے کیونکہ تو جانتا ہے کہ جب ہم تیرے سامنے میدان میں آگئے ہیں تو ہم ہرگز فرار اختیار نہیں کریں گے بلکہ آخر تک اس جنگ میں روحانی ہتھیاروں سے لڑیں گے۔ ہم خدا کے دین یعنی مسیحیت سے ہرگز نہیں ہٹیں گے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم دین حق کے معاملہ میں تم پر فتح پائیں گے۔ اور اب اگر تو اس امر میں ہم کو ملامت کا نشانہ بنائے گا۔

تو تُو بے انصاف ٹھہریگا اور ہم اِس بات میں تیری یا کسی اَور کی ملامت کی بھی پروا نہیں کرینگے۔ خدا تعالیٰ عزّ وجلّ تیری ہدایت کرے۔"

جب عبدالمسیح کا جواب عبداللہ ہاشمی کو مِلا تو خلیفہ مامُون نے حُکم دیا کہ دونوں خط (عبداللہ ہاشمی کا خط اور عبدالمسیح کا جواب) اُس کے روبرو پڑھے جائیں۔ اُس نے دونوں کو نہایت غور سے سُنا۔ جب عبدالمسیح کا خط ختم ہوگیا تو مامُون نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ کہا "دین دراصل دو ہی ہیں۔ ایک دُنیا کا دین اور دُوسرا آخرت کا دین۔ دُنیا کا دین مجُوسی مذہب ہے لیکن آخرت کا دین عیسائیوں کا دین ہے۔ پر صحیح دین توحید کا ہے جو ہمارے حضرت لائے ہیں کیونکہ اُس میں دُنیا اور آخرت دونوں ہیں۔"

مغربی ممالک کے بعض مسیحی مصنّفین نے عبدالمسیح بن اسحٰق کِندی کے نام کو اسلام کے زبردست اور واحد فلاسفر ابو یُوسف بن اسحٰق کِندی کے ساتھ خلط ملط کرکے یہ خیال کیا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص تھے۔ لیکن یہ دونوں عالم دو مختلف شخص تھے اگرچہ دونوں قبیلہ کِندی کے تھے۔ ابو یُوسف مسلمان تھا اور تاریخ اسلام میں واحد فلاسفر ہُوا ہے۔ کوئی دُوسرا مسلمان اُس کے پایہ کو نہیں پہنچ سکا۔ وُہ بھی خلیفہ مامون کا ہم عصر تھا اور خلیفہ معتصم کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ اِس مسلمان فلاسفر نے مسئلہ تثلیث کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا جواب عیسائیوں کی طرف سے مسیحی فاضل یحیٰی بن عدی یعقُوبی مسیحی نے دیا تھا۔

اسلامی مملکت کے دیگر مسلمان علماء بھی عبداللہ ہاشمی کی طرح مسیحیوں سے مناظرے کرکے اُن کو اسلام قبُول کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس کا بعض اوقات یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ بعض مسیحی صدق دِل سے اسلام پر ایمان

لے آتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان تاجروں نے بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا حصّہ لیا۔ وُہ جہاں بھی جاتے تھے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔

لیکن بدقسمتی سے یہ تبدیلی دو رُویہ نہ تھی کیونکہ اسلامی مملکت کے قوانین اور شریعتِ ارتداد کی وجہ سے کوئی مسلمان خواہ وُہ انجیلی تعلیم سے کتنا ہی متاثر نہ ہُوا ہو، اسلام کو ترک کرکے مسیحیت کے حلقہ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ لیکن عیسائیوں کو اپنے مذہب تبدیل کرنے میں کوئی دِقّت پیش نہ آتی تھی پس وُہ مسیحی مسلمان علما کی دلائل سے عاجز آکر اسلام کو بآسانی تمام قبُول کرسکتے تھے۔ یہ تبدیلی خاص کر ایسے ممالک میں ہوتی تھی جہاں یا تو کلیسیا کی جڑیں اندرُونی تفرقوں کے باعث کھوکھلی ہوچُکی تھیں یا جہاں مصر اور افریقہ کے ممالک کی طرح مسیحی خود جاہل اور بے علم ہوتے تھے جس کی وجہ سے وُہ غیر مسلم علما کے اعتراضات اور دلائل کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔

(۷)

خلیفہ مامون کی وفات (۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء) کے ساتھ ہی اسلامی مملکت میں تحقیقِ حق اور علم و فضل کی جُستجو ختم ہونے شروع ہوگئے۔ خلیفہ معتصم ایک سپاہی مزاج آدمی تھا اور اس کا جانشین خلیفہ واثق اُس سے بھی اکھڑ تھا۔ اس قسم کے خلفا کے عہد میں علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے وسائل کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ پس اسلام کا زرّیں زمانہ جس میں حکمت و فلسفہ اور علوم و فنوں کا چرچا ہوتا رہتا تھا ختم ہوگیا۔ کیونکہ اَب حکُومت کی سرپرستی اور مدد ختم ہوگئی تھی۔ لیکن گو اسلامی سلطنت میں علم و حکمت زمانۂ ماضی کی داستان ہوگئی تھی مسیحی کلیسیا میں ایسے علما اور فضلا برپا ہوتے گئے جنھوں نے

علم و تمدن کے چراغ کو کلیسیائی حلقوں میں بجھنے دیا۔

علی طبری جس کا ہم سطور بالا میں ذکر کر آئے ہیں خلیفہ متوکل کے ملازم تھا۔ وہ پہلے مسیحی تھا اور مسیحی کتب مقدسہ سے واقف تھا۔ وہ اپنی کتاب میں مسیحی علما کے اعتراضات اور دلائل کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت محمد نے دیگر انبیا کی طرح خدا کی وحدت کی تعلیم دی ہے جس پر ابراہیم کا ایمان تھا۔ اس کے بعد وہ اسلامی شرع اور قرآنی احکام کا، معجزات محمد کا، محمد کی پیشین گوئیوں کا اور قرآن کی اعجازی عبارت کا ذکر کرتا ہے اور عہد عتیق اور قرآن کا مقابلہ کر کے قرآن کو اعلیٰ ثابت کرتا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ گو انجیل میں اچھی قسم کی اخلاقی تعلیم ہے اور اچھی اور سادہ عام فہم تمثیلیں ہیں لیکن اس میں شرعی قوانین نہیں پائے جاتے۔ زبور کی کتاب میں بھی شریعت کے قوانین نہیں ملتے لیکن قرآن میں اخلاقی تعلیم اور شریعت دونوں موجود ہیں جس کی وجہ سے قرآن ایک بے نظیر کتاب ہے۔ حضرت محمد کی فتوحات اس کی رسالت کو ثابت کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر، عمر، علی، عمر بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن عمر اعلیٰ ترین درجہ کے باضمیر قطب زمانہ تھے جو مقبول درگاہ الٰہی تھے۔ اس کے بعد وہ حضرت محمد کی بابت پیشین گوئیوں کا ذکر کر کے کہتا ہے[1] کہ زبور کی کتاب میں جہاں جہاں الفاظ "حمد"، "محمود" وغیرہ لکھے ہیں (مثلاً ۴۸: ۱-۲، ۵۰: ۲ + ۵۰: ۲-۳ وغیرہ) وہ سب بانی اسلام کی نسبت پیشین گوئیاں ہیں۔

[1] واقف کار ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں بھی یہی فرسودہ دلیلیں آج کل مسلمان مناظرین پیش کرتے ہیں جن کا مسکت جواب عیسائی علما صدیوں سے دے چکے ہیں۔ اس مضمون پر مرحوم پادری شمس الحق کا رسالہ "ینابیع" میں مضامین اور میری کتاب "توضیح موسوی اور محمد عربی" ناظرین کے لئے دلچسپی کے موجب ہونگے۔ یہ دونوں کتابیں چند آنوں کے عوض پنجاب رلیجس بک سوسائٹی سے مل سکتی ہیں۔ (برکت اللہ)

یسعیاہ ۹: ۶ کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ سلطنت حضرت محمد کے کندھوں پر ہے۔ یرمیاہ، حزقی ایل اور دانی ایل کی کتابوں میں بھی محمد کی نسبت پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ انجیل یوحنا میں فارقلیط کے وعدہ سے مراد رسول عربی ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ جب مسیح نے حکم دیا تھا کہ کپڑے بیچ کر تلوار خریدو تو اس مقام میں اسلام کی آمد کی بشارت ہے۔ پولوس رسول کے خط گلتیوں کے نام میں ۴: ۲۲-۲۶ کی نسبت لکھتا ہے کہ اس مقام میں مقدس پولوس کا مطلب نبی اسلام سے ہے!

خلیفہ متوکل اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہتا تھا۔ اس کے بعد گو خلافت عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تاہم خلفا اور ان کے امرا وزرا اشاعت اسلام کی طرف سے غافل نہیں رہتے تھے چنانچہ گیارھویں صدی میں نصیبین کے بشپ ایلیاہ کو خلیفہ کے وزیر نے طلب کیا اور اس سے مسئلہ تثلیث پر سوال کیا۔ بشپ ایلیاہ نے جواب دیا کہ خدا واجب الوجود ہستی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جوہر ذات واحد ہے جس میں کلمہ ہے اور زندگی ہے۔ کلمہ اقنوم ثانی مسیح کلمتہ اللہ ہے اور زندگی روح القدس ہے کیونکہ روح کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس واجب الوجود ہستی میں جوہر ذات، کلمہ اور روح بطور عرض کے نہیں رہ سکتے اور نہ یہ تینوں ازلی اقانیم بطور جوہر کے جدا جدا ایک واجب الوجود ہستی کی ذات میں الگ الگ جمع ہو سکتے ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ تینوں ایک ہی واحد ذات الٰہی کے تین ازلی اقانیم ہیں۔ خدائے واحد کی جوہر ذات سے کلمہ اسی طرح مولود ہے جس طرح انسان کے فہم کے تصورات سے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کے پاک جوہر ذات سے روح القدس اسی طرح صادر ہوتی ہے جس طرح زندگی جوہر سے صادر ہوتی ہے۔ پس خدا کی ذات واحد ہے اور اس واحد ذات الٰہی میں تین اقانیم ہیں۔ یہ دقیق مسئلہ میں ایک عام فہم مثال کے ذریعہ

سمجھاتا ہوں جس طرح آفتاب سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور اسی آفتاب سے گرمی صادر ہوتی ہے اسی طرح جوہر باپ ہے جس سے کلمہ مولود ہوا جو ابن ہے۔ اور رُوح القدس جو زندگی ہے وُہ اُسی جوہر سے صادر ہوئی۔ ہم اِس قسم کا استدلال خُدا کی کسی صفت سے نہیں کر سکتے اور نہ کرتے ہیں کیونکہ خُدا کا جوہر ذات ایک شئے ہے اور اُس کی صفات اور شئے ہیں۔ دونوں میں یعنی خُدا کی ذات اور صفات میں بیّن فرق ہے۔ وزیر نے بڑے غور سے بشپ ایلیاہ کے دلائل کو سُن کر کہا کہ اگر آپ کی بات صحیح ہے تو پھر مسیحیت بھی توحیدِ الٰہی کی قائل ہے اور آپ بھی ہماری طرح ایک واحد خُدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ بشپ نے جواب دیا کہ ہاں فرق صرف یہ ہے کہ آپ وحدتِ محضہ کے قائل ہیں جو علم و فلسفہ کی رُو سے غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ اِس وحدت میں ما فیہ اور محتویات نہیں لیکن ہم تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کے قائل ہیں کیونکہ حکمت اور فلسفہ اسی قسم کی وحدت کے متقاضی ہیں۔ ہمارے دُشمن ہم پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ ہم تین خُداؤں پر ایمان رکھتے ہیں۔

مُسلمانوں میں بھی بعض فہمیدہ اشخاص ایسے تھے جو صدقِ دِل سے مسیحی تصورِ خُدا کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً شہرستانی (سالِ وفات ۵۴۸ھ) کہتا ہے کہ جب مسیحی کہتے ہیں کہ خُدا میں تین شخصیتیں ہیں تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خُدائے واحد کی ذات میں تین شئے ہیں یعنی وجُود، زندگی اور علم جن کو وُہ باپ۔ بیٹا اور رُوح القدس کا نام دیتے ہیں۔

جب واثق کے بعد متوکل (از ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) خلیفہ ہُوا تو اُس نے سُنّتِ اسلامی کے احیاء کی طرف توجہ دی۔ مسیحی کلیسیاؤں کی بدبختی کے دن پھر لوٹ آئے۔ اُس نے مسیحی کلیسیاؤں پر جبر و تشدد سے کام لیا اور جتنے

مسیحی حکومت کی ملازمت میں تھے، وُہ سب نکال دیئے گئے۔ تبادلۂ خیالات کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ فلاسفہ اور معتزلہ حکومت کی سرپرستی سے محرُوم کر دیئے گئے۔ اس کے بعد خلفا علم و حکمت سے بیزار تھے۔ اسلامی مملکت میں پھر فقہا اور علما کا زور ہو گیا۔ مشہُور عرب فلاسفر ابو یُوسف یعقوب بن اسحٰق کندی کا انتقال خلیفہ معتضد (از ۸۹۲ء تا ۹۰۲ء) کے مرنے سے قریباً اٹھارہ سال پہلے ہو چکا تھا۔ یہ خلیفہ اپنے باپ متوکل کی طرح علُومِ عقلیہ سے اِس قدر بیزار تھا کہ اُس نے اپنے مرنے سے قبل بغداد کے کُتب فروشوں سے حلف اُٹھوا لیا کہ وُہ نہ تو حکمت و فلسفہ کی کُتب فروخت کریں گے اور نہ مناظرہ کی کوئی کتاب فروخت کرینگے۔ جب مشہُور اسلامی فلسفہ دان فارابی (تاریخ پیدائش ۲۵۹ھ) خراسان سے تحصیل علم کی خاطر بغداد آیا تو تمام دار الخلافت میں اُس کو ایک عالم شخص بھی ایسا نہ ملا جو اُس کو علم و فلسفہ کی تعلیم دے۔ پس اُس نے مسیحی کلیسیا کے سربرآوردہ عالم یُوحنّا بن خیلان سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ جب وُہ تحصیلِ علم سے فارغ ہو چکا تو اُس کو کوئی مُسلمان نہ ملا جو اُس سے حکمت و فلسفہ سیکھتا۔ اُس کے شاگرد مسیحی کلیسیا کے افراد تھے جن میں یحییٰ بن عدی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ مسیحی عالم یعقُوبی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ پس جب حکُومتِ اسلامی نے علم و حکمت کا چراغ بُجھا دیا تھا اُس زمانہ میں بھی مسیحی کلیسیاؤں میں ایسے بشپ، قسیس اور کلیسیا کے شُرکا تھے جو نہ صرف علم اور فلسفہ اور حکمت کے طالب تھے بلکہ ان علُوم میں سربرآوردہ تھے۔ حوادثِ زمانہ اُن کے علمی ذوق کو مٹا نہ سکے کیونکہ اُن کا ذوق حکُومت کی سرپرستی سے مُستغنی تھا۔ اسلامی حکومت کی آمد سے صدیوں پہلے یہ ذوق اُن کا طغرائے امتیاز تھا۔ مامُون کی حکُومت نے اُن میں اِس ذوق کو

دیکھا اور اُن کی سرپرستی کی۔ اُس کی سرپرستی اُن کے شوق و طلب کا سبب نہ تھی بلکہ اُن کا علمی شوق اُس سرپرستی کا باعث بنا اور جب حکومت کی سرپرستی اور حمایت اُٹھ گئی تو اُن کا شوق و ذوقِ علم جاری رہا اور مسیحی کلیسیائیں حسبِ سابق اپنے علمی شغف میں مشغول رہیں۔ ہاں۔ اس سرپرستی کے ختم ہو جانے سے دُنیائے اسلام پر اثر پڑا جس میں سے رفتہ رفتہ تحقیق اور تجسّس کی خواہش اور مادہ اُٹھ گیا اور حسبِ سابق جمود اور تصلب پھر طاری ہو گیا۔ اہلِ فقہ کے زیرِ اثر مسلمانوں کے قوائے دماغی شل ہونے لگے اور اُس کے افراد کی دماغی حالت روز بروز بیسویں صدی تک پست ہوتی چلی گئی۔

(۸)

ہم نے سطورِ بالا میں ابنِ رشد (از ۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) کے نام کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کا تعلق خلفائے بغداد سے نہیں بلکہ خلفائے مغرب سے تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسپین میں مسلمانوں میں جلد علمی ترقی شروع ہو گئی لیکن اُن کے علوم، ادب، تاریخ، حدیث، فقہ، قرآن اور لغت وغیرہ تک ہی محدود رہے۔ فلسفہ اور حکمت سے مسلمانانِ اندلس ہمیشہ نفرت کرتے رہے۔ وہاں کی حکومت خالص عرب تھی اور بربری قبائل تو علم و حکمت کے نزدیک پھٹکتے گویا نہ تھے۔ اندلس میں فقہی مذہب مالکی تھا جو عرب کے دل و دماغ کا آئینہ تھا۔ اسپین میں کسی نے اعتزال اور معتزلہ کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ علما فقہی مباحثات ہی میں مصروف رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص ذرا فلسفہ اور منطق کی طرف رجوع کرتا تو اُس کو زندیق کا خطاب مل جاتا اور اگر ایسے شخص کی زبان سے کوئی آزادانہ فقرہ نکل جاتا تو عامۃ المسلمین خود ہی بغیر حکومت کی طرف رجوع کرنے کے اُس کو جان سے مار ڈالتے تھے۔ پس جو لوگ علومِ عقلیہ یا فلسفہ کی کوئی کتاب تصنیف کرتے تھے

وہ اس کو مخفی رکھتے تھے۔ چنانچہ اندلس کے خلیفہ ثانی ابنِ منصور کے حکم سے ابنِ حبیب اشبیلی قتل کر دیا گیا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ فلسفہ اور حکمت کا شیدائی تھا۔ ابنِ باجہ کے ایک ہم عصر فاضل عبدالملک بن وہیب نے جب اپنی جان کو خطرہ میں پایا تو اُس نے اپنے شاگردوں کو مسائلِ فلسفہ پر بحث کرنے سے روک دیا۔ اور اپنی تصنیفات کی ایسی ترمیم کر دی کہ کسی کو گرفت کی گنجائش باقی نہ رہی۔ ایک اور فلاسفر مطرف اشبیلیہ میں فلسفہ کے ذوق کی وجہ سے مُلحد کہلاتا تھا جس کا عام مسلمانوں نے سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اُس نے اپنی کتابیں ایسی چھپائیں کہ اُن کو کیڑے کھا گئے کیونکہ اسپین میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو فلسفہ اور حکمت کی عداوت میں فساد کرنے اور کتابوں کو آگ کی نذر کر دینے میں مطلق باک نہ رکھتے تھے۔

ابتداءً عبدالرحمٰن ثالث (از ۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) کے عہد میں اسپین میں فلسفہ شروع ہوا جب بغداد میں مُقتدر اور اُس کے جانشین خلفاء تھے۔ اُس کی پنجاہ سالہ حکومت کا زمانہ "عہدِ زرّیں" کہلاتا ہے جس کے بعد زوال شروع ہو گیا۔ اُس نے عیسائیوں پر متواتر حملے کر کے اور اسلام کو اشاعت دے کر عوام میں اس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی کہ لوگوں کو عہدِ صحابہ یاد آ گیا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا خلیفہ الحکم المستنصر تخت نشین ہوا۔ وہ عالموں اور فلاسفروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ وہ خود عالم شخص تھا۔ کتابوں کے جمع کرنے کے لئے اُس نے قاصدوں کو دمشق، بغداد، قاہرہ، بخارا، مرو وغیرہ علمی مرکزوں میں (جو مسیحیت کے علمی مرکز تھے) بھیجا تاکہ نئی تصانیف کے نسخے حاصل کریں۔ اُس نے ایک بے نظیر کتب خانہ بنایا جس میں قریباً چار لاکھ کتابیں تھیں۔ لیکن اُس کی وفات کے بعد

اُس کے بیٹے ہشام ثانی کے زمانہ میں یہ کُتب خانہ جلا دیا گیا تاکہ بھولے بھالے مُسلمانوں کا عقیدہ خراب نہ ہو جائے۔ الحکم کی شاہانہ فیاضیوں سے فلسفہ و معقولات کی کُتب سے تمام مُسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو فائدہ ہُوا تھا اور مختلف مذہبوں کے پیروؤں میں علمی تعلقات کی بنا پر مذہبی رواداری جاری ہو گئی تھی۔ اور علماء کی برادری قائم ہو چلی تھی۔ لیکن اُس کے مرنے کے بعد حکمت و فلسفہ کی روشنی پھر دھندلی ہو گئی۔ اور اسلام و فلسفہ کے تصادم سے پرخاش پیدا ہو گئی جو بڑھتی چلی گئی کیونکہ فضلا کا گروہ فلسفہ کے اُصول کو صحیح مان کر اسلامی تعلیمات میں شکوک و شبہات پیدا کرتا جاتا تھا۔ اندلس کی حالت بغداد کے خلیفہ مستنجد کے زمانہ سے بھی بدتر ہو گئی جس نے (جیسا ہم بیان کر چکے ہیں)، عبدالقادر جیلانی کے بیٹے کے کُتب خانہ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ مغرب میں خلیفہ منصُور نے بھی ایک خاص محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ فلسفہ، حکمت اور منطق کی کتابیں ہر جگہ سے مہیا کی جائیں اور ان کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ جو لوگ ان علوم کی تحصیل میں مشغول تھے اُن کو سخت سزائیں اور ایذائیں دی گئیں۔ اِس حُکم سے فقط علم ریاضی اور علم ہیئت کی کتابیں بچ رہیں کیونکہ دن رات کے گھنٹوں کو اور نماز کا وقت اور سمتِ قبلہ کی تعین میں اُن کی ضرورت پڑتی تھی!

ایسے مخالف ماحول میں علم و فلسفہ کی پرورش نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہُوئی۔ لیکن ان ناسازگار حالات میں بھی قُدرت کو منظور تھا کہ ۱۱۲۶ء میں ابنِ رشد جیسا زبردست عالم اور فلاسفر پیدا ہو۔ مرحُوم مولوی محمد یُونس انصاری کا خیال ہے کہ ابنِ رشد کسی یہودی نومُسلم خاندان سے تھا جس طرح امام ابوحنیفہ ایک نومُسلم خاندان سے تھا (ابنِ رشد صفحہ ۳ حاشیہ)۔

مرحُوم شبلی لکھتے ہیں "ابنِ رشد نے موحدین کے دورِ حکومت میں نشوونما حاصل کیا تھا۔ اِس سلسلہ کے اکثر تاجداروں نے خود سلطنت کی بُنیاد مذہب کی سطح پر قائم کی تھی۔ حکومت کا صدر مقام مراکش تھا جو جاہل بدوؤں کا گویا منبع تھا اور جہاں ہر طرف بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے۔ سلطنت کی مُلکی قوت محض اس بات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش کو ترقی دی جائے۔ عیسائیوں نے اسپین کے اکثر حصے دبا لئے تھے۔ پس اُن کے مقابلہ میں مذہبی جوش کی قُوت سے عُہدہ برآئی ہو سکتی تھی اور منصُور نے (جو اس سلسلہ کا تیسرا تاجدار تھا) اسی قوت سے کام لے کر عیسائیوں پر عظیم الشان فتوحات حاصل کی تھیں"۔

ان حالات میں ابنِ رشد نے فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ ارسطو اُس —— کا اُستادِ دنیا جس کی کتابوں کی اُس نے شرحیں لکھیں۔ اُس نے متعدد مسائل کی جو جمہورِ اسلام کے خلاف تھے حمایت کی۔ مثلاً یہ کہ افلاک ازلی ہیں جن کو خُدا نے پیدا نہیں کیا بلکہ خُدا صرف اُن کی حرکت کا خالق ہے۔ وُہ حشر اور سزا و جزا کا بھی مُنکر تھا اور کہتا تھا کہ افراد کی رُوحیں فانی ہیں جن کا روزِ حشر میں دوبارہ زندہ ہونا امرِ محال ہے۔ اُس نے اسلامی عقائد کی ارسطو کے فلسفہ کی روشنی میں تشریح کی اور کہا اُن کی تشریح ہی صحیح اسلامی عقائد ہیں کیونکہ وُہ ارسطُو کے موافق ہیں۔ اُس نے اشاعرہ مذہب کے عقائد کو باطل قرار دے دیا اور ثابت کیا کہ وُہ عقل و نقل کے خلاف ہیں۔ یہ سب کچھ اُس نے ایک ایسے مُلک میں کہا جہاں فلسفہ کا مطالعہ کُفر تھا اور عامتہ المسلمین ہر صاحبِ علم کو نہایت بیباکی سے بغیر حکومت کی مداخلت کے خود ہی قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ بھی خیر ہُوئی کہ ابنِ رشد اُسی وقت قتل نہ کیا گیا۔ بڑھاپے میں وُہ اپنے وطن قرطبہ سے شہر بدر کر دیا گیا۔ قُدرت کو منظور تھا کہ ابنِ رشد کی بدولت ارسطو کا فلسفہ صحت کے ساتھ سمجھا

جاتے اور وُہ یہ کام ختم کرکے رحلت کر گیا۔ لیکن مُسلمانوں نے نہ تو اُس کی قدر و منزلت کی اور نہ اُس کے نام کا ذکر تک اپنی کتابوں میں کیا۔ چنانچہ ابن خلکان اور جمال الدین قفطی اپنی تصنیفات میں ابن رشد کا نام بھی نہیں لیتے۔ حالانکہ قفطی نے ابنِ رشد کی وفات کے ایک مُدّت بعد اپنی تاریخِ حکما مرتب کی تھی جس میں اُس نے اندلس کے بُہت سے گمنام فلسفیوں کا ذکر کیا ہے۔

لیکن ابنِ رشد کا نام صدیوں تک یورپ کی علمی ترقی کا علَم بردار رہا۔ ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے اُس کی کتابوں کا اچھا خاصا حصّہ جمع کر رکھا تھا۔ یہودی فضلاء میں سے اکثر نے عربی زبان میں کتابیں تصنیف کی تھیں اور بعض نے عربی کتابوں کا عبرانی میں ترجمہ کیا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ انہی فضلاء کی بدولت مُسلمان مُصنّفوں کی اکثر فلسفیانہ تصانیف اَب تک باقی ہیں۔ اس زمانہ کے یہودی علماء میں مُوسیٰ ابنِ میمون (از ۱۱۳۵ء تا ۱۲۰۴ء) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے ارسطو کی تصانیف اور توراۃ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن متعصب مُسلمانوں کے تشدّد سے تنگ آ کر یہود مسیحی مُلکوں میں خاص کر جنوبی فرانس میں بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئے۔ جب وُہ اندلس سے ہجرت کر گئے تو وُہ یہ علمی ذخیرہ بھی اپنے ہمراہ یورپ کے ممالک میں لے گئے۔ اُس کی تصنیفات نے ممالکِ یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا جو ایک عرصہ سے عقلی جمود میں پھنسے ہُوئے تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں جہاں مُسلمان امام غزالی اور ابن رشد کی کتابوں سے علانیہ نفرت کرتے تھے وہاں مغرب کے مسیحی ممالک خوابِ گراں سے جاگ کر اور تعصب و تقلید کا لباس اُتار کر ابن رشد کے فلسفہ سے فیضیاب ہونے لگے۔ ان آزاد خیال تعلیم یافتہ اشخاص کے علاوہ فرانس اور اُس کے آس پاس کے مُلکوں میں جو یہودی فضلاء کثرت سے آباد تھے وُہ عربی فلسفہ کی کتابوں کا

عبرانی میں ترجمہ کرنے لگے۔ اُن کی دیکھا دیکھی عیسائیوں کو بھی ہوش آئی اور اُنہوں نے عربی تصنیفات کو بارھویں اور تیرھویں صدی مسیحی میں لاطینی میں ترجمہ کیا۔ پالرمو (جنوبی اطالیہ) میں قیصر فریڈرک ثانی کے دربار میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ عربی علوم کی تحصیل کی جاتی تھی تاکہ لاطینی جاننے والے اُن سے واقف ہو جائیں۔ قیصر اور اُس کے بیٹے مین فریڈ نے بولونا اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں کُتبِ فلسفہ کے ترجمے بھیجے۔ ان ترجموں میں سے بعض براہِ راست یونانی سے اور بعض عربی سے کئے گئے تھے۔

لیکن ترجموں کا اس سے کہیں زیادہ اہم کام ہسپانیہ میں کیا گیا۔ عیسائیوں نے طلیطلہ کو فتح کر لیا تھا۔ یہاں کی مسجد کے عظیم الشان کُتب خانے کی شُہرت شمالی مسیحی مُلکوں میں دُور دُور پھیل گئی تھی۔ یہاں عیسائی۔ عرب مسیحی اور یہودی مختلف مُلکوں سے ترجمہ کا کام کرنے کے لئے آتے تھے۔ اہلِ یہود کے ترجموں نے اس کام میں بڑی مدد کی اور چودھویں صدی عیسوی میں ابن سینا کی کتابوں اور زیادہ تر ابنِ رشد کی تصنیفات کا ترجمہ کیا گیا۔ مغربی ممالک میں پندرھویں صدی میں ابن رشد کے عرُوج کا آفتاب نصف النہار تھا اور فلسفہ و حکمت کا ہر طالب علم اُس کی کُتب کو اپنے حکیمانہ اقوال کا قبلہ نما بنائے ہُوئے تھا۔ بالخصُوص پیرس۔ اوکسفورڈ اور شمالی اطالیہ کے علما کے خیالات پر اُس کی فلسفیانہ کُتب نے ایسا اثر کیا کہ مغربی فلسفہ کی کایا پلٹ گئی۔ اور مسیحی دینیات اور الٰہیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔

پس مشرق کلیساؤں کے علما اور فضلا کی ادبی کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بصرہ۔ کُوفہ۔ بغداد۔ قاہرہ وغیرہ شہر جن میں اسلام کی آمد کے بعد صرف مذہبی ادارے ہی تھے وُہ ماموں کے عہد میں علم و فضل کا مرکز بن گئے جہاں

سے آفتابِ علم کی روشنی، اندلس کے تنگ و تاریک جگہوں میں جا پہنچی اور وہاں سے فرانس۔ انگلستان۔ اٹلی اور دیگر ممالکِ یورپ کو روشن کرتی چلی گئی پندرھویں صدی کے نصف میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو بازنطائن سلطنت کی شکست ممالکِ یورپ کے لئے ایک نئی دُنیا کی تخلیق کا باعث بنی۔ اس سلطنت کے بے خانماں راہب، پادری اور مسیحی فاضل اپنی کتابوں کو لے کر یورپ کے ممالک میں ہجرت کر گئے۔ اِن ممالک میں اُن کے قیمتی جواہر پاروں کا ترجمہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عراق وعجم کے نسطوری مسیحی فضلاء کے علم و فضل کی روشنی سے یورپ جگمگا اُٹھا اور اس برِاعظم کے مُلکوں اور لوگوں کے خیالات اور زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ مسیحی کلیسیا کے دینی مسائل ایک نئے نقطۂ نگاہ سے دیکھے جانے لگے اور مسیحی طرزِ مناظرہ کا رُخ بدل گیا۔

(۹)

اِس باب کے مطالعہ سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام کی اشاعت کے لئے اہلِ اسلام تلوار ہی واحد ہتھیار استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ میدانِ مناظرہ میں آ کر دلیرانہ مسیحی فضلاء کو للکارتے تھے۔ مغربی ممالک میں بھی یہ احساس پیدا ہوتے رہا کہ مُسلمانوں میں مسیحیت کی اشاعت کا ذریعہ صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں۔ چنانچہ روجر بیکن کہتا تھا کہ صلیبی جنگیں صرف وقت، زر اور انسانوں کی زندگیوں کو ضائع کرتی ہیں مُسلمانوں کو دلیل و بُرہان سے قائل کرنا چاہیئے۔ مسیحی فاضل ٹامس ایکیوینس (Thomas Aquinas) کا بھی یہی کہنا تھا۔ پس پوپ ہنوریئس چہارم (Honorius IV) (سِن وفات ۱۲۸۷ء) کے کہتے سُنتے سے چودھویں صدی کے شروع میں مغرب کی چند یونیورسٹیوں نے اہلِ اسلام میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے مبلغین تیار کرنے

شروع کئے۔ مُسلمانوں کو مسیحیت کی صداقت کے قائل کرنے کے لئے کتابیں بھی لکھی گئیں۔ فرانسِسکی اور ڈومِنکی جیسے اور راہب تیرھویں۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اِس بات کے کوشاں تھے کہ غیر مسیحیوں میں اور بالخصوص اہلِ اسلام میں مسیحیت کی تبلیغ ہو اور وُہ مسیحی تعلیم و عقائد کی اشاعت کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ یہ دونوں مذہبی سلسلے اور حلقے ریاضت کشی کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ تیرھویں صدی میں (جب یہ دونوں حلقے شروع ہُوئے) مغربی ممالک میں یونیورسٹیاں بھی قائم ہو گئیں عالیشان گرجے تعمیر ہُوئے اور کلیسیا کی کوششوں کی وجہ سے ان ممالک میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ جن ایشیائی ممالک کے ساتھ مغربی تاجر تجارت کرتے تھے وہاں فرانسِسکی اور ڈومِنکی مبلغین بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ اسیسی کا فرانسِس (Francis of Assisi) خود تین دفعہ گیا تاکہ اہلِ اسلام کو مسیحی نجات کا پیغام سُنائے۔ وُہ ۱۲۱۹ء میں مصر گیا اور وہاں انجیل کا جانفزا مژدہ سُنایا۔ بعض فرانسِسکی مُلکِ شام اور افریقہ کے مختلف مُلکوں میں گئے۔ پادری ڈومِنک نے اپنے سلسلہ کو تاکید کی کہ انجیلِ مُقدس کی تبلیغ ہر قوم میں کی جائے۔ تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے مغربی مبلغین میں سب سے زیادہ قابل اور جوشیلا مبلغ ریمنڈ لل (Raymond Lull) تھا جو ۱۲۳۲ء میں پیدا ہُوا تھا۔ وُہ ایک صُوفی منش عالم تھا جس نے اکتیس سال کی عمر میں اپنے آپ کو منجی مسیح کی خدمت کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اُس کے دل میں مُسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا زبردست جذبہ تھا۔ اس مقصد کی خاطر اُس نے عربی زبان سیکھی اور مبلغوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اُس نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں تاکہ مُسلمان مسیحیت کو قبول کریں۔ وُہ دُور دراز ممالک میں بھی گیا

تاکہ ہر جگہ ایسے مبلغ تیار کئے جائیں جو اہلِ اسلام میں خداوند کی نجات کا پیغام پہنچا سکیں۔ وُہ خود بھی ممالک اسلام میں گیا۔ اُس نے ٹیونس میں مسلمان علماء سے مناظرے کئے اور وہاں قید کر لیا گیا۔ جب وُہ واپس اپنے مُلک کو بھیجا جا رہا تھا تو اُس پر ڈنڈوں اور پتھروں کی بارش کی گئی لیکن اس جوان ہمت بہ سال کے جوش کو کوئی چیز دبا نہ سکی۔ وُہ پچھتر سال کی عُمر میں افریقہ میں الجزائر کے غریب تبلیغ کے لئے گیا جہاں وُہ دُوسری دفعہ قید کر لیا گیا اور واپس بھیجا گیا۔ جب وُہ اسّی برس سے زائد عُمر کا تھا وُہ پھر ٹیونس گیا جہاں اُس کی تبلیغی مساعی حسبِ معمول بار آور ہُوئیں اور متعدد آدمی مُنجی جہان کے قدموں میں آگئے۔ ۱۳۱۶ء میں اُس کو سنگسار کر دیا گیا اور اس نے اپنی رُوح اپنے مُنجی کے سپُرد کر دی۔

(۱۰)

مشرقی کلیسیا کی بابت میں مسیحیوں اور مُسلمانوں میں باوجُود قانُونی پابندیوں اور دیگر رکاوٹوں کے تبادلۂ خیالات اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہا اور خلافتِ عثمانیہ یعنی عثمانی ترکوں کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس حقیقت کی شہادت ہم کو مشہُور و معرُوف کتاب "اثمارِ شیریں"، سے ملتی ہے جس کا اُردُو میں ترجمہ موجُود ہے اور پنجاب رلیجس بُک سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور سے سستے داموں مل سکتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نہ صرف اُن اعتراضات اور جوابات کا پتہ چلتا ہے جو جانبین مباحثہ میں ایک دُوسرے پر کرتے تھے بلکہ اُن مصائب و مُشکلات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے جو ایک سچے حق کی تلاش کرنے والے کو اسلامی مُلک میں اُٹھانی پڑتی تھیں۔ کتاب کے ناظر پر یہ

بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ شریعتِ ارتداد کے قوانین کے نفاذ کی وجہ سے حق کے متلاشی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اور اس پر یہ بھید بھی کُھل جاتا ہے کہ اسلامی سلطنت میں کیوں وُہ مُسلمان جو خلوصِ دِل سے اسلام اور اسلامی عقائد کو نہیں مانتے تھے منافقانہ رویہ اختیار کر کے باطن میں مسیح اور مسیحیت کے قائل لیکن بظاہر حلقۂ اسلام میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ جو شخص خُود اس راہِ پُرخار بلکہ منزلِ ہفتخواں سے نہیں گزرا وُہ ان باتوں کو قیاس میں بھی نہیں لا سکتا جن کا سامنا متلاشیانِ حق کو اسلامی حکُومتوں میں کرنا پڑتا ہے ✤

باب ہفتم

وسط ایشیا کے منگولی قبائل اور مسیحیت و اسلام کا تصادم

فصل اوّل۔ وسط ایشیا میں مسیحیت کی اشاعت

وسط ایشیا میں ایک بڑا اور وسیع علاقہ ہے جو ایران کے شمال اور کیسپیئن کے مشرق اور دریائے اُوکسس کے مشرق و مغرب کی جانب واقع ہے۔ اس علاقہ میں چوتھی صدی سے پہلے مسیحیت دُور دُور پھیلی ہُوئی تھی۔ یہاں مسیحی نجات کا پیغام اُن لوگوں نے دیا تھا جو ساسانی شہنشاہوں کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر اُن علاقوں میں آ پناہ گزین ہُوئے تھے نسطوریوں کا پیٹریارک پہلے سلوکیہ ٹیسیفون میں اور پھر بغداد میں سکونت رکھتا تھا۔ اور یہ دونوں شہر مشرق و مغرب کی تجارت کے راستوں میں نکڑ کے شہر تھے نسطوری مسیحی ان تجارتی راستوں سے وسط ایشیا۔ ہندوستان اور چین وغیرہ ممالک میں جاتے تھے نسطوری مبلغین بھی انہی راستوں سے ان ممالک کو جاتے تھے۔ یُوں ان کا واسطہ ترقی یافتہ مذاہب مثلاً زرتشتی مذہب، ہندُو مت، بُدھ مت اور کنفیوشیش کے مذہب سے پڑا۔ وسط ایشیا کے قبائل کو بُدھ مت والے اور مسیحی دونوں اپنے اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ مسیحی سوداگر اور طبیب بھی انجیل جلیل کی تبلیغ میں کوششیں کرتے تھے۔ جنگوں کے زمانہ میں بھی یہ مسیحی سوداگر ایک جگہ

Rev Michael Joseph. Cell # 92 300 7233 854.
yscaljesus@gmail.com ycsmicheal@yahoo.co.uk
Evenglist Yousaf Masih. Cell # 92 300 7233 853.



مونگولی سلطنت
کوہ یورال
کوہ التائی
صحرائے گرگز
قپچاق
منگول
صحرائے گوبی
منچوریا
خطان
پیکن
بحر زرد
چین
سنگ
ہشی ہشیا
قبیلہ کریت
قرا قرم
قبیلہ اویغر
قرا خطائی
کاشغر
ترکستان
تبت
کوہ ہمالیہ
دہلی
ہندوستان
برما
خلیج بنگال
بحر عرب
عرب
سلطنت
خراسان
افغانستان
خوارزم
سیستان
مرو
ہرات
بغداد
فارس
شام
پیمانہ بحساب میل
0
500
1000

سے دُوسری جگہ تجارت کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے اور ہر کس و ناکس کو انجیل
کا پیغام بھی سُناتے تھے نسطوری مسیحی ان اقوام کے باشندوں میں طبابت
کا کام بھی کرتے تھے اور شفا کے ذریعہ اُن کو حقیقی شفا دینے والے کی خوشخبری
دیا کرتے تھے جس طرح نسطوری مبلغین نے ایران کی پہلوی زبان کی تکمیل کی
تھی اب اُنہوں نے وسط ایشیا کی بربری اقوام کے لئے حروفِ تہجی ایجاد کئے
جن کی بنا عِ قدرتی طور پر سریانی تھی۔ جب شہنشاہانِ ایران نے مسیحیت کی
بیخکنی کرنے کے لئے ایذا رسانیاں شروع کیں تب نسطوری کلیسیا کے شُرکا
مختلف ممالک میں پراگندہ ہوگئے اور ابتدائی کلیسیا کی طرح (اعمال ۸ باب)
جہاں بھی گئے مسیحی نجات کی منادی کرتے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ راحت افزا
پیغام ٹرانس اوکسینیا۔ سمرقند۔ بخارا۔ فرغانہ۔ بلخ۔ طوس اور بکٹیریا کے
دیگر مقاموں میں پھیل گیا۔ مسیحیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ کلیسیائیں
اس قدر ترقی کر گئیں کہ سلوکیہ کے پیٹریارک نے جب ۴۲۴ء میں اپنی کونسل
منعقد کی تو اُس میں ہرے۔ اصفہان۔ ہرات۔ مرو وغیرہ مقاموں کے بشپ
موجود تھے۔ چوتھی صدی میں مرو اور ہرات نسطوری اُسقفوں کے صدر مقام
تھے لیکن پانچویں صدی سے گیارھویں صدی تک وہ ایک میٹروپولٹین کے
صدر مقام ہو گئے۔ گیارھویں صدی میں سمرقند میٹروپولیٹن کا صدر مقام ہو
گیا۔ پانچویں صدی کے آخر میں ترکوں میں اور ہُن اقوام میں کلیسیائیں
اس قدر ترقی کر گئیں کہ پیٹریارک نے ۵۴۹ء میں ہُن اقوام کے
لئے ایک الگ بشپ مقرر کر دیا جس کا علاقہ دریائے اوکسس کی دونوں طرف
تھا۔ نسطوری پیٹریارک ٹموتھی نے ۷۸۱ء میں ترکوں کی ایک قوم کے سردار
کے لئے ایک میٹروپولیٹن مقرر کیا۔ اسی پیٹریارک نے کیسپین کے جنوبی اور

Rev Michael Joseph. Cell # 92 300 7233 854.
yscaliesus@gmail.com yesmicheal@yahoo.co.uk
Evenglist Yousaf Masih. Cell # 92 300 7233 853.

مشرقی علاقوں کی کلیسیاؤں کے لئے بشپ بھیجے۔ اس نے کیسپئین کے علاقہ کے شہر موکان کے لئے ایک اور بشپ کی تقدیس کی اور مسیحی عالمین کے پیرو اس قدر بڑھ گئے کہ کیسپئین کے علاقہ میں اور چینی ترکستان (سن کیانگ) میں مسیحی مذہب ایک غالب مذہب ہو گیا۔ لیکن جب آٹھویں صدی میں اسلامی افواج یہاں آئیں تو یہ ترقی رُک گئی۔ جھیل بالکش کے جنوبی علاقوں کی صدہا قبروں کے کتبے ثابت کرتے ہیں کہ ان علاقوں میں مسیحیوں کی ایک بڑی اکثریت آباد تھی۔ چنانچہ البیرونی (جو دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی کے پہلے نصف میں تھا) ہم کو بتلاتا ہے کہ اوکسس کے جنوب کی آبادی میں نسطوری مسیحیوں کی اکثریت تھی جس سے ظاہر ہے کہ چنگیز خاں کے زمانہ سے دو صدیاں پہلے مسیحی کلیسیائیں کثرت سے ان تمام مقامات میں آباد تھیں۔ غیر ہندی مسلمان مؤرخوں کی کتابوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دسویں صدی کے اواخر میں سمرقند کے گرد و نواح میں کلیسیائیں بستی تھیں۔ تاشقند کی سرحدوں پر مسیحی بڑی تعداد میں ہجرت کر کے آ بسے تھے۔ "غز" کے قبیلہ کے سلجوق کا بیٹا مائیکل مسیحی تھا۔ یہ وہی سلجوق تھا جو سلجوقی ترکوں کا جدِ امجد تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسیحیت کرغز کے لق و دق بیابان میں اُس زمانہ میں موجود تھی جب یہ قبیلہ ابھی جنوب کی جانب بخارا کو نہیں گیا تھا جہاں اس قبیلہ نے اسلام اختیار کر لیا۔

کریت کا مسیحی قبیلہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ قبیلہ منگولیا کے شمال کی طرف جھیل بیکال کے جنوب میں رہتا تھا۔ سنہ ۱۰۰۷ء کے قریب خراسان کے شہر مرو کا میٹروپولیٹن عبدیشوع نے اپنے کیتھولی کوس کو لکھا کہ "کریت کا سردار شکار کھیلتا اپنا راہ گم کر

بیٹھا۔ جب وہ اپنی جان سے مایوس ہو گیا تو اُس نے رویا میں دیکھا کہ ایک مقدس اُس کو کہتا ہے کہ اگر تُو مسیحی ہو جائے تو مَیں تجھ کو راہ دکھا دُونگا۔ تب اس نے اُس بزرگ سے وعدہ کیا۔ پھر اُس نے ایک راستہ دیکھا جس پر چل کر وہ صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ گیا۔ تب اُس نے مسیحی تاجروں کو طلب کیا اور اُن سے مسیحی تعلیم اور اصول و عقائد کی نسبت سوال کئے۔ تاجروں نے اُس کو انجیل کی ایک جلد دی۔ اب سردار قبیلہ نے مجھ کو بلا بھیجا ہے تاکہ اُس کو بپتسمہ دُوں۔ اُس کے قبیلہ کے دو لاکھ افراد اُس کے ساتھ بپتسمہ لینا چاہتے ہیں"۔ کیتھولی کوس نے اُس کو لکھا کہ اس قبیلہ کے پاس ایک قسیس اور ایک شماس قربان گاہ سمیت بھیج دو اور اُن کو تعلیم دے کر مسیحی جماعت کے قدموں میں لے آؤ۔ اس خط و کتابت سے ظاہر ہے کہ اُن دنوں مسیحی مبلغین کے علاوہ مسیحی تاجر اور کلیسیا کے عام ممبر بھی اپنے منجی کا جانفزا پیغام اسلامی حکومت کے باہر خلقِ خدا کو ہر ملک اور قوم و نسل میں ہر جگہ دیا کرتے تھے۔ یہ خط و کتابت اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ دسویں اور گیارھویں صدی میں خلفائے عباسیہ کے عہد میں نسطوری مسیحی کلیسیا کی حالت ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ کیتھولی کوس دو لاکھ لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے صرف دو خادمانِ دین ہی بھیج سکا۔ اس سے ہم اس کلیسیا کے قسیسوں اور شماسوں کی تعداد کی کمی کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ قبیلہ صدیوں تک نسطوری کلیسیا کا حصین قلعہ رہا!!

چنانچہ مسلمان مؤرخ رشید الدین کہتا ہے کہ "کریت قبیلہ کے سردار اُن پر حکومت کیا کرتے تھے اور اُن سب کا مذہب مسیحی تھا"۔ کریت قبیلہ کے علاقوں میں اور اُن کے نواحی میں جو چین کا کنسو صوبہ ہے، کثرت سے مسیحی کلیسیائیں بستی تھیں اور سب نسطوری کلیسیائیں مسیحیت کا گڑھ تھیں۔ بارھویں اور

تیرھویں صدی میں چین کی شمال مغربی حد حد پر مسیحی کلیسیائیں بڑا اقتدار رکھتی تھیں۔

آٹھویں صدی کے دوسرے نصف میں ترکوں کا اُوگر قبیلہ مسیحی تھا اور تمام مشرقی ایشیا کے قبائل میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس کا دارالسلطنت کراکرم تھا۔ اُوگر قبیلہ کے مسیحی ترک کتاب مقدس کی تلاوت سریانی زبان میں کیا کرتے تھے۔ ان کی مذہبی عبادتوں اور مجلسوں میں کتب مقدسہ کا سریانی سے ترکی میں زبانی ترجمہ کیا جاتا تھا تاکہ ہر شخص اُن کو سمجھ سکے۔ وہ خیموں میں رہتے تھے اور تعداد میں تقریباً تین لاکھ تھے جو سب کے سب مسیحی تھے۔ اس قبیلہ کی تاریخ خود اُوگر قبیلہ کے مسیحیوں نے لکھی ہے۔ ان مؤرخوں میں ایک کا نام ربّن یار کوما تھا جو خان بلیق (پیکن) میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہیں کے میٹروپولیٹن مار جارج نے اُس کو قسیس کے عہدہ پر مقرر کیا تھا۔ ایک اور مؤرخ مرقس بن بنی ایل تھا جو ۱۲۴۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو مار جارج کے جانشین نے ۱۲۷۸ء میں قسیس بنایا تھا۔ بعد کے زمانہ میں یہ قسیس مرقس ۱۲۸۱ء میں پیٹریارک کے عہدہ پر ممتاز ہوا اور اس نے اپنا نام یحبت اللہ سوم رکھا۔

مذکورہ بالا قبائل کے علاوہ نسطوری مبلغین نے نیمن قبیلہ کے تمام لوگوں کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کر لیا۔ یہ قبیلہ نو (۹) ترکی تاتاری قبائل پر مشتمل تھا جو سب مسیحی تھے اور سردار قبیلہ بھی مسیحی تھا۔ ایرانی مصنف ان کو "ترسا" کہتے ہیں۔ قبیلہ مرکت کی ایک بڑی تعداد مسیحی تھی۔ اگرچہ وہ نسل کے ترک تھے لیکن اُن کی رگوں میں منگولی خون تھا۔ ایک اور قبیلہ اُرین گلت تھا جو تقریباً تمام کا تمام مسیحی تھا۔ ۱۲۹۰ء میں اُن کی ملکہ

مسیحی مذہب کی پیرو تھی۔ ایک اور قبیلہ کتگلی تھا جس کی ایک بڑی تعداد مسیحی تھی۔ اس وقت تک مسیحیت تقریباً تمام ترکستان میں پھیل چکی تھی۔

ایک اور قبیلہ کِتائی تھا جس کے سردار بحرِ کیسپین سے صحرائے گوبی تک حکمران تھے۔ اس کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد مسیحی تھی۔ یہ قبیلہ بڑا مہذب تھا۔ جب وہ کسی شہر کو فتح کر لیتے تھے وہ لوگوں کو نہ تو قتل کرتے تھے اور نہ لوٹ مار کرتے تھے بلکہ اُن سے خراج وصول کیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے زیرِ حکومت تمام مذاہب کو آزادی حاصل تھی۔ اس کی وسیع حکومت میں مسیحیت کی بڑی اشاعت ہوئی ایسا کہ پیٹریارک الیاس دوم (دور ۱۱۷۶ء تا ۱۱۹۰ء) کو کاشغر میں ایک میٹروپولیٹن مقرر کرنے کی ضرورت پڑی۔ اس قبیلہ کے آخری سردار کی ملکہ بھی مسیحی مذہب رکھتی تھی۔

اُن ایام میں وسطِ ایشیا کے بیسیوں شہروں اور بڑے قصبوں میں بے شمار مسیحی رہتے تھے جو صاحبِ رسوخ و جاہ تھے۔ تنگت کے شہر میں مسیحیوں کی ایک زبردست تعداد رہتی تھی اور یہاں کی کلیسیا ایسی با اقتدار تھی کہ اس جگہ کے میٹروپولیٹن نے پیٹریارک یحبت اللہ سوم کی تقدیس کے وقت اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ مشرقی ترکستان میں کاشغر کا شہر بڑا مشہور تھا اور اس علاقہ میں کئی سو گرجے کھڑے تھے جہاں منگولی مسیحی اپنی زبان میں زبور اور مسیحی گیت گاتے تھے۔ اس صوبہ کے بڑے اور مشہور شہروں کے علاوہ دو سو چھتیس ۲۳۶ شہروں اور قصبوں میں نسطوری مبلغین مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے۔ ان چھوٹے شہروں میں مسیحی بکثرت بستے تھے۔

ہم نے مختصر طور پر چند ایک قبائل کا ذکر کرنے پر اکتفا کی ہے اُن کے

علاوہ دیگر بیسیوں قبائل تھے جن کو نسطوری مبلغین مسیح خداوند کے قدموں میں لائے تھے۔

یورپین سیاحوں کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے کہ تیرھویں صدی میں مشرقی ترکستان اور چین کے مختلف شہروں اور مقاموں میں بہت مسیحی آباد تھے۔ کارا خطائی کے ایک قبیلہ نیمین کا سردار بھی مسیحی تھا جو مغرب کی کلیسیا میں پریسٹر جان (Prester John) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا تمام قبیلہ بھی مسیحی تھا جس کے بہت سے افراد کھوتان میں بستے تھے۔ یہ عیسائی مذہب کے معاملات میں اور انجیل کی تبلیغ میں بڑے جوشیلے تھے اور مذہبی مباحثے کر کے مسلمانوں کا ناک میں دم کر دیتے تھے اور ان کو کہتے تھے کہ یا تو تم مسیحی ہو جاؤ ورنہ چینی لباس پہنا کرو۔ یہ قبیلہ دریائے ارتش کے منبع کے قریب کوہستان التائی کے مشرق و مغرب کی جانب رہتا تھا۔ قبیلہ کے مسیحی سردار کا نام کوچولک تھا جو علم مناظرہ میں ایسا طاق تھا کہ وہ خود مسلمان علماء کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔

کیبنگ کے قریب ایک قصبہ کا نصف مسیحی تھا۔ نسطوری مسیحی اونگر کے قبیلہ کے مختلف شہروں میں کثرت سے بستے تھے۔ کراکورم اور اس کے گرد و نواح میں دو دو مسیحی کلیسیائیں موجود تھیں۔ چین کے پندرہ شہروں میں بھی مسیحی بکثرت آباد تھے۔ چنانچہ مارکو پولو ۱۲۷۵ء میں لکھتا ہے کہ نسطوری مسیحی سمرقند، کاشغر، یارقند میں اور چین تسی میں، جو تنگت کی حکومت میں ہے اور منچوریا میں، اور کوریا کی سرحدوں پر آباد تھے۔ اس نے نسطوری مسیحیوں سے برما کے سرحدی صوبہ یون نان میں اور دریائے ینگسی کے کنارے کے شہر چن کیانگ فو میں ملاقات کی۔

ہم سطور بالا میں ذکر کر آئے ہیں کہ نسطوری پیٹریارک نے ۷۸۱ء میں ترک قبائل کے لئے ایک میٹرو پولیٹن مقرر کیا تھا۔ اسی سال اس نے ایک خط میں لکھا کہ وہ تبت کے مسیحیوں کے لئے بھی ایک میٹرو پالیٹن مقرر کر رہا ہے اور کہ چین کا میٹرو پولیٹن وفات پا گیا ہے۔ مرگہ کا تھامس ہم کو بتلاتا ہے کہ اس جوشیلے پیٹریارک نے اسی آسامیاں ایسے چن رکھے تھے جو بشپوں کے عہدے پر فوراً مقرر کئے جا سکتے تھے۔ وہ اس تعداد میں سے چھ یا آٹھ کو چن چن کر مشرقی بعید کے ممالک میں بشپ بنا کر ان کو بھیجا کرتا تھا۔

افغانستان اور بلوچستان میں اور ان ممالک کے قرب و جوار میں اس قدر مسیحی کلیسیائیں آباد تھیں کہ ان کے لئے بھی نسطوری کلیسیا بشپ مقرر کیا کرتی تھی۔ قدیم زمانہ ہی سے اس راہ سے مسیحی مبلغین اور بشپ شمالی مغربی ہندوستان میں داخل ہوا کرتے تھے۔

نسطوری کلیسیا کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلیسیا کی بہترین تبلیغی مساعی کا زریں زمانہ چوتھی صدی کے آخر سے لے کر نویں صدی کے آخر تک کا ہے۔ گو منگولیا، چین اور سائبیریا میں مسیحیت کی تبلیغ کا زریں زمانہ اس کے بعد کا ہے جو تیرھویں صدی تک رہا۔ چنانچہ مؤرخ نیل لکھتا ہے۔ "ایڈیسہ کے بڑے مدرسہ اور ایران کی خانقاہوں اور مدرسوں سے اور بالخصوص ارباب کے مدرسے سے مسیحیت کے علمبردار بے شمار نکلے۔ انہوں نے تاتاریوں میں خیمے نصب کئے۔ تبت کے لاما ان مبلغین کے پیغام سے خائف و ترساں ہو گئے۔ پنجاب کے دانوں کے کھیتوں میں کھڑے ہو کر انجیل کی خوشخبری دیتے تھے۔ بحر آرال کے ماہی گیروں کو وہ مسیحی تعلیم دینے میں مشغول تھے۔ منگولیا کے لق و دق صحراؤں میں انہوں نے جا سر نکالا۔

اور وہاں سے چین کو اپنے خداوند کے لئے فتح کر لیا۔ ہندوستان میں زمین ان کے روحانی اقتدار کا قائل تھا۔ اُنہوں نے نڈر ہو کر بُت پرستوں اور آتش پرستوں میں جا کر صلیب کی منادی کی۔ طفلس کی گرمی کی شدت اُن کی گرمئ رفتار میں سدِ راہ نہ ہو سکی کیونکہ اُن کے جوش کی گرمی موسم کی حدت سے بھی زیادہ گرم تھی۔ اُنہوں نے براعظم یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں صلیب کا جھنڈا جا گاڑا۔ اور اراراط کے پہاڑ کی چوٹیوں پر مسیحی کلیسیائیں قائم کر دیں۔[1]

یہ ممالک نسطوری پیٹریارک کے صدر مقام سے اس قدر دور و دراز واقع ہوئے تھے اور رسل و رسائل کے ذرائع اس قدر محدود تھے کہ پیٹریارک نے بالآخر فیصلہ کیا کہ ان ممالک کے میٹروپولیٹن نسطوری کلیسیا کی جنرل کونسلوں میں آنے کی زحمت نہ اٹھایا کریں بلکہ چھ سالوں میں ایک دفعہ اپنے اسقفی علاقوں کی رپورٹیں صدر مقام بھیج دیا کریں۔ ان ممالک میں اب مسیحی کلیسیائیں اس کثرت سے تھیں کہ نسطوری میٹروپولیٹینوں میں چین کے میٹروپولیٹن کا درجہ چودھواں اور ہندوستان کے میٹروپولیٹن کا درجہ پندرھواں تھا۔ سمرقند کے میٹروپولیٹن کا درجہ اکیسواں اور ترکوں کے میٹروپولیٹن کا بائیسواں۔ پیکن یعنی خان بلیق کے میٹروپولیٹن کا پچیسواں، تنگت کے میٹروپولیٹن کا چھبیسواں اور کاشغر کے میٹروپولیٹن کا درجہ ستائیسواں تھا۔ ہر میٹروپولیٹن کے ماتحت نصف درجن سے ایک درجن بشپ ہوتے تھے۔ اس اعداد و شمار سے ہم نسطوری کلیسیا کی تبلیغی مساعی کی کامیابی کا کچھ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

[1] History of the Holy Eastern Church- Vol. I P.3. (Neale)

(۲)

مسیحیت کو اختیار کرنے سے پہلے ان مونگولی قبائل کا کیا مذہب تھا؟ اِس سوال کا جواب ہم کو کسی مسیحی مبلغ یا سیاح کی تصنیفات میں نہیں ملتا۔ قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبائل ایک معبود کی پرستش کرتے تھے جس کا نام "منتنگری" تھا۔ یہ دیوتا انسانی صفات رکھتا تھا۔ مونگولی قبائل اس کے خلوص دل سے قائل تھے۔ چنانچہ گو مسلمان چنگیز خاں کے جانی دشمن تھے لیکن وہ اس کے قلبی ایمان کے خلوص پر تعجب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ دیوتا اُس کے تمام خیالات کا محور تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دیوتا کا نہ تو کوئی بُت تھا اور نہ کوئی مندر۔ اِس کے آگے قربانیاں بھی چڑھائی نہیں جاتی تھیں۔ پس ان قبائل کے نہ کوئی پروہت تھے اور نہ پجاری تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس معبود کی عبادت جماعتی طور پر بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اور کہ یہ معبود قبیلہ کے ہر فرد کا معبود خیال کیا جاتا تھا۔

ان قبائل کے کوئی مخصوص عقائد بھی نہ تھے پس وُہ مذہبی معاملات میں رواداری سے کام لیتے تھے۔ مسیحی اور مسلمان مصنفین کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ان قبائل کی مذہبی رواداری کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں مذاہب کے پیرو صرف اپنے مذہب کو برحق اور دیگر تمام مذاہب کو باطل مانتے تھے۔ ایسے مذہب کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے پیرؤں کو دیگر مذاہب کے اختیار کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں ہوتا۔ ہم سطورِ بالا میں ذکر کر آئے ہیں کہ بدھ مت اور مسیحیت دونوں اِس کوشش میں تھے کہ یہ قبائل اُن کا مذہب اختیار کر لیں۔ جب اسلام اِن قبائل میں آیا تو دو کی بجائے تین مذہب ان قبائل میں اپنی اشاعت کرنے کی کوشش

میں ہو گئے۔

ہم اسی فصل میں بتلا چکے ہیں کہ ان قبائل میں سے بعض نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب اسلام آیا تو بعض قبائل نے اسلام اختیار کر لیا اور بعض بدھ مت کے پیرو تھے۔ لیکن ان کی مذہبی رواداری کے باوجود جنگوں کے زمانہ میں منگولی قبائل بغیر کسی تامل کے گرجاؤں مسجدوں اور مندروں کو تباہ و برباد کر دیتے تھے اور ان کے پاک مقامات کو بے حرمت کرتے تھے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ ان کی طبیعت کی افتاد تھی۔ وہ ہر شے کو جو ان کی راہ میں حائل ہوتی تھی بے دریغ برباد کر دیتے تھے اس کی تفصیل ہم آگے چل کر کرینگے۔

(۳)

یہ قبائل صحرائے گوبی کے شمال میں خانہ بدوشانہ حالت میں چراگاہوں اور پانی کی تلاش میں پھرا کرتے تھے۔ ان کا مشغلہ شکار تھا اور گوشت اور دودھ ان کی غذا تھی۔ وہ مویشی پالتے تھے اور چمڑے اور مویشی کی تجارت کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے برسر جنگ رہتے۔ چنگیز کی آمد سے پہلے ان قبائل کی یہ حالت تھی۔ چنگیز کی آمد نے ان قبائل کی کایا پلٹ دی۔

فصل دوم خانِ اعظم کا زمانہ

چنگیز خان (از ۱۱۶۲ء تا ۱۲۲۷ء) :-

بارھویں صدی کے آخر میں منگولی اچانک تاریخ افق پر نمودار ہوئے ان میں سب سے مشہور نام چنگیز خان کا ہے۔ اس شخص کا اصلی نام تیموجن تھا۔

جس کے معنی ہیں "خالص فولاد"۔ اس نے ۱۲۰۶ء میں اپنا نام "چنگیز" رکھ لیا۔ لفظ چنگیز کے معنی ہیں "قدرت والا"۔ اس کا دادا کابل خان قبیلہ یکہ کا سردار تھا جس کا علاقہ جھیل بیکال سے مشرق کی جانب موجودہ منچوریا کی سرحد خنگن پہاڑ تک تھا۔ چنگیز ابھی لڑکا ہی تھا جب اس کا باپ مر گیا پس اس کے سرداروں کی نظریں بدل گئیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک چھوکرا کس طرح بہادروں کی پیشوائی کر سکتا ہے، اور ان کو دشمن قبائل پر فتح دلوا سکتا ہے۔ سب چنگیز طغرل خان کے پاس گیا جو قبیلہ کرییت کا بھی سردار تھا، در نہایت نیک نہاد اور صلح پسند شخص تھا۔ جیسا ہم گذشتہ فصل میں بتلا چکے ہیں یہ زبردست ترک قبیلہ مسیحی تھا جو دیگر قبائل سے زیادہ تجارت کی طرف راغب تھا۔ طغرل نے کچھ مدت تک تو چنگیز کو بچایا لیکن مغرب کے تاتاری قبائل نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ تاتاری اور منگولی دو متضاد قبائل تھے تاتاریوں کا نام ان کے جدِ امجد تاتار کے نام پر پڑا تھا۔ چنگیز ایک شیر دل نوجوان تھا جس کی شجاعت، دانش اور جنگی قابلیت نے رفتہ رفتہ تمام منگولی قبائل کو رام کر کے اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا۔ ان جنگجو قبائل کو تحت میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ان میں باہمی خانہ جنگی صدیوں سے جاری تھی۔ ان کا شغل ہی یہ چلا آیا تھا کہ ایک دوسرے کی بیخکنی کرتے رہیں۔ چنگیز ان کو کہتا تھا کہ ہمارے بزرگ یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ مختلف دل ایک ہی پہلو میں نہیں رہ سکتے۔ میں تمام منگولی قبائل کو مطیع کر کے اس قول کو غلط ثابت کر دونگا۔ اس نے اویغر کے مسیحی قبیلہ پر فتح پائی اور ایک اویغر کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ بچوں کو اویغر زبان سکھلائے۔ یہ زبان ایک قسم کی سریانی زبان تھی جس کو نسطوری مبلغین نے ان میں جاری کیا تھا۔ چنگیز نے کرییت کے مسیحی قبیلہ کو جو جھیل بیکال کے جنوب میں

تھا فتح کر لیا اور قبیلہ کے سردار کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر لیا۔ چنگیز تمام مونگولی قبائل سے لڑتا رہا یہاں تک کہ ان جنگی مہموں نے تمام خانہ بدوش مونگولی قبائل کو اُس کے جھنڈے نیچے ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قبائل کی باہمی مخاصمت ختم ہو گئی اور سب مفتوح قبائل نے اس کو اپنا "خان" (شہنشاہ) منتخب کر لیا۔

چنگیز کی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ لفظ "مونگولی" کا اطلاق اُس کی رعیت کے ان تمام لوگوں پر ہونے لگا جو چینی ترکی نسل کے تھے۔ درحقیقت اُس زمانہ میں مونگولی تاتاریوں سے الگ تھے اور ان کا علاقہ بھی الگ تھا۔ تاریخ کے زمانہ کی ابتدا ہی سے یہ قبائل سائبیریا کے وسیع صحراؤں میں بود و باش رکھتے تھے۔ فرمانروایانِ چین نے انہی قبائل کے حملوں کی زد سے محفوظ رہنے کی خاطر ۲۲۱ سال قبل مسیح اپنی زبردست "دیوارِ چین" بنائی تھی۔ لیکن رشید الدین اپنی کتاب جامع التواریخ میں لکھتا ہے کہ یہی ترکی قبائل "تاتاری" کہلاتے تھے کیونکہ تمام ترکی قبائل میں تاتاری سب سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ مسلمان مؤرخ بغیر امتیاز کئے اس قوم کو "مغل" کہنے لگے جس طرح گذشتہ صدی میں ہندوستان میں یورپ کی تمام اقوام کو "فرنگی" کا نام دیا جاتا تھا۔ امیر خسرو تک ان کو کبھی ترک کہتا ہے، کبھی تاتاری اور کبھی مغل (قران السعدین)۔ بعض مسلمان مصنفین اُن صحرائی قبائل کو "ترک" کہتے ہیں جو بدوی زندگی کو ترک کر کے اور زراعت کا پیشہ اختیار کر کے شہروں میں رہنے لگے تھے۔ مثلاً ماوراء النہر اور ترکستان کے مونگولی جو چنگیز کے دوسرے بیٹے چغتائی کے ماتحت تھے وہ اپنے آپ کو "ترک" کہتے تھے اور دوسرے قبائل کو ازراہِ حقارت "مغل" بلاتے تھے حالانکہ دونوں

ایک ہی خون اور ایک ہی وطن کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تیمور اور بابر بادشاہ بھی اپنے لئے لفظ "مونگول" اور "مغل" پسند نہیں کرتے تھے۔ بابر اپنے آپ کو "ترک" کہتا تھا لیکن جہانگیر کے زمانہ میں لفظ "مغل" عام ہو گیا۔

چنگیز اُس زمانہ میں تھا جب اسلام کی طاقت مغربی ایشیا کے ممالک میں عروج پر تھی۔ خوارزم کی سلطنت کا سلطان محمد شاہ ایک زبردست فاتح تھا جس کی سلطنت ہندوستان کی حدود سے بغداد تک اور جھیل ارال سے لے کر خلیج فارس تک وسیع تھی۔ اس کا اقتدار سلجوق ترکوں اور مصر کے مملوکوں کو چھوڑ کر سب پر تھا۔ وہ درحقیقت ایک شاہنشاہ تھا جس کے عہد میں خلیفۂ بغداد کی حیثیت محض ایک روحانی پیشوا کی ہی رہ گئی تھی۔ اس کے آباء و اجداد بھی چنگیز کی طرح ایک خانہ بدوش قبیلہ سے آئے تھے۔ اور اس کے باپ اور دادا ملک شاہ سلجوق کے غلام تھے اور ساقی کے فرائض اُن کے سپرد تھے۔ غلام طبقہ اقتدار حاصل کرنے میں طاق تھا۔ علاوہ ازیں محمد ترک تھا اور توران کے جنگجو لوگوں کی طرح فنونِ جنگ اور آئینِ شجاعت سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ سیاست کا بھی ماہر تھا۔ اس کے حرص و آز کی کوئی حد نہ تھی اور اس کے دندانِ آز ہر ملک پر لگے رہتے تھے۔ اس کی فوج خاص چار لاکھ خوارزمی ترکوں پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں جنگلی ہاتھی اور اونٹوں کے رسالے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں فوجی غلام اُس کے حکم کے ہر وقت منتظر اور تیار رہتے تھے۔ اسلامی علم و فضل کے مرکز بخارا۔ سمرقند۔ بلخ۔ ہرات وغیرہ سب کے سب اُس کے قبضہ میں تھے۔ ان شہروں میں مسیحی کلیساؤں کے علما اور فضلا بھی بستے تھے۔ چنگیز کی آنکھ اُس کی مملکت پر بھی لگی تھی۔ اُس نے حملہ کر کے

بخارا۔ سمرقند۔ تاشقند۔ خراسان۔ مرو۔ ہرات اور دیگر حسین شہروں کو غارت اور برباد کر دیا۔ اُس نے جس شہر کو بھی فتح کیا اُس کو کھنڈرات کا ڈھیر کر دیا اور باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔ ان شہروں میں ایک بڑی تعداد مسیحیوں کی رہتی تھی۔ وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔ چنگیز مسیحیت کا دشمن نہ تھا لیکن مفتوح شہروں کے باشندوں کو قتل کرنا اُس کی حکومت کی پالیسی کا جزو تھا۔ اُس کی سلطنت میں بے شمار مسیحی رہتے تھے اور اُس کی فوج میں بھی جو چھ لاکھ کی تھی بے شمار مسیحی تھے جن کی وجہ سے اُس کی فوج میں آٹھ سو فوجی گاڑیاں ایسی تھیں جو مسیحی عبادت کے ساز و سامان سے آراستہ رہتی تھیں۔ گویا وہ گرجے تھے جو پہیوں پر جگہ بجگہ حرکت کرتے تھے۔

ہرات میں چنگیز نے سولہ لاکھ باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔ شہر کی حالت یہ ہو گئی کہ اُس کے جانے کے بعد صرف سولہ آدمی بچے رہے اور چوبیس آدمی مضافات سے آ گئے۔ پندرہ سال تک اس عظیم الشان شہر کی آبادی انہی چالیس نفوس پر مشتمل رہی۔ کاشغر۔ سمرقند۔ بخارا اور دیگر شہروں کا بھی ایسا ہی حشر ہوا۔ آبادیاں ہر طرف ویران ہو گئیں۔ تاشقند۔ بلخ۔ نیشاپور، مرو وغیرہ یکے بعد دیگرے تسخیر کر لئے گئے اور ان کا بھی یہی حال کیا گیا۔ جب ۱۲۲۱ء میں نیشاپور فتح ہوا تو ساڑھے سترہ لاکھ مرد و زن قتل کر دیئے گئے۔ شہر کو غارت کرنے میں پندرہ دن لگے۔ تمام مکانات کو مسمار کر کے وہاں ہل چلا دیا گیا۔ مرو میں تیرہ لاکھ آدمی مارے گئے۔ یہ تمام شہر مسیحیت کے مرکز و گڑھ تھے جن میں سے بعض میٹرو پولیٹینوں کے صدر مقام تھے۔ ان شہروں میں لاکھوں مسیحی دوسرے باشندوں کے ساتھ قتل کر دیئے گئے۔ جب خوارزم فتح ہوا تو ہر لشکری کو قتل کرنے کے لئے چوبیس قیدی دیئے گئے اور یوں بارہ

لاکھ انسانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ چنگیز نے اسلامی ممالک کے شاہزادے اور اُمراء قتل کر دیئے اور جو زندہ بچے اُن کو غلام بنا لیا۔ جو شاہزادیاں اور عورتیں اُس کو پسند آئیں وہ لونڈیاں بنا لی گئیں اور باقی تہ تیغ کر دی گئیں۔

چنگیز نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا اور مُلتان۔ لاہور وغیرہ شہروں کو غارت کرتا ہوا دہلی جا نکلا۔ لیکن گرمی کے موسم نے اُس کو بالآخر واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ شمالی ہند کے ہزاروں ہندو، مسلمان اور عیسائی اس مہم میں قتل ہو گئے اور جو غارتگری سے بچ گئے وہ غلام بنا لیے گئے۔ اُس نے تبت پر بھی حملہ کر کے اُس کو فتح کر لیا۔ واپسی کے وقت وہ لینڈار کو پامال کرتا ہوا سمرقند کی جانب چلا گیا۔ وہ بلا کا شخص تھا جو ایک دن میں ڈیڑھ سو میل بغیر کسی تکان کو محسوس کیئے سواری کیا کرتا تھا۔ اُس کی فوج کے سپاہی بھی اسی طبیعت کے انسان تھے۔

حق تو یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی کی قدر و وقعت کے سوال کو نظر انداز کر دیا جائے اور واقعات کو صرف ملک گیری اور جہاں کشائی کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھا جائے تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نسلِ آدم میں آج تک کوئی انسان پیدا نہیں ہوا جو چنگیز کی برابری کر سکے۔ سکندر اعظم بھی اُس کے کچھ کچھ قریب آتا ہے لیکن نپولین اور تیمور جیسے فاتح اُس کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ وہ عجیب انسان تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک بدو صحرائی تھا لیکن اُس کا ذہن رسا بین الاقوامی معاملات میں ایسا ذکی اور معاملہ فہم تھا کہ سلطنتوں کے تجربہ کار تاجدار دی۔ اسلامی ممالک کے جرنیلوں اور چین کے خاقانوں کی تمام تدبیروں منصوبوں۔ [illegible] ریشہ دوانیوں اور سازشوں وغیرہ پر وہ بآسانی تمام غالب آجاتا تھا۔ بین الاقوامی مشکلات کی گتھیوں کو وہ اپنی عقل کے ناخنوں سے

ویسا سلجھا الیت تھا کہ سب انگشت بدنداں ہو جاتے تھے۔ چنانچہ صاحبِ منہاس السراج لکھتا ہے کہ چنگیز صرف مونگولی زبان ہی میں کلام کر سکتا تھا وہ ترکی زبان تک سے نا آشنا تھا۔ پر اُس نے اپنے جنگی دفتر کی تنظیم ایسے اعلیٰ پیمانہ پر کر رکھی تھی کہ مشرقی یورپ سے بحرِ چین تک اور سائبیریا کے لق و دق صحرا سے مکران۔ ملتان اور لاہور تک کی مہمات کی ادنیٰ ترین تفاصیل پر بخوبی غور کر کے آخری فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اِس خانہ بدوش شکاری اور جانوروں کے ساتھ رہنے والے جنگلی انسان نے تین سلطنتوں کے جرنیلوں کی جنگی چالوں کو مات کر دیا۔

چنگیز خود ناخواندہ آدمی تھا لیکن اُس نے بیسیوں ملکوں کے لئے ایسے قوانین وضع کیے جو پشتوں تک اس کے مقبوضہ ممالک کے لوگوں کے لئے آسمانی وحی کا سا حکم رکھتے تھے۔ پادری کاربینی لکھتا ہے "ان قبائل کے لوگ اپنے بڑوں کا حکم بے چون و چرا مانتے ہیں اور آپس میں لڑائی جھگڑا اور خانہ جنگی نہیں کرتے۔ چور اور ڈاکو کہیں پائے نہیں جاتے۔ ان کے گھر مال و دولت اور خزانہ سے بھرے ہوتے ہیں لیکن مقفل نہیں لگائے جاتے۔ اگر کسی کے پاس کھانے کو نہ ہو تو اُس کی حاجت پوری کی جاتی ہے سفر کی تکان کا وہ نام بھی نہیں جانتے۔ اُن کی نظر میں تمام دیگر ممالک کے لوگ حقیر اور ذلیل ہیں۔ چنانچہ ملکِ رُوس کے نواب۔ جارجیا کے شہزادے اور دیگر ملکوں کے سلاطین کے اُمرا چنگیز کے دربار میں معمولی انسانوں سے زیادہ قدر اور منزلت نہیں رکھتے۔ دُوسرے لوگوں کے حق میں وُہ پرلے درجے کے دغاباز ہیں جن کو بات بات پر قتل کر دینا ایک عام بات ہے"۔

چنگیز خاں کے مطیع ہو کر اویغوروں کا لکھا پڑھا مسیحی قبیلہ اور

کرئیت جیسا شجاع مسیحی قبیلہ۔ یکّہ جیسا وحشی قبیلہ۔ تاتار کے تُند خو قبائل اور مرکیت قبیلہ کے بُغض پرور لوگ، سب کے سب متحد ہو کر ایک ہو گئے اور اُس کی فوج میں کارہائے نمایاں کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُنہوں نے سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ان کو ویرانے بنا دیا۔ حق تو یہ ہے کہ چنگیز مکاشفات کی کتاب دی ہے کا "زرد گھوڑا تھا جس کے سوار کا نام موت تھا" جس کے پیچھے پیچھے عالمِ ارواح تھا اور جس کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ کال، تلوار اور وبا سے اور زمین کے درندوں سے دُنیا کے رہنے والوں کو ہلاک کرے۔ اُس کی نظروں میں جنگی قیدیوں کو زندہ رکھنا بیکار تھا۔ اُن میں سے جو لوگ دستکار تھے یا کچھ علم رکھتے تھے اُن کو وُہ کارآمد سمجھ کر ہلاک نہیں کرتا تھا۔

چنگیز خاں بالآخر ۱۲۲۷ء میں راہیِ مُلکِ عدم ہُوا۔ موت کے وقت اُس کی سلطنت بحرِ اوقیانوس سے رُوس کے دریا نیپر تک پھیل گئی تھی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ اُس کی حکومت میں مُسلمان۔ بودھ، مسیحی اور جِن پرست غرض سب مذاہب کے پیرو بستے تھے۔ چنگیز خود اُن میں سے کسی مذہب کا پیرو نہیں تھا وُہ اپنے معبود تنگری کو ہی مانتا تھا اور ہر مذہب سے رواداری کا سلوک کرتا تھا۔ اُس کے دربار میں بُدھ مت کے فاضل اُس کے ہم مذہبوں سے آزادانہ بحث کیا کرتے تھے۔

چنگیز نے اپنے بیٹوں اور اُن کی اولاد میں اپنی سلطنت کو اِس طرح تقسیم کیا:—

۱۔ اوگوتائی کو زنگاری قبائل کی حکومت دی گئی۔ مرکزی حکومت بھی اُس کے سپرد کی گئی سلطنت کا مشرقی حصہ اُس کو دیا گیا۔

۲۔ تولوئی کو مونگولستان کے قبائل کی فرمانروائی دی گئی۔ اُس کو ایران بھی

میں ہوگوتے البیتائے کوچک کا بڑا حصہ شامل کر لیا۔

۳۔ جوجی کو کپچک کے ترکی قبائل اور خوانینِ زرین خیام وگولڈن ہورڈز (خوانینِ سفید خیام (وہائٹ ہورڈز)۔

خوانینِ استراخان۔ خوانینِ قازاق۔ خوانینِ خیوا و بخارا وغیرہ پر فرمانروا کیا گیا۔ سلطنت کا مغربی حصہ اُس کو دیا گیا۔

۴۔ چغتائی شاخ کو خوارزم اور ماوراء النہر بنا دیا گیا۔ سلطنت کا مرکزی حصہ اُس کو دیا گیا۔

اِس کتاب میں ہم مونگولوں کے اُن فرمانرواؤں کا ہی ذکر کریں گے جن کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔

فصلِ سوم چنگیزی خوانین کا عہدِ حکومت

۱۔ اوگوتائی (از ۱۲۲۷ء تا ۱۲۴۱ء)

تاریخ کا مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ زبردست فاتحین مثلاً سکندرِ اعظم کی موت کے بعد اُن کی سلطنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں لیکن چنگیز کی سلطنت کا یہ حال نہ ہوا۔ تمام مونگول اقبائل چنگیز کی موت کے بعد ایک ہی خاقان (شہنشاہ) کے دلدادہ تابعدار اور جانثار وفادار رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف تمام مفتوحہ ممالک چنگیز کے بیٹوں اور پوتوں کے زیر رہے بلکہ وہ دیگر ممالک کو بھی فتح کرتے چلے گئے۔ چنگیز کا بیٹا اوگوتائی ہر چند اُس کا بڑا بیٹا نہ تھا لیکن چنگیز کی وصیت کے مطابق تمام قبائلی سرداروں

نے اُس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اُس کے عہد میں سلطنت کو اچھی خاصی وسعت ہوئی۔ چنگیز کے زمانہ میں شمالی چین پوری طرح زیر نہ ہوا تھا وہ ۱۲۳۴ء میں فتح ہو گیا۔ شاہِ خوارزم محمد شاہ کے بیٹے جلال الدین کو بھی ختم کر دیا گیا۔ جوجی بن چنگیز کے بیٹے باتو نے یورپ کی طرف اقدام کیا۔ مونگولی افواج ماسکو۔ نووگراڈ میں اور پولینڈ ہنگری میں بھی داخل ہو گئیں۔ اُس نے یورپ کے ممالک کو بحرِ ایڈریاٹک تک اور اطالیہ ملک کے شہر وینس تک فتح کر لیا۔ دیگر مونگولی افواج نے کوریا۔ چین اور جنوبی ایران پر قبضہ کر لیا۔ آرمینیا کا ملک بھی فتح کر لیا گیا۔ ان ممالک میں بعض ایسے تھے جن کی پوری آبادی مسیحیوں کی تھی اور بعض میں آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ مسیحی تھا۔ ان جنگی مہموں میں ان مسیحیوں کا ایک غالب حصہ قتل کر دیا گیا اور ہر ملک و قوم کی کلیسیاؤں میں ماتم کی صف بچھ گئی۔

ہم نے گذشتہ فصل میں ذکر کیا ہے کہ چنگیز خاں نے کریت کے مسیحی قبیلہ کو زیر کر کے قبیلہ کے سردار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اوگوتائی نے بھی اسی خاندان میں شادی کی۔ اِس مسیحی عورت نے اپنے خاوند کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا تھا اور کوشش کرتی رہی کہ اُس کو اُس کی فطرتی بے رحمی سے باز رکھے لیکن قتلِ عام کرنا مونگولوں کا شیوہ تھا اور اوگوتائی کے سامنے چنگیز کا نمونہ تھا۔

مونگولی افواج نے مسوپوتامیہ۔ آرمینیا۔ آذربائیجان۔ جارجیا اور اُن علاقوں کو فتح کر لیا تھا جو بحیرۂ کیسپین کے مغرب کی جانب تھے اور جن میں لاکھوں کلیسیائیں آباد تھیں۔ ان افواج نے گرجاؤں کو شہید کر دیا۔ صلیبوں کو پاؤں تلے روند دیا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ

اوگوتائی کا طبیب شام کا مسیحی شمعون تھا جس نے بہت سے بے گناہ مسیحیوں کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ اُس کے کہنے سننے سے اوگوتائی نے اسلامی قصبوں میں گرجے بنوا دیئے۔ جہاں پہلے خلفا کی حکومت میں کسی مسیحی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے منجی مسیح کا نام لے، اب وہاں گرجاؤں کے گھنٹے علانیہ عبادت کے وقت بجنے لگے۔ بالخصوص تبریز اور نخ چیون کے شہروں میں (جو آذربائیجان میں تھے) مسیحی کلیسیاؤں کی حالت ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ مسیحی سرِ عام نکلنے سے بھی ڈرتے تھے لیکن اب یہاں کے مسیحی اپنے مُردوں کو مسیحی دستور کے مطابق جلوس میں صلیبوں کو دوا انجیل کو اے گاتے ہوئے گلی کوچوں میں سے گزر کر قبرستان لے جاتے تھے۔ جو شخص مسیحی اور کلیسیائی رسُوم کی مخالفت کرتا وہ مستوجب قتل ہو جاتا تھا۔ مونگولی افواج شمعون طبیب کی بے حد عزت و تکریم کرتی تھیں۔ اُس کے ذریعہ بہت سے مونگولی مسیحی کلیسیا میں شامل بھی ہو گئے۔

اوگوتائی کا ایک بھائی سمرقند کا وائسرائے تھا جو مسیحی تھا۔ اُس کی حکومت میں وسط ایشیا کے شہروں اور قصبوں میں بے شمار مسیحی بستے تھے۔ اُس کی حکومت میں سمرقند کے عیسائیوں نے ایک بڑا عالیشان گرجا تعمیر کیا جس کا نام "یوحنا بپتسمہ دینے والے کا گرجا" تھا۔

۲۔ اوگوتائی کے مرنے کے وقت اُس کا بیٹا کُویوک ہنگری مہم میں مصروف تھا۔ پس اوگوتائی کی بیوہ نے سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور جب وہ ۱۲۴۶ء میں آیا تو جوجی کی اولاد کے علاوہ تمام سرداروں نے اُس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اُس کی ماں کے زمانہ میں جو انتشار پیدا ہوا تھا وہ دُور ہو گیا اور اُس نے اپنی توجہ چین اور فارس کی طرف کی۔

اگرچہ کویوک خود مسیحی نہ تھا لیکن اُس کی بیوی مسیحی تھی اور وہ عیسائیوں کو اچھی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس کا وزیرِ اعظم اور سکریٹری دونوں اعلیٰ پایہ کے مسیحی تھے۔ اُس کے دربار میں نسطوری قسیس بڑی عزت اور توقیر سے دیکھے جاتے تھے۔ پوپ انوسینٹ چہارم نے اُس کے پاس ایک سفارت روانہ کی تھی۔ اُس کے لشکر گاہ میں بشپ، قسیس اور رُہبان ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور ہر جگہ مسیحیت کا بول بالا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ کویوک خود بھی مسیحی تھا بہرحال جب وہ گدی نشین ہوا تو اُس کے عہد میں اس قسم کے قتلِ عام نہ ہوئے جس قسم کے چنگیز اور اوگوتائی کے زمانہ میں ہوتے تھے۔ وہ ۱۲۴۸ء میں مر گیا۔ اُس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت تولوئی کی اولاد میں چلی گئی جو قبائل مونگولستان کے فرمانروا تھے۔

۳۔ منگو بن تولوئی۔ ۱۲۵۱ء میں گدی نشین ہوا اور اُس نے اپنے بھائی قبلائی خاں کو چین کا گورنر جنرل اور نائب السلطنت بنا دیا۔ دُوسرا بھائی ہلاگو ایران کا وائسرائے بنا دیا گیا۔ منگو کے عہد میں مونگولی افواج برابر فتوحات حاصل کرتی گئیں اور اُنہوں نے تبت کو تہ و بالا کر کے ویرانہ بنا دیا۔

منگو خاں کے دربار میں متعدد مسیحی موجود تھے۔ آرمینیا کے بادشاہ ہیٹن نے ہی منگو کو اُبھارا تھا کہ وہ ہلاگو کو بھیج کر بغداد کو فتح کرے جب مونگولوں نے آرمینیا اور جارجیا کو فتح کیا تھا تو بہت سے مونگل مسیحیت کے حلقہ بگوش بھی ہو گئے تھے بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ منگو اور اُس کا خاندان مسیحی تھا اور اُس کے متعدد اُمرا اور شُرفا نے بھی بپتسمہ پایا تھا۔ چنانچہ مسلمان مؤرخ رشید لکھتا ہے کہ وہ یسُوع ناصری کا پیرو اور دین

"عیسوی کا حامی تھا"۔ لیکن اگر یہ بات صحیح نہ بھی ہو تو بھی اِس حقیقت میں کچھ شک نہیں کہ اُس نے حکم جاری کیا تھا کہ ہر شخص اپنے دین وعقائد اور رسُوم کو ماننے میں آزاد ہے۔ بہر حال اِس کے عہد میں اُس کی مملکت کے مسیحیوں کو قدرے چین حاصل ہُوا۔ اُس کے عہد میں ایک دفعہ آرڈبیل کے مسیحیوں اور مسلمانوں میں مذہبی مناظرہ ہُوا تو شمالی مسوپوتامیہ کے گورنر نے عیسائیوں کی حمایت کی۔ بہر حال گو وُہ مسیحیت کو پسند کرتا تھا تاہم اُس کے دربار میں بدھ مت، مسیحیت اور اسلام کے علماء کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ مونگولوں کے رویّے سے بعض کے دلوں میں یہ اُمید بھی پیدا ہو گئی تھی کہ مونگولی حکمران عیسائی ہو جائیں گے اور وُہ اسلامی حکمرانوں کے خلاف اُن کی مدد کیا کریں گے۔ لیکن رومی کلیسیا، نسطوری کلیسیا اور آرمینی کلیسیاؤں کے تفرقوں اور باہمی تنازعوں نے جو مونگولی افواج میں بھی جا دخل پا لیا تھا، اُن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے نہ دیا۔ منگو نے ۱۲۵۹ء میں انتقال کیا۔

۴۔ قبلائی خان۔ منگو کی موت کے بعد اُس کا بھائی قبلائی اُس کی جگہ خان منتخب کیا گیا لیکن اوگوتائی کی اولاد نے اُس کی مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ۱۳۰۱ء تک یہ انتشار جاری رہا جس کے بعد اُنہوں نے تولوئی خاندان کی اطاعت قبول کر لی اور اُن کے قبائل ماوراء النہر اور کپچک کی طرف چلے گئے جہاں وُہ چغتائی خوانین کی حکومت میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن جب بعد کے زمانہ میں پھر اقتدار پیدا ہُوا تو اوگوتائی خاندان ماوراء النہر کا فرمانروا بن گیا۔

قبلائی خان نے قراقورم دارالسلطنت کی بجائے خان بلیق (موجودہ پیکن) کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ وُہ ۱۲۵۹ء سے ۱۲۹۴ء تک پینتیس ۳۵ سال حکومت کرتا رہا۔ اُس کی موت کے بعد اُس کا خاندان ۱۳۶۹ء تک چین کا حکمران رہا۔ اِس

کے فرمانرواؤں نے اپنے لئے "خاقان" کا لقب اختیار کر لیا۔ قبلائی خان کا سفیر اُوگر قبیلہ کا ایک مسیحی تھا۔ اِس زمانہ میں شمالی مسوپوتامیہ کے گورنر مسیحی ہُوا کرتے تھے۔ یہ خاقان نسطوری مسیحیوں اور مبلغوں کی بڑی قدر اور عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وُہ پیٹریارک کے سامنے اپنی دستار اُتار کر اُن کے سامنے گھٹنے بھی ٹیک دیا کرتے تھے۔ جب خاقانوں کے خاندان کو زوال آیا تو اُن کے بعد "منگ" خاندان برسر اقتدار ہو گیا اور جب منگ کی نئی حکومت کو قوت حاصل ہُوئی تو اُس نے چین میں مسیحیت کی بیخکنی کر دی اور لاکھوں مسیحیوں کو قتل کر دیا۔

قبلائی خان نے منگو خان کے زمانہ میں ہی تمام چین کو فتح کر لیا تھا۔ اُس کی حکومت کا زمانہ مونگولی حکومت کا "عہد زریں" کہلاتا ہے۔ اُس کو "خان" کے عہدہ پر منتخب کرنے والے ہنگری سے لے کر شام اور سندھ سے لے کر چین تک کے مُلکوں سے آئے تھے۔ اب انطاکیہ فتح ہو چکا تھا اور اس کی افواج یروشلیم کی نواحی تک پہنچ گئی ہُوئی تھیں۔ اُنہوں نے ایشیائے کوچک کے شہر سمرنا کو فتح کر لیا تھا اور قسطنطنیہ وہاں سے صرف ایک ہفتہ کا راستہ رہ گیا تھا۔ اُس نے جاپان پر حملہ کیا اور جزائر ملائے (MALAY) تک اور تبت سے آگے بنگال تک اپنی سلطنت کی حدُود بڑھا لیں۔ موت کے وقت وُہ آدھی دُنیا کا فرمانروا تھا۔ اُس کی سلطنت بحر چین سے لے کر بحر متوسط تک وسیع تھی۔ براعظم ایشیا کے کثیر ممالک اُس کے زیر نگین تھے اور بیسیوں ملکوں کے صدہا سردار، بادشاہ اور سلاطین اُس کے تابع فرمان تھے۔ اُس کے خزانے بےحساب تھے جن میں مفتوحہ ممالک کی لُوٹ اور خراج گذاری سے اضافہ ہوتا رہتا تھا اور اس آدھی دُنیا کے کروڑوں افراد اُس کی رعیّت تھے جو مختلف مذاہب سے

تعلق رکھتے تھے۔

۵۔ **ہلاگو خان** ۔قبلائی خاں کے سُنہری دَور میں مغولی سلطنت اِس قدر وسیع ہو گئی تھی کہ کوئی ایک "خان" اُس کو سنبھال نہیں سکتا تھا پس یہ سلطنت بڑی بڑی ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔

منگو کے عہد میں ہی ہلاگو کے گھرانے میں فارس کے مُلک کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔اِس خاندان کو "ایل خانی" کہتے ہیں۔ہلاگو کو فارس میں اپنی حکومت کی اقتدار قائم کرنے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئی کیونکہ چنگیز شاہِ خوارزم کو پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ ورمُلک کا بڑا حصہ اُس کے زیرِ نگیں تھا۔ہلاگو نے باقی ماندہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو ختم کر دیا اور فارس اور ارضِ رُوم کا مالک ہو گیا۔اُس کی حکومت شمال میں چغتائی اور جوچی کے علاقوں سے جا ملتی تھی اور جنُوب میں سلاطینِ مصر کی مملکت سے ملتی تھی۔اِن وسیع حدُود کے اندر اس کے خاندان نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی۔

ہلاگو خاں ۱۲۵۶ء میں تخت نشین ہُوا۔اُس کی چہیتی بیوی اوگوتائی کے بھائی تولوئی کی بیٹی تھی جو مسیحی تھی اور بڑی پارسا اور دین دار عورت تھی۔اُس کی ماں تولوئی کی بیوی تھی جو منگو اور قبلائی خاں کی بھی ماں تھی۔ وُہ کرَیت کے مسیحی قبیلہ کی شاہزادی تھی اور وُہ بھی مسیحی تھی۔یہی وجہ تھی کہ ہلاگو مسیحیوں کو بنظرِ استحسان دیکھتا تھا۔ایک دفعہ جب کیتھولی کوس مکو آوز نے اُس کے پاس جا کر شکایت کی کہ خانقاہیں اور اُن سے متعلقہ جائدادیں غیر محفوظ ہیں تو ہلاگو نے ایک افسر کو اُن کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا۔اور کیتھولی کوس کو ایک عصا نذر کیا جس پر سونے کی صلیب تھی۔

ہلاگو نے ۱۳۔فروری ۱۲۵۸ء کے روز بغداد کو فتح کر لیا۔اُس نے آٹھ

لاکھ مرد و زن کو تہ تیغ کر دیا۔عباسی خلیفہ مستعصم کو اُس نے قتل کر کے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔اُس نے شاہی مال و خزانہ لُوٹ لیا اور جو نسخے اور ادبی نوادر عباسی خلفاء نے جمع کر رکھے تھے تباہ کر دیئے گئے۔بغداد کی فتح سے تمام اسلامی ممالک میں غم و غُصّہ کی لہر دَوڑ گئی۔اِس قسم کا حادثہ اس سے پہلے کبھی دُنیائے اسلام میں واقع نہ ہُوا تھا۔الیپو (ALEPPO) کے شہر کو مسمار کر کے ویرانہ بنا دیا گیا۔باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔جو بچ رہے وُہ قید کر لئے گئے۔دمشق غارت کر دیا گیا لیکن اُس کے باشندے قتل نہ ہُوئے لیکن انطاکیہ جب غارت کیا گیا تو اِس شہر کے باشندوں کو بھی قتل کر دیا گیا جو بچ رہے وُہ وَبا اور قحط کی نذر ہو گئے اور شام کا مُلک ویرانہ ہو گیا۔

اِس قتل و غارت میں مسیحی بالعموم بچے کیونکہ ہلاگو مسیحیت سے اُنس رکھتا تھا۔اِس مہم میں جارجیا اور آرمینیا کے مسیحی اُس کے اتحادی تھے جنگ کے بعد جارجیا کے مسیحیوں نے اُس سے واپس اپنے گھروں میں جانے کی اجازت مانگی کیونکہ وُہ مُدت سے ہلاگو کے ہمرکاب رہے تھے۔اور جب وُہ واپس ۱۲۵۹ء میں آذربائیجان کے راستے طفلس کو گئے تو اپنے ساتھ بہت مالِ غنیمت اور تحائف لے گئے۔بغداد کی فتح کے بعد مغولی اوکسس سے دجلہ تک حکمران ہو گئے لیکن ہلاگو کا حُکم تھا کہ وُہ تمام ایشیا کو مغرب کی حد تک فتح کرتے چلے جائیں پس اُس کی افواج شام اور مسوپوتامیہ کے پرے مغرب کی جانب کے ممالک پر حملے کرتی گئیں۔

جب بغداد فتح ہو گیا تو مسیحی ٹیکس سے آزاد کر دیئے گئے۔ہلاگو اُن سے عزت و تکریم سے پیش آتا تھا اور وُہ اُس کو اُنہیں غُلامی سے آزاد کرنے والا مانتے تھے۔ہلاگو نے اُن کو ایک فرمان کی رُو سے امان دے دی اور اُن کو اپنے

دینی رسوم اور علانیہ عبادت ادا کرنے کے حقوق بھی حاصل ہو گئے۔ خلیفہ کا ایک محل "دارالدویدار" جو دربارِ خلافت کا "سیکریٹریٹ" تھا، قطوری کیتھولی کوس کو رہائش کے لئے دے دیا گیا اور یہ اجازت دی گئی کہ وہ محل میں ایک گرجا بنا لے۔ مشرقی کلیساؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا جب یوانی حاکم اپنے آپ کو علانیہ عیسائی کہتا تھا۔ چھ صدیوں سے عیسائی ایک ذلیل اقلیت ہی شمار کئے جا رہے تھے۔ اب وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ بھی انسان ہیں اور دیگر انسانوں کے سے حقوق رکھتے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے آزادی کا ناجائز استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ ماہِ رمضان میں آزادانہ شراب برسرِعام پینے لگے اور شراب کے خُم گلیوں میں مسلمانوں کے کپڑوں پر اچھالنے اور مسجدوں کے دروازوں کے سامنے خالی کرنے لگے۔ چنانچہ ایک مسلمان مؤرخ لکھتا ہے "عیسائی ماہِ رمضان میں علانیہ شراب پیتے تھے، مسلمانوں پر اور اُن کی مسجدوں پر تھوکتے تھے۔ جب وہ صلیب کے جلوس بازاروں میں برسرِعام نکالتے تھے تو دکانداروں کو مجبور کرتے تھے کہ تعظیماً کھڑے ہو جائیں اور جو کھڑا ہونے سے انکار کرتا تھا اُس سے بدسلوکی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے قسیس اپنے وعظوں میں علانیہ مسیحیت کی فتح کا ذکر کر کے کہتے تھے کہ آج اُن کا دین فتحمند ہے۔ جب مسلمان ہلاگو کے گورنر سے شکایت کرتے تو وہ اُن کی درخواست کو ٹھکرا دیتا تھا اور اُن میں سے بعض کو پٹواتا تھا۔ گورنر گرجا میں جاتا تھا اور قسیسوں کی بے حد عزت کرتا تھا"۔ یہ گورنر غالباً کتوبکہ تھا جو کریت کے قبیلہ کا مسیحی تھا۔ ہلاگو نے اپنی بیوی کے کہنے میں آکر مسجدوں کو مسمار کر دیا اور اذان، نماز اور اسلامی رسوم پر پابندیاں لگا دیں۔ اُس نے مسلمانوں کو ایسی غلامی میں رکھا کہ وہ گھروں سے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ جب ہلاگو اور

اُس کی بیوی مر گئے تو مسیحی کلیساؤں میں ماتم کی صف بچھ گئی۔

اِن باتوں کا قدرتی طور پر ردِعمل یہ ہوا کہ اسلامی ممالک میں کلیساؤں پر ظلم و ستم اور تشدّد کیا گیا۔ سلطان سنجر نے تمام مسیحیوں کو جو اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے تھے قتل کر دیا۔ بے شمار مسیحیوں اور دولتمند عیسائیوں بلکہ شماسوں اور قسیسوں تک نے اپنے خُداوند کا انکار کر کے اپنی جان بچالی۔ گرد و نواح کے کُردوں نے بھی عیسائیوں پر حملے کر کے قتل و غارت مچا دی۔ اُنہوں نے خدیدہ کی راہبات کی خانقاہ پر حملہ کر کے سب کو جو وہاں پناہ گزین تھے تہ تیغ کر دیا۔ وہ ایک ہزار سواروں کی معیت میں چار ماہ تک مارمتیو کی خانقاہ کا محاصرہ کرتے رہے لیکن راہب اُن کی کمندوں کو آگ لگا دیتے تھے۔ اِس پر کُردوں نے چٹانوں کو کھود کر خانقاہ کی دیوار کو مسمار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ بالآخر محاصرین کو فتح حاصل ہوئی۔ خانقاہ کے افسرِ اعلےٰ کی آنکھ نکال دی گئی۔ گرجا اور خانقاہ کو لوٹ لیا گیا۔ لیکن آخرکار مونگولی افواج کے خوف کے مارے ایک ہزار سونے کے سکے لے کر چلے گئے۔ ایک اور مسلمان امیر قتلغ بیگ نے اربیل کے عیسائیوں کا قتلِ عام کر دیا۔ جب سنجر نے سُنا کہ مونگولی افواج اُس کی طرف بڑھ رہی ہیں تو اُس نے اُن سے جنگ کی جس میں وہ قتل کر دیا گیا۔

تکریت کے علاقہ میں مسلمانوں نے گرجا پر قبضہ کر لیا اور مسیحیوں کو طرح طرح کے عذاب دیئے۔ جوجی کے خاندان کے تین شاہزادوں نے دربند کو مع لشکر عبور کیا اور حملے کر کے پہاڑوں کو میدان بنا دیا۔ اُن میں سے ایک جس کا نام خولی تھا اپنے آپ کو "ابن اللہ" کہتا تھا۔ وہ مسیحیوں کا جانی دشمن تھا اور جہاں کہیں اُن کو دیکھ پاتا قتل کر ڈالتا تھا۔ اُس کو

جہاں کہیں پہاڑ یا میدان میں صلیب نظر آجاتی وہ اُس جگہ کو آگ لگا دیتا تھا۔ اور جو خانقاہیں اِس کے راستہ میں ہوتیں اُن کو اور اُن کے رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیتا تھا۔ ایک خانقاہ کے سردار پادری کو اُس نے آگ میں جلا دیا۔ ایک موقعہ پر جب وہ بیمار ہُوا تو اپنے یہودی طبیب کے کہنے پر اُس نے تین عیسائی بچوں کو مروا کر اُن کی انتڑیاں اپنے پیٹ پر باندھیں۔

ہلاگو خاں کے زمانہ میں مشرقی کلیسیا کے تین فرقے زیادہ اہم تھے جو جسمِ مسیح کے مختلف نظریوں کی وجہ سے بٹے ہُوئے تھے۔ اوّل سب سے بڑا اور زبردست فرقہ نسطوریوں کا تھا۔ دُوسرا فرقہ یعقوبی فرقہ تھا جس کی اکثریت مصر اور شام میں تھی۔ نسطوریوں کی اکثریت اُس کے مشرق کی جانب تھی۔ تیسرا فرقہ آرمینی کلیسیا کا تھا جو کیلسیڈون کی کونسل کے بعد کلیسیائے جامع سے الگ ہو گیا تھا۔ راسخ الاعتقاد مسیحیوں کو یُونانی یا ملکی کہا جاتا تھا کیونکہ وہ بازنطینی قیصر کو اپنا دُنیوی حاکم اور انطاکیہ کے پیٹر یارک کو اپنا رُوحانی حاکم مانتے تھے۔ یہ پیٹریارک تمام مشرقی مسیحیوں کا سب سے بڑا فرمانروا تھا۔ یعقوبی پیٹریارک آمد میں یا ملتیہ کے قریب برسوما میں رہتا تھا۔ اِس فرقہ کا ایک اور افسرِ اعلیٰ تھا جس کو میفریئن یا پرائمیٹ (MAPHRION PRIMATE) کہتے تھے۔ وہ آرچ بشپوں سے بڑا اور پیٹریارک سے چھوٹا ہوتا تھا۔ اُس کا صدر مقام تکریت میں تھا اور وہ مشرقی اُسقفوں کا سردارِ اعلیٰ تھا۔ ایک سَو بیس سے زیادہ یعقوبی بشپ شام۔ ایشیائے کوچک اور اُن ممالک میں تھے جو دریائے دجلہ اور فرات سے سیراب ہوتے تھے۔ آرمینی کلیسیا کا پیٹریارک

دریائے فرات کے کنارے قلعہ اَرُدم میں رہتا تھا اور اُس کے ماتحت چونتیس اُسقفی علاقے تھے۔ ایشیا میں نسطوری کلیسیا کے پچیس صوبے (PROVINCES) اور ستر اُسقفی علاقے تھے۔ اُن کے پیٹریارک بغداد میں رہتے تھے اور جب خلیفہ وقت کسی پیٹریارک کے انتخاب کو تسلیم کر لیتا تو اُس کی تقدیس کوشے (KOCHE) کے بڑے گرجا میں عمل میں آتی تھی۔ چُونکہ اُن کو خلیفہ کے دربار میں رسوخ حاصل تھا اُنہوں نے انطاکیہ کے آرتھوڈوکس پیٹریارک کے نائب کو اور یعقوبی میفریئن کو بغداد سے نکلوا دیا تھا۔ نسطوری پیٹریارک کا اختیار گیارھویں صدی میں چین سے دریائے دجلہ تک اور جھیل بیکال سے راس کماری تک تھا۔ وہ نہ صرف عراق۔ دیار بکر۔ میسوپوتامیہ۔ آذربائیجان۔ شام۔ ایران۔ ہندوستان۔ ٹرانس اوکسیانا۔ ترکستان۔ چین۔ تبت وغیرہ کے مسیحیوں پر رُوحانی اقتدار رکھتا تھا بلکہ وہ اُن کا دُنیاوی حاکم بھی تھا کیونکہ خلیفہ کے ایک فرمان کی رُو سے وہ نہ صرف نسطوری کلیسیاؤں بلکہ یعقوبی اور ملکی کلیسیاؤں کے تنازعوں کا فیصلہ کرتا تھا کیونکہ دو حکمناموں کے مطابق (جو اب بھی موجود ہیں) اُس کو ان دونوں فرقوں کے قسیسوں پر بھی اختیار حاصل تھا۔ ان حکمناموں میں لکھا ہے کہ امیر المومنین کو یہ اچھا معلوم دیا ہے کہ وہ تم کو جو نسطوریوں کے کیتھولیکوس ہو اُن یعقوبی اور یونانی کلیسیاؤں کی حکمرانی عطا کرے جو ہماری مملکت اسلامیہ میں رہتے ہیں ... اِس بات کا خاص طور پر خیال رکھو کہ یہ سب مسیحی تمہارے حکم کے تابع رہیں۔

منگول فرمانروا بھی ان مسیحی کلیسیاؤں اور بشپوں کو اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی خاطر آلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے مثلاً

ایک سال مونگولی جشنِ نوروز کے دن ہلاگو کے دربار میں بھی بشپوں اور قسیسوں نے شرکت کی۔ آرمینیا خورد کا بادشاہ ہیتھوم اور جیارجیا کا بادشاہ داؤد بھی حاضرِ دربار تھے۔ انطاکیہ کا شہزادہ اور دیلین کے عاملوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی۔ ہلاگو نے بشپ سے درخواست کی کہ وہ مجھ پر کلماتِ برکت پڑھے۔ وہ بشپ کی اتنی تعظیم کرتا تھا کہ اُس نے اس کو نشست نیچا لگانے نہ دی اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اور کہا میں نے آپ کو اس مقصد کے لئے طلب کیا ہے کہ آپ اور میں ایک دوسرے کو دُور دُور دیکھیں اور آپ میرے لئے دعا کریں۔ اس جشن میں جیارجیا کی کلیسیا، شام کی کلیسیا اور یونانی کلیسیا کے شرکاء نے اپنے اپنے دستور کے مطابق عبادتیں کیں۔ بشپ نے ہلاگو کو دعا دی اور کہا کہ خدا جس کو پسند فرماتا ہے اسی کو فتح بھی بخشتا ہے۔ لیکن اگر فاتح خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرے محکوموں پر ظلم کرے تو اُس سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور خدا اُس کو شکست دلواتا ہے۔ اگر آپ لوگوں سے نیک سلوک کرینگے اور غربا پروری اور رعایا پروری کرینگے تو خدا آپ سے حکومت نہیں چھینے گا بلکہ آپ کو بیش از بیش قوت عطا کریگا۔ آپ ایسے لوگوں کو حکم دیتا ہیں جو نیک اور ایمان دار ہیں۔ جو بدقسمت لوگ تنگ آ کر تمہارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہیں اُن کی فریاد پر کان لگاؤ۔ رشوت خوار دل اور بدوں کو اپنے عہدے نہ دو۔ ہم جو مسیحی ہیں سب کے سب تمہارے خیر خواہ ہیں اور تمہارے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔ ہلاگو نے کہا کہ میری ماں مسیحی تھیں اور میں بھی مسیحیوں کو پسند کرتا ہوں۔ پھر اُس نے سب کو قیمتی تحائف دے کر رخصت کیا۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان بشپوں اور مسیحیوں کے ذہنی خیالات تھے جو یہودی رکھتے تھے کہ خدا ان کو جو اُس کے مقبول ہیں فتح بخشتا ہے اور جو اُس کے مقبولِ درگاہ نہیں اُن کو شکست نصیب ہوتی ہے۔ مونگولی حکمران یورپ کے ممالک کے طاقتور حکمرانوں اور ان کے پوپ اور بشپوں کی شان و شوکت اور دولت و سطوت دیکھ کر مسیحیت کی جانب مائل ہو گئے۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اگر وہ بھی مسیحیت کو قبول کر لیں گے تو مسیحیت کا خدا اُن کی فتوحات کو بڑھاتا چلا جائیگا۔ رُوم کے پوپ کو بھی یہ خیال ہوا کہ اگر مونگولی مسیحی ہو گئے تو اُس کے دینی اور دنیوی اقتدار میں اضافہ ہو جائیگا۔ اُس کے سفیر جو مونگولی حکمرانوں کے دربار میں جاتے تھے وہ بھی انجیل کو ایک ذریعہ بنا کر مونگولیوں پر پوپ کا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ پوپ ممالکِ مشرق و مغرب کا فرمانروا ہو جائے لیکن مونگولی خود اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے خواہشمند تھے اور اپنی مملکت کو رُوم کے پوپ کی سلطنت کا حصہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سمجھ بوجھ والے سیانے آدمی تھے پس وہ پوپ کی چالوں کو بھانپ گئے۔ اگر پوپ گریگوری دہم (از ۱۲۷۱ء تا ۱۲۷۶ء) اپنے شخصی اقتدار کو بڑھانے کا خیال نہ کرتا اور اس نادر موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیتا تو وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے ممالک کی کلیسیاؤں کی حالت ابتر ہونے کی بجائے بہتر ہو جاتی۔ مونگولی حکمران پوپ کے جھانسوں میں نہ آئے کیونکہ اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغربی ممالک کی طاقتوں کے ساتھ مل کر اسلامی مملکت کو کچل ڈالیں اور اپنی سلطنت کو بڑھائیں۔ پس اب اُنہوں نے اپنی مقصد برآری کے لئے نسطوری مسیحیوں کو آلۂ کار بنا لیا۔ ان کا پیٹریارک یحب اللہ خاص طور پر اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے۔ یہ پیٹریارک چین کا مسیحی تھا جو اپنی قابلیت

کی وجہ سے کینتھولی کوس (از ۱۲۸۱ء تا ۱۳۱۷ء) ہوگیا تھا۔ مونگولی حکمرانوں کا خیال تھا کہ مسیحیوں کا خدا قدرت والا خدا ہے کیونکہ اُس نے اپنے مغربی ممالک کے پرستاروں کو سلطنت، شوکت اور حشمت بخشی ہے اور اگر وُہ بھی مسیحیوں کے خُدا کے پرستار بن جائینگے تو اُن کی حکومت اور قوت زیادہ سے زیادہ مستحکم اور وسیع ہوتی جائیگی۔ بعض مونگولیوں نے اسلام اور بعض نے مسیحیت کو اختیار کیا ہُوا تھا لیکن بہ حیثیت ایک قوم اور نسل کے وُہ تذبذب کی حالت میں تھے کہ کس مذہب کو اختیار کریں۔ اُن کے نزدیک سچے مذہب کا واحد معیار طاقت، قوت، حشمت اور سلطنت ہی تھا۔ چنانچہ مارکو پولو لکھتا ہے "مونگولی یہ دیکھ رہے تھے کہ کس فرمانروا کو کامیابی نصیب ہوتی ہے اور خدا کس دین کو فتح بخشتا ہے تاکہ یہ عیاں ہوجائے کہ اُس کا خاص دین کونسا ہے مسیحیت یا اسلام؟ ایک دفعہ ایک مسیحی مونگولی حکمران قبلائی خاں سے باغی ہوگیا۔ جب دونوں میں جنگ ہُوئی تو وُہ اپنے جھنڈے پر صلیب آویزاں کرکے بڑی شان و شکوہ کے ساتھ میدان میں نکلا۔ وُہ اسی خیال میں تھا کہ چونکہ وُہ مسیحی ہے خُدا اُس کو فتح بخشیگا۔ لیکن اس کو شکستِ فاش نصیب ہُوئی۔ اس پر یہودی اور بُت پرست سب عیسائیوں کو طعنہ دینے لگے کہ دیکھو تمہارے خُدا نے اپنی صلیب کی یاوری نہ کی حالانکہ وُہ مسیح کا خادم اور سچا پرستار تھا لیکن اُس نے شکست پائی ہے پس تمہارا دین برحق نہیں۔ جب قبلائی خاں کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اُس نے سب کو بُلایا اور سب کی سرزنش کرکے کہا کہ تُم سب کو علم ہے کہ میرا مخالف باغی تھا پھر سچا خُدا ایک باغی کی مدد کس طرح کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی صلیب نے باغیوں کی مدد نہیں کی۔ وُہ سچا ہے اور باغیوں اور فسادیوں کا

کبھی ساتھ نہیں دیتا۔ پس ان عیسائیوں کی صلیب نے راستی کا ساتھ دیا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے قبلائی خاں سے پُوچھا کہ تُم خود کیوں مسیحی نہیں ہو جاتے؟ اُس نے جواب دیا کہ مَیں یہاں کے عیسائیوں میں کوئی طاقت اور قوت نہیں دیکھتا۔ اس کے برعکس مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ بُت پرست جو چاہتے ہیں اُس کو پُورا کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں حتّٰی کہ وُہ طوفانوں پر بھی قابو پا لیتے ہیں۔ اور ایسے عجائب کرشمے دکھاتے ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اُن کے بُت بولتے بھی ہیں اور آیندہ کی خبریں دیتے ہیں۔ اگر مَیں عیسائی ہو جاؤں اور میرے اُمرا مجھ سے پُوچھیں کہ تم نے اس دین میں کونسی اعجازی بات دیکھی ہے تو تم ہی بتلاؤ کہ مَیں اُن کو کیا جواب دے سکتا ہُوں؟ تم اپنے پوپ سے کہو کہ وُہ ایک سو ایسے آدمی میرے پاس بھیجے جو عالم ہوں اور اپنے کرشمے دکھا کر بُت پرستوں کو عاجز کر دیں اور یُوں اُن پر ثابت کر دیں کہ وُہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں اور مسیحی سچے خُدا کے پرستار ہیں۔ وُہ اپنی اعجازی طاقت سے اُن کی ارواح کو اپنے قابو میں لاکر ثابت کر سکتے ہیں کہ مسیحیوں کا خُدا ہی سچا خُدا ہے۔ جب وُہ ایسا کرینگے تو ہم بھی مسیحی دین کو قبول کر لینگے اور مَیں اور میرے اُمرا اور اعیانِ سلطنت معہ اپنے خدام و رعایا کے بپتسمہ پا لینگے۔ پھر تُم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ ممالکِ مشرق میں عیسائیوں کی تعداد مغربی ممالک سے بڑھ چڑھ کر ہوگی (سفرنامہ مارکو پولو)۔ قبلائی خاں کی اس تقریر سے ظاہر ہے کہ اُس کا خیال تھا کہ فتح اور شکست خُدا کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ اُن کو جو اُس کے منظورِ نظر ہوں فتح بخشتا ہے لیکن اُن کو جو اُس کے مغضوب ہوتے ہیں شکست دیتا ہے۔ منگو خاں اور ہلاگو خاں بھی اسی نظریہ کے قائل تھے۔

بالآخر جب ۱۲۶۰ء میں مصر کے مملوک سلطان کے ہاتھوں مونگولی افواج

ماتحت مسلمان بنا لیے گئے تھے۔ لیکن اسلامی سلطنتوں کے اور خلافت کے ختم ہو جانے کے باوجود یہ مسلمان پھر سابق مذہبوں کی طرف نہ لوٹے۔ وہ اسلام سے روگردان ہو کر نہ یہودی بنے اور نہ عیسائی ہوئے وہ نہ زرتشتی مذہب میں واپس گئے اور نہ انہوں نے بت پرستی کی طرف رجوع کیا۔ اب دائرہ اسلام میں تمام مغربی ایشیا کے ملکوں، قوموں اور نسلوں کے لوگ داخل تھے جو اپنے ساتھ اپنی رسوم، کلچر اور عقائد لے آئے تھے۔ اب رسول عرب کا مذہب ہی ایک واحد شے رہ گئی تھی جس نے ان متواتر زلزلوں اور جھٹکوں کے باوجود ان مختلف اجزا کو باہم مربوط کر رکھا تھا۔ یہ مسلمان اپنے آپ کو فخریہ عرب کہتے تھے گو وہ خالص عرب نہ تھے کیونکہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد غیر عرب تھی۔ وہ مختلف اقسام کے کلچروں کے وارث تھے لیکن اب خلط ملط ہو کر ایک ہی قوم بن گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حلقۂ اسلام میں ان کو کوئی ایسا تجربہ حاصل ہو گیا تھا جو زمانہ کے ساتھ ان کے رگ و خون میں بس گیا تھا۔ اور گو زمانہ کے حوادث نے سیاسی حالات کو پلٹ دیا تھا تاہم ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا بلکہ غیر مساعد حالات میں بھی قائم اور استوار رہا۔ مخالف حالات ایسے تھے کہ گیارھویں صدی کے وسط میں ہی دنیائے اسلام کے مرکزوں میں زوال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ابھی منگولی حملوں کا طوفان بغداد کے قریب بھی نہ آیا تھا جب اسلامی اخلاق و کردار کی سب بنیادیں ہل گئی تھیں جس نظام کے سیاسی ڈھانچوں کو ہلاگو خاں کی ضربوں نے بعد میں چکنا چور کر دیا تھا اس کا سماجی، اخلاقی اور روحانی جنازہ مدتوں پہلے نکل چکا تھا۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود یہ مختلف اقوام و ممالک کے لوگ اسلام پر قائم رہے۔ مسیحی کلیسیا کے لئے یہ جائے غور و عبرت ہے۔

نیز حقیقت ترک کر گئی تو ان کو یہ یقین ہو گیا کہ اسلام کا خدا زبردست طاقت والا خدا ہے۔ اور جب ۱۲۹۱ء میں عکہ (ACRE) فتح ہوا تو ان کو پکا یقین ہو گیا کہ مسیحیت کے خدا میں طاقت نہیں ورنہ صلیبی افواج کو ایسی زبردست شکست نہ ہوتی۔ اب انہوں نے یہ خیال دل سے نکال دیا کہ وہ مسیحی ہو کر اپنی طاقت اور سلطنت کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ منگولی افواج کی ترک کے بعد مسلمانوں نے عیسائیوں کو ان کے متکبرانہ سلوک کا مزا چکھا دیا۔ انہوں نے بے شمار مسیحیوں کو جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا بے دریغ تلوار کا لقمہ بنا دیا۔ جو بچ رہے وہ غلام بنا لیے گئے۔ ان کی عورتیں اور بہو بیٹیاں لونڈیاں ہو گئیں۔

ہلاگو نے اپنی عمر کے آخر میں ایک مسیحی راہب کو بلا کر کہا "میرے لیے دعا کرو تاکہ میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں یا اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں دغا سے ہلاک نہ کیا جاؤں۔ جب وہ ۱۲۶۵ء میں مر گیا تو یہ افواہ عام تھی کہ اس کو زہر دے دیا گیا ہے۔ جب ہلاگو نے عید قیامت کے موقعہ پر وفات پائی تو اس کی بیوی توزک خاتون نے ایک راہب کو بلا کر پوچھا کہ کیا اس کی روح کے لئے ماس "عشائے ربانی کی رسم" ادا کی جائے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی بجائے آپ غربا کو خیرات دیں۔ اس کی موت کے ایک سال بعد توزک خاتون بھی مر گئی۔ یہ مشہور تھا کہ دونوں کو زہر دیا گیا ہے۔ جب وہ مر گئے تو مسیحی کلیسیاؤں میں ماتم اور نوحہ کیا گیا۔

چنگیز اور اس کے جانشینوں نے اسلامی سلطنتوں اور بادشاہتوں کا خاتمہ کر دیا حتیٰ کہ خلافت بھی ختم ہو گئی لیکن یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ان منگولی زلزلوں کے جھٹکوں سے اسلام کو بہت ضعف نہ پہنچا۔ اسلام نے مختلف ممالک و اقوام کو زیر کر کے لاکھوں کو حلقہ بگوش کر لیا تھا۔ ان مسلمانوں میں زیادہ تعداد ذمیوں کی تھی جن کے آبا و اجداد جبریہ "یا قتل یا تلوار" کے

فصل چہارم

ایران کے ایل خانی بادشاہ

ہم گذشتہ فصل میں بتلا چکے ہیں کہ ہلاگو خاں نے ایران کے اُس خاندان کی بُنیاد ڈالی جس کو "ایل خان" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہلاگو اور اُس کے جانشینوں کے زمانہ کے حالات مسیحیت کی اشاعت کے لئے سازگار تھے۔ ہلاگو بغداد کی خلافت کو ختم کر چکا تھا۔ اُس کو مسیحیت سے اُنس تھا۔ اُس کے بعض جانشین مسیحیت کی طرف مائل تھے کیونکہ وُہ مُسلمانوں کو مغربی ایشیا میں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعض ایل خانی خاندان کے سِکّوں پر الفاظ "باپ۔ بیٹے اور رُوح القدس واحد خُدا کے نام سے" کندہ بھی ہیں لیکن کلیسیا نے اُن موافق حالات سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ اُن میں اَب کوئی ایسا شخص نہ تھا جو مسیحیت کے پیغام کو اور انجیل کی تعلیم کو ایسی شکل میں پیش کرتا جو اُن مسیحیوں کی اولاد کو واپس کلیسیا میں کو لوٹا لاتی جن کے آباؤ اجداد جبراً مُسلمان کر لئے گئے تھے۔ صدیوں کی غلامی آخر اپنے نتائج دکھلا رہی تھی اور اس پست ہمتی کا یہ نتیجہ ہُوا کہ کلیسیا میں کوئی مقدس یُوحنا ئے دمشقی جیسا تخلیقی دماغ پیدا نہ ہُوا جو اس نازک مرحلہ میں حالات کا جائزہ لے کر کلیسیا کی کایا پلٹ دیتا۔

(۱) اَباکا خان (از ۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۱ء)۔

اگرچہ اَباکا خان خود مسیحی نہ تھا لیکن اُس کی شادی قسطنطنیہ کے قیصر کی

بیٹی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس کا دربار عیسائیوں سے بھرا رہتا تھا۔ یورپ کے بعض مسیحی بادشاہوں نے اُس کے پاس وفد بھیجے تاکہ صلیبی جنگوں میں وُہ اُن کا اتحادی ہو جائے۔ وُہ مسیحیوں کو اچھی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس نے مُسلمانوں کو دوبارہ شکست فاش دی اور کیتھولی کوس ماردینہ اوّل کو پھر محل دارالّلہ دیدار دے دیا گیا۔

اَب جو عیسائیوں کو پھر سے طاقت حاصل ہُوئی تو اُنہوں نے ناعاقبت اندیشی کر کے مُسلم آزاری شروع کر دی اور انجیل کی تعلیم کو بالائے طاق رکھ دیا مثال کے طور پر جب ایک مسیحی مُرتد ہو کر مُسلمان ہو گیا تو کیتھولی کوس کے حُکم کے مطابق اُس کو دریائے دجلہ میں ڈبو دینے کی دھمکی دی گئی۔ مُسلمانوں نے علاؤ الدّین کو جو بغداد کا گورنر تھا جا کر اطلاع دی۔ اُس نے کیتھولی کوس کو کہا کہ قیدی کو رہا کر دو لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر مُسلمانوں کے ہجُوم نے کیتھولی کوس کے گھر کو گھیر لیا تاکہ اُس کو قتل کر ڈالیں۔ لیکن ماردینہ خفیہ راہ سے اربیل کو بھاگ گیا۔ جب ۱۲۷۱ء میں اسمٰعیلیوں نے علاؤ الدّین کو مار ڈالا تو مُسلمانوں نے بشپ پر اُس کو قتل کروا دینے کا الزام لگایا۔ اس پر مُسلمانوں نے تمام بشپوں اور قسیسوں کو قید کر لیا۔ اربیل کے گورنر نے کیتھولی کوس اور اُس کے بشپوں کو بعض ہفتوں زندان میں رکھا اور اُن کو سخت اذیت دی۔ نسطوری پیٹریارک نے لاچار ہو کر اپنی رہائش آذربائیجان سے مقام اشنو میں بدل لی۔ اس کے تین سال بعد ۱۲۷۴ء میں ایک نسطوری راہب ایک مُسلمان عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر مُسلمان ہو گیا۔ عیسائی راہبوں نے مونگولیوں سے شکایت کی جنہوں نے موصل جا کر مُرتد راہب کو پکڑ لیا۔ اس پر فتنہ برپا ہو گیا۔ مُسلمانوں نے ہجُوم کو برانگیختہ کر کے مُرتد کے واپس دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ مونگولیوں کو

اُن کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اُس کو رہا کر دیا گیا اور مسلمانوں نے بڑی دھوم دھام سے اُس کی سواری نکالی اور عیسائیوں کو نیچا ہونا پڑا۔ پھر مسلمانوں کے ہجوم نے عیسائیوں پر اچانک اُس وقت حملہ کر دیا جب وہ کرسمس کے اتوار کے روز منگولی فوج کی حفاظت میں جلوس نکال کر جا رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد عیسائیوں کا حوصلہ ایسا ٹوٹا کہ وہ گھر سے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔

اباکا خان مسلمانوں سے زیادہ عیسائیوں کو پسند کرتا تھا۔ ایسا کہ اُس نے ایک دفعہ حکم صادر کر دیا کہ سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کی بجائے یہودی اور مسیحی کلرک رکھے جائیں کیونکہ وہ زیادہ قابلیت کے مالک ہیں۔ اباکا کے وطیرہ کو دیکھ کر سلجوقیوں کا بادشاہ بیبرس منگولیوں کی حکومت کا مخالف اور اباکا کا دشمن ہو گیا تھا۔ اباکا نے اُس پر لشکر کشی کی۔ وہ یہ خبر سن کر بھاگ گیا لیکن جانے سے پہلے اُس نے عیسائیوں کا قتل عام کر دیا۔ اس مہم میں اباکا خاں کے ساتھ تیس ہزار کی فوج تھی جو اس کے حکم کے مطابق قیصریہ اور ارض رُوم کی وسعت میں پھیل گئی ہوئی تھی اور ہر طرف غارت اور تباہی مچا رہی تھی اور اس نے پانچ لاکھ آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ہر چند اباکا نے حکم دے رکھا تھا کہ کسی عیسائی پر تلوار نہ چلائی جائے لیکن فوجیوں نے عیسائی تاجروں کو لوٹ لیا اور بہت سے مرد و زن اور بچوں کو قید کر کے غلام بنا لیا۔ جب یہ خبر اباکا کو ملی تو اُس نے ایک قسیس اور ایک رہبان کو حکم دیا کہ وہ لشکر میں جا کر جہاں مسیحی قیدیوں اور غلاموں اور لونڈیوں کو پائیں اُن کو آزاد کر دیں۔ منگولی افواج مصری لشکر کا تعاقب کرتی گئیں اور مصریوں کو شکست فاش دے کر ہزاروں قیدیوں اور لوٹ کے مال کو لے کر واپس آئیں۔ ان قیدیوں میں پانچ ہزار کُردی اور اُن کے خاندان شامل تھے۔

اباکا خاں کے عہد میں ایک عیسائی گورنر موصل تھا جس کا نام مسعود تھا۔

اُس نے ایک ایرانی شخص پاپا کو اُس کی بداعمالیوں کی سزا میں قتل کرنا چاہا۔ پاپا نے مسعود اور اس کے اُدِگر مسیحی وزیر لیشمت کے خلاف شکایت کی۔ جب اباکا نے اصل معاملہ دریافت کرنے کے لئے آدمی بھیجے تو پاپا نے اُن کو بھاری رقم رشوت دے کر گورنر اور وزیر کو معزول کروا دیا اور خود گورنر ہو گیا اور سنہ ۱۲۸۰ء تک گورنر رہا۔ اس سال اباکا اصل حالات پر مطلع ہوا تو پاپا کو قتل کر دیا گیا اور مسعود اور لیشمت اپنے عہدوں پر بحال کر دیئے گئے۔

اباکا خان کے عہد میں آخری شاہ خوارزم کے ساقی کے بیٹے نے مصر کے سلطان سے مل کر سازباز کی تاکہ بغداد کے کیتھولی کوس اور مسیحیوں کا قتلِ عام ہو جائے۔ اُس کی تدبیر کارگر ہوئی۔ ساقی کے بیٹے کے کہنے سننے پر اباکا خاں نے حکم دیا کہ کیتھولی کوس قتل کر دیا جائے لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُس کو وقت پر اصل حقیقت کا پتہ لگ گیا اور کیتھولی کوس اور عیسائی بچ گئے لیکن عیسائی ہمیشہ ایسی سازشوں سے خائف ہی رہا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب مسیحیوں میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ علانیہ مسلمانوں کے شہروں میں رہ کر اپنی دینی رسوم بھی ادا کر سکیں۔ چنانچہ اس سال عید ظہور کا تہوار آیا لیکن اُن کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس تہوار کو منائیں۔ جب ہلاگو خاں کی بیوی کو تانی سماتون نے یہ سنا تو وہ خود مراغہ کے شہر کو گئی اور اُس نے حکم دیا کہ مسیحی اپنے قدیم دستور کے مطابق برچھیوں پر صلیبیں لگا کر جلوس نکالیں۔

سطور بالا سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ گو اباقا خاں اپنے باپ ہلاگو خان کی طرح مسیحیوں سے اُنس رکھتا تھا لیکن وقت ہی ایسا آ گیا تھا جب منگولی پہلی سی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ مسلمان ہر طرف سے اُن کے خلاف برپا ہو رہے تھے۔ انہوں نے منگولیوں کو عین جالوت کے مقام پر شکست دے دی تھی

جس کی وجہ سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اگرچہ کہنے کو تو رُوم کے سلجوق، مُوصل کے امیر اور کُردی پہاڑوں کے قبائل کے سردار اور دیگر مُسلمان اقوام اُن کے مطیع تھے لیکن وُہ مومن مُسلمان تھے جو کافر مونگولیوں کے وفادار نہیں ہو سکتے تھے۔ پس مونگولیوں کو اتحادیوں کی ضرورت تھی اور اُن کی نظریں مشرق و مغرب کے مسیحی ممالک اور کلیسیاؤں کی طرف اُٹھتی تھیں۔ جارجیا اور آرمینیا کے حکمران اُن کا ساتھ دینے کو ہمیشہ تیار رہتے کیونکہ اُنہوں سے مسلمان اُن کے خون کے پیاسے تھے۔ صلیبی جنگوں کی افواج بھی مونگولیوں کا ساتھ دینے کو تیار تھیں تاکہ وُہ شام میں جزیہ سے اور دیگر پابندیوں سے آزاد ہو کر مونگولیوں کے نائب السلطنت ہو کر رہ سکیں۔ اباکا کی مسیحی بیوی ماریہ بھی یہی چاہتی تھی کہ مغربی ممالک کے مسیحی اور مونگولی دونوں ایک دُوسرے کے حلیف ہو جائیں۔

ہم سطُورِ بالا میں بتلا چکے ہیں کہ مونگولی تذبذب کی حالت میں تھے کہ اسلام اور مسیحیت میں سے کس کو اختیار کریں۔ کبھی وُہ مسیحیوں کی طرف جُھکتے تھے اور کبھی مسلمانوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں بعض سکّے ہیں جو بغداد، اربیل، مُوصل اور تبریز میں ۱۲۶۶ء اور ۱۲۸۲ء کے درمیان سکوک ہوئے تھے۔ اُن میں سے بعض پر مونگولی زبان میں اباکا خاں کا نام ہے اور ان پر کلمۂ توحید "لا اِلٰہ اِلّا اللہ" کندہ ہے۔

(۲) احمد خاں (از ۱۲۸۱ء تا ۱۲۸۴ء):۔

اباکا خاں کی وصیّت کے مطابق اُس کا بڑا بیٹا ارغُون اُس کا جانشین ہونا چاہیئے تھا جس کو اُس نے خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن چنگیزی

قانون کے مطابق خاندان کا سب سے معمّر شخص تگودر بن ہلاگو تخت نشین ہُوا جو اباکا خاں کا بھائی تھا۔ تگودر خاں ہلاگو کی مسیحی بیوی کوتائی خانم کے بطن سے پیدا ہُوا تھا۔ وُہ عیسائی تھا اور اُس کا مسیحی نام نکولس تھا۔ اُس کی تخت نشینی کے وقت مبفری اتیس (یعقوبی) مشرقی کلیسیا کا سردارِ اعلیٰ اور بہت سے مسیحی قسیس اور سردار آئے اور اُس نے گرجاؤں اور مسیحی خانقاہوں کو اور اُن کے قسیسوں اور راہبوں اور عیسائیوں کے خراج ہر جگہ معاف کر دیئے۔ اور آذربائیجان، اسیریا اور مسوپوتامیہ میں گرجے تعمیر کرنے کی اجازت دی۔

۱۲۸۰ء میں مصر کے مُسلمانوں نے مونگولی افواج کو زبردست شکست دی تھی جس سے مونگولوں کے دِلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ عیسائیوں کے خُدا میں فتح عطا کرنے کی طاقت نہیں ہے کیونکہ اِس جنگ میں جارجیا کے پانچ ہزار مسیحی اور آرمینیا کے مسیحیوں کا دستہ شامل تھا۔ علاوہ ازیں مغربی ممالک کے مسیحی بھی اُن کے اتحادی ہو کر مُسلمانوں سے لڑ رہے تھے۔

یہ حالات دیکھ کر تگودر نے مسیحیت کو ترک کر دیا اور تخت نشینی کے بعد مُسلمان ہو گیا۔ اُس نے اپنا نام احمد رکھا اور اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا "بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ۔ بغداد کے رہنے والوں میں یہ اعلان کر دو کہ ہم بدولت اب مُسلمان ہیں۔۔۔ ان پر واجب ہے کہ مدرسوں اور وقف جائدادوں کو اور اپنے دین و مذہب کو اُسی طرح محفوظ رکھیں جس طرح وُہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں کرتے تھے۔ ہم اُن سب کی جو کسی قسم کی خیرات پاتے رہے ہیں اور سب غربا اور مساکین کی پرورش کرینگے۔ ہم مدرسوں اور مسجدوں کے اماموں کو اُن کے کام پر بحال کرتے ہیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ قرآنی اور شرعی احکام کی کہیں خلاف ورزی

ہونے نہ پائے۔ ہم کو علم ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ دینِ اسلام غالب ہو کر رہیگا۔ مخبرِ صادق کی یہ پیشنگوئی پوری ہو کر رہیگی"۔

جب تگودر مسلمان ہو گیا تو اُس کے ساتھ موگولیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا اور بعد دن کو اُس نے بڑے اعزاز اور انعام و اکرام دیئے اور اُنہوں نے مسیحیت کے استیصال پر کمر باندھ لی۔ تگودر (سلطان احمد خان) نے عیسائیوں کو سخت ترین عذاب دینے شروع کیے۔ اس ایذا رسانی میں بے شمار مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ کلیسیا کی حالت ایسی پست ہو گئی کہ دو عیسائی بشپ احمد کو اس کام پر اُکساتے تھے تاکہ وہ اُن کو کتبغولی کوس یحب اللہ کی جگہ دے دے۔ لیکن احمد خان کو اُن کے اصلی منشاء کا پتہ لگ گیا۔ اُس نے یحب اللہ کو زندان سے رہا کر دیا اور حکم دیا کہ دونوں بشپوں کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن یحب اللہ نے اُن کی جان بخشی کی سفارش کر کے اُن کی جان بچا لی۔ اور کلیسیائی قانون کے مطابق اُن کو بشپ کے عہدہ سے معزول اور کلیسیا سے خارج کر دیا۔ احمد خان کتبغولی کوس کی سفارش سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے ایذا رسانی بند کرنے کا حکم صادر کر دیا اور عیسائیوں کا دوست بن گیا۔ لیکن وہ سابق کی طرح اسلامی شریعت اور قرآنی احکام پر سختی سے عمل کرتا رہا۔

جب قبلائی خان کو اِس بات کا علم ہُوا کہ تگودر مسلمان ہو گیا ہے تو اُس نے اِس بات کو بہت بُرا منایا۔ مونگولیوں نے اِس کے خلاف بغاوت اختیار کی کیونکہ اُس نے مونگولی مسیحی قبائل کو ایذائیں پہنچائی تھیں، اور وہ قتل کر دیا گیا۔

۱۳،۳۔ ارغون خان (از ۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء): ارغون خان بن اباقا خان مسیحی

نہ تھا لیکن وہ مسیحیوں کا اور بالخصوص یحب اللہ کتبغولی کوس کا بڑا مداح تھا۔ اُس نے اپنے شاہی خیمہ کے پاس ایک اور خیمہ کھڑا کر وایا جس میں عشائے ربانی کی رسمِ عمل میں آتی تھی اور روزانہ مسیحی عبادتیں کی جاتی تھیں۔ اِس کے عہد میں تگودر کے وقت کی ایذا رسانی کا ردِ عمل یہ ہُوا کہ اُس نے اُن مسلمانوں کو دربار سے نکال دیا جن کی مدد سے تگودر نے اُس کے باپ اباقا خان کا تخت حاصل کر لیا تھا۔

عیسائیوں کا خیال تھا کہ اُس کے زمانہ میں کلیسیا کو چین سا عطا ہو گی لیکن یہ آرام تھوڑے دنوں کا ہی تھا۔ ارغون کا دوست بوقہ اُس کا معتمدِ اعلیٰ تھا۔ بوقہ کے حاسدوں نے اُس پر طرح طرح کے الزام تراشے۔ عبد المومن نے اُس کو حراست میں لے لیا اور مسیحیوں پر سخت مظالم ہونے شروع ہو گئے۔ اربیل کی کلیسیا کے رکنِ اعلیٰ کے بیٹے کو شکنجہ میں کھینچا گیا اور اُس کو عذاب دیا گیا۔ لیکن وہ پچاس ہزار دینار دے کر وہاں سے فرار ہو گیا اور دریائے دجلہ کو عبور کر کے اُس نے اپنی جان بچا لی چونکہ وہ خود بیمار تھا لہٰذا اُس کو عذاب نہ دیا گیا۔ لیکن اس سے بارہ تمن سونا لے لیا گیا اور زد و کوب کر کے اُس کو اربیل لے گئے جہاں اُس کو ۱۲۹۷ء میں قتل کر دیا گیا۔ اُس کے بیٹے کو قید کر کے لوہے سے داغ دیا گیا۔ مسیحیوں کی ہر جانب سے آفت آ گئی۔ ایک جوان مسیحی پر ایک مسلمان عورت سے زنا کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا اور اُس کو قتل کر دیا گیا۔ اُس کی مُردہ لاش کو گلیوں میں گھسیٹا گیا اور اُس کو اُن بستیوں میں جہاں گرجے اور مسیحی تھے نیزہ پر لٹکایا گیا۔ دو ماہ تک ایسی ایذا رسانی جاری رہی کہ الامان والحفیظ۔

مسولپوٹامیا اور اُس کی سرحدوں میں رہنے والے مسیحیوں پر اس سے بھی کئی گنا زیادہ آفتیں ٹوٹ پڑیں۔ اسلامی لشکر دریائے دجلہ پار کر کے واسیترا میں گھس گئے جو نسطوری مسیحیوں کا گڑھ تھا۔ انہوں نے قصبہ پر قبضہ کر لیا اور پانچ سو عیسائیوں کو تلوار کا لقمہ بنا کر ایک ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کو اور بکریوں بیلوں وغیرہ کو لے گئے۔ انہی ایام میں قرکین کے گورنر نے مسیحیوں پر ہاتھ ڈالا اور حملہ کر کے مار کوما کی خانقاہ کو برباد کر دیا۔ ایک راہب وہاں سے بھاگ کر ارغون کے دربار میں جا فریادی ہوا جس نے گورنر کو اُس کے کردار کی پاداش میں قتل کر دیا۔

[illegible] بادشاہ بوکہ کا بھی خیرخواہ اور دوست تھا۔ جب بوکہ کے اقبال کا ستارہ ڈوب گیا تو اُس کی شامت آ گئی۔ وہ دربار میں طلب کیا گیا۔ طلبی کی خبر پا کر اُس نے کیتھولی کوس بشپوں۔ راہبوں۔ قسیسوں اور کلیسیا کے ارکان کو بلا کر کہا "اب تک تو خدا کا فضل میرے شامل حال رہا ہے۔ منجی جہان کے کرم نے اور آپ لوگوں کی دعاؤں نے ہمارے ملک کو کشت و خون سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر میں دربار میں نہ گیا تو خان مجھے قتل کر دیگا اور مسیحیوں کا قتل عام کر دیا جائیگا اور جو بچ رہینگے وہ غلام اور لونڈیاں بنالی جائینگی۔ ہمارے گرجے اور مقدس مقامات سب کے سب تباہ و غارت ہو جائینگے۔ میں نے تم کو جمع کیا ہے تاکہ تم مجھے صلاح دو کہ میں کیا کروں۔" انہوں نے بیک زبان کہا کہ آپ نہ جائیے۔ خدا خود ہمارے گلے اور اپنی کلیسیا کا محافظ ہے۔ ہم کو کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا جو آپ کی جگہ لینے کے قابل ہو۔ اگر آپ قتل کر دیئے گئے تو ملک ویران ہو جائیگا۔ ہم آپ کو اپنی وفاداری کا یقین

دلاتے ہیں لیکن جارجیا کے بادشاہ نے کہا کہ یہ بہتر ہے کہ میری جان ضائع ہو جائے لیکن میرا ملک و قوم اور کلیسیا غارت نہ ہو۔ یہ سن کر کیتھولی کوس اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر ارغون خاں کے پاس چلا گیا۔ ارغون نے اس کو دیکھتے ہی قید کر لیا اور بیدوں سے اس قدر پٹوایا کہ وہ شہید ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۲۸۹ء کا ہے۔

ارغون نے مرنے سے چند ماہ پیشتر نکولس چہارم اور شاہ انگلستان ایڈورڈ کو ۱۲۹۱ء میں خطوط بھیجے تاکہ وہ اُس کے اتحادی بن کر ملک شام پر چڑھائی کریں۔ دونوں بادشاہوں نے اس سے اتحاد کر کے صلیبی جنگوں کے لئے زر اور لشکر بھیجے اور ارغون کو مسیحیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ رُوم کے پوپ نے بھی اُس کو مسیحی ہو جانے کی دعوت دی۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر میں نے فتح حاصل کر لی تو میں ضرور مسیحی ہو جاؤنگا۔ ارغون کو کسی مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ نہ تو اسلام کی طرف مائل تھا اور نہ مسیحیت کی پروا کرتا تھا۔ لیکن مصلحت وقت کو دیکھ کر اُس نے میٹروپولیٹن کی بڑی عزت و تکریم کی اور اُس سے عرض کی کہ آپ خیمہ عبادت کی تقدیس کر دیں۔ اِس رسم تقدیس میں بارہ (۱۲) بشپ بھی شریک تھے۔ ارغون نے خود گرجا کا گھنٹہ بجایا اور سب کو مجبور کیا کہ میٹروپولیٹن سے برکت لیں۔ اُس کے عہد کے ایک سکہ پر یہ الفاظ کندہ ہیں "باپ۔ بیٹے اور رُوح القدس کے نام سے"۔ یہ سکہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

اس کی موت سے پہلے اس کی دو بیویاں۔ ارک خاتون اور اُس کا بیٹا نکولس جس کا نام بعد میں "خربندہ" پڑ گیا بپتسمہ پا کر مسیحی ہو چکے تھے اور مسیحیت تاتاری علاقہ میں ترقی کر رہی تھی۔

(۴) گیخاتو (از ۱۲۹۱ء تا ۱۲۹۵ء) :-

جب یہ بادشاہ تخت نشین ہوا تو کلیسیا کو چندے آرام حاصل ہوا۔ وہ فیاضی کو کام میں لا کر کلیسیا کو زر و مال عطا کرتا تھا۔ لیکن شومئی قسمت سے اسی سال اسلامی افواج نے عکہ فتح کر لیا جو صلیبی جنگ کرنے والوں کا آخری گڑھ تھا۔ اس فتح سے مونگولی حکمران خاندان کے ذہنوں میں یہ بات کالنقش فی الحجر ہو گئی کہ مغرب کی مسیحی سلطنتوں کا خدا کوئی قدرت نہیں رکھتا جس کی وجہ سے صلیبی جنگ کرنے والوں کو شکست پر شکست ملتی ہے۔ اس کے اگلے سال سلطان مصر نے قلعہ الروم کو فتح کر لیا جو آرمینیا کے پیٹریارک کا صدر مقام تھا۔ پیٹریارک قید کر لیا گیا۔ گرجے برباد کر دیئے گئے اور آرمینی اور مونگولی افواج تہ تیغ کر دی گئیں۔ ان فتوحات نے مشرق کی کلیسیاؤں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مونگولیوں کے دل مسیحیت کی طرف سے پھر گئے اور اسلام کی طرف مائل ہو گئے کیونکہ اب ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اسلام کا خدا قدرت والا خدا ہے پس اسلام برحق اور مسیحیت باطل ہے۔

(۵) غازان محمود (از ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء) :-

جب گیخاتو فوت ہو گیا تو بیدو خان تخت نشین ہوا۔ بیدو خان مسیحیت کا شیدائی تھا پس اس نے کوشش کی کہ مونگولی قبائل میں اسلام کی اشاعت ہونے نہ پائے پس اس نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو ممنوع قرار دے دیا لیکن وہ ایک سال بھی حکومت نہ کرنے پایا تھا کہ وہ مارا گیا۔ اور دشمنِ اسلام کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

اس کے بعد ارغون کا بیٹا غازان تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر ۲۴ سال کی

تھی جب اس کا دادا اباکا خان مر گیا تھا ان ایام میں وہ مسیحی تھا لیکن اس کی تربیت بدھ مت میں ہوئی تھی۔ وہ اپنا وقت زیادہ تر بھکشوؤں میں گذارتا تھا جو ایک بڑی تعداد میں ایران میں تھے۔ اس کو مذہبی مناظروں کا بھی بڑا شوق تھا۔

جب بیدو خان مارا گیا تو مونگولیوں نے جن کے دل مسیحیت کی جانب سے پھر گئے تھے اس کو کہا کہ اگر تم مسیحیت کو ترک کر کے اسلام اختیار کر لو تو ہم تمہارا ساتھ دینگے۔ پس اپنی تخت نشینی کے دو سال بعد ۲ نومبر ۱۲۹۷ء کے روز اس نے مع اپنے خاندان کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے امراء، فوج کے افسر اور سپاہی بھی مسلمان ہو گئے۔ اپنے حامی مسلمانوں کو خوش کرنے کی خاطر اس نے عیسائیوں کو سخت سے سخت عقوبتیں دیں۔ گرجاؤں کو مسمار کر دیا تمام مسیحی عبادتوں اور عشائے ربانی کی رسم کو ادا کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ گرجاؤں کے گھنٹے بجنے بھی جاتونا بند کر دیئے گئے۔ اس نے قسیسوں، دین کے ہادیوں اور راہبانِ کلیسیا کو چن چن کر شہید کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی مسیحی زنار باندھے بغیر کسی شاہراہ پر نظر نہ آئے۔ عوام نے بھی مسیحیوں سے ان تمام مصائب کا بدلہ لینا شروع کیا جو ہلاکو اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں مسلمانوں پر نازل ہوئی تھیں۔ تبریز کے تمام گرجے مسمار کر دیئے گئے اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں عیسائیوں پر ظلم و ستم ہونے لگے۔ نہ کوئی داد تھی نہ فریاد۔ عوام الناس کو کھلی اجازت تھی کہ وہ ہر جگہ گرجے مسمار کر دیں اور لوٹ اور غارت مچا دیں۔ عیسائیوں کے گھر وار کو برباد کر دیں اور جو مال وہ لوٹ میں حاصل کریں گے وہ ان کا اپنا مال تصور کیا جائیگا۔ بغداد کے مسیحی خاص طور پر اس ستمرانی کا نشانہ بنائے گئے۔ مسلمان عیسائیوں کو طعنہ دے کر کہتے تھے "اب بتاؤ۔

تمہارا خدا کہاں ہے؟ اگر اس میں کوئی قدرت ہے تو وہ تم کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے کیوں چھڑا نہیں لیتا؟ بے شمار عیسائی زندانوں میں ڈال دیئے گئے۔ اُن کی بیویاں، بہو بیٹیاں اور لڑکے لونڈیاں اور غلام بنا لیے گئے۔ کوئی عیسائی گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ صرف عورتیں ہی ہمت کر کے بازار سے سودا سلف خرید لاتی تھیں کیونکہ اُن کے لباس میں اور مسلمان عورتوں کے لباس میں کوئی فرق نہ تھا۔ غازان نے ایک فرمان کے ذریعے حکم دیا کہ تمام گرجاؤں کو منہدم کر دیا جائے۔ نسطوری، یعقوبی، اور دیگر مسیحی گرجاؤں کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے اربیل کے دو بڑے خوبصورت گرجاؤں کو مسمار کر دیا۔ یہ خبر پا کر موصل کے مسیحیوں میں پریشانی پھیل گئی۔ اور انہوں نے بڑی بڑی رقمیں رشوت دے کر اپنے گرجاؤں کو بچا لیا لیکن پھر بھی اُن کے گرجاؤں کے مقدس برتن، صلیبیں اور تمام سامان لوٹ لیا گیا۔ صرف گرجاؤں کی عمارتیں ہی محفوظ رہ گئیں۔ موصل کے مضافات کے مسیحیوں نے ۱۵ ہزار دینار دے کر اپنے گرجاؤں کو بچا لیا۔ پیٹر یارک ہیبکیہ نے بغداد کے اس محل میں ایک گرجا بنوایا تھا جو ہلاکو نے اس کو دیا تھا۔ یہ گرجا بھی مسمار کر دیا گیا۔ یہ ایذا رسانی بالخصوص بغداد، موصل، ہمیان، ہمدان اور مراغہ میں ایسی سخت ہوئی کہ الٰہی توبہ۔ آرمینیا کے گرجاؤں اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ مراغہ کے نسطوری کیتھولی کوس یحییٰ اللہ کو قید کر لیا گیا۔ اور اس کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ آرمینیا کا بادشاہ ہیتھون خود غازان خان کے پاس گیا اور بصد مشکل ایک بڑی رقم فدیہ میں دے کر اس نے کیتھولی کوس کو رہا کرایا۔ یہ ایذا رسانی مسلسل چار سال تک جاری رہی۔ اس میں بہت سے نفیس قتل کر دیئے گئے۔ بشپوں کو شکنجہ میں کھینچا گیا۔ غازان ویسے بھی

بے رحم شخص تھا چنانچہ اُس کے وزیر رشید الدین کی کتاب کا بمشکل کوئی صفحہ ہوگا جہاں کسی نہ کسی افسر کے قتل کا ذکر نہ ہو۔ لیکن ساتھ ہی وہ لکھتا ہے کہ غازان خان بڑا پکا اور دین دار مسلمان بادشاہ تھا جو قبروں اور مسجدوں کی زیارت کیا کرتا تھا۔ غازان خان کے تمام جانشین مسلمان تھے پس ایران میں کلیسیاؤں کی رہی سہی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

(۲) اُلجایتو (از ۱۳۰۴ء تا ۱۳۱۶ء):۔

اُلجایتو کی ماں ایک پارسا اور عابدہ مسیحی خاتون تھی جس کے زیر اثر اس نے مسیحیت کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اُس کا نام نکولس تھا لیکن ماں کے مرنے کے بعد جب وہ ابھی جوان ہی تھا تو اس نے اپنی مسلمان بیوی کے زیر اثر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُس کا نام محمد خدابندہ رکھا گیا۔ جب وہ شیعہ ہو گیا تو سُنیوں نے اس کا نام "خربندہ" رکھ دیا!۔

ابن بطوطہ ہم کو بتلاتا ہے کہ بہت سے مونگل اُس کا نمونہ اختیار کر کے مسلمان ہو گئے اور اُس کے عہد سے ایل خانی خاندان کی سلطنت کے بیشتر حصے کا مذہب اسلام ہو گیا۔

اسلام اختیار کرنے کے بعد اُلجایتو نے مسیحیوں کو عذاب دینے شروع کر دیئے۔ مسلمان علما اور فقہا کے اُکسانے پر اُس نے حکم صادر کیا کہ جب تک بادشاہ اور اُس کے تمام مسیحی باشندے سب کے سب اسلام قبول کریں اور اپنے ہاتھوں خود اپنے گرجے مسمار کریں۔ جب بادشاہ کا یہ حکمنامہ پہنچا تو اس نے اپنے ارکان دولت، بشپوں اور قسیسوں کو فراہم کیا اور کہا "تم سب میرے ہمراہ خان کے پاس چلو۔ وہاں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو اور شہدا کی فوج کو

ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھو"۔ جب وہ شاہی دربار میں گیا تو اُس نے خان کو کہا۔ آپ نے مجھ کو اور اپنی سلطنت کے تمام مسیحی والیوں کے نام حکم نامہ بھیجا ہے کہ ہم اپنے مسیحی ایمان کا انکار کر کے اسلام کو قبول کر لیں۔ لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ لیجئے میری گردن حاضر ہے"۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ اُس کے دلیرانہ رویّہ کو دیکھ کر خان کو اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آ گیا اور اُس نے بادشاہ کی توقیر کی اور اپنے حکم سے پچھتایا لیکن دیگر مصنّف کہتے ہیں کہ اُس نے بادشاہ کو سخت ترین عذاب دینے کے بعد شہید کر دیا۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس نے حکم دیا کہ عیسائیوں سے جزیہ اور خراج وصول کیا جائے۔ مسلمان اُن کو جہاں کہیں دیکھ پائیں اُن کے گالوں پر طمانچے ماریں اور اُن کی داڑھیاں نوچ لیں۔ حکم ہوا کہ عیسائیوں کے دائیں کندھے لوہے سے داغ دیئے جائیں۔ ہر شہر، قصبہ اور گاؤں کے گرجاؤں میں عبادتیں کرنا حکماً بند ہو گیا۔ مسیحی والدین کے بچوں کو بپتسمہ دینے کی ممانعت کر دی گئی۔ غرضیکہ ہر ممکن طور پر یہ کوشش کی گئی کہ کلیسیاؤں کے شرکا جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ لیکن اِن تمام کوششوں اور ستم رانیوں کے باوجود بیشمار مسیحی اپنے ایمان پر قائم رہے۔ اس پر خدا بندہ جھنجھلا اٹھا اور اُس نے حکم دیا کہ جو مسیحی اسلام قبول نہیں کرتے، اُن کے اعضائے تناسل کاٹ دیئے جائیں اور ہر شخص کی ایک آنکھ نکال دی جائے۔ بے شمار مسیحیوں نے اُن عقوبتوں کی صبر آزما حالات میں برداشت کی اور انہوں نے اپنے خون سے اپنے ایمان پر مُہر لگا دی۔

(۷) ابو سعید خان (از ۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۵ء):۔

ابو سعید کے عہد میں ایران کے ایل خانی خاندان کو زوال پہنچنا شروع

ہو گیا۔ اس زوال کے اسباب وہی تھے جنہوں نے خلفائے عباسیہ کی حکومت کو تباہ کر دیا تھا۔ فوج کے جرنیلوں اور سلطنت کے اُمراء و وزراء میں باہم حریفانہ کشمکش پیدا ہو گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ابو سعید کی موت کے بعد اس خاندان کے فرمانروا اعیانِ سلطنت کے کھلونے بن گئے۔

گو سلطنت میں زوال آ رہا تھا پھر بھی ابو سعید مسیحی کلیسیاؤں کو ایذا دینے سے نہ چوکا۔ چنانچہ تخت نشینی کے ایک سال بعد ۱۳۱۷ء میں دیار بکر کے مسیحیوں کو سخت سے سخت عقوبتوں کے بعد شہید کر دیا گیا۔ بارہ ہزار آدمیوں کو قید کر کے غلام اور لونڈی بنائے گئے۔ بشپ مار گیوریس کو عذاب دے کر قتل کر دیا گیا۔ گرجاؤں کو آگ لگا دی گئی۔ عیسائیوں کے گھروں کو لوٹ کر ویرانہ بنا دیا گیا اور کلیسیائیں پراگندہ ہو گئیں۔

جب چغتائی خان کی قائم کردہ سلطنت کو بھی زوال آیا تو اُس کی سلطنت کا مشرقی حصہ خود مختار ہو گیا۔ اُس کا بادشاہ محمد خان پندرھویں صدی کے شروع میں مسلمان ہو گیا اور اُس نے اسلام قبول کرنے کے بعد ۱۴۱۶ء میں متعدد مونگولی قبائل کو جبراً حلقہ اسلام میں داخل کیا اور جو اسلام قبول نہیں کرتے تھے تو اُن کی کھوپڑیوں میں گھوڑوں کے پاؤں کی نعلیں ٹھوک دیتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار مونگول اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور انہوں نے مسیح کا انکار کر دیا۔

ایل خانی سلطنت کی ابتری کے ایام میں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے مسیحی مقامی مسلمانوں کے رحم پر تھے۔ ۱۳۶۹ء اور ۱۳۸۰ء کے درمیان قسطوری کیتھولی کوس کی اسامی خالی رہی بلکہ اس کے بعد کے زمانہ میں چودھویں صدی کے آخر میں بھی یہ عہدہ اکثر خالی رہا۔ میتھری اینیس کا عہدہ بھی ۱۳۷۹ء تک

سنہ ۱۳۴۰ء تک یہ پچیس برس تک خالی رہا۔

اس شاہی خاندان کی حکومت کے دوران میں فرانسسکی اور ڈومنکی راہب اس کی سلطنت میں آ گئے۔ سنہ ۱۳۱۸ء میں شہر سلطانیہ جو الجائتو نے تعمیر کیا تھا، رومی کلیسیا کے ایک آرچ بشپ کا صدر مقام تھا۔ رومی کلیسیا نے ایل خانی سلطنت کی حدود کے باہر بھی وسط ایشیا میں اپنے مبلغین بھیجے چنانچہ سنہ ۱۳۳۹ء میں ایک بشپ اور نصف درجن راہب شہید کر دیئے گئے۔ اس کے اگلے سال مارینیولی کے جان (JOHN OF MARIGNOLLI) نے وہاں جا کر عیسائیت قبول کرنے والوں کو بپتسمے دیئے اور ایک گرجا بھی تعمیر کیا۔ اس سلطنت کے متعلق آخری بات جو تاریخ ہم کو بتلاتی ہے یہ ہے کہ سنہ ۱۳۶۲ء میں رومی کلیسیا کے مبلغ اور مسیحی سب کے سب شہید کر دیئے گئے۔

فصل پنجم

قبائلِ ترک اور آلِ سلجوق

ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ ترک قبائل وسط ایشیا کے رہنے والے تھے۔ ترکوں نے پہلے پہل اسلامی حکومت میں خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں داخل ہونا شروع کیا اور نمایاں حصہ لینا شروع کیا۔ ہارون نے بعض ترک شجاعوں کو اپنی فوج میں افسر بنایا۔ اس کے بعد خلیفہ معتصم نے سنہ ۸۳۳ء اور سنہ ۸۴۲ء کے درمیان ایک پلٹن بنائی جو صرف ترکوں پر ہی مشتمل تھی۔ اس پلٹن میں تین ہزار ترک تھے جو اس کے باڈی گارڈ تھے پس قدرتاً ان کو رفتہ رفتہ اقتدار حاصل ہوتا

گیا۔ ان کا شمار فوج میں بڑھتا گیا اور وہ فوج کے ہر حصہ اور ہر شعبہ میں ایک زبردست اکثریت ہو گئے۔ جوں جوں ترکی قبائل کو ان ترکی لشکریوں کی عزت، دولت اور حشمت و مرتبہ کا پتہ لگتا گیا وہ زیادہ تعداد میں خلیفہ کی مملکت کی حدود میں نقل مکانی کر کے آنے لگے۔ جب خلفائے عباسیہ نے دیکھا کہ ترکوں کا اقتدار حد سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے تو انھوں نے بہت سے غلاموں کو فوج میں بھرتی کر لیا کیونکہ ان غلاموں کے کوئی رشتہ دار نہیں ہوتے تھے اور ان کی بہبودی خلیفہ وقت کی ذات سے وابستہ تھی۔ منشا کا خیال تھا کہ وہ ان کے ذریعہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو توڑ دیں گے۔ لیکن غلام طبقہ خود غرض اور مطلب پرست ہوتا ہے۔ پس بہ ضرورت یہ حالت یہ ہو گئی کہ اصل اقتدار ترکوں کے ہاتھ آ گیا اور خلیفہ وقت ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ اس کی حیثیت محض روحانی رہ گئی۔ ترک بطور دیوانی کارروائی کرتے تھے۔ خود سر ریاستیں یکے بعد دیگرے قائم ہوتی گئیں یہاں تک کہ ملک افسوسناک حد تک پہنچ گئی۔ مصر میں فاطمیین۔ شام اور عراق عرب میں آلِ حمدان، مشرق میں آلِ سامان اور بنی طاہر کی حکومتیں تھیں جن پر ترک آہستہ آہستہ غلبہ پا رہے تھے۔

(۲)

ایران کے سامانی خاندان کے بادشاہ سنہ ۸۷۴ء سے سنہ ۹۹۹ء تک مغربی ترکوں پر حکمران تھے جن کے دو شہر سمرقند اور بخارا اسلامی دنیا میں علم و ادب کے مرکز تھے۔ سامانی شہر بلخ کا ایک سردار تھا جس نے خلیفہ مامون کے زمانہ میں اسد بن عبد اللہ گورنر خراسان کے ہاتھ سے اسلام اختیار کر لیا تھا۔ اس خاندان کی حکومت ماوراء النہر میں بہت مستحکم تھی۔ اور اس کے

زمانۂ حکومت میں ترکوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی کیونکہ ترک ان بادشاہوں کے غلام اور ان کی زیرِ حکومت تھے اور وہ ان بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلمان ہو گئے اور رفتہ رفتہ اقتدار حاصل کر کے امورِ سلطنت میں دخل دینے لگ گئے۔ نصف صدی کے اندر اندر ان بادشاہوں کی حکومت صرف ماوراء النہر اور خراسان تک ہی محدود ہو گئی۔ اُن کے ترکی غلاموں نے ان سے طاقت چھین لی اور خود مختار بادشاہ ہو گئے۔ ایک ترکی بادشاہت دریائے آکسس کے شمال کے علاقہ میں قائم ہو گئی جو ایلک خانی کہلاتی ہے اور دوسری افغانستان میں قائم ہو گئی۔ ان ترکی غلاموں میں ایک الپتگین تھا جس نے بعد میں غزنوی حکومت کی بنیاد ڈالی، جو ۹۹۴ء میں ماوراء النہر کے جنوبی حصّہ پر قابض ہو گیا۔ غزنوی سلطنت کا سب سے مشہور بادشاہ محمود غزنوی تھا جس کی سلطنت لاہور سے اصفہان تک تھی۔ بلکہ اس کی تاریخ میں ایک ایسا زمانہ آیا جب آکسس سے پرے سمرقند اور بخارا بھی اس خاندان کے قبضہ میں تھا۔

(۳)

اسلامی حکومت کی تاریخ میں ترک سلجوقیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس وقت یہ رونما ہوئے حکومت خلافت کی وسیع مملکت ختم ہو چکی تھی اور متعدد خاندانوں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ اُس زمانہ میں مصر کی صرف فاطمی حکومت ہی ایک حکومت تھی جو واقعی شاہانہ اقتدار رکھتی تھی۔ ایسے وقت میں ترک سلجوقیوں کے حملے شروع ہوئے۔

سلجوق اس قبیلہ کا جدِ امجد تھا۔ سلجوقیوں کو سبکتگین (از ۹۷۰ء تا ۹۹۰ء) نے اپنی فوج میں ملازم کر رکھا تھا۔ جب ۹۹۷ء میں محمود غزنوی تخت نشین ہوا

اور خلیفہ قادر نے اس کو خراسان اور غزنی کا سلطان تسلیم کر لیا تو سلجوقی مختلف اسلامی ریاستوں میں صاحبِ اقتدار ہو گئے۔ دسویں صدی کے آخر میں سلجوق اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ بخارا کے میدانوں کی جانب چلا گیا اور وہیں فوت ہو گیا۔ اس کا لڑکا مائیکل اس کا جانشین ہوا۔ یہ نام ثابت کرتا ہے کہ وہ مسیحی تھا۔ سلجوقی مسلمان ہو گئے لیکن جیسا ایک مسلمان مؤرخ لکھتا ہے "یہ خانہ بدوش لوگ تہذیب و تمدن سے ناواقف تھے اور مذہب کا بھی کوئی صحیح تصوّر ان کے سامنے نہ تھا"۔ جب یہ مسلمان ہوئے تو تازہ مذہبی جوش کے زیرِ اثر محمود کی موت کے بعد انہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے افغانستان کی مغربی حدود سے لے کر بحرِ روم تک ایک وسیع سلطنت قائم کر دی جس کا فرمانروا ایک ہی تھا۔ انہوں نے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دی اور مجاہدینِ اسلام کی ایک زبردست پُر جوش جماعت پیدا کر کے بازنطینی حکومت کے خلاف ایک آہنی دیوار قائم کر کے عیسائیوں کی صلیبی جنگوں میں فتح حاصل کرنی ناممکن بنا دی۔

(۴)

سلجوق کے بیٹوں اور پوتوں نے اُن لڑائیوں میں نمایاں حصّہ لیا جو سامانیوں، ایلک خانیوں اور غزنویوں میں ہو رہی تھیں۔ سلجوق کے بیٹے طغرل بیگ اور چغر بیگ نے خراسان پر حملہ کر کے غزنوی فوجوں کو شکست دی چنانچہ ۱۰۳۷ء میں چغر بیگ کے نام کا خطبہ مرو کی مسجدوں میں اور طغرل بیگ کے نام کا خطبہ نیشاپور میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد ہی اُن کا بلخ۔ جرجان۔ طبرستان اور خوارزم پر قبضہ ہو گیا اور ۱۰۴۰ء اور ۱۰۴۵ء کے درمیان جبال۔ ہمدان۔ دینور۔ حلوان رے اور اصفہان اس سلطنت میں شامل ہو گئے۔ ۱۰۵۵ء میں طغرل بغداد میں داخل ہوا جہاں عباسی خلیفہ قائم تختِ خلافت پر تھا وہاں طغرل نے اپنے نام کا

خطبہ پڑھوایا۔ الغرض سلاجقہ کی کامیابی ایک سیلاب کی مانند آئی اور تمام مغربی ایشیا میں افغانستان کی سرحد سے لے کر ارض رُوم کی یُونانی مسیحی حکومت اور مصر کی فاطمی حکومت تک ۱۰۷۲ء سے پہلے ایک زبردست اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ سلجوقی ایشیائے کوچک سے نکل کر بلقان کے ممالک اور بحر اسود کے کنارے تک فتح کرتے چلے گئے۔ اُنہوں نے ملک سردیا کو کچل دیا اور ہنگری کی جانب نکل گئے۔ دُنیا بھر میں ان کی پیادہ فوج سے بہتر کوئی فوج نہ تھی۔ اُنہوں نے لیونٹ کے مُلکوں کی عورتوں سے ازدواجی تعلقات پیدا کر کے یُونانی اور سلیوو مسیحی عورتوں سے (جو اب اُن کی لونڈیاں تھیں) ایک نئی نسل پیدا کر دی۔

بغداد کی فتح کے بعد طغرل نے ایران۔ کاکیشیا۔ جارجیا اور آرمینیا پر حملہ کیا اور ان ممالک کی مسیحی کلیسیاؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن چونکہ مسیحیت ان ممالک کا قومی مذہب تھا ان حملوں کے باوجود مسیحیت یہاں زندہ رہی۔ جب طغرل مرگیا تو اُس کے بھائی چغر بیگ کا بیٹا الپ ارسلان (یعنی فاتح شیر) تخت نشین ہُوا۔ وہ نہایت جوشیلا مسلمان تھا جو کلیسیاؤں کی بیخکنی پر تُلا ہُوا تھا۔ چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ مسیحیوں کو جبراً حلقۂ اسلام میں شامل کر لیا جائے۔ جو مسیحی اپنے ایمان پر قائم رہے اُن کو طرح طرح کے عذاب دیئے گئے۔ ان میں سے بیشمار مسلمان ہوگئے اور جو بچ رہے اُن کے گلے میں لوہے کا بڑا اور وزنی طوق ڈال دیا گیا۔

الپ ارسلان کے بعد سلجوقیوں کی وسیع سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اس خاندان کا آخری فرمانروا سنجر ۱۱۵۷ء میں مرگیا۔ مشرق میں سلجوقی حکومت کو خوارزم شاہ نے ختم کر دیا۔ آذربائیجان۔ فارس۔ عراق وغیرہ دیگر میں سلجوقی افسروں نے اور اتابکوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنالیں۔ ارضِ رُوم کی مسیحی

حکومت عثمانی ترکوں کی آمد (۱۳۰۰ء) تک قائم رہی۔

(۵)

ترکستان میں اسلام بڑی سُرعت کے ساتھ پھیل گیا۔ ابتدا میں اس کی وجہ زیادہ تر سامانی فتوحات تھیں۔ مسلمان ہر چہار طرف تعداد میں بڑھتے چلے گئے۔ جو ترک قبیلے مسیحی ہو گئے تھے وہ بھی ۱۰۴۳ء میں اسلام میں جا داخل ہوگئے اور اب ہر جگہ مسجدیں اور ان کے مینار ہی نظر آنے لگے۔ ہر شہر اور بڑے قصبہ کے افسر مسلمان تھے جن کے اثر اور اقتدار کی وجہ سے اسلام سیلاب کی مانند بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ دسویں صدی کے آخر میں مشرقی اور مغربی ترکستان میں اسلام غالب مذہب ہوگیا اور مسیحیت رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ چنانچہ پیٹریارک ماربس دوم کے زمانہ میں (از [illegible] تا ۹۹۱ء) ویلم کا آخری میٹروپالی ٹن مرگیا جس کے بعد کوئی میٹروپالی ٹن مقرر نہ ہُوا۔ ہرات کا میٹروپالیٹن بھی پیٹریارک عبد یشوع سوم کے زمانہ میں فوت ہوگیا اور اس کے بعد کوئی میٹروپالیٹن مقرر نہ ہُوا۔ انہی ایام میں تبت اور طبرستان کے آخری میٹروپالیٹنوں کے بعد کوئی میٹروپالی ٹن مقرر نہ ہُوا۔ مرو کا بھی میٹروپالیٹن مقرر نہ کیا گیا کیونکہ مسیحی کلیسیائیں تعداد میں اس قدر کم ہوگئی تھیں کہ ان علاقوں میں میٹروپالیٹنوں کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۳۰۰ء کے بعد خلاط اور مراغہ۔ بیت بردت مسیحی علاقوں میں نہ کوئی میٹروپالی ٹن رہا اور نہ ہی کوئی بشپ رہا۔

(۶)

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ سلجوقی مجاہدین کے حملوں کا زیادہ اثر ارض مقدس کنعان اور شام پر پڑا جہاں مسیحی کلیسیائیں آباد تھیں۔ مشرق اور مغربی ممالک کے لاکھوں مسیحی ان ملکوں کے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے ہر سال دُور دُور

سے آیا کرتے تھے۔ ان زائرین کی سہولت کی خاطر خلیفہ ہارون رشید نے سنہ ۷۹۷ء میں شاہنشاہ شارل مین (CHARLMAGNE) کو یروشلیم کے گرجے "چرچ آف دی ہولی سیپلکر" (CHURCH OF THE HOLY SEPULCHRE) کا محافظ بنا دیا تھا۔ سلجوقیوں نے سنہ ۱۰۷۱ء میں یروشلیم کو فتح کر لیا اور اس کے اگلے سال انہوں نے بازنطینی سلطنت کو شکست دے دی اور ایشیائے کوچک میں بڑھتے چلے گئے۔ وہ مسیحی زائرین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیا کرتے تھے اور ان کو طرح طرح کی تکلیفوں بلکہ عقوبتوں اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ولیم اول فاتح انگلستان بادشاہ تھا۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ سات ہزار زائرین مغربی ممالک سے یروشلیم زیارت کی خاطر گئے لیکن وہاں ان کو اس قدر ایذائیں ملیں کہ صرف دو ہزار زائرین واپس اپنے ملکوں میں زندہ پہنچے۔ ان زائرین میں ولیم فاتح کا سیکریٹری انگلف (INGULF) تھا۔ ترکوں نے زائرین پر عرصۂ حیات ایسا تنگ کر دیا تھا کہ سنہ ۱۰۹۴ء میں ایک سپاہی نے یورپ واپس جا کر "صلیبی جنگ" کے لئے عیسائیوں کو ابھارا۔ اس سپاہی کا نام پیٹر (PETER THE HERMIT) تھا۔ پوپ اربن دوم نے سنہ ۱۰۹۵ء میں یورپ کے مسیحیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے حکم نامے بھیجے۔

اس زمانہ میں مشرقی اور مغربی کلیسیاؤں میں باہم آویزش تھی۔ یہ آویزش جیسا ہم گذشتہ ابواب میں بتلا چکے ہیں پانچویں صدی سے چلی آتی تھی جس کا اصلی سبب رومی کلیسیا کے پوپ اور مشرقی کلیسیا کے پیٹریارک کی باہمی رقابت تھی۔ لیکن گیارھویں صدی میں مغربی کلیسیا نے عقیدہ کے فقرہ "روح القدس باپ سے صادر ہے" میں دو لفظ "اور بیٹے" کا اضافہ کر دیا۔ اس کو بہانہ بنا کر مشرقی اور مغربی کلیسیائیں ایک دوسرے سے

قطعی طور پر جدا ہو گئیں گو اصل حقیقت یہ تھی کہ پوپ اور پیٹریارک دونوں مسیحی دنیا پر حکومت جتا کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہم دونوں میں سے بڑا کون ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جیسا پروفیسر ٹائن بی (TOYNBEE) کہتا ہے "مسیحی کلیسیا کی دونوں عظیم شاخیں (یعنی رومن کیتھولک چرچ اور گریک آرتھوڈوکس چرچ) ایک دوسرے سے ایسی برسرِ جنگ تھیں کہ وہ دونوں کی دونوں مسلمانوں سے صلح کے ساتھ رہ سکتی تھیں لیکن آپس میں صلح کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں"۔ سلجوقیوں کے بغداد کو فتح کرنے سے ایک سال پہلے سنہ ۱۰۵۴ء میں روم کے پوپ اور قسطنطنیہ کے پیٹریارک میں دشمنی کی آگ اس قدر بھڑک اٹھی کہ دونوں نے ایک دوسرے کو کلیسیائے جامع سے خارج کر دیا!

پہلی صلیبی جنگ سنہ ۱۰۹۶ء میں ہوئی۔ مسیحی افواج نے ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۵ جولائی کے روز یروشلیم کو فتح کر لیا۔ بیت المقدس کی گلیوں میں خون کی نہریں بہہ گئیں۔ ان صلیبی جنگوں کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ خدا کی بادشاہت قائم کی جائے لیکن پوپ اور دیگر روحانی پیشوا بھول گئے کہ ان کے منجی نے اس قسم کی آزمائش کو شیطانی قرار دے دیا تھا اور رد کر دیا تھا (متی ۸ : ۱۰)۔ لیکن اس کی کلیسیا نے یہ سبق نہ سیکھا۔ یہ نام نہاد "صلیبی جنگیں" تاریخِ کلیسیا کا تاریک ترین باب ہیں۔ وہ نہ صرف مسیحیت کے حقیقی مفاد و مقصد اور اس کی ترقی اور اشاعت میں رکاوٹ کا باعث ثابت ہوئیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی دشمنی جو پشت در پشت چلی آتی ہے کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ طرفین کی افواج میں جو ممالک ان صلیبی جنگوں میں شامل ہوئے وہ خود ایک دوسرے سے رقابت اور عداوت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو یورپ کی افواج نے کہیں کہیں شام میں

اپنے قدم جما لئے لیکن بارھویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں نے اپنی افواج کی حالت کو مستحکم بنالیا۔ انھوں نے ۱۱۸۷ء میں یروشلم کو فتح کر لیا۔ تیرھویں صدی میں جو قصبے یورپین ممالک کے ہاتھ آگئے تھے وہ اب سرف تجارت کے مرکز ہی ہو کر رہ گئے کیونکہ صلیبی جنگوں کا جذبہ سرد ہو گیا تھا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں اسلامی افواج نے یورپ کی جنگی سپاہ کو مشرق سے نکال دیا۔ لیکن یہ نام نہاد صلیبی جنگیں (جیسا ہم باب سوم کی فصل سوم میں بتلا چکے ہیں) مشرقی کلیسیا کے حق میں نہایت ضرر رساں ثابت ہوئیں۔ مغربی ایشیا اور مصر کی کلیسیاؤں پر ظلم و ستم اور جفا اور ایذا جا بجا شروع ہو گئے اور اسلامی حکومتیں مسیحیوں سے انتقام لیتی رہیں یہاں تک کہ سلطان صلاح الدین جیسے انسان نے بیت المقدس میں ان تمام گرجاؤں کو جو گذشتہ کالف برسوں میں تعمیر کئے گئے تھے منہدم کر دیا اور ان کی جگہ مدرسہ شافعی کھڑا کر دیا۔

فصل ششم

تیموری حکومت

امیر تیمور چنگیز خان کے خاندان سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد میں سے ایک شخص چنگیز کے بیٹے چغتائی کی فرمانروائے ماوراء النہر کا وزیر رہ چکا تھا۔ ابھی تیس سال کی عمر کا نہ تھا جب وہ ٹرانس اوکسینیا پر قابض ہو گیا۔ اس نے سمرقند کو دارالسلطنت بنا کر خوارزم، کاشغر، ہرات، قندھار، بلخ، خراسان، سیستان، سجستان، افغانستان، آذربائیجان اور

کردستان کو سات سالوں کے اندر فتح کر لیا۔ اور اُن کے شہروں کو غارت کر کے ویران کر دیا۔ ۱۳۹۰ء میں اُس نے ایران پر حملہ کیا اور ہلاکو کے جانشینوں کو ہلاک کر کے جارجیا اور لارستان کو فتح کر لیا۔ اسی مہم میں اُس نے حاجیوں کے قافلہ کو لوٹ لیا۔ اس کے بعد اُس نے ایشیائے کوچک کا رُخ کیا۔ وہ جس طرف گیا فتح اُس کے ہمرکاب رہی۔ اُس نے اصفہان کو فتح کر کے قتلِ عام کر دیا اور حکم دیا کہ ہر سپاہی اتنے سروں کو حاضر کرے۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ستر ہزار سروں کا مینار بنایا۔ شیراز، فارس، یزد و کرمان کو مطیع کر کے اُس نے قلعہ سفید کو تسخیر کر لیا۔ مظفر شاہ کی اولاد کے سب لوگوں کو قتل کر دیا۔ بغداد کو فتح کر کے اُس نے نوّے ہزار سروں کا مینار کھڑا کر دیا۔ تکریت نہایت حصین قلعہ تھا لیکن اس کے ۷۲ ہزار لشکری اِس قلعہ کی دیواروں کی بنیادوں کو کئی ہفتوں تک کھودتے رہے تب جا کر یہ شہر فتح ہوا۔ تکریت کو فتح کر کے اُس نے ہزاروں سروں کا مینار کھڑا کر دیا۔ اسی طرح اُس نے ایشیائے کوچک، میسوپوتامیہ اور دیگر ممالک کے شہروں کو غارت کیا اور ہر شہر میں مقتولوں کے سروں کا مینار کھڑا کیا۔ روس میں پہنچ کر اُس نے ماسکو کو ویرانہ بنا دیا۔ اس کے اگلے سال اُس نے استرخان کو فتح کیا اور پھر جارجیا اور سرکیشیا کو دوبارہ غارت کر دیا۔ تمام مغربی ایشیا اُس کے نام سے کانپ اُٹھتا تھا۔ اُس نے ترکی افواج کو شکست دے کر سلطان بایزید کو قید کر لیا۔ بایزید ایسا زبردست سلطان تھا اور اُس کی سلطنت ایسی وسیع تھی کہ وہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ وہ ملکِ آسٹریا کو فتح کر کے فرانس اور اٹلی کو مسخر کریگا اور رُوم کے بڑے گرجا سینٹ پیٹر کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنائیگا۔ لیکن تیمور کے حملہ نے اُس کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ وہ تیمور کی فوج کی تاب نہ لا سکا اور

اور مخاصمت کا باعث بن گئیں اور وہ ایسی باریک تھیں کہ عوام مسیحی اُن کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ ان حکما اور فضلاء کا مباحثہ اکثر جنگ و جدال کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ آثر نیوس کہتا تھا کہ کلیسیا کے بشپ مسیحی ایمان کے محافظ ہیں لیکن اب وہ وقت آگیا جب یہ بشپ خود ایک دوسرے کے خیالات اور فلسفیانہ باریکیوں کے ایسے مخالف ہو گئے کہ اپنے ہی فلسفیانہ خیالات کو صحیح اور انجیلی سمجھ کر دوسروں کے فلسفیانہ تصورات کو بدعت اور باطل قرار دے کر اُن کو کلیسیائے جامع سے خارج کرنے لگ گئے۔ چنانچہ جیسا ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں سکندریہ کے بشپوں نے انطاکیہ کے بشپ نسطوریئس کو افسس کی کونسل (۴۳۱ء) میں اس کے نمائندوں کی آمد سے پہلے ہی خارج کر دیا تھا۔ ان کلیسیائی تفرقوں نے جو درحقیقت موشگافیاں تھیں مشرقی ممالک کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیشِ نظر مختلف مسیحی فرقوں کو اپنے اختلافات مٹا کر اور واحد کلیسیا ئے جامع بن کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے تھا جس کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی بجائے کلیسیا ایسے فرقوں میں بٹی رہی جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

عرب کے مسیحی قبائل اور بدوی لوگ اس بات کے اہل ہی نہ تھے کہ وہ ان فلسفیانہ تصورات اور موشگافیوں کو سمجھ سکیں اور اُن حکیمانہ باریکیوں کو عقل کی میزان میں تول سکیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسی دقیق باتوں کو صرف چند ایک ماہرین ہی سمجھ سکتے تھے[1]

[1] یہ موشگافیاں اور باریکیاں ہم ایک مثال سے ناظرین پر واضح کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے یورپ کی ایک مشہور یونیورسٹی کا ایک شخص جس نے فلسفہ میں ایم۔ اے پاس کیا ہوا تھا

(باقی دیکھو صفحہ ۳۹۷ پر)

چنانچہ مثل مشہور ہے کہ کلیسیائے جامع کو تین یونانی حروفِ تہجی نے بانٹ رکھا تھا۔ اندریں حالات کلیسیا میں اسلام کی مقاومت کی تاب نہ تھی۔ خداوند مسیح نے انجیل میں درست فرمایا ہے کہ جس گھر میں پھوٹ ہو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ علم و فضل کے چراغ نے دنیا کو روشن کرنے کی بجائے کلیسیا کے گھر کو آگ لگا دی۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(۳) قرآنی احکام اور شرعی قوانین :-

ان کا ہم مفصل ذکر باب دوم میں کر آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے جس ملک کو بھی اسلام نے فتح کیا، اُس میں مسیحیت اور مسیحی کلیسیا ؤں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ لاکھوں مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور لاتعداد عیسائی ہجرت کر کے غیر ممالک میں جا بسے اور وہاں بھی ایک اقلیت بن کر ہی رہے۔ مسیحی ممالک اور وہ شہر اور قصبے جو مسیحیت کے گڑھ تھے چند سالوں کے اندر اندر اسلامی افواج کے قبضہ میں آگئے جہاں کلیسیائیں یا تو فنا ہو گئیں اور یا سسک سسک کر زندگی کے دن کاٹتی رہیں۔ مثال کے طور پر نجران کی کلیسیا کو بانیٔ اسلام کے معاہدہ

(بقیہ صفحہ ۳۹۶) میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے ایک ایسی کتاب دیں جس میں مسیح کی ذات پر بحث کے تمام نظریوں کا تواریخی ذکر ہو۔ میں نے اُس کو ڈاکٹر میکی ناش کی کتاب "دی پرسن آف جیزس کرائسٹ" دی۔ چند دنوں کے بعد وہ آیا اور کہنے لگا کہ میں نے ان قاضل آبائے کلیسیا کی فلسفیانہ موشگافیوں کو سمجھنے کی از حد کوشش کی ہے جس سے میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا ہے اور پھر بھی ان نظریوں کی باریکیوں کا فرق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ لوگ کس غضب کے عالم تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو تو فلسفہ سے خاص شغف ہے اور آپ کا یہ حال ہے۔ اُن لوگوں کی حالت آپ خود ہی خیال کر سکتے ہیں جو فلسفہ کے نام سے بھی آشنا نہیں ہیں۔

کے باوجود ملک بدر کر دیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ عراق میں بھیجے گئے جہاں ان کی تعداد اسی سالوں میں چالیس ہزار سے صرف آٹھ ہزار رہ گئی۔ بنو تنوخ کا قبیلہ آٹھویں صدی تک مسیحیت پر ثابت قدم رہا لیکن پھر خلیفہ بغداد کے حکم سے ان کے پانچ ہزار نفوس کو جبریہ مسلمان بنا لیا گیا۔ شریعتِ ارتداد کے باعث کوئی شخص یا خاندان واپس مسیحیت کی آغوش میں نہیں آسکتا تھا۔ کثرتِ ازدواج اور بے شمار لونڈیوں باندیوں کو رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت روز بروز بڑھتی گئی اور مسیحی عورتیں اور عیسائیوں کی بہو بیٹیاں مسلمانوں کی کنیزیں۔ مدخولہ اور داشتہ ہو کر مسلمان بچوں کی مائیں بنتی گئیں۔

(۴) کلیسیائی فرقوں کی مخاصمت اور عناد:۔

مسیحیت کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ کلیسیا میں زبردست فرقے تھے جو ایک دوسرے کی بیخ کنی پر تلے ہوئے تھے۔ واجب تو یہ تھا کہ ہر مسیحی فرقہ کے فیصلہ اسلام کے زبردست خطرہ کے پیش نظر ایک متحدہ محاذ قائم کرتے لیکن یہ کوتاہ اندیش عالم ایک دوسرے کے عقائد اور فلسفیانہ نظریوں پر بحث کرتے ہیں خطرہ اٹھاتے اور اپنے حریف فاضل کو مناظروں اور مذہبی کونسلوں اور مجلسوں میں شکست دے کر خوشی سے بغلیں بجاتے تھے۔ یعقوبی فرقہ نسطوریوں کا دشمن جان تھا اور نسطوری فرقہ یعقوبی کلیسیاؤں کو ہر جگہ نیچا دکھا کر ان کے استیصال پر کمر باندھے تھا۔ قسطنطنیہ کے قیصر ہرقلس نے حکم دیا کہ تمام کلیسیائیں آرتھوڈوکس کلیسیا کے ماتحت ہو جائیں تاکہ کلیسیائی تنازعوں کا خاتمہ ہو جائے لیکن اس کے حکم نے جدائی کی خلیج کو اور بھی چوڑا کر دیا۔ اور یہ باہمی عناد یہاں تک بڑھ گئے کہ بازنطائن کی مملکت کے مسیحی فرقے اسلامی حکومت کو مقابلۃً استحسان اور دوستی کی نظر سے

دیکھ کر اسلامی افواج کا خیر مقدم کرنے لگ گئے۔ وہ نئے مسلمان آقاؤں کو قدیم مسیحی آقاؤں پر ترجیح دینے لگ گئے کیونکہ شروع شروع میں مسلمان فرمانروا ان کے مذہبی عقائد و رسوم میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بارھویں صدی کے دوسرے نصف میں انطاکیہ کا پیٹریارک "مائیکل بزرگ" اس ابتدائی دور کی نسبت لکھتا ہے "ذوالانتقام خدا اکیلا قادر خدا ہے جو جس کو چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ بازنطائن کی سلطنت بدی سے باز نہیں آتی اور کلیسیاؤں کی خانقاہوں اور گرجاؤں کو تباہ و برباد کرتی ہے اور بے رحمی سے ہر کلیسیا کو قتل و غارت کرتی ہے تو اس نے جنوب سے عربوں کو اٹھا کھڑا کیا تاکہ ہم کو قیصر کے ہاتھوں سے نجات دلوائے۔ ہمارے گرجے چھین کر ان لوگوں کو دے دیئے گئے تھے جو کیلسیڈون کے عقیدہ پر قائم تھے لیکن ان عربوں نے ہمارے گرجاؤں پر قبضہ نہ کیا۔ ہر مسیحی فرقہ کو اس کے گرجا واپس کر دیئے گئے۔ ہم نے رومیوں کے ہاتھوں سے نجات پائی اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔"

ان باہمی تنازعوں اور برادرکش خونریزیوں سے تنگ آکر عیسائیوں نے ہر جگہ اسلامی افواج کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ جب ابو عبیدہ نے یردن کی وادی میں پہنچ کر اپنا لشکر فحل میں اتارا تو وہاں کے عیسائیوں نے اس کو لکھا "مسلمانو ہم تم کو بازنطائن کے عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔ ہمارے حق میں تمہاری حکومت ان کی حکومت سے بہتر ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے مال کو۔ ہمارے گھروں کو اور ہمارے گرجاؤں کو بھی ہم سے چھین لیا ہے۔ شہر حمص (EMESSA) کے باشندوں نے اپنے شہر کے دروازے ہرقلس شہنشاہ بازنطائن کی فوج کی آمد کے وقت بند کر دیئے اور انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ ہم تمہاری حکومت کو قیصر کی حکومت

پر اور تمہارے عدل و انصاف کو اُس کے ظُلم و بے انصافی پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ حالات ۶۳۳ء اور ۶۳۹ء کے درمیانی عرصہ کے ہیں جب عرب افواج رفتہ رفتہ بازنطائن حکومت پر فتح حاصل کرتی جا رہی تھیں۔ ۶۳۷ء میں دمشق کے شہر نے عرب سے صُلح کر کے ایک ایسا نمونہ قائم کر دیا جو دُوسرے شہروں نے اختیار کر لیا۔ اور حمص۔ اَیراتھیوسا۔ ہاٹرالِس اور دیگر مسیحی شہروں نے جزیہ دے کر خلیفہ عُمر کی متابعت کر لی۔ حالانکہ حمص میں سامانِ جنگ اور رسد وغیرہ برسوں سے جمع تھا اور افواج کے اجتماع کی وجہ سے وہ نہایت مضبوط شہر شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن اب حالات کی صُورت یہ ہو گئی کہ جہاں کوئی اسلامی فوجی افسر تھوڑی سی جمعیت لے کر بھی نکل جاتا وہاں عیسائی خود آ کر صُلح کی درخواست کرتے تھے۔ چنانچہ یوفا۔ جومہ۔ سرمین۔ تیرین۔ قورس۔ تل عزاز۔ رعبان۔ منبج۔ بانس۔ قاصرین جیسے مقامات پر اس آسانی سے قبضہ ہو گیا کہ خُون کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ جنگ حیرہ میں قسیس اور راہب اپنے قسیسی اور درویشانہ لباس میں خالد کے پاس آئے اور اس مسیحی وفد کے سن رسیدہ سردار قسیس عبد المسیح نے صُلح کی درخواست کی جو جرنیل خالد نے منظور کی۔ حتیٰ کہ یروشلیم کے پیٹریارک نے بھی دمشق کی سی شرائط پر شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

مصر میں بھی کلیسیاؤں کی فرقہ بندی رنگ لائی۔ اُس نے مسیحیت کی جڑ کو کھوکھلا کر رکھا تھا۔ بازنطائن کے قیصر نے وہاں کی قبطی یعقوبی کلیسیا کو بھی زبردستی آرتھوڈکس کلیسیا کے ماتحت کر دیا تھا۔ لیکن مصر کے مسیحی قبطی تھے اور آرتھوڈکس ملکی تھے جو زیادہ تر یونانی تھے۔ قسطنطنیہ کے قیصر جسٹینین نے دو لاکھ قبطیوں کو سکندریہ میں قتل کر ڈالا تھا۔ اُس کے

جانشینوں نے بھی اسی قسم کے مظالم اس حد تک اس غریب کلیسیا پر توڑے کہ اکثر قبطی عیسائیوں کو صحرائے اعظم میں پناہ لینی پڑی۔ اختلافات نے قوم و مُلک اور کلیسیا کا شیرازہ ایسا بکھیر دیا ہُوا تھا کہ پیٹریارک نے خود سکندریہ کو اسلامی فوج کے حوالے کر دیا حالانکہ وُہ ایک بین الاقوامی اہمیت کا شہر تھا اور اس کے علاوہ نہایت حصین قلعہ تھا۔ بہُت عیسائی ایسے بھی تھے جو جنگوں میں اسلامی افواج کو امداد دینے کا وعدہ کر دیتے تھے اور عین جنگ کے دَوران میں اُن سے آملتے اور اُن کا پانسہ بھاری کر دیتے تھے۔ جب مسیحی ممالک اسلام کے مطیع ہو گئے تو بہتیرے مسیحی ایسے بھی تھے جو اپنے فرقہ کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر مسلمانوں سے اور احکام سے در پردہ ساز باز کرتے تھے تاکہ اُن مخالف فرقہ کو گزند پہنچے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ کلیسیا کے جامع میں ہر طرف سے انتشار پیدا ہو گیا اور مختلف کلیسیائیں ہر مُلک میں پراگندہ اور ذلیل ہو گئیں۔

ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا جب منگولی فرمانرواؤں کے رویہ سے یہ اُمید پیدا ہو گئی تھی کہ وُہ سب مع اپنی رعایا کے مسیحی ہو جائیں گے یعنی رُومی کلیسیا۔ گریک آرتھوڈکس کلیسیا۔ نسطوری کلیسیا۔ آرمینی کلیسیا اور یعقوبی کلیسیا وغیرہ کے باہمی تنازعوں۔ تفرقوں اور دُشمنیوں نے اور ان کلیسیاؤں کے لیڈروں کے باہمی بُغض و عناد اور رقابت نے منگولیوں کے لشکروں میں بھی بڑا دخل پایا اور اس اُمید کو پُورا ہونے نہ دیا۔ یہ مختلف کلیسیائیں تو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں لیکن بدھ مت اور اسلام ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر منگولیوں میں ترقی کرتے چلے گئے۔ جب رُومی کلیسیا کے پوپ کے شخصی

اقتدار کے دعوؤں نے منگولیوں کو مسیحیت اختیار کرنے سے روک دیا تب بھی نسطوری کلیسیا نے اس حالت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ خود نسطوری کلیسیا کے پیٹریارک نے عباسی خلیفہ کی پاسداری حاصل کر کے اپنے حریف یعقوبی کلیسیا کے میفرن کو بغداد سے نکلوا دیا اور خلیفہ نے دیگر کلیسیاؤں کے بشپوں کو اس کے ماتحت کر کے اُس کے اقتدار کی ہوس کو پورا کر دیا اور اپنا اُلو بھی سیدھا کر لیا۔

جزیرہ کپرس کی مسیحی کلیسیائیں قبطی پیٹریارک کے ماتحت تھیں لیکن ان کلیسیاؤں کو آرتھوڈوکس کلیسیا نے اس قدر ایذائیں دیں کہ قبطی پیٹریارک ان ستم رسیدہ اور آفت زدہ کلیسیاؤں کے درمیان کام کرنے کو کوئی قسیس نہیں بھیج سکتا تھا۔ وہ جس قسیس کو بھی حکم دیتا تھا وہ کانوں پر ہاتھ لگاتا اور اُس کا حکم ماننے سے انکار کر دیتا تھا۔ اس دہشت انگیزی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں کے غریب مسیحی تنگ آ کر جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

جب ہم ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہیں تو ہم کو تعجب نہیں آتا کہ لاتعداد عیسائیوں نے تنگ آ کر اپنے مذہب کو خیرباد کہہ دیا۔ اور دوسرے کے شگون بگاڑنے کے لئے اپنی ناک کاٹ لی۔ وہ پہلے ہی اسلامی احکام اور شرعی اور سیاسی پابندیوں کے ہاتھوں تنگ آئے بیٹھے تھے۔ اب اُنہوں نے اپنے ایمان کو ترک کر کے چین و امن حاصل کر لیا۔ بے شمار مسیحی مسلمان ہو گئے اور اسلامی سلطنتوں میں کلیسیا کے وہ افراد جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے ایک ذلیل اقلیت بن کر ہی رہ گئے۔ چنانچہ شبیر احمد خان غوری لکھتے ہیں "مسیحی صدیوں کی تاریخ رومی سلطنت کی بالادستی کے خلاف مسلسل نفرت اور مختلف فرقوں کی کشمکش کی ایک اکتا دینے والی داستان ہے۔ چوتھی صدی مسیحی کے ربع دوم سے جو یہ مذہبی مناقشات شروع ہوئے تو آخر تک انہوں نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ جس فرقہ کو سیاسی

غلبہ حاصل ہو جاتا وہ اپنے مخالفین کو ملعون اور خارج از کلیسیا قرار دلوا دیتا تھا۔ انہی مذہبی نزاعوں نے مصر کی یکجہتی اور سیاسی استحکام کو بھی پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اس اندرونی خلفشار کی وجہ سے پہلے اہل فارس اور پھر عرب اُن پر آسانی سے قابو پا گئے" (یونانی علوم کا مسلمانوں میں داخلہ۔ برہان نومبر ۱۹۵۹ء)

(۵) اسلام عرب کا قومی مذہب بن گیا:۔

جب قیصر کانسٹنٹائن مسیحی ہوا تو مسیحیت رومی سلطنت کا قومی مذہب ہو گیا۔ سلطنت کے بشپ اور اعلیٰ قسیس مملکت کے افسر اور حاکم ہو گئے۔ سیاسیات نے مذہب میں دخل پایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق و مغرب کے باشندے یہی خیال کرتے تھے کہ مسیحیت کو قبول کرنا رومی سلطنت کی حکومت کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ جب اسلام عرب میں پھیل گیا تو وہ بھی عرب کا قومی مذہب ہو گیا اور اسلام کو اختیار کرنا اسلامی حکومت کو قبول کرنے کے مترادف ہو گیا۔ قبائل عرب میں قومیت کا جذبہ ہمیشہ جوش زن رہا تھا۔ ان کو عرب ہونے پر فخر تھا یہی وجہ ہے کہ جیسا ہم باب سوم میں لکھ چکے ہیں اسلامی افواج کے افسر مسیحی عرب قبائل کو جنگ کے وقت اُن کے قومیت کے جذبہ کو جگا کر اُن سے اپیل کرتے تھے کہ تم ہمارا خون ہو۔ تم کیوں ہم سے جنگ کرتے ہو اور خود اپنے دشمن رومیوں کی حمایت اور امداد کرتے ہو۔ بلکہ جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں مسیحی قبائل کے سردار اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کی خاطر خود میدان جنگ میں کود پڑتے تھے اور مسلمانوں کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑتے تھے۔ اور اگر وہ اسلام اختیار کر لیتے تھے تو وہ اسلامی افواج کی فتح کا باعث ہو جاتے تھے۔ مثلاً جنگِ مرج الدیباج میں اسلامی فوج کا رہبر یونس تھا جو پہلے عیسائی تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ قبائل عرب نے جب دیکھا کہ ان کے اپنے ہوتا

اور نسل کے لوگ جو مسلمان ہیں وہ حکومت کر رہے ہیں اور ہم مسیحی ہونے کی وجہ سے رومی سلطنت کے ماتحت ہیں تو جن کی رگوں میں عرب کا خون جوش زن ہوا انہوں نے قومیت کی آواز پر کان رکھا اور ایک ایسے دین کو اختیار کر لیا جو خالص عرب اور قومی دین تھا جس میں شامل ہو کر وہ سب مالِ غنیمت کے برابر کے شریک ہو سکتے تھے پس وہ جوق در جوق اسلام میں شامل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں عیسائیوں اور مسیحی کلیسیاؤں سے نسبتاً اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔

یہاں ہم یہ بھی ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں کہ عرب کے مسیحی انجیلی تعلیم سے بخوبی واقف بھی نہ تھے۔ وہ سریانی زبان میں اور دیگر غیر عرب زبانوں میں عبادت کیا کرتے تھے جن کو وہ سمجھتے بھی نہ تھے۔ ان کی کلیسیاؤں کے رہبر قسیس اور بشپ زیادہ تر پردیسی ہوتے تھے جن کا عرب کے مسیحیوں کی قومی اور ملی زندگی سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ ان کی عبادتیں ایسی زبان میں ہوتی تھیں جس کو وہ نہ جانتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے۔ ان کی روزمرہ کی زندگی اور ان کی روحانی زندگی ایک دوسرے سے جدا تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مسیحیت صرف سطحی تھی۔ وہ مسیحی مذہب کے پیرو تھے کیونکہ وہ پشتوں سے ان کا مذہب چلا آیا تھا۔ ان کا روحانی مسیحی تجربہ ایسا گہرا نہ تھا جو مخالف حالات کا دلیرانہ مقابلہ کر کے ثابت قدم رہ سکتا۔ ہندوستانی کلیسیا کے لئے یہ جائے عبرت ہے۔ کوئی غیر ملکی کلیسیا کسی ملک میں پردیسی نظامِ کلیسیا پر کاربند ہو کر اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے غیر ملکی سہاروں کے بل پر تھوڑی مدت تک مردِ بیمار کی طرح زندہ رہ سکتی ہے لیکن ملک میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ غیر ملکی مبلغ سیاسی اور دیگر حالات کی وجہ سے کسی ملک میں ہر وقت آمد و رفت نہیں کر سکتے اور نہ ان کی تبلیغی اور کلیسیائی مساعی مسلسل طور پر جاری رہ سکتی ہیں۔ یہ مبلغ اپنے

ملک کے پیٹریارک یا سدر بشپ سے صلاح و مشورہ بھی نہیں لے سکتے تھے کیونکہ ایک تو وہ ہزاروں میل دور تھے اور دوسرا وہ ملک اور کلیسیا کے اصل حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے درست صلاح اور صحیح مشورہ بھی نہیں دے سکتے تھے اور نہ کوئی صاحب رائے قائم کر سکتے تھے۔ جب کبھی ان ملکوں کے فرمانروا مسیحی کلیسیاؤں کو ایذائیں دیتے تھے تو پیٹریارک یا سدر بشپ بیچ بچاؤ بھی نہیں کر سکتے تھے اور حکومتِ وقت سے تو اس قسم کی توقع رکھنی ہی عبث تھی۔

(۴) فتوحات نے اسلام کا پانسہ [illegible] کر دیا۔

بانیِ اسلام کی وفات کے بعد اسلامی افواج کو مسلسل فتوحات حاصل ہوئیں جو لا انتہا ہی نظر آتی تھیں۔ چند سالوں کے اندر علاقوں کے علاقے اور شہروں کے شہر جو مسیحی کلیسیاؤں کے گڑھ تھے فتح ہوتے چلے گئے۔ ان کلیسیاؤں کے بے شمار شرکا کے سامنے صرف اسلام یا تلوار یا قید و غلامی اور جزیہ کے راہ ہی کھلے تھے۔ ان حالات میں لاتعداد مسیحیوں نے جان کی امان پر اپنے ایمان کو قربان کر دیا اور اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ ان کی اکثریت شہروں میں رہتی تھی اور تجارت پیشہ تھی۔ انہوں نے ایمان فروشی کر کے تجارت کو فروغ حاصل کر لیا۔ اور امن و آرام کے ایسے حالات میں زندگی بسر کرنے لگ گئے جن میں وہ مالدار ہوتے گئے۔ ان میں سے جو اسلامی افواج میں شامل ہو گئے ان کے حصہ میں مالِ غنیمت اس قدر آیا کہ وہ پشتوں تک مالا مال ہو گئے۔ غرض مسیحیوں کو اسلام قبول کرنے میں نفع ہی نفع تھا اور اس کو قبول نہ کرنے میں ضرر اور نقصان ہی نظر آتا تھا۔ پس جائے حیرت نہیں کہ لاتعداد مسیحی اسلام کے معتقد ہیں یا تو جبر و اکراہ

سے اور یا خود اپنی رضامندی سے داخل ہو گئے۔

(۲)

علاوہ ازیں جیسا ہم گذشتہ ابواب میں بتلا چکے ہیں یہودی اور عیسائی بھی مسلمانوں کے ہم خیال ہو کر یہ سمجھتے تھے کہ جس مذہب کو خدا پے در پے فتح بخشتا ہے وہی خدا کا اصلی اور برحق دین ہوتا ہے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کی دنیاوی دولت اور حشمت و صولت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سلطنت خدا کی عطا کردہ ہے اور جس سے یہ چھن جاتی ہے وہ مغضوب الٰہی ہوتا ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا دین باطل ہے۔ اس دلیل نے بہتوں کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا۔ جس طرح بعد کے زمانہ میں منگول قبائل کے سلاطین اس دلیل سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ مغربی ایشیا کے مسیحی بھی اس دلیل کو مانتے تھے۔ چنانچہ الکندی تک اس دلیل کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کے بنیادی مفروضہ کو صحیح تسلیم کر کے عربوں کی فتوحات کے اسباب کی نسبت لکھتا ہے "عربوں کے حملے ان کی مفلسی کی وجہ سے تھے۔ ان کی فتوحات کی وجہ یہ تھی کہ ایرانیوں نے عیسائیوں کو ایذائیں دے دے کر ان کے خون ناحق کی ندیاں بہا دی تھیں۔ پس ایرانیوں کی شکست اور عربوں کی فتح درحقیقت خدا کا انتقام تھا۔ ایرانی بے دین تھے جنہوں نے خدا سے سرکشی اختیار کر لی تھی پس خدا نے ان کو شکست دی"۔ اس مقام سے ظاہر ہے کہ الکندی بھی اسلامی نظریہ کا قائل تھا کہ خدا ان لوگوں کو دنیاوی سلطنت عطا کرتا ہے جو اس کے منظور نظر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بنیادی مفروضہ انجیلی تعلیم کے منافی ہے۔ مسلمان متواتر اس دلیل کو بار بار پیش کر کے مسیحیوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ

علی طبری (جو پہلے مسیحی تھا) اپنے مذہب کی تبدیلی کی وجہ یہی بتلاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "نبوت محمدیہ کی صداقت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا نے نبی اسلام کو قوموں پر فتح بخشی ہے۔ رسول اللہ کا یہ معجزہ ہے کہ اس کو کفار پر فتح حاصل ہوئی اور یہ دلیل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں، اور جس کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں۔ دنیا اور اس کی حکومت اللہ ہی کی ہے۔ وہ اپنے سچے دین کو غلبہ بخشتا ہے اور جہادوں میں اپنے مجاہدین کو فتح عطا کرتا ہے کیونکہ کافروں پر اللہ کا غضب ہے۔ مسیح نے جنگ سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ جو تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب عیسائیوں کے پاس نہ دین رہا ہے اور نہ دنیا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کو کھو بیٹھے ہیں اور خدا نے دونوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ چند ایک ملکوں کے سوا اب مسیحیت کہاں رہی ہے اور اگر ہے بھی تو اس کے پیرو مٹھی بھر ہیں جو مختلف ملکوں میں بے سرو سامان کی حالت میں مارے مارے پھرتے ہیں" (کتاب الدین والدولۃ)۔

لیکن مذکورہ بالا نظریہ سر سے غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر فتح اور کامیابی کسی برحق دین کا نشان ہیں تو فراعنہ مصر اور اٹیلا۔ سکندر اعظم اور چنگیز خاں کے دین برحق ثابت ہو گئے۔ چنگیز اور اس کے جانشینوں نے ہر ملک کی اسلامی افواج کو شکست پر شکست دی۔ خلیفہ بغداد کی مملکت کے ہر حصہ کو تاخت و تاراج کر کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تو کیا اس دلیل سے اسلام باطل مذہب ثابت ہو گیا؟ حق تو یہ ہے کہ جنگ میں فتح اور شکست خدا کی خوشنودی یا غضب پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ جنگ کرنے والوں کی جنگی طاقت۔ قابلیت۔ تعداد اور جان فروشی وغیرہ پر منحصر ہوتی ہے۔

خُدا محبت اور صُلح کا بانی ہے وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مخلوق کُشت و خون کریں۔ کلیسیا کے رہبر اسلامی نظریہ کی منفرد شدہ بُنیاد کو پرکھنے کی بجائے مسلمانوں کو یہ جواب دیتے تھے کہ ہمارا خُدا طاقت اور قُدرت والا خُدا ہے اور ہمارا دین برحق ہے۔ ہم محدود العقل انسان اُس غیر محدود ہستی کے ازلی ارادوں اور کاموں کو نہیں سمجھ سکتے۔ وُہ اپنی لامحدود دانش میں جانتا ہے کہ وُہ کب اور کس طرح ہماری مدد کریگا۔ پس ہم ایمان کے ساتھ اُس کی قُدرت کاملہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

کمزور ایمان والے عام مسیحی اس دلیل سے ایسے متاثر ہو گئے کہ مصر کی فتح ابھی مکمل ہونے بھی نہ پائی تھی اور سکندریہ میں ابھی مقابلہ ہو رہا تھا جب اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا اور وُہ مُلک جو ابتدائے اسلام میں ایک مسیحی مُلک تھا اب دورِ حاضرہ میں اس کی تمام آبادی کلیسیا کی اقلیت نے غلبہ کر سوا مسلمانوں کی ہے۔

(۳)

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جیسا ہم باب سوم میں بتلا چکے ہیں خلفا کا زمانہ مسیحی کلیسیاؤں کے لئے مسلسل ایذا رسانیوں کا زمانہ تھا۔ بعض خلفا متوکل جیسے تھے جس نے حضرت علی کے پیروؤں کو قید کر دیا تھا۔ کربلا میں حسین کی قبر کو منہدم کر کے حکم دیا تھا کہ وہاں کوئی زیارت کے لئے نہ جائے۔ ایسے خلفا مسیحی کلیسیا کو ایذائیں دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ بعض خلفا کو کلیسیا کے نام نہاد لیڈر خود کلیسیاؤں کے خلاف اُکساتے تھے۔ بعض اوقات حاسدین اُن کے کان بھر کر فتنہ فساد برپا کروا کر خونخوار آفتیں دلواتے تھے۔ بعض اوقات مسیحی بادشاہوں کی دغابازیوں سے بچارے عیسائیوں پر آفت ٹوٹ پڑتی تھی۔

مثلاً ہارون رشید نے بازنطانی کے قیصر نیسی فورس کی بدعہدی کی وجہ سے مسیحی کلیسیاؤں پر عتاب کئے۔ صلیبی جنگوں کے ایام میں جب کبھی مغربی اقوام کے مسیحی حملے کرتے یا فتحیاب ہو جاتے تو غریب مشرقی کلیسیاؤں کی مختلف اسلامی سلطنتوں میں شامت آجاتی تھی۔ ان ایام میں یروشلیم کی سلطنت اور دیگر مقامات کے مسیحیوں کو زندانوں میں ڈال دیا گیا اور ان کو ایسے عذاب دیئے گئے کہ انہوں نے اپنا مذہب ترک کرنے ہی میں اپنی خیریت دیکھی تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹-۹۱ء) میں جب عکہ (ACRE) کا محاصرہ کیا گیا اور مغربی افواج بھوکوں مرنے لگیں تو بے شمار فوجیوں نے اسلام اختیار کر لیا۔ ان مرتدوں میں سے بعض رُومی کلیسیا کے پریسٹ بھی تھے۔ ان مغربی ممالک کے مسیحی سپاہیوں کی تعداد جو مسیحیت کو ترک کر بیٹھے تھے اس قدر تھی کہ تیرھویں صدی کے آخر میں ایسے پچیس ہزار مرتد صرف قاہرہ شہر میں رہتے تھے۔ بعض مسیحی ایسے بھی تھے جو سزائے موت سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیتے تھے۔ ان صدیوں کے دوران میں بے شمار مسیحی نے دُکھ۔ ایذا وجفا، جلاوطنی اور موت پر قبولیتِ اسلام کو ترجیح دے کر شہید ہونا پسند کر لیتے تھے۔

آرمینی کلیسیا کیلسیڈون کی کونسل کے بعد کلیسیائے جامع سے مسیح کی ذات کی وحدت کے سوال پر الگ ہو چکی تھی۔ یہ کلیسیا اپنی ہمسایہ طاقتوں کے سامنے ہمیشہ دفاعی طرز اختیار کرتی رہی۔ اس کے پیرو ایک کے ماتحت جو فیسٹس کیتھولکس کہلاتے تھے۔ اس کلیسیا کو قومیت کے جذبہ نے باہم متحد کر رکھا تھا کیونکہ مسیحیت مُلک کا قومی مذہب تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قومیت کے احساس نے اس کو انجیل کی تبلیغ سے روک دیا۔ آرمینیا اور جارجیا کے مسیحی مسلمان فاتحین کے ہاتھوں

ہمیشہ ایذائیں سہتے رہے۔ ان کی کلیسیاؤں کو بازنطائن سلطنت۔۔ ایرانی سلطنت۔ ترکوں کے غلبہ۔ عربوں کی سلطنت اور مونگولیوں کی حکومت نے صدیوں تک پامال کر دیا تھا لیکن انہوں نے ایمان کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مسیحیت کو ترک کر کے وہ اپنی قوم سے غداری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جارجیا کی تاریخ میں شہیدوں کی نورانی فوج کے نام ہر صدی میں پائے جاتے ہیں۔ جب منگولی افواج نے جارجیا کو تہ و بالا کر دیا اور مسیحی ہادی اور قسیس شمار میں بہت کم رہ گئے تب وہاں مسیحیت کے قدم اکھڑنے لگے۔ تیمور کے حملے کے وقت جارجیا کے شہیدوں کے خون کی نہریں بہہ گئیں۔ جب قسطنطنیہ فتح ہوا اور ایشیائے کوچک میں ترکوں کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو جارجیا کے مغربی اطراف کے علاقوں کے مسیحی مسلمان ہو گئے۔

اسلامی فتوحات کی وجہ سے افریقہ کے شمالی علاقوں میں بھی اسلام پھیل گیا۔ جب ۶۹۸ء میں کارتھیج فتح ہوا تو افریقہ کی یہ زبردست کلیسیا (جس میں ٹرٹولین - سپرین اور آگسٹائن جیسی زبردست ہستیاں پیدا ہوئی تھیں) ماضی کا افسانہ ہو گئی۔ اسلامی تلوار نے تمام شمالی افریقہ کی کلیسیاؤں کو غارت کر کے ان کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ جب چودھویں صدی میں قبطی کلیسیا قتل و غارت کا نشانہ بنی تو مصر اور سوڈان کے مسیحی بھی مسلمان ہو گئے اور حال یہ ہو گیا کہ ۱۵۰۰ء میں سوڈان میں خال خال گرجے ہی پائے جاتے تھے اور اس ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

جب وسط ایشیا کے مونگول مسلمان ہو گئے تو وہ نہایت جوشیلے مسلمان مجاہد اور غازی بن گئے۔ انہوں نے اپنی حکومت کی حدود میں ہر جگہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا کے

تاتاری۔ ترکی۔ کریت۔ اوگر وغیرہ قبائل جنہوں نے مسیحیت کو اختیار کیا ہوا تھا وہ سب اسلام کے حلقہ میں آ گئے۔ مونگولی مسلمان نہایت جوشیلے اور جارحانہ مزاج کے مسلمان تھے۔ انہوں نے تیرھویں صدی کے نصف میں پچاس سالوں تک لگاتار ایذائیں دے کر ہزاروں مسیحیوں کو قتل کر دیا۔ فرات کے مشرق کی جانب کی مسیحی آبادی یا تو ختم ہو گئی اور یا پرچھائیں کی مانند ہو کر رہ گئی۔

سلجوق ترکوں نے گیارھویں صدی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایران کے مونگولی بادشاہوں نے مسیحیوں کو ایذائیں دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بالآخر جب تیمور نے وسط ایشیا - ایران - جارجیا وغیرہ کی جانب حملے کئے تو اس قدر کلیسیائیں قتل و غارت کا نشانہ بنیں کہ مسیحیت کی جڑیں ہل گئیں۔ جس طرف دیکھو مسیحی جوق در جوق مسلمان ہوتے گئے۔ کلیسیا کی قلیل اقلیت روز بروز اور بھی قلیل ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دائرہ میں اب مغربی ایشیا کے ممالک ہیں اور مصر و افریقہ کے ممالک میں بھی کلیسیاؤں کے شرکا کی تعداد کروڑوں کی بجائے لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

(۴)

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب حکومت کا ظلم بیس پچاس سالوں تک ہی محدود نہ ہو بلکہ صدیوں تک مسلسل جاری رہے تو آخر انسان ضعیف البنیان ہے وہ کب تک اپنے ایمان اور اصولوں پر ایسے صبر آزما حالات میں ثابت قدم رہ سکتا ہے تا وقتیکہ توفیق الٰہی اس کے شامل حال نہ ہو۔ تاریخ اسلام میں انہی عباسی خلفا کے زمانہ میں شام کے ایک زرخیز حصہ پر ہمدانیوں کی حکومت تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے نصف میں یہاں کے والیِ حکومت نے رعایا پر اس قدر ٹیکس لگا دیئے کہ رعایا جو مسلمان تھی عاجز آ گئی۔ بالخصوص قبیلہ بنی

حبیب پر اس قدر مظالم ڈھائے گئے کہ اُس نے پناہ لینے کی خاطر مسیحی سلطنتِ رُوم کی مدد چاہی۔ رُومی سلطنت نے اُن کو اُمیدیں دلوائیں اور وُہ اپنا تمام مال و متاع لے کر عیسائی سلطنت میں جا بسے۔ اُن میں سے بارہ ہزار مُسلمان بپتسمہ حاصل کر کے کلیسیا میں شامل ہو گئے لیکن ہمدانی حکُومت جفا کاری سے نہ ٹلی اور حسبِ معمول رعایا پر ظلم و ستم کرتی رہی۔ ابنِ اثیر لکھتا ہے کہ قیصرِ رُوم نے اُن کو زمینیں عطا کیں اور محصُول نہ لیا۔ اُن کی مالی امداد کی۔ ہر طرح سے اُن کو ٹیکسوں میں رعایتیں دیں۔ اور اُنہوں نے اسلام سے رُوگردانی کر کے مسیحیت کو قبُول کر لیا۔ جب اُن کے مظلوم بھائیوں نے یہ سُنا تو وُہ بھی اسلامی حدُود سے نکل کر اُن سے سینکڑوں کی تعداد میں جا ملے اور عیسائی ہو گئے۔ وُہ ٹولیاں بنا بنا کر ہر سال اسلامی سرحد پر حملہ کر کے شہر فتح کر لیتے تھے اور اُن کو رُومی سلطنت میں شامل کر لیتے تھے۔

مذکورہ بالا امثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ضعیف الایمان والے اشخاص خواہ وُہ کسی مذہب و ملّت کے ہوں مدّت تک صبر آزما حالات میں اپنے مذہب پر ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ مسیحی کلیسیاؤں نے صدیوں تک ان مصائب کا دلیری سے مقابلہ کیا لیکن تا کے؟ مختلف کلیسیاؤں کے باہمی تفرقوں۔ ایک ایک کلیسیا کے اندرُونی تنازعوں، خُود غرض [illegible] کی ذاتی اغراض، حصُولِ دولت کی خواہش۔ حُبِ جاہ و مرتبہ وغیرہ نے ان کلیسیاؤں کا شیرازہ بکھیر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں حکّامِ وقت کی نو مسلموں پر عنایات بے نہایات انعام و اکرام نے رہی سہی قوّت کا بھی دیوالہ نکال دیا تھا اور حالاتِ وقت کی مجبُوریوں کے باعث بے شمار مسیحی ان صدیوں کے دَوران میں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

(۵)

ان پریشان کُن حالات میں کلیسیا کے ایمان دار مسیحی اپنے اُن بھائیوں کے لئے دستِ بدُعا رہتے تھے جو مختلف وجُوہ کے باعث اپنے مُنجی کا انکار کرنے پر مجبُور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ عبدالمسیح بن اسحٰق کِندی لکھتا ہے "ہم مسیحی نہایت صبر اور استقلال سے اپنی اور اپنی اولاد کی جانوں کے دینے اور قتل ہونے سے اور دُنیائے دُوں کے چین و آرام کے چھوڑنے سے ذرا بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ ثابت قدمی اور دلی خلُوص سے صرف خُدا کی محبت کی خاطر قربان ہو جاتے۔ مصیبتیں اُٹھانے اور شہید ہو جانے کو سعادتِ دارین سمجھتے ہیں۔ . . . ہماری دُعائیں ادھوری رہ جاتی ہیں اگر ہم اُن کے لئے دُعا نہ کریں جو راہِ حق سے برگشتہ ہو گئے ہیں تاکہ خُدا اُن کی آنکھوں کو کھول دے اور اُن کے دِلوں پر سے غفلت کا پردہ اُٹھا دے تاکہ وُہ اُس کی طرف واپس آئیں جو راہِ حق اور زندگی ہے۔ جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ہم اُن کے لئے بھی دُعا کرتے ہیں کہ نجات کی جو نعمت خُدا نے اُن کو بخشی ہے وُہ اس پر قائم رہیں۔" (رسالہ الکندی ص۱۸۵)۔

(۷) کلیسیاؤں کی رُوحانی حالت کا انحطاط:-

ہم سطُورِ بالا میں بتلا چکے ہیں کہ ہر صدی میں لاتعداد مسیحی مختلف وجُوہ کے باعث اپنے مُنجی کا انکار کر کے اسلام قبُول کر لیتے تھے۔ اب اسلام شاہی مذہب تھا۔ اُن مسیحیوں کی حیثیت میں جو مُسلمان ہو جاتے تھے اور اُن کی حیثیت میں جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتے تھے زمین آسمان کا فرق تھا۔ نو مسلم اپنے مذہب کو دولتِ دُنیا پر قربان کر کے صاحبِ جاہ و حشمت ہو جاتے تھے اُن کو امارت و شوکت حاصل ہو جاتی تھی۔ اس کے برعکس کلیسیاؤں کے شرکا کی

حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ جو مسیحی ذمی رعایا تھے اُن کو مسلمان ہونے میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا تھا۔ جب خلیفۂ وقت یا بادشاہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں جوشیلا ہوتا تو اُس کا اثر قدرتی طور پر مسیحی کلیسیاؤں اور اُن کے شرکا کی تعداد پر پڑتا۔ خود غرض اور موقع پرست مسیحی اسلام قبول کر لیتے تھے کیونکہ وہ ایمان پر ثابت قدم رہنے کو بے وقوفی اور راہِ حق میں اظہارِ عزیمت کو ناعاقبت اندیشی سمجھتے تھے۔ بعض مسلمانوں اور کلیسیائیوں دونوں سے منافقانہ رویہ اختیار کر کے فریب کارانہ راہ و رسم رکھتے تھے تاکہ ہر دو کی مخالفت سے امن حاصل رہے۔ بعض مسیحی اصولوں کو خلافِ مصلحت بلکہ ناقابلِ عمل سمجھ کر اپنے وضع کردہ خود غرضانہ طرزِ عمل کو بنائے مصلح و آشتی قرار دیتے تھے۔ بعض باہمی تنازعوں کو کلیسیائی عدالتوں میں لے جانے کی بجائے اسلامی عدالتوں میں فیصلے کرواتے تھے۔ اور اگر مسیحی عدالتوں کا فیصلہ اُن کے خلاف ہوتا تو وہ اُس کو ٹھکرا دینے میں تامل نہ کرتے تھے۔ بعض مسیحیت کو حق جاننے اور مسیح کو منجیِ جہان ماننے کے باوجود غرور، خود پرستی اور جھوٹی عزت کے خیال سے مسلمان ہو جاتے تھے۔ بعض اپنی عقل و فہم کو ہی معیارِ حق قرار دے کر انجیل کی مخالفانہ نکتہ چینی کر کے مسلمانوں میں شہرت حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ بلکہ بعض کلیسیا کے شرکا کھلے بندوں مسیحی عقائد کا مذاق اُڑاتے اور کلیسیا کے مذہبی اور دُنیوی رہبروں اور پیشواؤں کو دل لگی کا سامان بناتے تھے۔ بعض حاسد اشخاص ایسے بھی تھے جو مالدار مسیحیوں پر الزام تراشی کر کے تمام کلیسیا کی آفت کا باعث ہو جاتے تھے۔ اور یُوں پراگندگی پیدا کر دیتے تھے۔ بعض مسیحی ہونے کا یہ مطلب سمجھ بیٹھے تھے کہ کسی مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑیگا اور ایثار و قربانی سے رُوگردانی اختیار کر کے دُوسروں کو بھی مسیحیت پر قائم رہنے سے روکتے

تھے۔ جُوں جُوں کلیسیائیں کمزور ہوتی گئیں اُن میں ایسے شرکا پیدا ہوتے گئے جو یہ بھول تے جا رہے تھے کہ وہ ایک زندہ فاتح مسیح کے حلقہ بگوش ہیں جس کو زمین و آسمان کا کُل اختیار حاصل ہے۔ یہ مسیحی ایمان کی قوت اور صبر و توکل علی اللہ سے ناشناس تھے اور راہِ حق میں جان قربان کرنے کی سعادت اور ارجمندی سے ناواقف تھے۔ وُہ مقامی کلیسیاؤں میں فتنے فساد برپا کر کے گروہ بندیاں بنا کر اپنے دِلوں کو ایسا سخت کر لیتے تھے کہ وُہ بے حس ہو کر انجیلی اور کلیسیا کے ہادیوں کی پند و نصیحت کی طرف سے کان بند کر لیتے تھے۔ ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ کلیسیائیں جماعتی حیثیت سے منتشر رہیں اور ان کے شرکا بظاہر متحد دکھائی دینے کے باوجود باطن میں ایک دُوسرے سے کھنچے رہیں۔ لیکن اکثر مسیحی دُنیوی فائدوں اور حصولِ غنائم کو مدِنظر رکھ کر جاہ و مرتبے کے لالچ میں آ کر اسلام قبول کر لیتے تھے اور یُوں حربیوں، حکام، جزیہ اور دیگر تکلیف دہ پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ظلم و ستم اور استبداد سے نجات حاصل کر لیتے تھے۔

مسیحی کلیسیاؤں کے شرکا عموماً تاجر ہوتے تھے اور متمول طبقہ کے لوگ تھے۔ مال داروں کے لئے مال مُہلک ثابت ہو جاتا ہے جب وُہ عیش پروری کا وسیلہ ہو جائے۔ حرام خوری، عیاشی، شراب خواری اور تمام خراب عادتیں جو اِن سے پیدا ہوتی ہیں بالآخر کلیسیا کے لئے بھی مُہلک ثابت ہوئیں۔ کلیسیاؤں کے شرکا جب مسیحی ایمان کا ملمع ہی رہ گیا تو قُدرتاً ان میں بداخلاقی اور فحش تدریج ہو گئی۔ ایسے لوگ جو اپنے اوقات کو گُناہ اور بدی کے لئے وقف کر دیتے ہیں بآسانی اپنے ایمان کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس قماش کے بُہت سے انسان مسیحیت کو ترک کر کے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ ایسے مسیحیوں میں

تجی وفاداری اور پاسِ عہد کا احساس نہ رہا۔ عبادت کی ادائیگی اور کلیسیائی قوانین کی پابندی ان کو گراں محسوس ہوتی تھی۔ اگر وہ گرجاؤں میں جاتے بھی تھے تو محض مطلب اور دکھاوے کی خاطر یا دلِ ناخواستہ عبادت کرتے تھے اور جو کھلے بندوں مسلمان نہیں ہو جاتے تھے وہ دشمنانِ مسیحیت سے دوستی۔ محبت۔ مددگاری اور معاونت کے تعلقات پیدا کر لیتے تھے۔ چنانچہ رومی کلیسیا کا بشپ ژاک ڈویٹری (JACQUES de VITRY) جو صلیبی جنگوں کے ایام میں عکہ (ACRE) کا ۱۲۱۶ء سے ۱۲۲۸ء تک بشپ تھا لکھتا ہے کہ مشرقی کلیسیا بدکاری اور بداخلاقی اور زناکاری کے باعث کمزور اور شیطان کی غلام ہو چکی تھی۔ اس قماش کے لوگ کشادہ راستہ کو پسند کرتے ہیں جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہوتے ہیں لیکن ایمان پر ثابت قدم رہنے والے سکڑا اور تنگ راستہ ہی اختیار کرتے ہیں جو زندگی کو پہنچاتا ہے۔ ان کی تعداد قلیل ہی ہوتی گئی۔

(۲)

مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کی حالت اب یہ ہو گئی تھی کہ ایمان کے سرد ہو جانے اور مسیح کی محبت کے ٹھنڈا ہو جانے اور اکثریت کے تعاون کی وجہ سے ان میں تبلیغ و اشاعتِ دین کا جوش نہایت مدھم پڑ گیا۔ کلیسیا کے شرکا ایسے موقعوں سے دور ہی رہتے تھے جہاں وہ حق و صداقت کا اعلان کر سکتے تھے۔ تبلیغ کرنا اہم فرض کی ادائیگی کلیسیا کی روحِ رواں ہوتی ہے اور جہاں یہ نہ ہو کلیسیا پژمردہ بلکہ مُردہ ہو جاتی ہے۔

ان مخالفانہ حالات کا اثر صرف کلیسیا کے شرکا پر ہی نہ پڑا تھا بلکہ ان کے مذہبی رہبر قسیس اور بشپ بلکہ بعض صدر بشپ بھی ان کا شکار ہو گئے۔

مسیحی قسیس اور بشپ تک بد دل، پست ہمت اور بداخلاق ہو رہے تھے۔ ان میں سے بعض بدکار بھی تھے چنانچہ ماری بن سلیمان لکھتا ہے کہ جب دسویں صدی کے آخر میں ایذا رسانی کی وجہ سے بے شمار عیسائی مسلمان ہو گئے تھے تو اس کا اصلی سبب یہ تھا۔ اخلق کثیر وکان اصل ذالک تجوز الناس فی ادیانہم وقبیح سیرۃ الاسقفۃ فی المذبح وبیع بیوت المقدس۔ ایک اور مؤرخ ہم کو بتلاتا ہے کہ جب بودھ مذہب کے بھکشو اور مسیحی قسیس منگولوں میں اپنا اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے ان دنوں میں بھی ان قسیسوں کی روحانی زندگی بھکشوؤں کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ یہی مؤرخ لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین کے عہد (از ۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) میں جب اس کی سلطنت کی کلیسیاؤں کو نسبتاً آرام حاصل ہو گیا تھا ان کے قسیس رشوت دیتے اور لیتے تھے پس جاہل اور بداخلاق اشخاص اس پاک عہدہ پر ممتاز ہو گئے اور جو نادار ان عہدوں کے لئے رشوت نہیں دیتے تھے وہ ان پر مقرر نہیں کئے جاتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسیاؤں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور ان کے شرکا کی مسیحیت صرف نام ہی کی رہ گئی۔ حالت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب ۱۲۰۶ء میں یعقوبی کلیسیا کا بوڑھا "پیٹریارک" مر گیا تو اس کلیسیا کے باہمی تنازعوں اور فرقہ بندیوں کی وجہ سے یہ اسامی پُر نہ ہو سکی۔ ہر پارٹی اپنی ہی ضد پر قائم رہی تاکہ ان کا نامزد ہی پیٹریارک بنایا جائے۔ پارٹیوں کے لیڈروں کو کلیسیا کی بُری حالت کی پروا نہ تھی۔ سلطان نے کئی بار ان کو بلا کر ان میں مصالحت کرانے کی کوشش بھی کی لیکن سب بے سود۔ یہ نام نہاد لیڈر سلطان کو سونے کے دس ہزار سکے دیتے تھے تاکہ ان کا آدمی پیٹریارک ہو جائے لیکن سلطان نے صرف

اس پیشکش کو ٹھکرا دیا بلکہ اُس نے اعلان کر دیا کہ کلیسیا جو فیس نئے پیٹریارک کے لئے حکومت کو ادا کرتی ہے وہ بھی معاف کر دی جائیگی بشرطیکہ وہ متفق ہو کر اپنے پیٹریارک کو انتخاب کریں۔ اس باہمی تنازعہ کا اثر کلیسیائی زندگی پر بہت بُرا ہُوا کیونکہ اس بیس سال کی طویل مدت میں جو اُسقف اور قسیس مر گئے اُن کی آسامیاں بھی پیٹریارک کے منتخب نہ ہونے کی وجہ سے خالی رہیں۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ مقدس میکیرئس کی خانقاہ میں ۱۰۰ قسیسوں کی بجائے صرف چار قسیس رہ گئے! اور اس کی حدود کے مغرب کی جانب کے ملحقہ علاقے ایسی کسمپرسی کی حالت میں پڑ گئے کہ وہ سب کے سب اسلام لے آئے۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں بعض صدر اُسقف اس قدر خود غرض، خود پرست اور جاہ و مرتبہ کے عاشق ہو گئے تھے کہ وہ بُری سے بُری باتوں کا ارتکاب کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے مثلاً خلیفہ مہدی کے زمانہ میں (از ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) مرو کا میٹروپالیٹن جو نسطوری پیٹریارک تموتھی کا مخالف تھا مہدی کو اُس کے خلاف اُکساتا رہتا تھا اُس نے خلیفہ کو خوش کرنے اور اُس کا منظورِ نظر بننے کی خاطر اسلام قبول کر لیا۔ خلیفہ نے اُس کو بھاری انعام و اکرام دیئے اور بصرہ میں بڑے سرکاری عہدہ پر ممتاز کیا۔ (رسالہ الکندی)۔ بعض بشپ اور قسیس بھی مختلف وجوہ کے باعث اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ مثلاً بحرین کا بشپ جارج جو نویں صدی کے نصف کے قریب اپنے عہدہ سے برخاست کر دیا گیا تھا مسلمان ہو گیا۔ یہ بشپ بار بار کلیسیائی قوانین کی خلاف ورزی کیا کرتا تھا۔ دسویں صدی کے نصف کے قریب صوبہ فارس کے میٹروپالیٹن جبرئیل کا بھائی مسلمان ہو گیا۔ اسی صدی کے شروع میں بیت گرمائے کا نسطوری بشپ تھیوڈور اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس کے چند سال بعد ۹۶۰ء اور ۹۷۹ء کے درمیان

آذربائیجان کا یعقوبی بشپ زِلوکسے نوس مسلمان ہو گیا۔ ۱۰۱۶ء میں تکریت کا یعقوبی میٹروپالیٹن ڈگنیشس جو ۲۵ سال سے بشپ تھا بغداد آ کر خلیفہ القادر کے دربار میں مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام ابو مسلم رکھا گیا۔ لیکن پھر اسلام لانے کے بیس سال بعد اپنی موت سے پہلے تائب ہو کر عیسائی ہو گیا۔ سولھویں صدی میں انطاکیہ کا یعقوبی پیٹریارک یشوعہ ۱۵۱۷ء میں مسلمان ہو گیا لیکن اس کی ضمیر نے اس کو اس قدر ایسا ستایا کہ وہ کپرس بھاگ گیا اور وہاں کے بڑے گرجا کے سامنے لیٹ گیا تاکہ عبادت گذار گرجا میں آتے جاتے اُس کے جسم پر پاؤں رکھ کر آئیں اور جائیں۔ ایک اور پیٹریارک نعمت اللہ ۱۵۶۰ء میں مسلمان ہو گیا لیکن بعد میں تائب ہو کر روم کو بھاگ گیا اور وہاں پوپ گریگوری سے مغفرت حاصل کر کے از سرِ نو کلیسیا میں شامل کیا گیا۔ مسیحی مؤرخ ان تینوں پیٹریارکوں کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ تینوں زناکار تھے اور گرجاؤں کے مقدس ظروف اور اشیا پر ناجائز قبضہ اور اوقاف کا ناجائز استعمال کرتے تھے۔ جب وہ بہت بدنام ہو گئے اور کلیسیا میں سر چھپانے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے اسلام اختیار کر لیا۔ یہی مؤرخ (بار ہیبریئس) لکھتا ہے کہ بارھویں صدی کے نصف میں جب خراسان کا بشپ بارمن زناکاری کی وجہ سے کلیسیا سے خارج کر دیا گیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ اُس نے بھی بعد میں توبہ کر لی اور دوبارہ کلیسیا میں شامل کر لیا گیا۔ اس مؤرخ کا ایک ہم عصر بشپ داتیانی تھا جو ایک بڑا عالم اور فاضل شخص تھا۔ اپنے علم کا اس کو بڑا غرور تھا اور ملیسو کے بشپ کے عہدہ پر ممتاز ہونا چاہتا تھا۔ لیکن نہ ہوا۔ غصہ کے مارے وہ مسلمان ہو گیا لیکن اسلام لانے کے چند ماہ بعد کسمپرسی کی حالت میں ایک سرائے میں مر گیا۔

(۳)

کلیساؤں کی مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی ۹۸۶ء کے بعد نسطوری کلیسیا جیسی مقتدر کلیسیا کا پیٹریارک خلیفۂ وقت کے ایما اور خوشنودی کی وجہ سے منتخب کیا جاتا تھا اور اُس کی طرف سے نامزد ہوتا تھا۔ ۱۰۶۳ء کے بعد یعقوبی اور ملکی کلیسیاؤں کے بشپ بھی جبراً اس نامزدہ پیٹریارک کے ماتحت کر دیے گئے تھے۔ خلیفۂ وقت جو چاہتا اُن سے کروا لیتا کیونکہ اُن کا اقتدار اسی طرح کلیسیاؤں پر قائم رہ سکتا تھا۔ پس خلیفہ نہ صرف کلیسیاؤں کا دُنیاوی حکمران تھا بلکہ اس طرزِ عمل سے اُن کا دینی پیشوا بھی ہو گیا۔ اور جب پیٹریارکوں کا یہ حال ہو تو اسقفوں اور قسیسوں کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کلیسیا کے ممبر کا اس قسم کے دینی رہبروں کی عزت و توقیر نہیں کر سکتے تھے۔ پس وہ عوام کی دل لگی کا باعث ہو جاتے تھے اور اس کا اثر کلیسیا کی رُوحانی حالت پر پڑتا تھا۔ کلیسیائیں دن بدن کمزور ہو کر اسلام کا آسانی سے شکار ہو جاتی تھیں۔

جب ہم مشرق و مغرب کی کلیسیاؤں کا مقابلہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں عظیم فرق نظر آتا ہے۔ مشرقی ممالک کی کلیسیاؤں کو مغربی ممالک کی کلیسیاؤں کی طرح حکومتِ وقت کی پُشت و پناہ کبھی حاصل نہ ہوئی۔ بڑی سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کلیسیاؤں کو زندہ رہنے دیا گیا۔ کبھی کبھار کوئی امیر یا سردارِ قبیلہ یا شاہزادہ مسیحی ہو جاتا تھا لیکن بالعموم یہ کلیسیائیں اقلیت بن کر ہی زندگی گزارتی رہیں۔ مسیحی کلیسیاؤں کے سردار ہمیشہ غیر مسیحی فرمانرواؤں کے ماتحت ہی رہے۔ ساسانیوں کے زمانہ میں وہ ساسانی شاہنشاہوں کے مطیع تھے اور پھر خلفاء کے ماتحت رہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں رُوم کا پوپ بادشاہوں پر حکمران تھا اور قسطنطنیہ کا پیٹریارک ۱۴۵۳ء تک بازنطینی قیصروں کے

احکام پر حکمران تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کلیسیا کا سردار کسی غیر مسیحی حکمران کے ماتحت ہو اور اس کے اشاروں پر چلے بغیر کام نہ چل سکتا ہو تو اس کی قیادت آزاد نہیں ہو سکتی بلکہ کلیسیا کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس طرزِ عمل سے اسلام کی آمد کے بعد دجلہ اور فرات کی کلیسیائیں نیم جان ہو گئیں اور جب تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں مونگولی خانوں نے اسلام اختیار کر لیا تو یہ کلیسیائیں اور وسط ایشیا کی کلیسیائیں جانبر نہ ہو سکیں۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وسط ایشیا میں نسطوری میٹروپولیٹن اور بشپ دسویں صدی کے آخری سالوں میں یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگے چنانچہ مارو (MARU) اور ایلشیا ہیگین (ALSCIA HEGIAN) کے آخری میٹروپالیٹن کے بعد وہاں کے میٹروپالیٹن کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دیلم (DAILUM) کے میٹروپالیٹنوں کا سلسلہ پیٹریارک ماریز (MARES) (از ۹۸۶ء تا ۹۹۹ء) کے زمانہ میں ختم ہو گیا۔ بردا (BARDA) کا سلسلہ پیٹریارک عبدیشوع سوم کے زمانہ میں ختم ہو گیا۔ رآئے (RAIA) اور طبرستانیہ (TABRESTANIA) کے میٹروپولیٹنوں کا سلسلہ بھی اسی زمانہ میں ختم ہو گیا۔ یہ سلسلے ایسی سُرعت کے ساتھ ختم ہونے لگے کہ ۱۰۴۳ء میں اخلاط (ACHLAT) اور مرگہ (MARGA) میں میٹروپولیٹن چھوڑ کوئی بشپ بھی نہ رہا۔

(۴)

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ متعدد مسیحی ایسے بھی تھے جو خلوصِ دل سے اس بات کے قائل تھے کہ اسلام برحق مذہب ہے اور وہ مسیحیت کو ترک کر کے تہِ دل سے اسلام قبول کر لیتے تھے۔ جوں جوں کلیسیاؤں کی حالت

بدسے بدتر ہوتی گئی اور ان کے قسیس جاہل بنتے گئے توں توں ایسے اشخاص کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ علم کے فقدان اور علما کی روز افزوں کمی کی وجہ سے مسیحی دلائل کو توڑنے والے اسلامی مملکت کے ہر حصہ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس کے برعکس اسلامی مدرسوں کی اور علما کی تعداد ہر ملک، شہر اور قصبہ میں بڑھتی جاتی تھی جو نومسلموں کو اسلامی عقائد و رسوم کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے زمانہ ہی سے نومسلموں کی تربیت کا باقاعدہ انتظام جاری تھا۔ جوں جوں اسلام پھیلتا گیا نومسلموں کی تربیت کے مدرسے بھی تعداد میں بڑھتے گئے جن میں قرآن و شرحِ اسلام کی ایسی خاطر خواہ تعلیم دی جاتی تھی کہ چند سالوں کے اندر یہ لوگ اسلام میں پکے ہو کر اس کے جوشیلے مبلغ ہو جاتے اور اس کی افواج میں جان تک قربان کر دیتے تھے۔ یہ نومسلم زیادہ تر ان طبقوں سے آتے تھے جو حکمت و فلسفہ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے اہل نہیں ہوتے تھے۔ ان کے لئے تثلیث فی التوحید، ابنیتِ مسیح، الوہیتِ مسیح وغیرہ دقیق مسائل جو فلسفیانہ زبان اور اصطلاحات میں پیش کئے جاتے تھے، سب بے معنی معمے تھے جن کے مقابلہ میں اسلامی کلمہ توحید سیدھا سادہ نظر آتا تھا۔ ان کو یہ سیدھی دلیل حلقۂ اسلام میں زیادہ کھینچ لاتی تھی کہ خدا اسلامی افواج کو مسلسل فتوحات بخشتا ہے پس اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔ جو عقل پسند لوگ نیک نیتی سے حق کی تلاش میں تھے، ان کے لئے یوحنا دمشقی اور دیگر مسیحی فضلا نے کتابیں لکھیں تاکہ وہ صراط المستقیم سے گمراہ نہ ہوں۔ جب اسلام میں اعتزال چل پڑا اور مسلمان علما و فضلا یونانی علوم و فلسفہ سے بہرہ ور ہوئے تو اس طبقہ کو جو عقل پسند تھا ایک گونہ تسلی ہوئی اور انہوں نے سچے دل سے اسلام کو اختیار کر لیا۔

جہاں مصر کی کلیسیاؤں کو ایک طرف ایذائیں دی جاتی تھیں اور اس کے شرکا کو تلوار کے زور سے جبریہ مسلمان بنا لیا جا رہا تھا وہاں اس ملک میں ایسے مسلمان بھی تھے جو مسیحیوں سے مناظرے کر کے ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور یوں بہت سے مسیحی صدق دل سے اسلام کو سچا مان کر قبول کر لیتے تھے کیونکہ قبطی قسیس زیادہ تر جاہل تھے اور وہ اسلامی مناظرین کے دلائل کا جواب باصواب دینے کے اہل نہ تھے۔ عامۃ المسلمین تبلیغِ اسلام کے معاملہ میں ہمیشہ جوشیلے رہے ہیں۔ چنانچہ خلیفہ مامون کے وقت عبداللہ ہاشمی نے اسحاق بن کندی کو دعوتِ اسلام دی تھی جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ اس قسم کے ہزاروں مسلمان اور تاجر طبقہ کے مسلمان جہاں جاتے تھے اسلام کی دعوت دے کر لوگوں کو حلقۂ اسلام میں لے آتے تھے۔ چنانچہ ہم جلد دوم میں ذکر کر چکے ہیں کہ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں مسلمان تاجروں نے اسلامی حملوں سے پہلے اسلام پھیلایا تھا۔ اس کے برعکس ذلیل اور حقیر اقلیتِ کلیسیا کے افراد مسلمانوں کو مسیحیت کی دعوت شرعی پابندیوں کی وجہ سے نہ دے سکتے تھے جس کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایمان متزلزل ہو گیا اور وہ مسلمان مناظروں اور فاضلوں کی دلیلوں سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے چلے گئے۔ اور اس زمانہ میں مسیحی کلیسیاؤں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کے صرف معدودے چند پیٹریارک اور کیتھولیکوس ہی تھے جن کا تبلیغ و اشاعتِ انجیل کا جوش سرد نہیں پڑ گیا تھا۔ عام طور پر ان کی اکثریت اب ایسی تھی جو مسیحیت کی اشاعت کی جانب سے لاپروا اور غافل تھی۔ جب کلیسیاؤں کے سرداروں کا یہ حال ہو تو قسیسوں اور شماسوں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ تبلیغ کے جذبہ کو استوار اور قائم رکھ سکیں۔ بچہ جاتیکہ عوام مسیحی اسلام کے خلاف بڑا یا نہ کر اپنے ایمان کو تھامے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے مسیحیت

پر ایسا اثر ہوا کہ کہتے ہیں کہ امام حنبل نے فوت ہونے سے پہلے بیس ہزار مسیحیوں اور یہودیوں کو مسلمان کیا تھا۔ ایک اور عالم ابوالفرج بن الجوزی (از ۱۱۱۵ء تا ۱۲۰۱ء) جو اپنے زمانہ کا یکتا عالم تھا فخریہ کہتا ہے کہ اُس کے ہاتھوں پر بیس ہزار نفوس اسلام لائے تھے۔ اسلام میں مسیحی کلیسیاؤں کی سی منظم تبلیغی انجمنیں نہ تھیں اور نہ ان کے مبلغ تنخواہ دار مقرر کئے جاتے تھے۔ ہر مسلمان تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو اپنا فرض سمجھ کر پورا کرتا تھا کیونکہ اس کو شروع ہی سے تبلیغِ اسلام کی تلقین کی جاتی تھی۔ ہر مسلمان مبلغ تھا جس کے ہاتھ پر ہر شخص اسلام قبول کر سکتا تھا (قرآن ۱۲۶/۱۶)۔ اسلام کی اشاعت میں نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ ہم باب ہفتم میں بتا چکے ہیں کہ مونگول حکمرانوں کے متعدد شہزادے اپنی مسلمان بیویوں کے کہنے سننے اور اصرار کرنے سے مسلمان ہو گئے تھے۔ غالباً تُرک بھی اپنی عورتوں کے وسیلے اسلام میں آئے تھے کیونکہ وہ حملے کر کے مسلمان ممالک سے عورتوں کو قید کر کے لے جاتے تھے جو اُن کی مدخولہ بن جاتی تھیں۔

ہم اُوپر لکھ آئے ہیں کہ اسلامی مملکت کے ہر حصہ میں اسلامی مدرسے قائم تھے جن میں قرآن اور اسلامی عقائد پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ ان مدرسوں میں اکثر اوقات مسیحی بچے بھی پڑھتے تھے اور وہ طفولیت ہی سے اسلام و قرآن کی تعلیم کو روزانہ سنتے تھے۔ اس ماحول میں پلنے کی وجہ سے تعجب نہیں کہ بڑے ہو کر وہ برضا و رغبتِ خود اسلام قبول کر لیتے تھے کیونکہ مسیحی قسیس اور راہب وغیرہ اس ماحول کا اثر زائل کرنے کے اہل نہیں ہوتے تھے۔ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام کا کلمہ توحید اُن کو مسیحی عقائد کی فلسفیانہ باریکیوں اور موشگافیوں کے مقابلہ میں سیدھا سادہ نظر آتا تھا جس کے

قبول کرنے میں ان کو کوئی دقت نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وہ کلمہ کے پہلے حصہ (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) کو تو پہلے ہی مانتے تھے اور تلوار اور دیگر مجبوریاں اور عقل اپنے اپنے طریقہ سے دوسرا حصہ (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ) منوا لیتے تھے۔ اور پھر اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِہِم ایک مسلّم حقیقت ہے۔

علاوہ ازیں صوفیہ اور درویشوں کی سادہ اور فقیرانہ زندگی مسیحیوں کے لئے کشش کا باعث تھی۔ اُن کی پاکیزہ زندگی عام مسیحیوں کی بداخلاقی اور بعض مسیحی لیڈروں کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ رُوحانی نظر آتی تھی۔ صوفیہ کی بے لوث زندگی کلیسیا کے راہبوں کی عکس تھی جس میں اُن کو خداوند مسیح کا جلوہ نظر آیا کرتا تھا۔ اُن کی خانقاہیں نومسلموں کے لئے راہبوں کی خانقاہوں کا نعم البدل تھیں۔ اُن کی صحبتوں میں بیٹھ کر وہ ویسی ہی رُوحانی لذت اُٹھا لیتے تھے جو اُن کو مسیحیت میں نصیب تھی لیکن اسلام اختیار کرنے کے بعد وہ کھو بیٹھے تھے اور یُوں اُن کو ایک گونہ تسلی ہو جاتی تھی۔

(۸) کلیسیاؤں کی جغرافیائی وسعت:۔

عہدِ خلفاء میں جب مسیحی کلیسیاؤں نے دیکھا کہ وہ اسلامی ممالک میں اپنے خداوند کے حکم کے مطابق انجیل کی تبلیغ نہیں کر سکتیں اور قانونی رکاوٹیں مسیحیت کی اشاعت میں سدِّراہ ہیں تو اُنہوں نے اسلامی مملکت کے باہر (جیسا ہم بتلا چکے ہیں) برِّاعظم ایشیا کے طول و عرض میں اپنے مبلغ بھیجے جنہوں نے کوہ و دشت و بیابان تک میں ہر جگہ خداوند کی نجات کا پیغام بُت پرستوں کو سُنایا اور ہر ملک و قوم میں جا بجا کلیسیائیں قائم کر دیں۔ چنانچہ وسط ایشیا۔ رُوس۔ کوریا۔ چین۔ جاپان۔ منچوریا۔ برما۔ ہندوستان۔ لنکا وغیرہ ممالک میں اس قدر

کلیسیائیں قائم ہوگئیں اور ان دُور و دراز ممالک کے شہروں میں نسطوری پیٹریارک نے اس قدر بشپ اور میٹروپولیٹن مقرر کیے کہ اُن سب کا سال میں ایک دفعہ مرکزی صدر مقام میں پیٹریارک کے حضور میں خود آنا ایک ناقابلِ عمل امر ہوگیا۔ اور پیٹریارک نے جیسا ہم بتلا چکے ہیں ان کو معذور کر دیا۔ چنانچہ ۱۲۷۸ء میں مارکو پولو جو ایک اطالوی سیاح تھا لکھتا ہے کہ نسطوری مسیحی سمرقند۔ کاشغر۔ یارقند میں اور چینی تسن میں جو تنگت کے راج میں ہے، اور منچوریا میں اور کوریا کی سرحد میں رہتے ہیں کہ اس کی ملاقات برما کے سرحدی صوبہ یونان میں اور دریائے ینگسی کے کنارے کے شہر چن کیانگ فو میں نسطوری مسیحیوں سے ہوئی۔ اس آخری شہر میں مار سرجیس نے ۱۲۸۱ء میں ایک مسیحی خانقاہ بنائی تھی۔ اس خانقاہ کے علاوہ چھ اور خانقاہیں بھی موجود تھیں۔ اس شخص کا دادا سمرقند کا ایک مسیحی طبیب تھا جس کے ہاتھوں چنگیز خان کے بیٹے کو شفا ملی تھی اور جو خود چنگیز خان کے پوتے قبلائی خان کا طبیب تھا اور اس شہر کا نائب گورنر تھا۔ اس میں ایک سو چھ مسیحی خاندانوں کے علاوہ ایک سو نو (۱۰۹) مسیحی افراد رہتے تھے جس سے ہم ان علاقوں کی مسیحی آبادی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سلطانیہ کا صدر اسقف ۱۳۳۰ء میں لکھتا ہے کہ خان بلیق (موجودہ پیکن) میں مسیحی آباد تھے اور ہمیں بتلاتا ہے کہ ملک چین میں تیس ہزار مسیحی رہتے ہیں۔ خود چینی مصنفوں کی کتابوں سے ثابت ہے کہ چین کے شمال اور جنوب میں اس قدر مسیحی بستے تھے کہ حکومت کو ان کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کرنا پڑا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ براعظم ایشیا کے ہر ملک و قوم کے بڑے شہروں اور قصبوں میں مسیحی پائے جاتے تھے اور وہ شمار میں کروڑوں کی تعداد میں تھے لیکن عام طور پر وہ انجیل کی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ نسطوری پیٹریارک کا

علاقہ اس قدر وسیع تھا کہ گیارھویں صدی کے شروع میں اس کا اختیار چین سے دریائے دجلہ تک اور جھیل بیکال سے راس کماری تک تھا۔ ان ممالک کے باشندے مسیحی مبلغوں اور بالخصوص مسیحی تاجروں کے ذریعہ خداوند مسیح کے قدموں میں آئے تھے۔ شام کے مسیحی تاجر قسطنطنیہ اور سکندریہ کے مسیحی تاجروں سے کہیں زیادہ مالدار تھے کیونکہ بغداد میں رہنے کی وجہ سے ان کو ایشیائی ممالک کے سوداگری راہوں کے ٹھیکے مل جاتے تھے اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے وہ غیر مسیحیوں سے ہمیشہ میل ملاقات رکھتے تھے۔ پس وہ چین۔ ہندوستان۔ اور وسط ایشیا کے شہروں اور مشرق بعید کے دیگر ملکوں میں آزادی سے آتے جاتے تھے اور ہر جگہ انجیل جلیل کا جانفزا پیغام لے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دُور و نزدیک کے ملک میں مسیحی کلیسیائیں قائم ہوگئی تھیں۔ ایسا کہ تیرھویں صدی کے آخر تک عرب ایک نسطوری کلیسیا ایشیا کے مختلف گوشوں میں اس قدر پھیل گئی تھی کہ نسطوری پیٹریارک کے ماتحت ستائیس میٹروپولیٹن تھے جن کے ماتحت دو صد سے زیادہ بشپ تھے جو ایشیا کے براعظم کے ہر ملک اور گوشہ میں رہتے تھے۔ ان دُور و دراز مقامات کی کلیسیاؤں کے مسیحی پیٹریارک سے ہزاروں کوس دُور بلکہ اپنے میٹروپولیٹنوں اور صدر اسقفوں کے صدر مقاموں سے بھی کوسوں دُور بستے تھے۔ ان کے بشپ تک ان کے پاس بمشکل تمام پہنچ سکتے تھے۔ راستے ایسے دشوار گذار اور صدر مقام سے دُور و دراز فاصلوں پر تھے کہ ایک بشپ کے لیے اپنے اسقفی علاقہ کو سنبھالنا جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اسلامی سلطنت کی قیود اور پابندیوں کی وجہ سے خود پیٹریارک مصیبتوں میں پھنسا رہتا تھا

اور ان دُور و دراز ممالک کی کلیسیاؤں کے استحکام کے لئے کوئی مضبوط قدم اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ پسنس، ایذا رسانیاں اور فسادات بغداد کی کلیسیا اور دیگر بڑی کلیسیاؤں کو اقلیتیں بنائے چلے جاتے تھے اور یہ کلیسیائیں اس قدر کمزور ہوتی چلی جاتی تھیں کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتی تھیں چہ جائیکہ وہ ان غیر ممالک کی کلیسیاؤں کو سنبھالیں جو اُن سے ہزاروں کوس دُور رہتی تھیں اور جن کے نام تک سے وہ آشنا نہ تھیں۔ اسلامی ممالک میں قسیسوں کی تعداد ہر سال کم ہوتی جا رہی تھی بیچارا پیٹریارک کتنے قسیس کہاں کہاں بھیجتا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جب ایک مونگول قبیلہ کے لئے اُس سے قسیسوں اور شماسوں کی درخواست کی تو اُس نے میٹرپولیٹن کو لکھا کہ ایک قسیس اور ایک شماس وہاں بھیج دو۔ ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ لاکھوں نو مریدوں کے لئے ایک قسیس اور ایک شماس کس طرح کفایت کر سکتا تھا۔ کلیسیا کی حالت رفتہ رفتہ ایسی خراب اور ناگفتہ بہ ہو گئی کہ نسطوری کلیسیا کا بشپ پچاس سالوں میں بمشکل تمام ایک دفعہ اپنے علاقہ میں ان دُور اُفتادہ جگہوں میں پہنچ پاتا تھا۔ اور جب کبھی وہ ان شاذ موقعوں پر اپنی کلیسیاؤں میں جاتا تو وہ کوشش کرتا کہ آئندہ سالوں کے لئے ایسا انتظام کر جائے کہ اس کی اگلی آمد تک کلیسیاؤں کا انتظام چلتا رہے۔ بعض اوقات ان دُور افتادہ مقامات کے مسیحی بضد ہو کر اپنے بشپوں کو مجبور کر کے اپنے نابالغ لڑکوں کو قسیس کے پاک عہدہ پر مامور کروا لیتے تھے تاکہ وہ بالغ ہو کر قسیس کے فرائض کو سرانجام دے سکیں۔ ایسی کلیسیاؤں کے شرکا کے قریباً تمام کے تمام لڑکے قسیس کے عہدہ پر ممتاز ہوتے۔ دریں حالات ان دُور و دراز ممالک کی کلیسیاؤں سے کس

طرح اُمید کی جا سکتی تھی کہ اُن کے شرکا انجیل کے جوشیلے مبلغ ہوں، کلیسیائیں سُرعت کے ساتھ ترقی کر کے اپنے ممالک میں مقتدر ہستیاں ہو جائیں۔ ہم کو حیرت نہیں ہوتی جب ہم پڑھتے ہیں کہ یہ قسیس جادو منتر ٹونا ٹوٹکا کیا کرتے تھے اور کلیسیا کے اکثر شرکا شرابی سُود خوار اور زناکار ہوتے تھے۔ جو شرکا تاتاریوں میں رہتے تھے وہ متعدد عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے اور اپنے قبائل کے دستور کے مطابق باپ کی وفات کے بعد اُس کی بیویوں پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس قسم کی بد اخلاقیاں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ وہ انجیل کی تعلیم سے بالعموم بے بہرہ تھے۔ اُن کی عبادتیں بھی سریانی زبان میں ہوتی تھیں جس کو وہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ پس مسیحیت نے ان ملکوں میں جڑ نہ پکڑی۔ اس کا نتیجہ قدرتاً یہ ہوا کہ اُن کی رُوحانی زندگی سال بسال بد سے بدتر ہوتی گئی اور جب ایذاؤں کی بادِ سموم چلی تو وہ مرجھا کر سُوکھ گئیں اور مختلف ممالک کے گروہوں کے گروہ مسیحیت کو ترک کر بیٹھے۔ بہتوں نے اسلام قبول کر لیا اور بے شمار لوگ بُدھ ہو گئے حتیٰ کہ بعض ممالک میں کلیسیائیں بالکل نابود ہو گئیں۔

(۹) کلیسیاؤں کی وحشت انگیز تنہائی کی زندگی:۔

اگر یہ مسیحی کلیسیائیں جو ممالکِ ایشیا کے دُور و دراز گوشوں میں پھیلی ہوئی تھیں ایک واحد جامع رسُولی کلیسیا کے ماتحت منظم ہو کر چلتی ہوتیں تو ان کی جُغرافیائی وُسعت کلیسیاؤں کے استحکام اور تقویت کا باعث ہوتی کیونکہ دُور و دراز کے مقامات کی کلیسیائیں انسانی جسم کے ہاتھ پاؤں کی طرح ہوتے جو دل سے تو جُدا ہوتے ہیں لیکن ان میں

دل کا خون دَورہ کرتا ہے جو ان اعضا کی رگوں، نسوں اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ لیکن جن کلیساؤں نے ان دُور دراز ممالک کی لاکھوں کلیساؤں کی بنیاد ڈالی تھی وُہ خود آپس میں بٹی ہُوئی تھیں اور ایک کلیسیا کی شاخیں کسی دُوسری کلیسیا کی شاخوں کی نگہبان نہ تھیں جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اگر ایک ہی شہر میں دو یا زیادہ کلیسیائیں ہوتیں تو وُہ ایک دُوسرے سے الگ جُداگانہ اپنی اپنی زندگی ایسی بسر کرتیں گویا کہ وُہ ایک دُوسرے سے غیر ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں۔ جب یہ غیریت کسی ایک شہر میں ہی نہیں بلکہ ایک مُلک میں ہر جانب پائی جائے تو اس مُلک میں مسیحی کلیسیا ترقی نہیں کر سکتی۔ ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ جب یہ غیریت صرف ایک یا دو مُلکوں تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اقصائے عالم تک پائی جائے تو ان دُور و دراز ممالک اور مقامات کی کلیسیائیں کس طرح قائم اور استوار رہ سکتی تھیں۔ اور مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کس طرح جاری رہ سکتی تھی

جب ہم اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ ان کلیساؤں میں نہ صرف غیریت ہی تھی بلکہ ان میں باہمی عناد ایسا تھا کہ وُہ ایک دُوسرے کے خون کی پیاسی تھیں تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دُور و دراز مقامات کی کلیسیاؤں کی تنہائی کا کیا عالم ہوگا اور ان کی کس مپرسی کس حالت کو پہنچ گئی ہوگی۔

پھر وُہ کلیسیائیں جو اسلامی ممالک میں تھیں روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کا تعلق اُن کلیساؤں سے قطع ہو گیا تھا جو اسلامی ممالک کے باہر تھیں اور جن سے وُہ الگ ہو گئی تھیں۔ اس حقیقت نے اسلامی ممالک کی کلیسیاؤں کو کلیسیائے جامع کے دیگر حصص سے جُدا کر دیا تھا اور وُہ عضوِ معطل کی طرح بیکار ہوتی جا رہی تھیں۔ جُوں جُوں اسلام غالب ہوتا جاتا تھا ان کلیسیاؤں کی ہمت پست ہوتی جا رہی تھی۔ اس جُدائی نے ان میں کمتری

کے احساس کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ وُہ اکیلی تن تنہا رہ گئی تھیں اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ کیونکہ اُنہوں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی تھی کہ وُہ اپنی سماجی زندگی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہ کر ہی گذاریں۔ پس وُہ ایک تنہا جماعت تھیں جس کو مسلمانوں کی جماعت اور سماجی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کے کاروبار بھی مسلمانوں سے جُدا تھے۔ یُوں اُن میں اور مسلمانوں میں مذہبی، سماجی، لسانی اور کلچرل اختلافات بڑھتے گئے۔ اور کلیسیائیں جُداگانہ جماعت تھیں لیکن ہر گروہ مسیحیت کے رشتہ میں بندھا تھا اور ایک دُوسرے کا ساتھی تھا۔ اس احساس نے مسیحی کلیسیاؤں کو اسلام قبول کرنے سے روکے رکھا۔ وُہ اس بات کی کوشش کرتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے وُہ اپنی مذہبی رسُوم کو ادا کرتی رہیں اور اپنی خاندانی زندگی کو مسیحی اخلاق سے آراستہ رکھیں۔ لیکن اکثریت کے مذہب، اقتصادی قیود، مذہبی پابندیوں اور حکمرانوں کی جفاکاریوں اور چالبازیوں کے آگے اُن کی کچھ پیش نہ گئی۔ اُن کی یہ دہشت انگیز تنہائی اُن کی زندگی کو کھوکھلا کر رہی تھی۔ جب اُن کی لاچاری کا یہ عالم تھا تو ہم ان کلیسیاؤں کی رُوحانی تنہائی اور دہشت کا قیاس کر سکتے ہیں جو اُن کے ذریعہ ایشیا کے مختلف ممالک کے گوشوں میں وجُود میں آئی تھیں۔

(۱۰) کلیسیاؤں کا ذہنی زوال:

جُوں جُوں کلیسیاؤں کی حالت پراگندہ اور ابتر ہوتی گئی اور اُن کی پست ہمتی، احساس کمتری اور دہشت بڑھتی گئی اور اس حالت میں صدیاں بیتتی گئیں۔ ان کلیسیاؤں کے علم و فضل، جدت اور قوتِ تخلیق پر مخالف حالات کا اثر پڑتا گیا۔ تخلیقی قوت کے لئے یکسوئی، اطمینان اور موافق و

سازگار حالات کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ صرف ایسے ہی ماحول میں نشوونما پا سکتی ہے لیکن مغربی ایشیا کی کلیسیاؤں میں صدیوں تک ایسے حالات موجود نہیں تھے۔ پس قدرتی طور پر ان میں رفتہ رفتہ علم و فضل کی کمی آگئی۔ اب مسیحی عالم مقدس یوحنائے دمشقی اور دیگر آبائے کلیسیا کی قدیم دلائل پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو دلائل ایک نسل کے لوگوں کو معقول نظر آتے ہیں وہ مابعد کی پشتوں کے لئے ناکافی ہوتے ہیں۔ پر جب کلیسیا کی اپنی ہستی ہی ہر وقت معرض خطر میں ہو تو اس کو کچھ سوجھ نہیں سکتا تھا۔ کلیسیا کو یہ یارا ہی نہ رہا تھا کہ وہ ایسے مفکر پیدا کرے جو علمی مشاغل کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے۔ پس کلیسیا کے شرکا کی تخلیقی قوت اس قسم کی مخالف فضا میں پرورش نہ پانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی اور کلیسیا کے علماء زمانہ ماضی کے فضلا کی صدائے بازگشت ہونے لگے۔ ان کے اپنے ذہن بنجر ہو رہے تھے۔ جوں جوں صدیاں گذرتی گئیں کلیسیا کے قسیس اور رہنما اور عام مسیحی پرانے فرسودہ عقائد و دلائل کو ہی چھاتی سے لگائے رہے۔ بے معنی رسوم کلیسیا کی حرز جان ہوتی گئیں اور ان کی ادائیگی ہی مسیحیت سمجھی جانے لگی۔ مسیحیت میں سے تبلیغ کی روح پرواز کر گئی اور رسوم کا ڈھانچہ رہ گیا۔ مسیحی کلیسیا میں اجتہاد ختم ہو گیا اور عقائد کو طوطے کی طرح رٹنا جزو ایمان ہو گیا۔ یعنی رسوم نے زندہ مسیحی تجربہ کی جگہ غصب کر لی۔ پس جائے حیرت نہیں کہ کلیسیا کی روحانی حالت روز بروز گرتی گئی اور اس کے بے شمار شرکا اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ اسلام کا بول بالا ہوتا گیا اور کلیسیا تباہ و ویران ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔

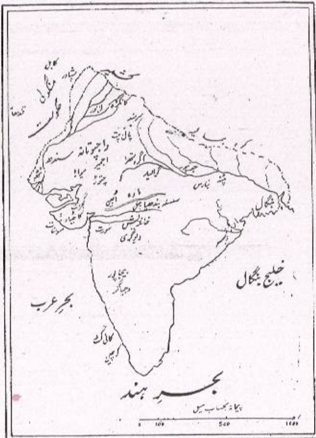
حصہ دوم

سلطنتِ دہلی کا قیام

اور

شمالی ہند کی کلیسیا کا انجام

Rev Michael Joseph. Cell # 92 300 7233 854.
yscaljesus@gmail.com
yesmicheal@yahoo.co.uk
Evenglist Yousaf Masih.
Cell # 92 300 7233 853.



بابِ اوّل

شمالی ہندوستان کی قدیم کلیسیائیں

ہم اس سلسلہ کی جلد اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ کتاب "مقدس تُوما کے اعمال" دوسری صدی مسیحی میں لکھی گئی تھی۔ اُس میں یہ روایت موجود ہے کہ مقدس تُوما ہندوستان کے رسُول ہو کر ہمارے ملک میں آئے تھے۔ یہ روایت کتاب کی تصنیف سے بہت پہلے کلیسیا کے مجامع میں مروّج تھی جب ابتدائی مسیحیوں کے دل میں مسیحِ عالمین کے رسُولوں کے روشن کارناموں کی یاد تازہ تھی۔ یہ روایت نہ صرف "مقدس تُوما کے اعمال" کی کتاب میں ہے بلکہ آبائے کلیسیا میں سے نسی بس کا مقدس افرائیم۔ مقدس گریگوری آف نازی آینزس۔ مقدس ایمبروز۔ تور کا مقدس گریگوری جیسی ہستیاں جو مشرق و مغرب میں مشہور تھیں اس روایت کی تائید کرتی ہیں۔

اس روایت کے متعلق مقدس تُوما "شہنشاہ اعظم گونڈو فرس" کے زمانہ میں شمالی ہند آئے تھے۔ اس بادشاہ کے بے شمار سکّے کابل۔ قندھار۔ ایران۔ سیستان۔ اور سندھ سے مغربی اور جنوبی پنجاب سے پٹھان کوٹ میں ملے ہیں۔ علاوہ ازیں تخت بائی کی پہاڑی سے (جو پشاور سے ۴۰ میل شمال مشرق کی

جانب واقع ہے۔ ایک کتبہ بھی دستیاب ہُوا ہے جو اب لاہور کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ ان سکّوں سے اس بادشاہ کی سلطنت کی وُسعت معلوم ہو جاتی ہے اور کتبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وُہ ۲۰ء میں تخت نشین ہُوا تھا۔ اس کا دارالسلطنت ٹیکسلا تھا جو راولپنڈی کے قریب ہے۔

اُس زمانہ میں وُہ علم و فضل کا مرکز تھا۔ مقدّس توما یہاں ۴۸ء کے قریب وارد ہُوئے اور آپ نے جا بجا مسیحی کلیسیائیں قائم کر دیں جو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئیں۔ جب کُشان قوم نے ٹیکسلا اور اس کی نواحی کو برباد کر دیا تو وہاں کے بُہت مسیحی بھاگ کر پنجاب اور شمالی ہند اور وسط ہند کے شہروں میں پناہ گزیں ہُوئے اور جہاں گئے ابتدائی مسیحیوں کی طرح (اعمال ۸ ب) خُداوند مسیح کی انجیل کا پیغام سُناتے رہے۔

ٹیکسلا کی سلطنت کے مسیحیوں کی پراگندگی کا یہ نتیجہ ہُوا کہ نہ صرف ٹیکسلا کی سلطنت کے صُوبوں میں بلکہ شمالی ہندوستان کے اور وسط ہندوستان کے مختلف صُوبوں مثلاً شمالی مغربی سرحدی صُوبہ۔ پنجاب۔ اُتر پردیش۔ مدھیا پردیش وغیرہ میں جا بجا مسیحی کلیسیاؤں کے زبردست مرکز پیدا ہو گئے۔ چُنانچہ ۱۹۳۵ء میں ٹیکسلا سے ایک صلیب دستیاب ہُوئی جو سیاہ پتھر کی بنی ہُوئی ہے اور اب ٹیکسلا کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ صلیب پہلی صدی عیسوی کی ہے۔

(۲)

شمالی اور وسط ہندوستان کی نوزادہ اور نوخیز مسیحی کلیسیاؤں کی پرورش نگہداشت اور استحکام اور ان کی تیز رفتار اشاعت کا سہرا نسطوری کلیسیا کے مبلّغوں کے سر پر ہے۔ وُہ مُقدّس پولُوس رسُول کے ہم نوا ہو کر کہتے

تھے کہ "انجیل کا سُنانا ہم پر فرض ہے۔ ہم پر افسوس اگر ہم اس کو نہ سُنائیں مسیح کی محبت ہم کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم سُنائے بغیر رہ نہیں سکتے" (اکر 9/16 - رومیوں 1/14 وغیرہ)۔ جغرافیائی طور پر بھی تمام شمالی ہندوستان مسیحیت کے زبردست مرکزوں کے قریب تھا۔ اور تجارت کی وجہ سے ہندوستان۔ سکندریہ اور مسوپوتامیہ بحری اور بری راستوں سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ پس شمال مغربی ہند میں بری راہ سے اور جنوبی ہند میں بحری راستہ سے نسطوری مبلغین ان زبردست مسیحی مرکزوں سے ہمارے ملک میں آتے رہے۔ ہندوستان کی بڑی شاہراہوں پر مسیحی کلیسیائیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ افغانستان اور بلوچستان کے قرب و جوار میں بیسیوں کلیسیائیں بستی تھیں جن کے بشپ تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر منگانا چھتیس بشپوں کے صدر مقاموں کے نام بتلاتا ہے جو ہندوستان کی شاہراہ پر یا ہندوستان کے قرب و جوار میں تھے۔ جہاں سے شمالی اور شمال مغرب کے دروں سے صلیب کے جاں نثار مبلغ آتے رہے۔ ان مختلف وجوہ کے باعث پہلی تین صدیوں میں مختلف اور دور و دراز مقامات میں مسیحی کلیسیائیں بکثرت پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے لگ گئیں۔

چنانچہ کافرستان (جو اب افغانستان کا حصہ ہے) ان قدیم زمانوں میں مسیحی ملک تھا[1]۔ اس کا ذکر ہم نے اپنی کتاب "صلیب کے علم بردار" میں کیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں بقول ڈاکٹر منگانا "مسیحی کلیسیائیں موجود تھیں جن کے ممبر ملک ہندوستان کے باشندے تھے کیونکہ ان کے آبا و اجداد نے مسیحیت کو ان مبلغوں کے وسیلے اختیار کیا تھا جو ایران اور مسوپوتامیہ سے آئے تھے"
(بلیٹن جان رائی لنڈز لائبریری جلد دہم)

[1] ZWEMER, ISLAM. P.231.

جب چوتھی صدی میں ساسانی شہنشاہوں نے مسیحی کلیسیاؤں کی بیخ کنی پر کمر باندھ لی تو بہت سے مصیبت زدہ مہاجرین نے شمالی ہندوستان کا رُخ کیا جس طرح توما تاجر اور اس کے ساتھیوں نے جنوبی ہندوستان کا رُخ کیا تھا۔ ان مسیحی ایرانی مہاجرین کی آمد نے شمالی ہند اور وسط ہند کی کلیسیاؤں کی رونق کو دوبالا کر دیا اور مسیحیت کے انوار ہر طرف اور ہر صوبہ میں چمکنے لگے۔

(۳)

چوتھی صدی میں شمالی ہندوستان کی کلیسیائیں صوبہ فارس کے ایرانی میٹروپولیٹن کے ماتحت تھیں جس کا صدر مقام ریوردشیر (موجودہ ریے) تھا۔ یہاں کے بشپ ابتدا ہی سے ہندوستان کی تمام کلیسیاؤں کے نگران اور حکمران رہے تھے۔ چنانچہ یہاں کا بشپ یوحنا "اسقف ایران و ہندوستان اعظم" ان بشپوں میں سے تھا جو کلیسیائے جامع کی پہلی کونسل نیکایاہ (۳۲۵ء) میں شریک تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں شمالی ہندوستان کی کلیسیائیں اس سُرعت کے ساتھ چاروں طرف ترقی کر گئی تھیں کہ پیٹریارک اسحٰق (از ۳۹۹ء تا ۴۱۰ء) اور پیٹریارک یحب اللہ (از ۴۱۵ء تا ۴۲۰ء) کے زمانہ میں یہاں کا بشپ آرچ بشپ بنا دیا گیا تھا۔ اعمال ماری کا مصنف ہم کو بتلاتا ہے کہ ۵۲ء میں شمال مغربی ہندوستان میں مسیحی کلیسیائیں روز افزوں ترقی کر رہی تھیں۔ ان میں علم و فضل کی کمی نہ تھی کیونکہ ریوردشیر کے بشپ معنا نے ۴۷۰ء میں چند الٰہیات کی کتابوں اور دینیات کے رسالوں کا ترجمہ پہلوی زبان میں کر کے یہاں بھیجا تھا۔ ان کلیسیاؤں کی ترقی کی رفتار کی سرعت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ پیٹریارک یشوعیب دوم (از ۶۲۸ء تا ۶۴۳ء) نے خاص ہندوستان کے لئے الگ ایک میٹروپولیٹن

مقرر کر دیا جس کے ماتحت قریباً ایک درجن بشپ تھے۔ ان شمالی ہندوستان کی کلیسیاؤں کے شمار اور اقتدار کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ اس میٹروپولیٹن کا رتبہ چین و سمرقند کے میٹروپولیٹنوں سے بڑا تھا۔ اس میٹروپولیٹن کا صدر مقام ٹیکسلا کے قریب گندرس پور (موجودہ شاہ آباد) تھا۔

مذکورہ بالا حقائق سے شمالی ہندوستان کی کلیسیاؤں کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں شمالی ہند کے طول و عرض میں گندرس پور کے میٹروپولیٹن کے ماتحت متعدد بشپ، ہزاروں قسیس اور شماس وغیرہ تھے۔ ان بشپوں کے صدر مقام اور قسیسوں کی جماعتیں اس وسیع ملک کے مختلف حصوں میں تھیں۔ چنانچہ مورخ لکھتا ہے کہ جس طرح رومی کلیسیا کا پوپ اپنے بشپوں کو مختلف ممالک میں بھیجتا ہے اسی طرح نسطوری پیٹریارک اپنے صدر اسقفوں اور اسقفوں کو ہندوستان کے تمام حصوں میں بھیجتا ہے۔

(۴)

وادیٔ گنگا اور بنگال میں مسیحی کلیسیائیں قدیم زمانہ سے موجود تھیں۔ تاحال تاریخ کی ورق گردانی سے یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ کلیسیائیں کب اور کس نے قائم کی تھیں لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قائم کرنے والے مسیحی تاجر تھے جو مغربی ایشیا کے زبردست مسیحی مرکزوں کے رہنے والے تھے اور تجارت کی خاطر اطراف و اکنافِ عالم میں جایا کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے اپنے تجارت و ہندہ مسیح کی انجیل کا جانفزا پیغام سنا کر ہر جگہ لوگوں کو اپنے خداوند کے قدموں میں لا کر کلیسیاؤں کا بیج بوتے تھے۔ یہ کلیسیائیں موافق فضا میں پرورش پا کر پھلتی پھولتی اور ترقی کیا کرتی تھیں۔

گنگا کی وادی میں اس قدر مسیحی کلیسیائیں تھیں کہ جب پانچویں صدی میں پردہ اٹھتا ہے اور تاریخ کی کرنیں پڑتی ہیں تو ہم کو وہاں خداوند مسیح کے نام لیوا لاکھوں کی تعداد میں ملتے ہیں۔ چنانچہ کوسمس سیاحِ ہند (جو سکندریہ کا بڑا مالدار تاجر تھا) ۵۲۲ء کے قریب یہاں آیا تو وہ لکھتا ہے کہ اس نے گنگا کی وادی میں بے شمار کلیسیاؤں اور متعدد بشپوں کو دیکھا۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے اس گوشہ میں بے شمار گرجے موجود تھے اور کہ یہاں خانقاہیں بھی تھیں جہاں راہب اور مسیحی درویش بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ یہاں کے مسیحیوں نے بڑی تعداد میں شہید ہو کر اپنے ایمان پر مہر ثبت کی۔ کوسمس کلکتہ کی کلیسیا کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ وہاں کی کلیسیا ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

(۵)

کوسمس نے اس بحری سفر میں بمبئی اور مالابار کی کلیسیاؤں کو بھی ۵۲۲ء میں دیکھا۔ ان کی نسبت وہ لکھتا ہے "ہم نے یہ دیکھا ہے کہ کلیسیا کسی جگہ بھی تباہ اور خستہ حالت میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہاں کی کلیسیائیں جا بجا وسیع پیمانہ پر قائم اور استوار ہیں اور تمام عالم ہمارے منجی مسیح کی تعلیم کے نور سے منور اور معمور ہو رہا ہے۔ انجیل مقدس روز افزوں ترقی پر ہے اور اس کی منادی تمام دنیا میں ہو رہی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ خود میری آنکھوں نے کیا ہے اور میرے کانوں نے وثوق سے سنا ہے۔ میں سچائی کی خاطر یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں"۔

بمبئی کے صوبہ کی اور اس کے قریب و جوار کے ضلعوں کی کلیسیاؤں کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ اس کے ضلع کناڈا کی ایک مرہٹہ جنگلی قوم سبدی کسی

زمانہ میں مسیحی تھے۔ چنانچہ اس ضلع کے گزیٹیر میں لکھا ہے[1] "یہ قبیلہ جو اب ہندو ہے کسی زمانہ میں مسیحی تھا۔ اس قبیلہ کے ناموں سے یہ حقیقت ظاہر ہے"۔ سر ولیم ہنٹر کہتا ہے کہ غالباً اس قسم کی بہت سی دیگر اقوام اور قبائل بھی کسی زمانہ میں مسیحی تھیں۔

(۶)

کوسمس کے چند صدیوں بعد تو سو ٹیمس اور جارجی[2] کس ہم کو بتلاتے ہیں کہ بنگال اور وسط ہندوستان میں بے شمار مسیحی کلیسیائیں قائم تھیں جو روز بروز ترقی کر رہی تھیں۔ یہ کلیسیائیں ایسی سرعت سے ترقی کر گئیں کہ یہاں کے قسیس اور شماس تعداد میں بڑھتے چلے گئے اور بالآخر پٹنہ کا شہر ایک الگ میٹروپولیٹن کا صدر مقام ہو گیا۔ جب ہم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہر میٹروپولیٹن کے ماتحت نصف درجن سے لے کر ایک درجن بشپ ہوتے تھے جو دور و دراز مقامات میں متعین کئے جاتے تھے اور ہر بشپ کے ماتحت متعدد قسیس اور شماس ہوتے تھے تو ہم وسط ہندوستان کی کلیسیاؤں کی تعداد اور وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

(۷)

ہم اس سلسلہ کی جلد دوم کے باب ششم میں ذکر آئے ہیں کہ حال ہی میں کشمیر میں پہاڑ کی وادی کے قدیم قبرستانوں میں نسطوری صلیبیں دستیاب ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وسیع خطہ میں بھی نسطوری مسیحی قدیم

1. GEZETTEER OF KANARA. VOL.15. P 397.
2. WILTSCH GEOGRAPHY AND STATISTICS OF THE CHURCH. (PP. 163—168)

صدیوں میں آباد تھے، اور کہ وہاں مسیحی کلیسیائیں جا بجا قائم تھیں۔ جب کشمیر کے مؤرخ اس طرف توجہ کریں گے تو ان کلیسیاؤں کے تفصیلی معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

(۸)

پس جب ہم شمالی اور وسط ہندوستان کی قدیم کلیسیاؤں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اولین مسلمان حملہ آوروں کی آمد سے پہلے ان وسیع خطوں میں جا بجا اور دور و دراز مقامات تک مسیحی کلیسیائیں قائم تھیں جو صوبہ سرحد سے لے کر بمبئی تک اور وسط ہندوستان اور بنگال تک غرضیکہ تمام شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی تعداد ہزاروں کی تھی اور ان کے شرکا کا شمار اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں ضرور تھا۔ کیونکہ ان کی نگہداشت کے لئے نسطوری کلیسیا نے دو میٹروپولیٹن مقرر کر رکھے تھے جن کے صدر مقام گندس پور اور پٹنہ تھے اور جن کے نیچے ڈیڑھ دو درجن بشپ تھے جو دور و دراز مقامات میں رہتے تھے اور یہ ہزاروں کلیسیائیں منتظم صورت میں ان کے ماتحت روز افزوں ترقی کر رہی تھیں۔

باب دوم

اولین مسلم حملہ آور اور مسیحی کلیسیا کی پراگندگی

فصل اوّل

محمد بن قاسم ۹۲ھ مطابق ۷۱۱ء

بانیِ اسلام کے زمانہ میں راجہ ہرش ہندوستان پر حکومت کرتا تھا لیکن جب وہ ۶۴۷ء میں مر گیا تو اُس کے بعد کوئی ایسا طاقتور راجہ پیدا نہ ہوا جو تمام ملک پر قبضہ کر کے اُس کے مختلف حصوں میں یکجہتی کو قائم رکھتا۔ جب رسولِ عربی نے وفات پائی اُس زمانہ میں ہندوستان کا ملک مختلف ریاستوں میں تقسیم تھا اور ہر ریاست کا راجہ ایک خود مختار حاکم تھا جو ہمیشہ اپنی ہمسایہ ریاستوں سے برسرِ پیکار رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنا دائرہ اقتدار بڑھا کر دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کر لے۔ پس ملک کی مختلف ریاستوں میں نہ اتحاد تھا اور نہ کسی قسم کی موافقت تھی۔

(۲)

ہم جلد اوّل میں ذکر کر چکے ہیں کہ اہلِ عرب مغربی ہند کے ساحلوں سے بخوبی واقف تھے کیونکہ زمانہ قدیم سے عرب تاجر ہندوستان آیا جایا کرتے

تھے۔ ان تاجروں سے ملک کی دولت کا حال سُن کر سب سے پہلے ایک فوجی مہم خلیفہ عمر کے زمانہ میں ۱۵ھ میں ساحلِ ہند کی جانب روانہ کی گئی جو بمبئی کے قریب تھانہ پر قابض ہو کر بھڑوچ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد خلیج فارس کے عربوں نے کئی دفعہ ساحلِ ہند پر اپنی فوجیں پھیلائیں لیکن یہ صرف فوجی مہمیں ہی تھیں جن کا کام صرف تاخت و تاراج کرنا تھا۔

عربوں کا سب سے پہلا باقاعدہ حملہ مکران کی طرف سے ہوا جو انتہائے مشرق میں ایک صوبہ تھا۔ چونکہ اس طرف سے ہند کی سرحد پر کوئی قدرتی رکاوٹ موجود نہ تھی پس مکران کے گورنر نے متعدد حملے کئے لیکن ان کا کوئی مستقل نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ حملے خلیفہ دوم حضرت عمر کے زمانہ میں ہوئے۔

بھڑوچ کا مقام نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کی بڑی بندرگاہ تھا۔ احمد بن یحییٰ جو عام طور پر بلاذری کے نام سے مشہور ہے اپنی کتاب فتوح البلدان میں ان حملوں کا ذکر کرتا ہے۔ ہم حصہ اوّل میں اس کتاب کا اکثر ذکر کرتے آئے ہیں کیونکہ یہ کتاب عربی کی قدیم تاریخی کتب میں سے ہے اور اس میں عربوں کی وہ فتوحات درج ہیں جو شام، عراق، مصر، ایران، آرمینیا، ماوراء النہر (ٹرانس آکسینیا)، ہسپانیہ اور سندھ میں اسلامی افواج نے حاصل کیں۔ ان جنگی مہموں کے بعد جب ابو موسیٰ (جو صحابہ رسول میں سے تھے) عراق کے گورنر مقرر ہوئے تو خلیفہ عمر نے ان سے ہندوستان کے حالات دریافت کئے اور کوئی اُمید افزا جواب نہ پا کر انہوں نے ان مہموں کو بند کر دیا۔

جب بنو اُمیہ کا پہلا حکمران امیر معاویہ تختِ خلافت پر بیٹھا تو اُس نے

اور یزید اوّل نے اور معاویہ ثانی نے کئی بار ہندوستان کی سرحدوں پر فوجی مہمیں بھیجیں۔ جب ولید اوّل مسندِ خلافت پر بیٹھا تو گورنر عراق حجاج بن یوسف نے بانیٔ اسلام کی وفات کے اَسّی (۸۰) سال بعد اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو (جس کی عمر صرف سترہ سال تھی) سندھ کی طرف بھیجا۔ ادھر محمد بن قاسم سندھ کی وادیوں میں جنگ کر رہا تھا، ادھر طارق ہسپانیہ کو فتح کرتا ہوا فرانس کی جانب بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف ایشیا میں حجاج نے ایک اور لشکر خوارزم۔ بخارا۔ سمرقند۔ خجند اور فرغانہ کو فتح کرنے کے لئے حدودِ تاتار میں بھیجا۔

حجاج بن یوسف سخت ظالم شخص تھا۔ اگر تمام مظالم جو اس سے منسوب کئے جاتے ہیں درست واقعات ہیں تو اس سے انسانیت سوز افعال شنیعہ سرزد ہوئے تھے۔ بہرحال وہ خلفائے بنو امیّہ کا ایک قابل جرنیل اور عراق۔ ایران۔ توران۔ ترکستان۔ خراسان۔ کابل۔ مکران۔ سندھ و گجرات وغیرہ کا وائسرائے یا نائب السلطنت تھا۔ اپنی سخت گیری کی وجہ سے وہ ضرب المثل ہو گیا تھا لیکن وہ ایک لائق۔ منتظم اور مدبّر شخص تھا۔ اس نے خلیفہ عبدالملک کے لئے درم اور دینار کے سکّے عربی میں جاری کئے جس سے شاہِ روم کا سکہ قطعی منسوخ اور متروک ہو گیا۔ اس نے اسلام کی ایک بڑی خدمت یہ کی کہ خلیفہ عثمان کے قرآن کو جمع کرنے کے قریباً ساٹھ برس بعد قرآن پر اعراب لگوائے جو اب تک مروّج ہیں۔

محمد بن قاسم کے مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لئے حضرت ابوہریرہ نے (جس سے قریباً پانچ ہزار حدیثیں مروی ہیں) ایک حدیث وضع کی کہ رسول اللہ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم نے سنا ہے ایسا شہر جس کے ایک جانب خشکی ہے اور ایک جانب سمندر ہے۔ جب مسلمان اس شہر کے پاس آئیں گے تو نہ

ہتھیاروں سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے بلکہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے تب دریا کے طرف کی دیوار گر پڑے گی۔ جب وہ دوسری بار یہی کلمہ کہیں گے تو دوسری طرف کی دیوار گر پڑے گی اور جب وہ تیسری بار یہی نعرہ لگائیں گے تو ہر طرف سے شہر کھل جائیگا اور مجاہدین اس شہر میں گھس جائیں گے اور لوٹ کا مال حاصل کریں گے" (رسالہ نگار جنوری ۱۹۵۹ء صفحہ ۴۲)۔

محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت ہندوستان کے کروڑوں باشندے بت و بت پرستی۔ اوہام باطلہ اور مخرب اخلاق رسوم میں مبتلا تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر برہمن حکمران تھے جن کے ابرو کے اشارہ پر راجے مہاراجے چلتے تھے۔ ذات پات کی قیود نے سب کو ذہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ پس ملک کے مختلف طبقوں میں نہ کوئی یگانگت تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ تمام ملک (جیسا ہم اوپر بتلا چکے ہیں) صرف جغرافیائی حیثیت ہی سے ایک تھا لیکن اس کے مختلف حصّے راجاؤں کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے بٹے ہوئے تھے۔ پس جب ان غیر ملکی مسلمانوں نے حملہ کیا تو راجاؤں نے باہمی رقابتوں اور دشمنیوں کی وجہ سے کوئی متحدہ محاذ قائم کر کے لڑائیاں نہ کیں۔ محمد بن قاسم مکران اور بلوچستان کی راہ سے آیا۔ اس نے دیبل (موجودہ ٹھٹھہ) پر ۹۳ھ (۷۱۱ء) میں حملہ کیا تو سندھ کے جاٹ اور میڈ اس کے ساتھ مل گئے کیونکہ یہ قومیں ہندو راجاؤں کے ظلم سے تنگ آ گئی تھیں۔ فتحمند اسلامی افواج نے تین دن شہر دیبل (کراچی) میں لوٹ مار کی۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ ۱۷ سال کے اوپر کے سب بالغ ہندو جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا قتل کر دیئے گئے۔ محمد بن قاسم نے وہاں ایک مسجد تعمیر کی اور کشتیوں کا پل بنا کر دریائے سندھ کو عبور کر لیا۔ راجہ داہر اور اس کے ساتھیوں نے جان توڑ مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گئے۔ محمد بن قاسم

نے داہر کے خزانہ پر قبضہ کر لیا اور کئی روز قتل و غارت ہوتی رہی۔ قلعہ کے چھ ہزار آدمی کام آ گئے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا وہ غلامی، خراج اور جزیہ سے آزاد ہو گئے۔ حجاج نے غیر مسلموں کی نسبت ہدایت بھیجی کہ چونکہ ان لوگوں نے اسلام کی اطاعت قبول کر لی ہے وہ ہماری زیر حفاظت ہیں اور ان کا جان و مال محفوظ ہوگا۔ ان کو اپنے معبودوں کو پوجنے کی اجازت ہے۔ خلفائے بنی امیہ کی عام پالیسی کے مطابق برہمنوں کے رتبہ کو حسب سابق ملحوظ رکھا گیا اور ملک کا انتظام ان کے ماتحت کر دیا گیا۔

وہاں سے محمد بن قاسم ملتان کی جانب بڑھا جو شمالی ہند کا بڑا شہر تھا۔ سات روز کی خونریز جنگ کے بعد ملتان بھی فتح ہو گیا۔ ہندو سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا اور چھ ہزار عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ عیسائیوں کے گرجاؤں اور یہودیوں کے عبادت خانوں کی طرح ہندوؤں کے مندروں کی بھی حرمت کی جائے۔ ۹۵ھ تک اس نے بہت سا مشرقی حصہ فتح کر لیا۔ ان حملوں میں اسلامی افواج نے اس قدر خونریزی کی کہ ہر طرف خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ چنانچہ دیبل کی فتح کے بعد تین روز تک خون کی نہریں جاری رہیں۔ داہر میں اتنا کشت و خون ہوا کہ مسلمان خود قتل کرتے کرتے تنگ آ گئے۔ ہندو راجہ کی بیوی نے عورتوں کو اکٹھا کیا اور وہ سب آگ میں جل مریں تاکہ ان کی عفت محفوظ رہے۔

ابھی محمد قاسم ملتان کے آگے نہ بڑھا تھا کہ حجاج مر گیا اور اس کے چھ ماہ بعد خلیفہ ولید بھی فوت ہو گیا۔ جب اس کا بھائی سلیمان ۷۱۵ء میں خلیفہ ہوا تو اس نے حجاج کے تمام ساتھیوں کو چن چن کر قتل کر دیا۔ محمد بن قاسم بھی اس کے حکم کے مطابق قتل کر دیا گیا۔

(۴۳)

چونکہ عرب اتنے بڑے اور وسیع علاقہ کا خاطر خواہ انتظام خود نہیں کر سکتے تھے انہوں نے زر و جواہرات، قیدیوں، غلاموں اور لونڈیوں پر ہی اکتفا کر کے ملک کا انتظام راجہ داہر کے بیٹے کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ عربوں کا تسلط قائم نہ رہ سکا کیونکہ جو راجہ مسلمان ہو گئے تھے وہ عربوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔ بعض عرب سپاہی ملتان کے علاقہ میں آباد ہو گئے اور انہوں نے متعدد ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور ملتان کے گرد نو آبادیاں بسا کر انہوں نے دیگر ممالک کے ساتھ بری اور بحری تجارت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ہندوؤں کی وضع اور طرز رہائش اختیار کر لی۔ چنانچہ مؤرخ ابن حوقل بغدادی جس نے چوتھی صدی ہجری کے شروع میں یہاں سفر کیا تھا، کھنبایت کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہاں مسلمانوں اور کافروں کی ایک ہی وضع ہے۔ دونوں ایک سا لباس پہنتے ہیں اور بڑے بڑے بال رکھتے ہیں۔" یہی مؤرخ سندھ اور منصورہ کی نو آبادیوں کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہاں کے مسلمانوں کا لباس عراق کا سا ہے لیکن یہاں کے بادشاہوں کی وضع ہندو راجاؤں کے قریب قریب ہے۔" (مقالات شبلی جلد اول)

اوّل اوّل دیبل، نیرون اور اروڑ میں مندر مسمار کیے گئے تھے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ محمد بن قاسم نے ملتان کے سورج دیوتا کے مندر کے خزانہ کو لوٹ لیا تھا اور مردوں کو قتل کر کے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا تھا۔ لیکن راجپوتوں کی طاقت کی وجہ سے خلیفۂ وقت کے لیے ان علاقوں کا خاطر خواہ انتظام کرنا ممکن نہ تھا پس رفتہ رفتہ غیر مسلموں سے

بہتر سلوک ہونے لگا ۔ اسلامی سلطنت کے استحکام کو شمال اور جنوب کے راجپوتوں کی وجہ سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا ۔ پس محمد بن قاسم کی فتوحات کا کوئی مستقل نتیجہ نہ نکلا ۔ عرب کی اسلامی افواج نے شجاعت اور جہاد کے جذبات سے سرشار ہو کر سندھ اور ملتان کے علاقوں کو فتح تو کر لیا لیکن اُن کی ملک گیری کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہُوا ۔ یہ ضرور ہُوا کہ پردیسی فاتحین کے نئے عقیدہ اور اُن کی اجنبی زبان کے قدم مُلک میں جم گئے ۔ سندھ میں اسلامی قانون رائج ہو گیا اور ہر طرف قاضی مقرر ہو گئے ۔ جب ہلاکو نے عباسیہ خاندان کا خاتمہ کر دیا تو سندھ کا عرب گورنر خود مختار ہو گیا ۔ اُن قدیم دِنوں میں یہ اسلامی حکومت دیر تک قائم نہ رہی ۔ جو غیر مسلم جان کے خوف کے مارے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے اُن میں سے بعض اپنے مذاہب کی طرف لوٹ گئے اور اُن میں جذب ہو گئے ۔

(۴)

ہم اُوپر لکھ چکے ہیں کہ محمد بن قاسم مکران اور بلوچستان کی راہ سے آیا تھا ۔ یہ وُہ راستہ تھا جس سے نسطوری مسیحی مبلغین صدیوں تک آتے جاتے رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیسیائیں ہر طرف آباد تھیں ۔ جن جگہوں میں محمد بن قاسم نے حملے کئے تھے وہاں نسطوری مبلغین نے تبلیغی مساعی ضرور کی ہونگی اور وہاں بھی کلیسیائیں قائم ہونگی اور ان حملوں کی وجہ سے پراگندہ ہو گئی ہوں گی ۔ کلیسیائے ہند کے مستقبل مؤرخوں کے لئے یہاں کھوج کرنے کے لئے وسیع میدان ہے ۔

کلیسیائے ہند کی تاریخ میں یہ وُہ زمانہ تھا جب جیسا ہم جلد دوم میں لکھ آئے ہیں ، نسطوری کلیسیا کے پیٹریارک نے فارس کے میٹروپولیٹنوں کی مخالفت کے باوجود ہندوستان کی کلیسیا کے لئے الگ میٹروپولیٹن مقرر کر دیا

تھا ۔ اِس واقعہ سے نسطوری کلیسیا میں ایسی پھوٹ پڑ گئی تھی کہ فارس کے میٹروپولیٹن کہنے لگ گئے تھے کہ ہم مقدس تُوما رسُول کے جانشین ہیں اور ہمارا پیٹریارک سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اور وُہ پیٹریارک سے سرکشی کر کے الگ ہو کر خود مختار بننا چاہتے تھے ۔ اِس ہوس اقتدار نے کلیسیا کو کمزور بنا دیا ۔ علاوہ ازیں خلیفہ متوکل کے زمانہ میں اسلام کی سیاسی طاقت نے اور اسلامی شریعت کی پابندیوں نے بغداد کے پیٹریارک اور ممالک ایشیا کے میٹروپولیٹنوں میں فاصلہ اور دیگر حالات کی وجہ سے ایسی دُوری پیدا کر دی تھی کہ پیٹریارک تھیوڈوسی اس نے کونسل نیکیاہ کے اِس قاعدہ کو کہ "تمام بشپ سال میں ایک دفعہ پیٹریارک کی سنڈ میں حاضر ہُوا کریں" تبدیل کر کے یہ فیصلہ کیا کہ دُور دراز ممالک کے میٹروپولیٹن ہر چھٹے سال اپنی متابعت کا خط بھیجا کریں ۔ اس سے قدرتاً کلیسیائے ہند کی قوت و استحکام پر اثر پڑا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلام کی آمد کے دِنوں میں مسیحی کلیسیاؤں کے باوجود باشندوں کی اکثریت کا مذہب بُت پرستی تھا اور حیا سوز رسُوم مروّج تھیں ۔ بعض لوگ خلوص دِل سے کروڑوں بُتوں کی پرستش سے بیزار تھے اور اُنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ گو چالیس سال بعد ۷۵۲ء میں راجپوتوں نے مسلمانوں سے سندھ واپس لے لیا پر اسلام سندھ میں قائم رہا ۔ بلکہ اس کی اشاعت سندھ کے باہر بھی ہوتی رہی ۔ اِس حقیقت سے ظاہر ہے کہ جو مسیحی کلیسیائیں سندھ میں موجود تھیں اُن کا ایمان کمزور تھا اور اُن کا تبلیغی جذبہ سرد پڑ گیا تھا ۔ گو ۷۹۲ء میں ہندو سندھ پر قابض تھے پھر بھی اسلام کی تعلیم عوام میں رفتہ رفتہ اثر کرتی چلی گئی ۔ بعض ہندو راجے بھی مختلف وجوہ کے باعث مسلمان ہو گئے تھے اور انھوں نے اسلامی نام اختیار کر لئے تھے ۔ ملتان اور منصورہ کی اسلامی حکومتوں میں عربی اور سندھی دو نوں زبانیں بولی جاتی تھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دُوسرے کے ساتھ اختلاط اور میل جول رکھتے تھے ۔ اسلام

کی اشاعت کے زیادہ تر اسباب یہ تھے :۔ (۱) اسلامی وحدت کے عقیدہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے اسلام کو آبائی مذہب پر ترجیح دی۔ (۲) اسلامی اُخوّت کی تعلیم سے ہندوؤں نے ذات پات کی قیود سے نجات پائی۔ بالخصوص نیچی ذات کے ہندوؤں کے لئے یہ تعلیم نہایت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ (۳) ہر شخص جو دائرۂ اسلام میں آجاتا تھا یہی چاہتا تھا کہ اس کے دیگر رشتہ دار بھی ذات پات کی غلامی سے رہائی حاصل کرنے کے لئے اسلام قبول کرلیں۔ (۴) جو لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوجاتے تھے اُن کو حکومت کی طرف سے عمر بھر کے لئے ملازمت اور عزّت حاصل ہوجاتی تھی۔ (۵) ہر نو مسلم کو اپنی جائداد وغیرہ کی حفاظت کا یقین ہو جاتا تھا۔ (۶) عرب مسلمانوں نے ہندو عورتوں سے ازدواجی تعلّقات پیدا کر لئے اور یوں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی کیونکہ وہ چار بیویاں اور لاتعداد لونڈیاں رکھ سکتے تھے۔ (۷) جو شخص مسلمان ہوجاتا وہ ان تمام حقوق کا مالک ہوجاتا تھا جو باقی مسلمانوں کے تھے اور کوئی شخص اُس کو اِن حقوق سے محروم نہیں کرسکتا تھا۔ (۸) جب کوئی ہندو مسلمان ہوجاتا تھا تو وہ ہندو خاندانوں کے باہمی تنازعوں اور ہندو قبیلوں کی باہمی مخاصمت اور ذات پات سے چھٹکارا حاصل کرلیتا تھا۔ (۹) مسلمانوں کا اقتدار روز افزوں تھا۔ ایسا کوئی اُن سے لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اقتدار رفتہ رفتہ ایسا بڑھ گیا کہ جب بعد کے زمانہ میں ترکوں اور افغانوں نے حملے کئے تو ان مسلمانوں کے وجود سے حملہ آوروں کے حوصلے بڑھ گئے۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ جو کلیسیائیں ان علاقوں میں قائم تھیں وہ کمزور تھیں۔ اُن کے وجود نے ہندو سوسائٹی پر کوئی مستقل اثر نہیں کیا تھا ان میں تبلیغی جوش نہ تھا اور وہ اپنی حال میں ہی مست رہتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلام کی آمد نے اور سلطانی سلطنتوں کے قیام نے ان کو آگے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا۔

فصل دوم

محمود غزنوی کے حملے (از ۱۰۰۰ئہ تا ۱۰۲۶ئہ)

ہم اس جلد کے حصّہ اوّل کے باب ہفتم کی فصل پنجم میں ترکوں اور سلجوقیوں کا مختصر حال لکھ چکے ہیں۔ جب دسویں صدی کے آخر میں خلافت بغداد بہت کمزور ہوگئی تو سلجوقیوں نے اس میں نئی زندگی پھونک دی۔ سامانی حکومت میں ترک مملوکوں (غلاموں) کو بڑا عروج حاصل تھا اور تمام کلیدی عہدے اُنہیں کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے ایک الپتگین تھا جو عبد الملک سامانی کے عہد میں افواج کا کمانڈر تھا۔ اُس نے غزنہ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ لیکن غزنوی حکومت کا اصل بانی الپتگین کا دوسرا مملوک سبکتگین تھا جو اُس کا داماد بھی تھا۔ یہ سبکتگین محمود غزنوی کا باپ تھا۔

محمود غزنوی نہایت کٹّر اور متعصب مسلمان تھا۔ وہ بت و بت پرستی کو مٹانا اور اسلام کو پھیلانا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔ وہ ترک تھا جو رواداری کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ اُس نے خلیفہ قادر باللہ سے سندِ حکومت کی درخواست کی۔ خلیفہ نے اُس کو سندِ حکومت اور خلعت اور یمین الدولہ کہف الاسلام" کا لقب عطا کیا اور حکم دیا کہ اعتزال اور باطنیت کے فرقوں کا انسداد کرے اور احیائے سنّت کرے۔ چنانچہ اُس نے نہایت سختی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ (ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۱۴۴)۔ وہ علمِ حدیث کا بڑا دلدادہ تھا (ابن خلکان جلد ۲ ۔ صفحہ ۸۶)۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے بڑے قائدین اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ اُس نے ۱۰۰۰ئہ اور ۱۰۲۶ئہ کے درمیان ہندوستان پر سترہ حملے

کئے۔ اُس کا ٹِڈی دَل لشکر براہِ افغان کوہستان ہندوستان میں داخل ہوتا تھا۔ مالِ غنیمت کی فراوانی کی وجہ سے محمود کو غازیوں اور مجاہدوں کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی اور وسط ایشیا۔ ایران۔ افغانستان وغیرہ مسلم ممالک کے من چلے اور مفلس مفلوک الحال مسلمان ہر حملہ کے وقت اُس کے جھنڈے تلے آ جمع ہوتے تھے۔ مالِ غنیمت کے لالچ۔ جہاد کے جذبہ اور نعمائے بہشت کی حرص نے اسلامی افواج میں تُرکی تاتاری۔ عربی۔ ایرانی وغیرہ سپاہیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا چنانچہ آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتا ہے کہ "ایسے لوگوں کی تعداد جو خالص دینی اور مذہبی اصولوں کی خاطر دائرہ اسلام میں آتے تھے بہت کم تھی۔ لیکن ایسے مسلمانوں کی تعداد نہایت کثرت میں تھی جو کسی نہ کسی وبا یا قتل و غارت اور مالِ غنیمت کے لالچ کی وجہ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے عرب کی سلطنت کی وُسعت کی اصل وجہ عربوں اور مسلمانوں کا مذہبی جوش نہ تھا بلکہ ہمسایہ ممالک کی زرخیز زمین اور بے شمار دولت تھی جو اُن کو کشاں کشاں لشکرِ اسلام میں لے آتی تھی"۔ ہر بار محمود ہندوستان سے بے اندازہ دولت۔ بے شمار مندروں کے خزانے اور ہزاروں مردوں۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر غزنی لے جاتا تھا۔ تختِ خلافت کی طرف سے اُس کو خلعت اور خطاب عطا ہوئے تھے جس نے اُس کے اور اُس کی افواج کے شوقِ جہاد کو دوبالا کر دیا۔ ہم مالِ غنیمت کا اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فقط کانگڑہ سے (جو ایک حصین ترین قلعہ شمار کیا جاتا تھا) بے انتہا جواہرات اور سیم و زر کے خزانے اُونٹوں پر لادے گئے اور غزنی میں دکھلائے گئے۔ بیش قیمت آبدار موتی۔ لعل اور ہیرے جو اناروں کے برابر بڑے تھے محمود کے ہاتھ آئے۔ ان کے علاوہ کئی ہزار من وزنی، سونے اور چاندی کے برتن پیالے وغیرہ مالِ غنیمت میں آئے۔ ہر حملہ کے بعد اس قدر مال ہاتھ آتا کہ محمود کو مجبوراً واپس

لَوٹنا پڑتا تاکہ وہ اس لُوٹ کو غزنی پہنچا سکے۔ راجہ جے پال کے گلے کا ہار اکیلا ایک لاکھ اسّی ہزار دینار کی مالیت کا تھا۔ اِس جنگ میں اُس کو بے اندازہ مالِ غنیمت اور پچاس ہزار غلام اور لونڈیاں ہاتھ آئیں۔ متھرا کے مندر سے محمود کو قریباً ایک لاکھ سونے کے مثقال۔ چاندی کے دو صد بُت۔ پانچ ہزار دینار کے دو لعل۔ چار سو پچاس مثقال کا ایک نیلم اور بے شمار زر و جواہرات ملے۔ ۱۰۲۶ء میں محمود نے آخری حملہ سومنات پر کیا۔ اس نے مندر کے مشہور بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یہ ٹکڑے "بُت شکن" فاتح کے محل میں لے جائے گئے۔ اس مندر کی بے قیاس دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس سونے کی زنجیر سے پجاریوں کو بُلایا جاتا تھا وہ دو سو من کی تھی۔ اس کے چھپّن ستون تھے جو قیمتی پتھروں سے جڑے ہوئے تھے۔ شہر کی تسخیر سے محمود کے ہاتھ ڈیڑھ کروڑ روپیہ کا مالِ غنیمت آیا۔ اُس زمانہ میں ہندوؤں کے تمام مندر عجائب روزگار ہوتے تھے اور محمود ان کو دیکھ کر سکتے کے عالم میں آجاتا تھا۔ عرب سیاح البیرونی جو خود کٹر مسلمان تھا ان مندروں کی فنِ تعمیری اور عمارت سازی کی خوبی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم ان کو دیکھتے ہیں تو ہماری عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اُن کی سی عمارت بنانا تو درکنار ہم اُن کی عمارت کی ہر تفصیل کی خوبصورتی کو بھی الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے۔ ان مندروں کے ہندو پرستار بڑھ چڑھ کر اُن پر اپنی دولت نچھاور کیا کرتے تھے سومناتھ کے مندر کے دروازے ایسے بیش قیمت اور خوبصورت تھے کہ محمود اُن کو غزنی لے گیا جہاں وہ اُس کے دارالسلطنت کی زینت بنے۔ سومناتھ کی فتح کے بعد خلیفہ القادر باللہ نے اس کو اور اس کے بیٹوں کو خلعت عطا کئے اور

تمام اسلامی دُنیا میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ اب وہ "امیر محمود" کی بجائے "سلطان محمود" ہو گیا۔ وہ پہلا مسلمان فرمانروا تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

البیرونی جو خیوہ میں ۹۷۳ء میں پیدا ہوا تھا محمود کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ وہ ایک عالم شخص تھا جس نے ہندو فلسفہ اور ہندو رسوم و رواج کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوؤں کی تعزیرات عیسائی دین کی طرح نرم ہیں۔ ان کی رسوم کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ بدچلنی کی روک تھام اور نیک چلنی کا رواج ہو۔ لیکن ان کے خالقوں کی نظر میں سب انسان برابر نہیں کیونکہ برہمنوں کو موت کی سزا نہیں دی جاتی بلکہ جب کوئی برہمن کسی کو مار ڈالتا ہے تو اس سے برت رکھوائے جاتے ہیں اور پرارتھنا اور دان لیا جاتا ہے۔ ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔ ستی کی رسم ہر جگہ پائی جاتی ہے اور بیواؤں کا نکاحِ ثانی ممنوع ہے۔ اس کی تصنیف سے پتہ لگتا ہے کہ دسویں صدی مسیحی میں ہندو مذہب میں حقیقی دین داری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور علم و فلسفہ اور زہد و اخلاق کی بجائے جہالت اور حرص و طمع کا دور دورہ تھا۔ ہم انشاء اللہ آگے چل کر بتلائیں گے کہ انجیل کے روح پرور پیغام نے کس حد تک ان مخرب اخلاق حالات کا مقابلہ کر کے ان صدیوں میں ملک کا سدھار کیا تھا۔

محمود کو علم و ادب کا بڑا شوق تھا۔ اس کے عہد میں ہر چہار طرف کے علما اور فضلا غزنی کی طرف اُمڈے چلے آئے جن کو وہ ہر سال چار لاکھ دینار دیتا تھا۔ ہندوستان کی لوٹ سے اس نے بے مثل مسجدیں بنوائیں۔ اور بے نظیر عمارتیں۔ باغ۔ حوض۔ فوارے وغیرہ بنائے۔ مفتوحہ ممالک کی عمارات کے ساتھ وہ وہاں کے صناعوں کو بھی غلام بنا کر لے آیا۔ غزنی میں ایک عالی شان مسجد

تعمیر ہوئی جو سنگِ مرمر۔ سنگ خارا اور بہترین قسم کے سرخ پتھر سے بنائی گئی تھی یہ مسجد دُنیائے اسلام میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ وہ سونے سے مزین تھی جس میں چاندی کے چراغدان۔ بیش قیمت غالیچے اور بیش بہا جواہرات لگے تھے۔

محمود کے عہد کے آئین و قوانین کا کسی کتاب میں ذکر نہیں آتا کیونکہ وہ تمام معاملات میں قرآنی احکام اور شریعت اسلام کا سخت پابند تھا اور اپنے احکام انہی کے مطابق ہر جگہ صادر کرتا تھا۔ ہندوستان کے حملوں کی وجہ سے غزنی کا شہر ہندی غلاموں سے بھرا پڑا تھا۔ لونڈیاں غلام نہایت سستے داموں فروخت کئے جاتے تھے کیونکہ وہ تعداد میں اس کثرت سے تھے کہ ہر مجاہد کے پاس غلام اور لونڈیاں تھیں جو از روئے قرآن "ان کے ہاتھ کا مال" تھیں۔

محمود ایک عالم پرور شخص تھا جس کے دربار میں غضائری۔ اسدی طوسی۔ فارابی۔ عتبی۔ عسجدی۔ عنصری اور فردوسی جیسے باکمال لوگ موجود تھے۔ اس کو جہاں اصحابِ کمال کا پتہ چلتا ان کو وہ غزنی بلا بھیجتا چنانچہ خوارزم کے دربار میں ان دنوں مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال جمع تھے وہاں سے اس کے بلاوے پر البیرونی اور دیگر حکما غزنی چلے گئے لیکن مشہور مسیحی فلاسفر ابو سہل نے جانا پسند نہ کیا اور محمود کے خوف سے خوارزم کو چھوڑ کر چلا گیا۔

محمود نے خاص غزنی میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور مختلف زبانوں کی عجیب و غریب کتابیں جمع کیں۔ اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سا روپیہ مقرر کیا اور طلبا اور اساتذہ اور دیگر صاحب کمال لوگوں کے وظائف کے لئے اس نے مستقل ذرائع آمدنی قائم کئے۔ علما کو ایک لاکھ

سالانہ وظائف دیتا تھا۔

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ "اُس نے مسجد کے قریب ایک مدرسہ بنا کیا اور بہترین کتابوں اور نادر نسخوں سے اس کو آراستہ کیا مسجد اور مدرسہ کے لئے اُس نے بہت سے گاؤں وقف کر دیئے" (ص۳۰)۔ وُہ اپنے دربار کے عُلما سے فقہ و حدیث وغیرہ کے مسائل دریافت کرتا رہتا تھا اور اپنے سامنے عُلما کے مباحثے کراتا تھا تاکہ اُس کو مسئلہ کے ہر پہلو کا پتہ لگ جائے۔ فِقہ میں وُہ پہلے حنفی تھا لیکن بعد میں وُہ شافعی ہو گیا۔

محمُودؒ کے دربار میں اعلےٰ پایہ کے شاعر تھے اور وُہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ جب وُہ مرض الموت میں گرفتار ہُوا تو اپنی گذشتہ شان و شوکت اور جلال کے اور موجُودہ لاچاری اور موت کے خیال سے اکثرا نات رو پڑتا۔ اُس نے تب ذیل کے اشعار کہے جو رقت انگیز ہیں:۔

ز بیم تیغ جہانگیر و گرزِ قلعہ کشائے — جہاں مسخرِ من شد چو من مسخرِ رائے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد — گہے ز حرص ہمی رفتمی ز جائے بہ جائے
بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم — کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے
اگر دو کلّۂ بوسیدہ بر کشی ز دو گور — سرِ امیر کہ داند ز کلّۂ گدائے
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارتِ دست — بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد — بقا بقائے خدا است ملک ملکِ خدائے

(لباب الالباب جلد ا۔ صفحہ ۲۴)

محمُودؒ کی مملکت بحیرۂ ارال سے فرات کے کنارے تک اور دریائے اوکسس سے گنگا کے کناروں تک تھی۔ وُہ تا دمِ مرگ اپنی افواج کو مشرق و مغرب اور جنُوب کی طرف بھیج کر دیگر ممالک کو مطیع کر کے غیر مسلموں کو اسلام کا حلقہ بگوش کرتا رہا۔

ہندوستان میں اس کے حملوں کا یہ نتیجہ ہُوا کہ جہاں اُس کی فوج ظفر موج گئی وہاں اور بالخصُوص پنجاب اور صُوبۂ سرحد میں اسلام پھیل گیا۔ اور سندھ میں مستحکم ہو گیا۔ محمُود کی پے درپے فتُوحات سے لوگوں کو جو تذبذب کی حالت میں تھے یہ یقین ہو گیا کہ فقط اسلام ہی خُدا کا سچا دین ہے جو اپنے مجاہدوں کو فتح پر فتح بخشتا ہے اور بُتوں کی کچھ حقیقت نہیں کیونکہ وُہ ہر جگہ توڑے پھوڑے جاتے ہیں۔

(۲)

محمُودؒ کے حملوں سے کلیسیائے ہند اور اس کی ہمسایہ کلیسیاؤں کی تاریخ میں ایک نئے اور حسرتناک باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ جس راہ سے اُس نے ہندوستان پر ایک ربع صدی میں پے در پے سترہ[۱۷] حملے کئے، یہ وُہ راستہ تھا جس سے اُس سے پہلے کے مسلمان حملہ آور آئے تھے۔ بلکہ یہ نیا راستہ وُہ تھا جو ہندوستان کی حدُود کے شمال میں واقع تھا۔ ہم باب اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ غزنی اور ہندوستان کے درمیان جو ممالک تھے اُن میں مسیحی کلیسیائیں بکثرت بستی تھیں اور نسطوری مسیحی مبلغین اس راہ سے ہندوستان میں انجیل کی اشاعت کرتے تھے۔ یہ کوہستانی راستہ تھا جس کے ہر طرف جیسا ہم ذکر کر آئے ہیں کلیسیائیں موجُود تھیں۔ محمُودؒ کے ٹڈی دَل لشکروں کے پے در پے سترہ حملوں نے ان کلیسیاؤں کو پراگندہ کر دیا۔ کلیسیا کے بے شمار افراد اپنے ایمان کا انکار کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان میں بہتیرے اُس کے ٹڈی دَل لشکروں میں شامل ہو گئے اور مالِ غنیمت حاصل کر کے پُشتوں تک مالا مال ہو گئے۔ اِس لالچ میں آکر بہت سے قصبوں اور شہروں کے دیگر مسیحیوں نے بھی اپنے نجات دہندے کا انکار کر دیا اور ہر حملہ کے ساتھ

ایسے لوگوں کا شمار بڑھتا چلا گیا اور یوں ان ممالک کی کلیسیائیں محمود کے شوقِ جہاد کی وجہ سے دن بدن کمزور ہوتی چلی گئیں۔

ہم باب اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ محمود کے حملوں کے زمانہ میں شمالی ہندوستان میں بے شمار کلیسیائیں موجود تھیں۔ شمالی مغربی صوبہ سرحد اور پنجاب اور بمبئی کے صوبہ وغیرہ میں میٹروپولیٹن، بشپ، قسیس اور شماس تھے۔ جو ان کلیسیاؤں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے تھے اور ملک کے [illegible] کو ان [illegible] خداوند کے قدموں میں لاتے تھے۔ ان علاقوں کی کلیسیا کو ایک فضیلت [illegible] یہ علم و فضل کی مالک تھی اور ایرانی کلیسیاؤں کے علما و فضلا کی وجہ سے [illegible] مغربی ایشیا کے ممالک کے مسیحیوں کی ہجرت سے ترقی پر تھی۔ ان ایام میں ٹیکسلا کے نزدیک شہر گندس بور (جو موجودہ شاہ آباد کے قریب تھا) ہندوستان کے میٹروپولیٹن کا صدر مقام تھا اور یہاں مسیحی کلیسیا نے ایک طبی مدرسہ کھول رکھا تھا جس کی شہرت دور دور تک تھی۔ آٹھویں صدی میں نسطوری پیٹریارک ٹموتھی اوّل (از ۷۷۹ء تا ۸۲۳ء) نے مارماروں کے راہبوں کو خط لکھا جس سے ظاہر ہے کہ چین، تبت اور شمال مغربی ہندوستان میں کلیسیائیں منظم ہو کر ہر جانب ترقی کر رہی تھیں۔ نویں صدی میں پیٹریارک تھیوڈوس (از ۸۵۲ء تا ۸۵۸ء) کی تصنیفات سے ثابت ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کی کلیسیائیں آرچ بشپ کے ماتحت اچھی خاصی ترقی کر رہی تھیں۔ گو اہل ہند کی اکثریت بت پرست تھی اور کلیسیا مقابلتاً ایک چھوٹی جماعت تھی اور بعض راجاؤں کے زمانہ میں اس نے مصیبت کے ایام بھی دیکھے تھے تاہم وہ اس امر میں آزاد تھی کہ اپنے ہم وطنوں کو انجیل کا جانفزا پیغام سنا کر ان کو خداوند کے قدموں میں لائے۔ ہندو راجاؤں نے کلیسیا پر اسلامی شریعت کے سے قوانین عائد نہ کئے اور نہ

ان کو شرعی پابندیوں کی طرح کے قوانین میں جکڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو بعض اوقات ہندو اکثریت نے مختلف طریقوں سے کلیسیا کو ستایا اور دبایا لیکن تاریکی کی طاقتیں اس پر غالب نہ آئیں اور وہ باوجود ان مخالفتوں کے اشاعتِ انجیل کرتی رہی اور ترقی کرتی گئی۔ محمود کے حملوں سے پہلے وہ گویا گوشۂ عافیت میں اپنی زندگی بلا قانونی روک ٹوک بسر کرتی رہی تھیں۔ لیکن جب محمود نے شمال کے راستے سے ہندوستان کو تاخت و تاراج کیا اور اس کی حملہ آور فوجیں پچیس سال سے کم عرصہ میں سترہ دفعہ ان شہروں، قصبوں اور گاؤں میں سے گذریں جہاں یہ کلیسیائیں بستی تھیں تو ان کے امن و چین کا زمانہ ختم ہو گیا اور شمالی ہندوستان کی زندگی میں ایک حسرتناک باب شروع ہو گیا جس کا انجام مسیحی کلیسیا کا انحطاط اور زوال ہوا۔ کلیسیائیں ہر سو پراگندہ ہو گئیں اور ان کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ اسلامی حملہ آوروں کی آمد ان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہو گیا۔

فصل سوم

شہاب الدین محمد غوری

محمود غزنوی کی وفات (۱۰۳۰ء) کے بعد سلجوق خود مختار ہو گئے۔ طغرل بے خراسان کا حاکم ہو گیا۔ اس نے ۱۰۵۵ء میں بغداد کو اور پھر جارجیا کو فتح کر لیا۔ وہ بڑا کٹر مسلمان تھا جو ہر جگہ کی کلیسیاؤں کو پامال کرتا گیا۔ گرجاؤں کو منہدم کر کے اس نے بے شمار مسجدیں تعمیر کیں۔ جب الپ ارسلان گدی پر بیٹھا تو اس نے مسیحی کلیسیاؤں کو ہر جگہ تباہ کر دیا اور حکم دیا کہ جو

مسیحی اسلام قبول نہ کرے اُس کے گلے میں لوہے کا طوق پہنایا جائے۔ ایسے سخت گیر حکام کی حکومت میں مسیحی کلیسیائیں ہر جگہ یکے بعد دیگرے ختم ہونی شروع ہوگئیں۔ جیسا ہم حصّہ اوّل میں بتلا چکے ہیں وسط ایشیا میں نسطوری کلیسیاؤں کے بشپ اور میٹروپولیٹن یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگے۔ جو غیور مسیحی کلیسیائیں اسلام کی حلقہ بگوش نہ ہوئیں، اُن کی قسمت میں ہمیشہ کی ذلت لکھی گئی اور وہ اِن اسلامی ممالک میں ذلیل اقلیتیں ہو کر سسک سسک کر اپنے دن گذارتے لگیں۔

غزنی کی سلطنت دو سو سال کے بعد ختم ہوگئی۔ محمود نے دریائے سندھ کے میدان سے دریائے گنگا تک حملے کئے تھے اور جیسا ہم پچھلی فصل میں لکھ چکے ہیں لاکھوں غلام اور لونڈیاں اور لوٹ کا ان گنت مال۔ بے شمار جواہرات اور سیم و زر کے ڈھیلے اور دیگر بیش بہا اشیائے غنیمت کے بوجھ سے اُس کے لشکروں کے اونٹوں اور گھوڑوں کی پیٹھیں بوجھل ہو جاتی تھیں۔ اِن حالات میں عیش و عشرت کی زندگی ناگزیر ہوگئی تھی جس نے سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کے جانشین جنگی مُہموں کے قابل نہ رہے۔ ترکوں نے غزنوی سلطنت کے حصّوں پر قبضہ کرلیا۔ غور کے سرداروں میں محمد غوری سب سے زبردست سردار تھا جس نے ۱۱۸۶ء میں سبکتگین کے خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

غور اور اُس کے قُرب و جوار میں اسلام سے پہلے مہایانہ بُدھ مت تھا۔ جن اسلامی مبلّغین نے ان علاقوں میں اسلام کی اشاعت کی تھی اُن کا یہ اصول تھا کہ خدا جسم رکھتا ہے اور وہ عرشِ معلی پر بیٹھا ہے۔ ہم اس فرقہ کا ذکر حصّہ اوّل کے باب پنجم میں کر آئے ہیں۔ پس ان علاقوں کے نومسلموں

کے لئے مذہب کی تبدیلی کا صرف یہ مطلب ہُوا کہ جہاں وُہ پہلے یہ مانتے تھے کہ مہاتما بُدھ کنول پر بیٹھا ہے اب وُہ یہ ماننے لگ گئے کہ اسلام کا معبود اللہ آسمان پر بیٹھا ہے۔ تشبیہ اور تجسّم کے خیالات دونوں مذاہب میں موجود تھے یاں غنیمت کی حرص۔ جہاد کے شوق اور نعمائے بہشت کے وعدوں نے اُن کے مذہب کی تبدیلی میں آسانیاں پیدا کر دیں اور یہ ہزاروں غیر مسلم بُدھ کلمہ گو مسلمان ہوگئے۔ شہاب الدین محمد غوری بھی اسلام کے اِسی قسم کے معتقدات کا پہلے قائل تھا لیکن بعد میں وُہ حنفی المذہب ہوگیا۔

دسویں صدی کے ترکوں کا سب سے بڑا مقصد اسلام کی اشاعت تھا۔ مذہبی تعصّب۔ شوقِ جہاد اور مالِ غنیمت کی حرص نے ان کی شجاعت کے لئے تازیانہ کا کام دیا۔ ان شجاعوں کے سامنے محمود کے کارنامے تھے جس کی فوج ظفر موج کو ہر جگہ اسلام کی اشاعت کی وجہ سے زر و سیم و جواہرات کے خزانے ملتے رہے۔ اس نمونہ کا یہ نتیجہ ہُوا کہ یہ بہادر اور شجاع نو مرید مسلمان ہندوستان پر بیش از بیش حوصلہ مند ہو کر حملے کی تیاریاں کرنے لگے۔

اِدھر ہندوستان کے راجاؤں کو باہمی رقابت اور عداوت کی لعنت نے متحد نہ ہونے دیا۔ اس خصومت اور تفرقہ نے اُن کی زبردست طاقت کو منتشر اور زائل کر رکھا تھا۔ اِس افتراق کے مقابلہ میں اسلام نے اسلامی حکومتوں کے مُفلس اور حریص لوگوں میں یک جہتی پیدا کر رکھی تھی۔ ہندوستان کی دولت نے ان کے مذہبی جوشِ جہاد کو ہوا دے رکھی تھی۔ محمد غوری کی فتوحات نے محمود غزنوی کی دو سو سال پیشتر کی فتوحات کی یاد تازہ کر دی۔ محمود نے قریباً تیس سال تک ہندوستان کو سندھ سے لے کر گنگا تک پامال کر دیا تھا۔ محمد غوری وغیرہ نے بھی تیس سال تک مُلک کو پریشان اور تباہ حال کر دیا۔

جب محمد غوری نے دہلی کے راجہ پرتھوی راج پر حملہ کیا تو قنوج کے راجہ جے چند نے غفلت شعاری اختیار کی اور پرتھوی راج کے ساتھ متحد ہو کر نہ لڑا۔ کیونکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے رقیب کا سر نیچا ہو جائے۔ پرتھوی راج کو شکست ہوئی۔ محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں راجپوتوں پر فتح پائی۔ اُس وقت اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہوگا کہ وہ تاریخ ہند میں ایک نئے اور مستقل باب کا اضافہ کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کی فتح نے ہندوستان کے ملک کی کایا پلٹ دی۔ ہندو راجاؤں کو بھی اس بات کا احساس نہ آیا ہوگا کہ اس نئے باب کا ہندوستان کے ملک اور ملک کے مختلف مذاہب پر کیا اثر پڑے گا۔

محمد غوری نے لاہور کے آخری غزنوی حکمران سے حکومت چھیننے کے لئے جموں کے ہندو راجہ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اُس نے اجمیر کے مندروں کو مسمار کرکے اُن کی جگہ مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اُس نے جس علاقہ کو بھی فتح کیا وہاں قرآنی احکام اور اسلامی شریعت کو نافذ کر دیا۔ مفتوحہ شہروں میں اسلامی مدرسے قائم ہو گئے۔ محمد غوری کی فتوحات کے نتائج زیادہ پائیدار ثابت ہوئے۔ محمود کا مقصد ہندوستان پر مستقل طور پر حکومت کرنا نہ تھا۔ اُس کے حملے صرف تاخت اور جنگی مہمیں ہی تھیں جو اسلام کی اشاعت۔ بت پرستی اور کفر کو مٹانے اور مالِ غنیمت کو حاصل کرنے کی غرض سے کی گئی تھیں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ ترک ہندوستان میں مستقل بود و باش کا خیال بھی کرتے۔ لیکن محمد غوری نے جس علاقہ کو بھی فتح کیا وہ کبھی اسلام کے ہاتھوں سے نہ نکلا۔ اس کی حکومت اسلامی اور عسکری حکومت تھی۔ اس میں اسلام کا مذہبی جوش تھا چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ شمالی پنجاب کے پہاڑی علاقہ کے گکھڑوں کا سردار

غوری کے حکم سے مسلمان ہو گیا اور محمد غوری نے اُس کی سرداری کو بحال رکھا۔ اور اُس کو کہا کہ اپنی قوم کو دائرہ اسلام میں لے آؤ۔ چنانچہ سب گکھڑ اس کی تلوار کے زور سے مسلمان ہو گئے۔ اس کی اسلامی حکومت کو اس کے بعد کے حکمران استوار اور مستحکم کرتے چلے گئے۔ محمد غوری کے زمانہ سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کے پایہ تخت پر کوئی نہ کوئی مسلمان بادشاہ سریر آرائے سلطنت رہا۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں دہلی کی سلطنت کی حدود کو وسعت ملتی گئی توں توں اسلام کی اشاعت ہوتی گئی۔ قرآنی احکام اور شریعت اسلام نے غیر مسلم مذاہب کے اصول۔ رسوم اور رواج پر ایسی سخت پابندیاں لگا دیں کہ ان مذاہب کو جو گذشتہ دو صد سال میں نسبتاً آرام میں تھے، دھکے پر دھکے لگنے شروع ہوئے۔ محمود کے حملوں کے بعد شمالی ہندوستان کی کلیسیاؤں کو قدرے چین نصیب ہوا تھا اور مسیحی کلیسیائیں اُس کے متواتر حملوں کی آفتوں سے مر مر کر جی گئی تھیں۔ اگرچہ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھیں لیکن اُن کو قدرے توازن حاصل ہو گیا تھا۔ ان کی کمزوری کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ وہ ان حملوں سے پریشان اور منتشر ہو کر پراگندہ ہو گئی تھیں اور ان کے بہت سے شرکاء اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے لیکن ان کی کمزوری کا سبب یہ تھا کہ (جیسا ہم حصہ اول میں بتلا چکے ہیں)، مغربی اور وسط ایشیا کی کلیسیاؤں کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اور یہی کلیسیائیں شمالی ہند کی کلیسیاؤں کی ماں تھیں۔ اسلام کے غلبہ نے نسطوری کلیسیا کے بشپوں اور میٹروپولیٹنوں کو

آہستہ آہستہ ختم کرنے کی ٹھان رکھی تھی لیکن یہی لوگ ہندوستان کی کلیسیا کے رُوحانی پیشوا تھے پس قُدرتی طور پر بیرو وصد سالہ سکوُن جاتا رہا اور یہ کمزور کلیسیائیں غوری حملوں سے پریشان ہوکر بھر مُنتشر ہوگئیں - جُوں جُوں اسلامی حکومت اور اسلام کی اشاعت کی حدُود میں اضافہ ہوتا گیا یہ کلیسیائیں زیادہ پراگندہ اور کمزور ہوتی گئیں اور ان کی تعداد میں سال بسال فرق نمُودار ہوتا گیا۔

باب سوم

سلاطین دہلی کا زمانہ اور مسیحی کلیسیا کا زوال

ہم اِس جلد کے دیباچہ میں بتلا چکے ہیں کہ قدیم تاریخوں کی کتابیں عموماً سُلطانوں کی فتوحات اور ان کے شاندار کارناموں پر ہی مشتمل ہیں لیکن زمانۂ جدید کے مورخوں کے لئے ضرُوری ہے کہ وُہ حُکام اور سلاطین کے واقعات لکھنے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ رعایا اور عوام النّاس کی حالت، اُن کی فلاح و بہبُودی یا خواری اور لاچاری - اُن کے خطرات، اُن کی خُوشی اور غمی اُن کی خوشحالی اور مُفلسی وغیرہ کی طرف توجہ دیں کہ ان کے اصل حالات کے اسباب کی کھوج لگائیں - اور جس زمانہ کی وُہ تاریخ لکھتے ہیں اُس کے سماج کی اقتصادی - ذہنی اور رُوحانی حالت بتلائیں تاکہ موجُودہ زمانہ کی نسل اُن سے سبق اور عبرت حاصل کر سکے - بدقسمتی سے سلاطین دہلی کے مورخ اِس طرف مطلق توجہ نہیں دیتے - بالخصُوص وُہ اُن مسیحی کلیسیاؤں کا ذکر ہی نہیں کرتے جو اُس زمانہ میں سلطنت کے مختلف اطراف و جوانب میں موجُود تھیں - اور منظم طور پر میٹروپولٹن اور بشپوں اور قسیسوں کے ماتحت اپنی زندگی بسر کر رہی تھیں - یہ کلیسیائیں اپنے مُنجی کے حکم کے مطابق سلاطین وقت کے ماتحت رضلح اور امن کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں، اور انجیل حُکم کے مطابق حاکم وقت کی جائز معاملات میں حکم عدولی اور سرتابی کر کے بغاوت نہیں کرتی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلاطین کو

بغاوت کی وجہ سے ان کی سرکوبی کا موقعہ نہ ملا۔ پس اُنہوں نے ان پر نہ لشکرکشی کی اور نہ ان سلاطین کے مؤرخوں نے اُن کا ذکر کیا۔

ہم بیرونی مؤرخوں کی کتابوں سے جانتے ہیں کہ جیسا ہم باب اوّل میں ذکر کر چکے ہیں۔ صُوبۂ سرحد۔ پنجاب۔ کشمیر۔ وسط ہند۔ بنگال سے بمبئی تک مسیحی کلیسیائیں موجود تھیں اور وُہ سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں جیتی جاگتی تھیں۔ پس اگر سلطنت کے مؤرخ ان کا ذکر نہیں کرتے تو ہم کو از رُوئے منطق اور قواعدِ علم تاریخ ان کی خاموشی سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق حاصل نہیں کہ ان کا وجُود ہی نہ تھا۔ ان کی خاموشی صرف ان کی بے اعتنائی کی دلیل ہے۔ ان کلیساؤں کا ذکر ان کے تواریخی بیانات سے غیر متعلق تھا اور وُہ ان کو غیر متعلق سمجھ کر ہی ان کا ذکر نہیں کرتے اور ان کی ہستی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہمیں اُمید کرنی چاہیئے کہ ہمارے مُلک کے آئندہ مؤرخ اپنی عنانِ توجہ اس طرف موڑینگے تاکہ مُلک کے ایک زبردست باب پر روشنی پڑے۔ موجودہ حالات میں سلطنت دہلی کے متعلق ہمارے ذرائع غیر مکمل ہیں پس ہم ان کلیساؤں کی نسبت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ہاں قیاس اور عقل سے کام لے کر مختلف سلاطین کے خصائل اور اُن کے عہدِ سلطنت کے حالات کو مدِنظر رکھ کر ہم کچھ کچھ دھندلے طور پر ہندوستان کے مختلف مقامات کی کلیسیاؤں کی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور قطعی نتائج قائم کرنے کی بجائے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں قسم کی خصلت اور مذہبی رُجحان رکھنے والے سلطان کے عہد میں اور فلاں فلاں حالات کے اندر مسیحی کلیسیاؤں کی غالباً فلاں حالت ہوگی۔ اور اس حالت کی وجہ سے یہ کلیسیائیں جو سلطنت کے زمانہ کے آغاز میں پھلتی پھولتی تھیں اور ترقی کر رہی تھیں تین چار صدیوں کے اندر تقریباً

ختم ہوگئیں

فصلِ اوّل۔ خاندانِ غلاماں

سلطنتِ دہلی کے سلاطین زیادہ تر چالو نسل کے تُرک تھے یا دریا افغان تھے۔ قطب الدین ایبک شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن بہت سے دیگر تُرکوں کی طرح جو غُلامی کی حالت میں خرید کر لائے گئے تھے، ایسے قبائل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے یا تو اسلام کو قبول نہیں کیا تھا اور یا اُن کو مُسلمان ہُوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ تُرکوں کے قبائل بالعموم ابھی تمدن و تہذیب سے آشنا بھی نہ ہُوئے تھے۔ یہی حال افغانوں کا تھا۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں "تُرک فاتح جو ہندوستان آئے خاص خاص افسروں یا عہدہ داروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے نمایندہ نہ تھے۔ اور نہ اُن کے اُصولِ سلطنت کو اسلام کی طرزِ حکومت سے کوئی مناسبت تھی۔ ان کے تُرک افسر زیادہ تر غلام تھے جو نَومُسلم تھے۔ تُرک غُلاموں کی حیثیت سے ہزارہا کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے سلاطین اور اُمرا اُن کو خرید کر اور مسلمان بنا کر فوج میں بھرتی کرتے تھے یا وُہ خود لُوٹ مار کے شوق میں وسط ایشیا سے نکل کر اسلامی ممالک میں آجاتے تھے اور مسلمان ہو کر فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے اور آگے چل کر بڑے افسر اور بادشاہ بن جاتے تھے" (عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۱۰۷)

(۱) قطب الدین ایبک (از ۶۰۲ھ تا ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء)

سُلطان قطب الدین ایبک شہاب الدین غوری کا مشہور تُرک سپہ سالار

تھا جو غلاموں کی صف سے نکل کر بادشاہ ہوگیا۔ اور اس کے بعد غلام در غلام سلاطین دہلی کے تخت پر بیٹھتے گئے۔

محمد غوری سے پہلے بلکہ ساتویں صدی مسیحی سے پہلے جو یونانی۔ سکدی۔ پارتھی اور ہنی حملہ آور ہمارے ملک میں شمال مغربی سرحد کے دروں کو پار کرکے آئے۔ ان کا اثر ہندوستان کے رہنے والوں کی زندگیوں پر صفر کے برابر ہوا۔ یہ حملہ آور لوٹ مار کرکے یا تو اپنے اپنے ملک کو واپس چلے جاتے تھے اور یا اگر یہاں بس جاتے تو وہ ہندوستان کی آبادی میں ایسے جذب ہو جاتے کہ اب ان کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان کی سماجی اور مذہبی زندگی پر ان کا کوئی دائمی اثر نہ ہوا۔ محمد غوری سے پہلے کے مسلمان حملہ آور بھی قتل و غارت کرکے مال غنیمت اور غلاموں لونڈیوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس اپنے وطن چلے جاتے رہے۔ ان کے دلوں میں اس ملک میں ایک مستقل اسلامی سلطنت قائم کرنے کا خیال نہ آیا۔

لیکن جب محمد غوری غزنی کو واپس لوٹا تو اس نے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت بنا کر سخت تاکید کی کہ وہ اس کی اسلامی سلطنت کو بڑھاتا چلا جائے۔ اس کی موت کے بعد غزنی سے ہندوستان کا تعلق ٹوٹ گیا اور قطب الدین ایبک سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ وہ ان چونتیس ۳۴ سلاطین میں پہلا بادشاہ تھا جو تیرھویں صدی کے شروع سے بابر کے حملہ (۱۵۲۶ء) تک تخت دہلی پر بیٹھے۔ یہ چونتیس بادشاہ پانچ خاندانوں سے متعلق ہیں: (۱) خاندان غلاماں کے بادشاہ جو سب ترک تھے۔ (۲) خاندان خلجی کے بادشاہ جو غالباً ترکی نسل کے تھے لیکن خیالات اور تہذیب و تمدن میں افغان تھے۔ (۳) خاندان تغلق جو ترک تھے۔ تیمور کے حملہ نے اس خاندان کا خاتمہ کردیا۔

(۴) خاندان سادات کے بادشاہ جن کی پیدائش گو ہندوستان میں ہوئی تھی لیکن وہ عرب نژاد ہونے کے مدعی تھے۔ (۵) خاندان لودی کے بادشاہ۔ بابر نے اس خاندان کا خاتمہ کرکے خاندان مغلیہ کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر ہم انشاء اللہ اگلی جلد (جلد چہارم) میں کریں گے۔ اس باب میں ہم مذکورہ بالا خاندانوں کے چیدہ چیدہ سلاطین کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

جب قنوج کے راجہ جے چند کو شکست ہوئی تو اس کے بعد ایبک کی راہ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ محمد غوری کی زندگی میں اس نے بنارس تک قبضہ کر لیا اور بے شمار دولت پر قابض ہوگیا۔ اس نے کالنجر۔ متھرا۔ میرٹھ۔ علی گڑھ دہلی۔ اجمیر کو فتح کیا۔ محمد غوری کے قتل ہونے کے بعد قطب الدین لاہور میں تخت نشین ہوا۔ بعد میں وہاں سے اس نے اپنا پایہ تخت دہلی تبدیل کیا۔ دہلی کی سلطنت اب ٹھٹھہ سے لکھنوتی تک قریباً ایک ہزار میل لمبی اور پانچسو میل چوڑی تھی۔ اس نے پنجاب کو جو پہلے غزنی سلطنت کا حصہ تھا دوبارہ ہندوستان میں ملا دیا۔ راجہ ہرش کے بعد وہ پہلا بادشاہ تھا جو پشاور سے بنگال تک کی سرزمین کو اپنے قبضہ میں لایا۔ وہ جہاں گیا فتح اس کے ہمرکاب رہی۔ اس کا جرنیل محمد بختیار اودھ اور بہار کو فتح کرتا ہوا ۱۲۰۴ء میں لکھنوتی پہنچ گیا اور اب اس کی اسلامی سلطنت مغرب جنوب اور مشرق کی جانب بڑی تیزی سے پھیل گئی اور دریائے سندھ سے برہم پتر تک کا تمام علاقہ اس کے زیر حکومت ہوگیا تھا۔

(۲)

ایبک پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندوستان کو اپنا دیس سمجھا کیونکہ غلام ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی دوسرا ملک نہ تھا جس کو وہ اپنا وطن کہہ سکتا۔

ترکستان اور غور وغیرہ اُس کے لیے غیر ممالک تھے۔ اُس نے راجہ ہرش کے نقشِ قدم پر چل کر طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا۔ طبقاتِ ناصری کا مصنف لکھتا ہے کہ قطب الدین نہایت جری بادشاہ تھا اور سخاوت کی بنا پر اُس کا نام "لکھ بخش" پڑ گیا۔ اُس کا بیشتر وقت جنگوں اور معرکوں میں ہی بسر ہوا۔ اُس کی جنگوں میں جہاد کا جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ یہی مؤرخ لکھتا ہے کہ ایبک جس جگہ کو فتح کرتا تھا کشت و خون اور ہزاروں کو قتل کرنے کے بعد غیر مسلموں کو قیدی بنا لیتا تھا اور جو قیدی اسلام قبول نہیں کرتے تھے اُن سے جزیہ وصول کرتا تھا۔ اُس نے جگہ جگہ مندروں کو مسمار کر کے مسجدیں بنائیں اور مندروں کے خزانوں سے مسجدوں کو مزین کیا۔ اُس نے دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی جس کا نام اُس نے "مسجد قوّتِ اسلام" رکھا۔ اُس نے اجمیر میں بھی ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کی۔ مؤرخ لکھتا ہے "بتکدے برباد ہو گئے اور اُن کی جگہ مسجدیں اور مدرسے وجود میں آگئے۔ اسلام کے احکام اور شریعت کے آئین نافذ ہو گئے اور انہوں نے استواری حاصل کر لی"۔ ان جنگوں سے اُس کو مالِ غنیمت کثرت سے ملا کیونکہ ہر مندر میں چاروں طرف سے زر و جواہر کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔

قطب الدین کے عہد میں مشہور عالم امام صغانی گذرا ہے جس کی تصنیف مشارق الانوار ہے۔ اس عہد کا مشہور مؤرخ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری تھا۔ اس کی کتاب "تاج المآثر" ایبک ہی کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ جس میں ۵۸۷ھ سے ۶۱۵ھ تک کے واقعات لکھے گئے تھے۔ اس میں لکھا ہے کہ "قطب الدین کی بلند ہمّت شریعت کے نشانات کو زندہ کرنے

اور سنّت کے جھنڈوں کو بلند کرنے پر تُلی ہوئی تھی"۔ (ص ۲ ۔ ماخوذ از سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات مصنفہ خلیق احمد نظامی۔ علی گڑھ) اُس نے اسلامی علوم کی طرف ایسی توجہ کی کہ اس ابتدائی دَور میں بھی ان کا چرچا عام ہو گیا۔ چنانچہ مولانا ریاست علی لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے ایک نومسلم صاحبِ تعلم نے اپنے حدیث میں ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کی۔ ۔ ۔ ۔ رضی ہندی کا ذکر امام ذہبی۔ علامہ ابنِ حجر عسقلانی وغیرہ نے کیا ہے" (معارف مئی ۱۹۴۶ء)۔

(۴۲)

ہم سطورِ بالا میں ذکر کر آئے ہیں کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں سے شمالی ہندوستان کی کلیسیا میں انتشار پیدا ہو گیا اور کلیسیاؤں کے گلّے پراگندہ ہو گئے۔ قطب الدین ایبک نے نہ صرف ہندوؤں کے خلاف جہاد کر کے اُن کے مندروں کو مسمار کر دیا بلکہ اُس نے اپنی توجہ مسیحی کلیسیاؤں کی طرف بھی منعطف کی تاکہ جہاں تک ہو سکے ان کا بھی نام مٹا دے۔ اُس نے گرجاؤں کو منہدم کر دیا اور بہتیرے مسیحیوں نے جامِ شہادت پی کر اپنے خون سے اپنے ایمان پر مُہر دی۔ ان شہدا کے نام آسمان پر کتابِ حیات میں ہی لکھے ہیں۔ بہتیرے کمزور ایمان والوں نے اپنے نجات دہندہ کا انکار کر کے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ صاحب تاج المآثر قطب الدین کی تعریف میں لکھتا ہے:-

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسیا — در دارِ کفر مسجد و محراب و منبر است

آنجا کہ بود نعرہ و فریادِ مشرکاں — اکنوں خروش و نعرۂ اللہ اکبر است

(تاج المآثر صفحہ ۲۶۔ ماخوذ از سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات)

قطب الدین کے القاب ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی اشاعت میں جوشیلا اور غیر مسلم مذاہب کا دشمن تھا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ قاتل الکفرۃ والمشرکین

قامع الکفرۃ والمتمردین والمشرکین۔ ناصر الاسلام۔ کاسر الاصنام وغیرہ۔ ان سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں کا جانی دشمن تھا۔ مذکورہ بالا اشعار سے بھی ظاہر ہے کہ اُس نے مسیحی کلیساؤں کو اس قدر غارت و برباد کر دیا تھا کہ اُس کے اِس کارنامہ کو اُس کے مؤرخ نے قابلِ ذکر سمجھا۔

تخت نشین ہوتے ہی اُس نے مسلمانوں کی زندگی کو شرعی تشکیل دی۔ شریعت کے مطابق عشر لینے کا حکم دیا اور تمام غیر شرعی خراج ختم کر دیے۔ مصنفِ تاج المآثر لکھتا ہے کہ شرع اور سُنّت کی ترویج میں احکامِ حنفی کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ قطب الدین ایبک کی حکومت ہر نقطہ نظر سے اسلامی حکومت تھی۔ اُس کی تنظیم ہی اِس طریقہ سے کی گئی تھی کہ ہر ممکن طور سے اسلام کی اشاعت ہو سکے۔ حکومت کی ملازمت اسلام قبول کرنے پر منحصر تھی۔ بنگال کے غریب مسیحی اور نیچ ذاتوں کے ہندو بالخصوص اسلام میں جوق در جوق شامل ہو گئے۔ ان نومسلموں کی اکثریت زمینداروں کی تھی تاکہ وہ اپنی زمینوں کے مالک بنے رہیں اور جو زمیندار نہیں تھے وہ بھی مسلمان ہو کر زمین کے مالک بن گئے۔ قطب الدین کی فوج کے سپاہیوں نے غیر مسلم عورتوں سے نکاح کر لیے۔ جو عورتیں قید ہوتیں اُن کو جبراً مسلمان بنا لیا جاتا اور وہ مسلمانوں کی مائیں بن جاتیں۔

جب اگلے ڈیڑھ سو سال میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم ہو گئیں تو اُن کے قیام کے ساتھ ساتھ اسلام کی اشاعت بھی ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ ملک کے مختلف طبقوں میں اسلام گھر کرتا گیا اور پھیلتا گیا۔ لاکھوں کے دلوں کو حکومت کے رُعب نے جس سے ان کا روزانہ سابقہ پڑتا تھا، اور ملازمتوں کی اُمید اور شاہی مذہب کے

التفات نے اسلام کی طرف مائل کر دیا۔ بالخصوص غریب طبقہ کے لوگوں کے لئے اسلام باعثِ رحمت ثابت ہُوا کیونکہ اسلام قبول کرنے میں اُن کو فائدہ ہی فائدہ نظر آتا تھا۔

ہندوستان کی موجودہ بیسویں صدی کا جغرافیہ بھی اِس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ جہاں جہاں اسلامی سلطنت قائم ہو گئی وہاں کے باشندے مختلف وجوہ کے باعث اسلام اختیار کرتے چلے گئے۔ چنانچہ شمال مغربی ہند اور سندھ کے صوبوں میں، اور کشمیر میں حکومتِ اسلام کے قیام کے ساتھ وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان صوبوں کی آبادی کی اکثریت اب بھی مسلمان ہے۔ پنجاب میں ۱۹۴۷ء کے بٹوارے سے پہلے مسلم اور غیر مسلم تعداد میں تقریباً برابر تھے۔ مشرقی بنگال میں بٹوارہ سے پہلے باشندوں کی دو تہائی سے زیادہ تعداد مسلمان تھی۔ مالابار کے ساحل پر مسلمان موپلے صدیوں سے رہتے ہیں جو اُن مسلمانوں کی اولاد ہیں جو عرب اور خلیج فارس کے راستہ سے وہاں تجارت کرنے آتے تھے۔

(۲) شمس الدین التمش (از ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۵ء)

شمس الدین سُلطان قطب الدین ایبک کا غلام تھا۔ وہ خاندانِ غلاماں میں سب سے عظیم بادشاہ گذرا ہے۔ وہ مذہبِ اسلام کا ایسا دلدادہ تھا کہ اُس کا شمار اولیاء اور مشائخ میں کیا جاتا ہے۔ گو اُس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جنگ و حرب میں گذرا لیکن ان جنگی مہموں میں بھی نماز کا خاص انتظام تھا کیونکہ وہ پانچوں وقت نماز ادا کیا کرتا تھا اور ہر مہم میں امام اور واعظ اُس کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ ہر جمعہ کے روز مسجد جاتا تھا اور وہیں فرائض اور نوافل

ادا کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وُہ تمام رات دُعا اور عبادت میں گذار دیتا تھا۔ اُس کے دربار میں علمی مُباحثے اور وعظ بھی اکثر ہوتے تھے اور وُہ شیخ الاسلام اور دیگر علما کی صلاح پر عمل کیا کرتا تھا جو اُس کو قرآنی احکام اور شریعتِ اسلام پر عمل کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے وُہ اولیا اور علما کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اولیا کے تذکروں میں اُن کے ناموں کے پہلو بہ پہلو اُس کا نام بھی حُسنِ عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اُس نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ خواجہ نظام الدین نے اس کا ذکر بڑے احترام لُطف اور محبت سے کیا ہے۔

التمش کا شیخ الاسلام اُس کو بار بار یاد دلایا کرتا تھا کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وُہ ان چار چیزوں پر عمل کرے:۔ (۱) کلمۂ حق کی بلندی اور اسلامی رسُوم اور طریقوں کا رواج دے۔ شرک اور بُت پرستی کا خاتمہ کرے اور غیر مُسلم ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرے۔ (۲) امرِ حق کے ترک۔ بداعمالی اور زناکاری کا خاتمہ کرے۔ (۳) احکامِ قرآن و شریعت کو جاری کرے۔ فلسفیوں کو مُلک بدر کرے اور بددین لوگوں کو حکومت کے اعلےٰ عہدوں پر مقرر نہ کرے۔ اور (۴) عدل و انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ دے۔ اگر سُلطان ان باتوں میں سے کسی ایک پر عمل نہ کریگا تو اُس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ ایک دن عُلمائے اسلام نے اُس کو کہا کہ غیر مُسلموں کے ساتھ اِمّا القتل و اِمّا الاسلام (یا قتل اور یا اسلام قبول کرو) کے اصُول پر عمل کرنا چاہیئے اور ہندوؤں کو ذمّی قرار نہیں دینا چاہیئے کیونکہ وُہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔

التمش ہندوستان کا پہلا سُلطان تھا جس نے بغداد کے خلیفہ

المستنصر باللہ کا اقتدارِ اعلےٰ تسلیم کیا اور اپنے لئے اُس سے منشور حاصل کیا۔ خلیفہ نے اُس کو "ناصر امیر المؤمنین" کا خطاب بھی عطا کیا جب بارگاہِ خلافت کے سفیر آئے تو اُس نے ۱۹ فروری ۱۲۲۹ء کے روز اُن کا شاہانہ استقبال کیا اور اس واقعہ کی یادگار میں ایک سکّہ بھی جاری کیا جس پر عربی میں خلیفہ کا نام کندہ ہے۔ اُس نے اپنے مُرشد قطب الدین بختیار کے دہلی میں آنے کی یادگار میں قطب مینار بنایا جو اب عجائباتِ روزگار میں شمار ہوتا ہے۔ اس مینار پر سُلطان کے القاب "غیاث الاسلام و المسلمین" "المؤید من السّماء" "مظہر کلمۃ اللہ" وغیرہ لکھے ہیں۔

اس بادشاہ نے بہار و بنگال میں اور راجپوتانہ سندھ وغیرہ میں جنگیں کرکے فتح حاصل کی اور مغربی سرحدوں کی طرف سے مطمئن ہوکر اُس نے اپنی سلطنت کی حدُود مغرب میں شوالک پہاڑی اور مشرق میں برہم پتر تک بڑھالیں۔ وُہ اپنے حریفوں کو شکستوں پر شکستیں دے کر مُلک کے مختلف گوشوں میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتا چلا گیا۔ اس طرح کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک کا وسیع علاقہ سلطنتِ دہلی میں شامل ہوگیا۔ اُس کی سلطنت کی جنُوبی حدُود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئیں اُس زمانہ میں بہار اور بنگال، وسط ہندوستان میں مسیحی کلیسیائیں اس کثرت سے آباد تھیں کہ مؤرخ ہرک ہم کو بتلاتا ہے کہ ۱۲۲۲ء میں پٹنہ کا شہر ایک بیشپ لپڑ ڈائن کا صدر مقام تھا جس کے ماتحت نصف درجن اور درجن کے قریب بشپ تھے جو اپنے پادریوں اور شماسوں کے ذریعہ ان کلیسیاؤں کی نگہداشت کرتے تھے اور ہندوؤں کو مُنجی کی بشارت دیتے تھے۔

سُلطان نے از حد کوشش کی کہ غیر مُسلموں کو اسلام کا حلقہ بگوش

بنائے۔ جو غیر مسلم ہندو اسلام قبول کر لیتے تھے وہ اس نئے سماج میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اگرچہ ان نومسلموں سے قرآنی اصول مساوات اور اخوت کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا لیکن ان لوگوں کے لئے یہی غنیمت تھا کہ وہ فاتحین کے شاہی مذہب میں شامل ہو کر زیادہ عزت کی زندگی بسر کر سکتے تھے اور چھوت چھات اور ذات پات کی بندشوں سے آزاد ہو جاتے تھے۔

سلطان التمش نے جہاں جہاں فتوحات حاصل کیں ان جگہوں کی کلیسیاؤں پر تُند رتا گہرا اثر پڑا ہوگا۔ اُس کے آقا اور پیش رو سلطان قطب الدین ایبک کا نمونہ اس کے سامنے تھا جس نے صاحب تاج المآثر کے مطابق کسر صلیب میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اور گرجاؤں کی جگہ مسجدیں تعمیر کر دی تھیں۔ التمش کے درباری شاعر تاج الدین ریزہ کے ایک قصیدے میں مسیحی کلیسیاؤں کے وجود اور ان کے اعتقاد کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

زاں صلیب زلف کافر از نشانی دیدہ اند
مومنانِ صلیب نامِ خویش حرز کردہ اند

التمش کے عہد کا ایک فاضل سید نور الدین غزنوی اُس کے ساتھ خلوت و جلوت میں رہتا تھا۔ اُس نے بادشاہ کے سامنے ایک وعظ کے دوران میں کہا سلطان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ملک میں خلیفہ اور معقولات فلسفہ کے معتقدوں کو مطلق روا نہ رکھے اور فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت کسی حال میں بھی نہ دے۔ بلکہ مذہب کے گمراہوں۔ مذہب اور سنت کے دشمنوں اور بداعتقادوں کی تذلیل اور توہین میں برابر کوشاں رہے۔ بد دینی۔

بداعتقادی اور گمراہی کو مطلق جائز نہ سمجھے"۔ ظاہر ہے کہ ایسے علماء کے زیر اثر اس سلطان کے عہد میں مسیحی کلیسیاؤں کی تعداد و شمار میں روز بروز فرق آتا گیا ہوگا اور ان کے کمزور ایمان والے شرکا اسلام کے اقتدار کے زیر اثر مسلمان ہو گئے ہوں گے۔ التمش جیسے کٹر جوشیلے بادشاہ سے یہی اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ عیسائیوں کو مشرک سمجھ کر اُن سے سختی کرے اور اپنے شیخ الاسلام کی صلاح پر چل کر اُن کا قلع قمع کرے۔ مسیحی کلیسیائیں پہلے ہی پراگندہ ہو رہی تھیں اور اُن کا شیرازہ بکھر رہا تھا پس ایسی خصلت کے بادشاہ کی حکومت میں اُن کی حالت بیش از بیش بگڑتی ہوتی گئی ہوگی۔ علاوہ ازیں جہاں تک ہماری تحقیق ہے ان کلیسیاؤں کے ہاتھوں میں انجیل کا ہندی میں ترجمہ بھی نہ تھا جو عوام الناس کی زبان تھی۔ یہ کلیسیائیں نسطوری کلیسیا کی شاخیں تھیں جس کی مقدس زبان سُریانی تھی۔ اُن کی عبادت بھی سُریانی زبان میں ہی ہوتی تھی جس کو اُن کے شرکا نہیں سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے اُن کلیسیاؤں کی روحانی طاقت اور قوت رفتہ رفتہ سلب ہوتی گئی ہوگی اور مسیحی اقتصادی اور سیاسی حالات سے پریشان ہو کر زیادہ تعداد میں اسلام کے مطیع ہوتے گئے ہوں گے اور جزیہ اور دیگر شرعی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ذلیل اقلیت سے نکل کر فاتحین کے مذہب میں داخل ہوتے گئے ہوں گے۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ان نومسلموں کے ساتھ قرآنی اصول مساوات کا سلوک کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کی ذات پات کی فضا ہی ایسی تھی کہ مسلمان فاتحین اس سے نہ بچ سکے۔ ان میں قوم اور نسل کی امتیازات نے ذات پات کی جگہ لے لی تھی۔ اس اسلامی سماج میں سید۔ شیخ۔ پٹھان۔ ترک۔ افغان وغیرہ تھے گو یہ قومی اور نسلی امتیازات ہندوؤں کی سی ذات پات کی طرح نہ

تھیں۔ ایلتتمش خود باوجود اسلامی جوش کے اپنی مسلمان رعایا میں شریف و رذیل۔ ترک اور غیر ترک کے امتیاز کا ہمیشہ لحاظ رکھتا تھا۔

اس سلطان کے زمانہ میں چنگیز خان نے ۱۲۲۱ء میں ہندوستان میں طوفانِ قتل و غارت برپا کر دیا۔ ہم حصہ اول کے باب ہفتم میں بتلا چکے ہیں کہ اس نے مغربی ایشیا کے ممالک کے اُن شہروں کو برباد کر دیا تھا جہاں مسیحی کلیسیائیں بکثرت آباد تھیں سمرقند۔ بخارا۔ مرو۔ ہرات۔ نیشاپور وغیرہ مقامات میں اُس نے قتلِ عام کا حکم دے دیا تھا جس میں کلیسیا کے فضلاء بکثرت مارے گئے اور کلیسیائیں تباہ و برباد ہو گئی تھیں (کلیسیائے قدیم در ایران صفحہ ۶۲)۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ نسطوری بشپ تبت اور بلخ ہندوستان میں آتے بند ہو گئے تھے۔ اس "خدائی تازیانہ" نے ہندوستان پر حملہ کیا اور طوفان کی طرح بڑھتا چلا آیا۔ اس کے راستے میں جتنی مسیحی کلیسیائیں تھیں اُن کو قتل و غارت کرتا گیا۔ اس کے حملوں کا ہندوستان کی کلیسیا کی زندگی اور بقا پر بُرا اثر پڑا جو پائدار ثابت ہوا اگرچہ ہندوستان کی گرمی اور لُو نے اُس کو اور اُس کے سپاہیوں کو اُلٹے پاؤں واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

چنگیز کے حملوں کی وجہ سے اسلامی ملکوں کے علماء و فضلاء نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ جہاں اب اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ اور ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا گیا۔ جب جلال الدین تبریزی دہلی پہنچا تو ایلتتمش نے علماء کے ساتھ شہر کے باہر جا کر اُس کا استقبال کیا اور اُس کو آگے کر کے خود اُس کے پیچھے شہر کو گیا۔ اس کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں اسلامی علوم کا چراغ ہر طرف جگمگا اٹھا جس کا اثر قدرتی طور پر ملک کی مسیحی کلیسیاؤں

پر پڑا ہوگا۔

(۳) غیاث الدین بلبن (از ۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۷ء)

الغ خان بلبن سلطان ایلتتمش کا غلام تھا اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے میر شکار، جرنیل، وزیر اعظم اور پھر بادشاہ ہو گیا۔ اُس نے اپنا لقب غیاث الدین رکھا۔ اگرچہ وہ خانہ ساز غلام تھا لیکن بہادر نسل ہونے کی وجہ سے وہ اِن مختلف درجوں سے گذر کر بادشاہ بن گیا۔ تخت نشینی کے بعد اُس نے سب سے پہلے فوج کو نئے سرے سے منظم کیا اور اپنی حکومت کی داخلی پالیسی میں بھی نمایاں ترقی کی۔ اس کی حکومت سے سات سال پہلے ۱۲۵۸ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو نے بغداد کو فتح کر کے خلیفہ المستعصم کو وحشیانہ طور پر قتل کر دیا تھا۔ تمام دُنیائے اسلام سیلِ تاتاری کی مصیبت میں گرفتار تھی اور یہ سیل طوفان کی طرح مغربی ایشیا کی جانب اُمڈا چلا جا رہا تھا اور اسلامی حکومتوں کو یکے بعد دیگرے تباہ کر رہا تھا۔ ۱۲۲۱ء میں منگول ہند تک آ گئے تھے اور اس کو تباہ کر دیا تھا اس طرح انہوں نے پنجاب کے مالک ہونے کا دعوےٰ کیا اور وہ لگاتار یورشیں اور حملے کرتے رہے۔ چنانچہ بلبن نے ۱۲۵۷ء میں ملتان کو اُن کے حملہ سے بچا لیا۔ باوجودیکہ اِس خونخوار قوم نے تمام ایشیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا مگر ہندوستان کی مضبوط سلطنت کو دیکھ کر ہلاکو نے بلبن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اُس کے سفیر ۱۲۵۹ء میں ہندوستان آئے۔ بلبن نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اُن کا شاندار خیر مقدم کیا۔ دو لاکھ پیادے اور پچاس ہزار ہتھیار بند سوار کھڑے تھے۔ دو ہزار جنگی ہاتھی وغیرہ تھے تاکہ منگولی مرعوب ہو جائیں۔ سلطنت دہلی کا تزک و احتشام دیکھ کر اُن کی

آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس کے بعد اُن کو یہ حوصلہ نہ ہُوا کہ تختِ دہلی کی طرف نظر کریں اگرچہ وُہ پنجاب کے دعوے سے دست بردار نہ ہُوئے۔ اور اس پر حملہ کرتے رہے جن کو بلبن کے لشکر نے روک دیا۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ تاتاری فتنہ سے بھاگ کر ترکستان۔ ماوراءالنہر۔ خراسان۔ فارس۔ عراق۔ رُوم اور شام وغیرہ۔ اسلامی ممالک کے پندرہ شاہزادوں نے ہندوستان آکر پناہ لی۔ بلبن نے سب کے لئے شاہانہ وظائف مقرر کر دیئے۔ ان تباہ شدہ ممالک کے شاہزادے بلبن کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اور صرف خلیفۂ عباسی کے دو شہزادوں کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ بلبن ہر ممکن صُورت سے سلطنت کا رعب اور وقار قائم رکھتا تھا۔ اُس کے دربار میں مُلوک و اُمرا۔ صدہا نقیب و چاؤش اور دیوہیکل جوان ننگی تلواریں لئے ہُوئے اُس کے گرد و پیش کھڑے رہتے تھے۔ جب اُس کی سواری چلتی تو پانچ سو سیستانی۔ عربی۔ سمرقندی اور غوری سوار اُس کے جلو میں ننگی تلواریں لئے ہُوئے اور "بسم اللہ" کے نعرے بلند کرتے ہُوئے چلتے تھے۔ لیکن اس شوکت کے باوجود وُہ علمائے اسلام کی بے حد قدر اور تعظیم کرتا تھا۔ اور دینی مسائل کی تحقیق میں لگا رہتا تھا۔ مونگولی فتنہ کی وجہ سے خوارزم۔ دیلم۔ غور۔ یمن۔ موصل۔ سمرقند۔ کاشغر وغیرہ کے مُسلمان فضلاء نے دہلی میں آکر پناہ لی۔ بلبن نے اہلِ کمال کو الگ الگ پندرہ محلّوں میں آباد کر دیا اور اُن کے نام محلّۂ سنجری۔ محلّۂ خوارزم۔ محلّۂ عباسی۔ محلّۂ یمنی۔ محلّۂ سمرقندی وغیرہ رکھّا جس سے دہلی کی اسلامی فضیلت بڑھ گئی۔ وُہ کہتا تھا کہ اگر سلطان بارُعب نہ ہو تو اُس سے دینِ حق کی رُسوائی ہوتی ہے اور دُوسرے ادیان میں رونق آجاتی ہے۔ سُلطان

کے لئے لازم ہے کہ وُہ بد اعتقاد لوگوں کو اپنے مُلک میں رہنے نہ دے تاکہ خلقت گمراہ نہ ہو جائے۔ ان وجُوہ کے باعث بلبن کا دورِ حکومت تاریخِ اسلام میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اگرچہ خلافتِ عباسیہ ختم ہو چکی تھی لیکن سلاطینِ دہلی بغداد کے اسلامی مرکز کے ساتھ تعلّق رکھتے گئے۔ بلبن نے اپنے سکّوں پر خلیفہ کا نام جاری رکھّا۔ اور اپنے آپ کو "ناصر امیر المومنین" کہتا رہا۔ بغداد کے ختم ہونے سے پہلے کوئی مُسلمان فرمانروا خلیفہ کی منظوری اور منشور کے بغیر سُلطان نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ عوام کے دلوں میں تختِ خلافت کا بے حد احترام تھا اور سلطان سے اس کی رعیّت اسی بناء پر عقیدت رکھتی تھی کہ وُہ خلیفہ کا نائب ہے جس سے سرکشی کرنا خلیفہ سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ سلاطین بھی اسی میں مصلحت دیکھتے تھے کہ خلیفہ سے عقیدت رکھیں۔ ہم سطُورِ بالا میں بتلا چکے ہیں کہ سلاطینِ دہلی میں سے سب سے پہلے سُلطان التمش نے بغداد کے خلیفہ سے منشُور حاصل کیا تھا۔ اور کہ اُس کے سکّوں پر اور اس کے بعد کے سکّوں پر بھی خلیفہ کا نام ہندی میں کندہ ہے جلال الدین خلجی کے عہد تک خلیفہ کا نام سکّوں پر پایا جاتا ہے۔ محمد تغلق نے اپنی حکُومت کے ابتدائی زمانہ میں خلافت کے بے معنی تعلّق کو چھوڑ کر خلفائے راشدین کے نام سکّوں پر کندہ کئے اور پھر اُس نے خلافتِ مصر سے منشُور حاصل کر لیا۔ فیروز شاہ نے اِس تعلّق کو جاری رکھّا۔ سیّد خاندان کے سلاطین اپنے آپ کو "نائب امیر المومنین" کہتے تھے اور لودی خاندان کے سلاطین بھی یہی روش اختیار کرتے رہے۔ جس سال ابراہیم لودھی تخت پر بیٹھا اُسی سال خلافت کا مرکز بدل کر خاندانِ عثمانیہ میں منتقل ہو گیا جس کے ساتھ شاہانِ مُغلیہ کا سابقہ رہا۔

سطورِ بالا سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ سلاطینِ دہلی بالعموم اسلام کی اشاعت میں کوشاں اور غیر مسلم مذاہب کو دبانے اور مٹانے کے معاملہ میں جوشیلے تھے۔ چنانچہ بلبن جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا اور نمازِ جمعہ اور نمازِ تہجد کے ساتھ خاص رغبت رکھتا تھا۔ وہ علماء کی صحبت کو پسند کرتا اور مذہبی مسائل میں بہت دلچسپی دکھاتا تھا۔ وہ اپنی اولاد کو تاکیداً کہا کرتا تھا کہ "خزانوں اور دفینوں کو کفر اور کافروں کو مٹانے اور بت پرستی کا قلع قمع کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے اور دشمنانِ خدا اور رسول کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیئے۔ امرِ معروف اور نہی منکر کو رواج دینا چاہیئے اور شعارِ اسلام کو آسمان تک پہنچانا چاہیئے"۔ ایسے بادشاہ کے زمانہ میں جو سلوک مسیحی کلیسیاؤں سے کیا گیا ہوگا وہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بلبن کا مقولہ ہی یہ تھا کہ "الناس علیٰ دینِ ملوکھم" (یعنی عوام اپنے بادشاہ کے دین پر چلتے ہیں) اور اُسی کو اختیار کرتے ہیں۔ بلبن نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد اولیاء کے مزاروں اور علماء کی قبروں کی زیارت کرنے کے لئے بھی جایا کرتا تھا۔ وہ ایسا راسخ الاعتقاد اور دینِ اسلام کا پاسدار تھا کہ وہ کسی شخص کو بھی کسی مہم پر نہ بھیجتا جو زاہد اور پارسا نہ ہوتا تھا۔

بلبن کے عہد میں خواجہ علی چشتی۔ بابا فرید گنج شکر۔ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی۔ شیخ صدرالدین۔ شیخ بدرالدین غزنوی۔ شیخ ابوالموئد۔ نظام الدین۔ شیخ جمال الدین ہانسوی۔ خواجہ علاؤالدین علی بن احمد صابر۔ سیدی مولہ۔ شیخ حسام الدین ملتانی۔ شیخ نجیب الدین فردوسی۔ شیخ ابوبکر حیدر جیسے صاحبِ کمال صوفیہ اور علماء تھے جن کا وہ حد درجہ احترام کرتا تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب نے

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی کی کتاب "سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات" کے شروع میں "دو نقارے" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ بلبن کو درحقیقت مذہبِ اسلام کی پروا نہ تھی بلکہ وہ اسلام کو آلۂ کار بنانے کی خاطر علماء کو وظائف دیتا تھا۔ اس کا اولیاء کے مزاروں پر جانا اور گڑگڑانا اور حق و انصاف کا بار بار ذکر کرنا سب کچھ نمائشی تھا۔ اس کی طاقت کا راز خفیہ ریشہ دوانیوں میں تھا۔ وہ سرِ راہ پھانسیاں دے دے کر عوام کو سہماتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شرع کے معاملہ میں بلبن کا یہ اصول تھا کہ اگر ضروریاتِ ملکی کے ساتھ احکامِ شریعت نہ ٹکراتے تو وہ اُن کا احترام کرتا تھا ورنہ نہیں۔ وہ ملک کی فلاح کو سب امور پر مقدم سمجھتا تھا۔ اور دینداری کو بالائے طاق رکھ کر جس چیز میں ملک کی بہتری سمجھتا تھا وہی کرتا تھا خواہ وہ شرعاً جائز ہو یا ناجائز ہو لیکن اگر پروفیسر حبیب صاحب کا نظریہ درست بھی ہو اور بلبن کا مذہب صرف نمائشی بھی ہو، تب بھی اس نمائش کو فروغ دینے کے لئے اور عوام و شرفا میں اپنی دینداری کا سکہ بٹھانے کے لئے اس کے لئے یہ ضرور تھا کہ غیر مسلم مذاہب کا قلع قمع کرے اور کفر اور کافروں کا استیصال کرے۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ ہندوستان کی مسیحی کلیسیاؤں کو اس کے عہد میں کبھی چین نصیب نہ ہوا ہوگا اور وہ قعرِ مذلت میں ہی پڑی رہی ہوں گی اور شمار و اقتدار میں روز بروز کم ہوتی گئی ہوں گی۔ ان کلیسیاؤں کے ختم کرنے میں نہ قرآنی احکام، نہ شرعی فرمان اور نہ فلاحِ ملک سدِ راہ تھے۔

بلبن نے سلاطینِ عجم کے محلوں کی طرز پر اپنے دربار کو سجایا۔ اس دربار کے آئین و آداب و رسوم سب کی سب ایرانی تھیں۔ ایرانی روایات اس کے سیاسی نظریوں کی بنیاد بھی تھیں۔ اس نے "وقارِ بادشاہی و آدابِ شاہی" کے طریقے

اختیار کر لئے۔ پابوس کی ایرانی رسم التتمش کے زمانہ ہی سے جاری ہو گئی تھی۔ بلبن ایرانی تہوار نوروز کو بڑی شان سے مناتا تھا۔ زربفت کے پردوں، نقش و نگار والے فرشوں اور چاندی سونے کے برتنوں نے دربار کی رونق بڑھا رکھی تھی درباری نقیبوں کی آوازیں دُور سے ہی سُنائی دیتی تھیں اور جب شاہی سواری نکلتی تو لوگوں کے دِل سہم جاتے تھے۔ اپنی غلامی کے ایّام کی یاد کو بھلانے اور نسلی سلسلہ کی کمزوری کو چھپانے کی خاطر وُہ اپنے آپ کو افراسیاب کی نسل سے بتاتا تھا۔ جہاں ہندوستان کے راجپوت راجا اپنا نسب چاند اور سُورج تک پہنچاتے تھے، بلبن اپنا نسبی تعلق افراسیاب سے قائم کرتا تھا اور کسی کم مرتبہ شخص یا کم اصل انسان سے ہمکلام نہ ہوتا تھا اور نہ کسی ایسے شخص کو اعلےٰ عہدہ دیتا تھا جو عالی نسب نہ ہوتا۔

یہ مُسلمان فرمانروا کوئی عالی نسب کے نہ تھے لیکن پھر بھی وُہ غیر مُسلموں کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہ رکھتے تھے۔ گویا ہندوؤں کی چار ذاتوں کی طرح اُن کی بھی ایک الگ ذات تھی جو ہندوستان میں بود و باش کرتی تھی جب کوئی ہندو مسلمان ہو جاتا تو وُہ "مسلمان قوم" میں شمار کیا جاتا اور اپنی ذات سے خارج کیا جاتا تھا۔ جب کوئی عیسائی مرتد ہو کر اسلام کا حلقہ بگوش ہو جاتا تو وُہ بھی اس نئی ذات اور قوم کا فرد بن جاتا اور ترقی کے تمام راستے جو اُس پر اب تک بند تھے کھل جاتے ۔ وُہ جس کے ساتھ چاہتا شادی بیاہ کر سکتا تھا اور نہ صرف ہر قسم کا کام کر سکتا تھا بلکہ ہر عہدہ پر سرفراز ہو سکتا تھا۔ مسلمان باہم متحد ہو کر رہتے تھے اور فاتح قوم شمار کئے جاتے تھے پس گو وُہ غیر مُسلموں کے مقابلہ میں تعداد میں تھوڑے تھے لیکن وُہ سب پر غالب تھے کیونکہ اُن کی طاقت فوجی طاقت تھی۔ اسلامی فوج میں سب سپاہی ایک ہی مقصد کی خاطر ایک دوسرے

کا ساتھ دیتے تھے اور سب بھائی بھائی اور برابر کے شریک تھے۔ ان کا مذہب ان کی خود حفاظتی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ مسلمان غیر مسلموں کو حلقۂ اسلام میں لانے کی بے حد کوشش کرتے تھے خواہ وُہ تلوار کے زور سے اُن کو لائیں یا تبلیغ کے وسیلے سے لائیں۔ یوں مسیحیوں کی اقلیت میں روز بروز کمی واقع ہوتی جا رہی تھی اور مسیحی کلیسیا کی اقلیت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ہر قوم ملک کی آمد سے مسلمانوں کا جوش بیش از بیش ہو جاتا تھا۔ دائرہ اسلام میں اب مختلف اقوام کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے اور وُہ اپنے ساتھ اپنی اپنی قوم کی روایات کو اسلام کے حلقہ میں لا رہے تھے اور اسلامی کلچر اور ثقافت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ دیگر اسلامی ممالک کے مُسلمان جو اب تباہ حال اور تنگ دست ہو کر ہندوستان میں آ گئے تھے وُہ بھی یہاں کے مُسلمانوں کی تقویت کا سبب بن گئے اور اسلام روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مسیحی کلیسیاؤں کی دولت خستہ اور تباہ ہو گئی تھی پس اُنہوں نے حالات کا جائزہ لے کر اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ خود حفاظتی کی خاطر وُہ اپنی رُسوم و شعائر کی پہلے سے زیادہ پابند رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ کلیسیاؤں پر جمود کی حالت طاری ہو گئی اور وہ قدامت پسند ہو گئیں۔ اسلامی شریعت کے احکام کے خلاف مسیحی مسلمانوں میں انجیل کا پیغام سُنا کر اُن کو مسیحی جہان کے قدموں میں لا نہیں سکتے تھے ان کا مذہبی جوش ایسا سرد پڑ گیا کہ اُنہوں نے ہندوؤں میں بھی تبلیغ کرنا ترک کر دیا۔ اُن کے عزم دار ادے جاتے رہے اور کلیسیائیں ہمیشہ اپنے آپ کو اور اپنی ہستی کو بچانے پر ہی قناعت کرتی رہیں۔ ان کے برعکس اسلام میں کار نمایاں کرنے والے قسمت آزما لوگ تھے جن کو اپنے مذہب کی اشاعت کا جنون تھا اور مال غنیمت اور غیر مُسلموں کی دولت نے اُن کو مالا مال کر دیا تھا

ان حالات میں اسلام کو روز بروز مسیحیت پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہوتی گئی ہوگی۔

سطورِ بالا میں جن کلیسیاؤں کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اُن شہروں اور قصبوں میں تھیں جو اسلامی سلطنت کی حدود کے اندر تھے۔ ہندوستان ایک برِاعظم صغیر ہے جس میں بہتیرے ایسے صوبے تھے جن میں ابھی اسلامی سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی اور جن پر ترکوں کا قبضہ نہ تھا۔ اُن صوبوں کے شہروں اور قصبوں کی کلیسیاؤں کی حالت ایسی پراگندہ نہیں تھی لیکن وہ بھی طاقتور کلیسیائیں نہ تھیں کیونکہ کلیسیائے ایران کی طرف سے ایران کے سیاسی حالات کی وجہ سے اب مبلغین بہت کم آتے تھے اور اُن ہندوستانی خادمانِ دین کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جارہی تھی جو ایران و شام کے ممالک میں علمِ الٰہیات کی تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ تاہم ان حالات کے باوجود کلیسیا ترقی کرتی جاتی تھی اور انجیل جلیل کے پرچار کی وجہ سے ہندوؤں کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا کرتی چلی جارہی تھی۔ الہیا کرماس دھرم میں اصلاحی خیالات ترقی کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کی الوہیت کے تصورات اور انسانی اخوت و مساوات نے ہندوؤں کی سماج کے ذات پات کے خیالات کو تہ و بالا کردیا تھا۔ اس کی خاص وجہ جیسا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے یہ تھی کہ انجیل جلیل کا ترجمہ ہندی یا سنسکرت میں یا ہندوستان کی کسی صوبہ کی زبان میں نہ کیا گیا تھا اور عوام مسیحی انجیل کے الفاظ کو سُریانی زبان میں ہی سنتے تھے جن کو وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ہندوستان کی کلیسیاؤں کے بشپ ہندی نژاد نہ تھے بلکہ ایرانی تھے جو ایران کے سیاسی حالات کی وجہ سے خود پریشان رہتے تھے اور ایران سے پردیسی مبلغین کی جماعت

میں بھی کمی ہوتی جارہی تھی۔ ہندوستان کی کلیسیا کی کا نظام اور ان کی باگ ڈور بھی پردیسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسیا روز بروز کمزور ہوتی گئی۔

علاوہ ازیں سلطنتِ دہلی کے سلاطین خلفائے بغداد کی بے حد قدر کیا کرتے تھے۔ لیں جو سلوک خلفائے بغداد اپنے اقتدار کے زمانہ میں مسیحی کلیسیاؤں کے ساتھ روا رکھتے تھے وہ نمونہ ان سلاطین کے پیشِ نظر تھا اور وہ بھی خلافتِ بغداد کا سا سلوک اپنی سلطنت کی کلیسیاؤں کے ساتھ کرتے تھے۔ اس سلوک کی وجہ سے یہ کلیسیائیں ذلیل اور حقیر ہوتی گئیں۔

بلبن کی موت کے بعد اُس کا بیٹا کیقباد تخت نشین ہوا جو نہایت بدچلن شخص تھا۔ اُس کے عیش و عشرت کا یہ حال تھا کہ دو دخترانِ خوبرو" کو اس سے پہلے کہ "شگوفہ پستان و رگلستانِ جوانی سر بر آورد" تربیت دے کر اُس کے لئے تیار کیا جاتا اور لڑکوں کو "مثلِ عروسان جلوہ نگاہ" آراستہ کیا جاتا اور شراب و رقص و سرود کی مجالس کی رنگینیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فسق و فجور عام ہوگیا۔ اُس کے عملاء بھی ایسے زیادہ تھے کہ انہوں نے اُس کو نماز روزہ اور تمام شرعی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ بلبن نے نو صرف مملکت کے اصول دربار کے آداب اور محلات کے ماحول کو اور نہ صرف خواجہ سراؤں اور کنیزوں کی تربیت کو ہی ساسانی رنگ میں رنگا تھا اور آتش جنگ وغیرہ کے لئے ساسانی نقشہ بنایا تھا اور اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ناموں کو بدل کر کیقباد کیخسرو، کیکاؤس اور کیومرث وغیرہ نام رکھے تھے اور شریف و رذیل، ترک اور غیر ترک امتیازات کو قدرتی اور لازمی سمجھا تھا لیکن کیقباد نے تو "ہر چہ پدر نتواند پسر تمام کند" کو ثابت کر دیا۔ اس کا حکمران ترک طبقہ

کسی غیر تُرک کو اعلیٰ عُہدوں پر فائز ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر تُرک امیر اپنی ہی طاقت کے استحکام کے لئے کوشش کرتا رہتا تاکہ وُہ مُسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنا طرفدار بنا کر سلطان سے اپنی حیثیت کو دُوسروں سے بہتر منوا سکے۔ پس ہر تُرک امیر مسجدیں بنواتا، امام مقرر کرتا، قرآن خوان کو ملازم رکھتا تاکہ اس طرح عوام اُس کے طرفدار بن جائیں۔ بادشاہ بھی ایسے اُمراء کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا کیونکہ وُہ اُس کی ہر جائز و ناجائز بات میں ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں عُلماء کا بھی ایک ایسا طبقہ تھا جس نے دین کو دُنیا کے بدلے بیچ دیا تھا اور بادشاہوں کے ہر عمل کو جائز قرار دے کر اپنے رُتبہ اور دولت کو بڑھاتا تھا۔ لیکن علما کے دُنیادار اور دیندار طبقے دونوں مسیحی کلیساؤں کے اور عیسائیوں کے جانی دُشمن تھے اور اس بات پر تُلے رہتے تھے کہ جو مسیحی اپنے ایمان پر قائم رہیں وُہ صرف ذِلّت کی زندگی بسر کریں جیسا آئندہ سطور میں روشن ہو جائیگا۔

فصل دوم۔ خلجی سلاطین

(۱) جلال الدّین فیروز شاہ (از ۶۸۹ھ تا ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۵ء)

جلال الدّین فیروز شاہ خلجی خاندان کا پہلا سُلطان تھا جو تختِ دہلی پر بیٹھا۔ خلجی تُرک قوم کے تھے۔ پر وُہ نسل کے خالص تُرک نہ تھے اور افغانستان کے علاقہ خلج سے قسمت آزمائی کی خاطر آئے تھے۔ جلال الدّین بے حد مذہبی

آدمی تھا۔ وُہ خود کہتا ہے "من روزے یک سپارۂ قرآن بخوانم و پنج وقت نماز گذارم"۔ یعنی میں ہر روز قرآن کا ایک سپارہ (تیسواں حصّہ) پڑھتا ہُوں اور پانچوں وقت نماز پڑھتا ہُوں۔ وُہ شریعت اسلام پر سختی سے عمل کرتا تھا اور اگر کسی کو شرعی احکام کی خلاف ورزی کرتا دیکھ لیتا تو اُس کا کبھی اعتبار نہ کرتا تھا۔ وُہ افسوس کر کے کہتا تھا کہ "محمود غزنوی کے دِلوں میں ایک بددین نہ رہا تھا اور شعارِ اسلام آسمان تک پہنچے ہُوئے تھے، بُت پرستی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ہر روز ہندو جو خُدا اور رسُول کے بدترین دشمن ہیں اپنے سنکھ بجاتے میرے محل کے نیچے سے گذرتے ہیں اور جمنا کے کنارے بُت پرستی کرتے ہیں اور احکامِ شرک و کفر رعایا میں مروج ہیں لیکن ہم میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ ہم روک سکیں"۔ اس کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہلاکو کا پوتا عبداللہ ڈیڑھ لاکھ کی فوج جرّار کے ساتھ ہندوستان پر چڑھ آیا لیکن اُس نے شکست کھائی۔ چنگیز خاں کے پوتے اُلغو (ULGHU) نے دہلی میں رہائش اختیار کر لی اور سلطان نے اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی۔ مونگولیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اُن کو وظیفے اور انعامات بکثرت دیئے گئے۔ اُن کے لئے مکانات تعمیر کئے گئے اور اُن کی آبادیوں کا نام "مغل پورہ" پڑ گیا۔ اُنہوں نے مقامی مُسلمانوں سے بیاہ شادیاں کر لیں اور اسلامی رسُوم و رواج اور قرآنی احکام و شریعت پر چلنے کا وعدہ کیا۔ اور وُہ "نو مسلم" کہلانے لگے۔

اس سُلطان کے عہدِ سلطنت میں مغربی کلیسیا کا پادری جان آف مانٹی کورونیو (JOHN OF MONTE CORVINO) اور اٹلی کا سیاح مارکو پولو ۱۲۹۳ء میں ہندوستان آئے۔

ہندوستان میں مستقل طور پر بزرگوں کے بسنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطینِ دہلی رفتہ رفتہ غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کے سماجی حالات اور خیالات سے متاثر ہو گئے۔ نظامِ حکومت کو چلانے کے لئے بھی ان سلاطین کو ہندوؤں کی ضرورت ہمیشہ پڑتی تھی کیونکہ ہندو معمار عمارتوں کو بناتے تھے۔ ہندو سکے گھڑتے تھے اور وہی مالی نظام کو سنبھالنے کے اہل تھے۔ برہمن ہندوؤں کے باہمی مقدمات اور تنازعات کو طے کرنے میں مدد بھی دیتے تھے یہی وجہ تھی کہ فیروز خلجی جیسا شریعت کا پابند بادشاہ ہندوؤں کی بت پرستی کو دیکھ کر جل جاتا تھا، لیکن وہ بے بس تھا۔ جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں محمد بن قاسم کے زمانہ ہی سے ہندوؤں کو حکومت کے کاموں میں شریک کیا جانے لگا تھا۔ یہ امر ناگزیر تھا کیونکہ سلاطینِ دہلی کی ملکی ضروریات کا یہ تقاضا تھا کہ ہندوستان کی قابل اکثریت کے ساتھ جو اقتدار رکھتی تھی مصالحت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے لیکن مسیحی کلیسیا جیسی کمزور اور ذلیل اقلیت کے ساتھ جو بے بس و لاچار تھی اور جس کا وجود ان کے رحم پر تھا، اس قسم کی ملکی ضروریات وابستہ نہ تھیں۔ پس ان سلاطین کے زمانہ میں یہ کلیسیائیں روز بروز کمزور اور پست ہمت ہوتی گئی ہوں گی۔

(۲) سلطان علاؤ الدین (از ۶۹۵ھ تا ۷۱۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۶ء)

جس طرح غیاث الدین بلبن نے تاریخ میں جگہ پائی ہے اسی طرح علاؤ الدین کو خاندانِ خلجی میں تاریخی جگہ حاصل ہے۔ اس نے بلبن کے کام کو جاری رکھا اور منگولیوں کے بار بار حملوں کی وجہ سے فوج اور سرحد کو مضبوط کیا۔ منگولی ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ ملتان اور پنجاب کو فتح کرنے

کے لئے حملہ آور ہوئے لیکن انہوں نے شکست کھائی۔ وہ پھر سلدی کی سرکردگی میں حملہ آور ہوئے اور پھر شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ ترغی کی زیرِ کمان بے شمار تعداد میں حملہ آور ہوئے لیکن ان کو پسپا ہونا پڑا۔ ۱۳۰۶ء عیسوی میں منگولی علی بیگ اور خواجہ تاش نے لاہور اور سوالک پہاڑیوں پر حملے کئے اور امروہہ تک آ گئے لیکن پھر شکست کھا کر گئے۔ لیکن وہ پھر ۱۳۰۷ء میں اقبال مندی کی سرکردگی میں حملہ آور ہوئے پر ان کا ایک شخص بھی نہ بچ نکلا۔ ہزار ہا قتل ہو گئے۔ ہزارہا قید ہو کر دہلی لائے گئے جن میں بہتیرے سردارانِ لشکر تھے۔ سلطان کے حکم سے ان کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا گیا۔ سب کے سر کاٹ کر ایک منارہ کھڑا کر دیا گیا۔ جو منگولی مسلمان ہو کر دہلی میں رہتے تھے وہ منگولیوں کے متواتر حملوں سے خطرہ کا باعث ہو رہے تھے۔ وہ سلطنت سے ناراض بھی رہتے تھے کیونکہ اوّل۔ وہ ان کو غیر ملکی تصور کرتے تھے۔ دوم۔ وہ بدحال رہتے تھے کیونکہ ان کو عہدہ یا تنخواہ کوئی نہیں ملا۔ سوم۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ان کو قتل کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ جلال الدین فیروز خلجی کی موت کے بعد ان کو سختی کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی۔ علاؤ الدین نے ان کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا اور ان کے وظائف میں تخفیف بھی کر دی۔ اس پر وہ سلطنت کے خلاف سازشیں کرنے لگ گئے۔ بعض پر ان کا قتل عام کر دیا گیا اور بعض جو زندہ بچے نہایت سختی کے ساتھ منتشر ہو گئے۔ ہر جگہ ان کو تتر بتر کر دیا اور ان کی قطعاً نہیں چلی۔

ایلتتمش اور بلبن نے اسلامی اقتدار کی بنیاد دہلی قائم کی لیکن علاؤ الدین نے اس کام کو پورا کر دیا۔ اب اسلامی سلطنت کے اقتدار کو تمام شمالی ہند کے چھوٹے بڑے راجاؤں نے تسلیم کر لیا۔ علاؤ الدین اسلام پر صرف تنقیدی

اعتقاد ہی رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس نے مسجدوں، میناروں، مزاروں، خانقاہوں اور حوضوں کی مرمت کروائی اور اُن کو مستحکم کیا جس سے مسلمان خوش ہو گئے۔ اس کا اصلی ارادہ یہ تھا کہ وُہ اپنی رعایا کی زندگی کے ہر شعبہ پر حکمران ہو۔ تاکہ اُس کا اقتدار لامحدود طور پر مستحکم ہو جائے۔ پس وُہ ملک کے کسی طبقہ کو یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ وُہ کسی قسم کی طاقت حاصل کر کے امورِ سلطنت میں دخل دینے لگے۔ پس وُہ ہر طبقہ کو خواہ وُہ علماء کا ہو۔ یا اُمراء کا، فوجی افسروں کا ہو یا غیر مسلموں کا، اپنے تابع رکھتا تھا اور جس بات میں وُہ ملک کی بھلائی دیکھتا تھا وُہی کرتا تھا خواہ وُہ شرعاً جائز ہو یا ناجائز ہو خصوصاً وُہ علمائے شریعت کو امورِ سلطنت میں دخل انداز ہونے نہیں دیتا تھا۔ اور اپنے سے پہلے بادشاہوں کی طرح اپنے آپ کو شریعت کے ماتحت خیال نہیں کرتا تھا۔ بادشاہ کی مرضی اور اُس کی خوشی ہی قانون تھی اور بس۔ اس کا یہ مقولہ تھا کہ "جس قانون کو بادشاہ مُلک کی بہتری کی خاطر جاری کرے وُہی مُلک کا قانون ہوگا، خواہ وُہ اسلامی شرع کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ جب روزِ حساب آئیگا دیکھا جائیگا"۔ یہ سلطان نماز روزہ کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ حتّٰی کہ عہد کے ابتدائی زمانہ میں اُس کو ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کی سُوجھی لیکن جب یہ خبر عوام میں پھیلی اور ہر طرف تشویش کا اظہار ہونے لگا تب وُہ فتنہ کے خوف کے مارے اپنے ارادہ سے باز آیا۔

علاؤالدین کے زمانہ میں دہلی میں اس پایہ کے مسلمان علماء تھے کہ اُن کی مثال بعد کے زمانہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان اہلِ فضل والوں میں ہر شخص علامۂ وقت تھا اور اپنے فن میں یکتا تھا۔ تفسیر، فقہ، اصولِ دین، نحو، لُغت، کلام، منطق غرضیکہ ہر فن و علم کے صاحبِ کمال موجود تھے جن کی تعداد

پچاس سے زیادہ تھی۔ لیکن علاؤالدین خود اَن پڑھ ناخواندہ شخص تھا اور علما کی یا شریعت کی مُطلق پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ایک روز اُس نے اپنے قاضی مغیث الدین کو بُلا کر برسرِ دربار کہا "آج ہم تم سے کچھ مسائل پُوچھنا چاہتے ہیں۔ جو بات سچ اور صحیح ہو، وُہی ہم سے کہنا"۔ قاضی نے عرض کیا۔ "حضُور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری مَوت کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن خداوند جب دینی مسائل مجھ سے دریافت فرمائینگے تو اگر میں حق بات کہُونگا تو آپ ناراض ہو کر مجھ کو قتل کر دینگے"۔ علاؤالدین نے کہا "نہیں۔ ہم تم کو قتل نہیں کرینگے۔ جو ہم دریافت کریں وُہ سچ سچ کہو"۔ پس سلطان نے اُس سے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا۔ قاضی مغیث نے جواب دیا "شرع کے مطابق ہندو خراج گزار ہیں۔ لازم ہے کہ جب محصلِ دیوان ان سے چاندی طلب کرے تو وُہ بے حیل و حجت، نہایت عاجزی اور ادب و تعظیم کے ساتھ بلا کسی تامّل کے سونا پیش کر دے۔ اگر محصل اُس کے مُنہ میں تھُوکنا چاہے تو واجب ہے۔ وُہ بغیر کسی کراہت کے برضا و رغبت خود اپنا مُنہ کھول دے تاکہ سب پر ظاہر ہو جائے کہ وُہ محصل کا احترام کرتے ہیں مُراد یہ ہے کہ دینِ اسلام اور حق کی بلندی ہو اور دینِ باطل کی خواری ہو۔ خدا خود اِس خواری کے متعلق قرآن میں فرماتا ہے عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ہندوؤں کو خوار رکھنا لوازمِ دین داری سے ہے اِس لئے کہ وُہ مصطفےٰ کے سخت ترین دشمن ہیں اور چونکہ مصطفےٰ نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مالِ غنیمت لینے اور اُن کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے پس یا تو وُہ اسلام قبُول کریں، یا اُن کو قتل کیا جائے اور یا غلامی میں لے لیا جائے اور اُن کے مال و مُلک پر قبضہ کر لیا جائے۔ سوائے امام اعظم کے جن کے ہم پیرو ہیں اور جو ہندوؤں سے جزیہ

قبول کرنے کے حق میں ہیں، دوسرے آئمہ مذاہب کے نزدیک ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنا جائز نہیں سمجھا گیا۔ دیگر کے نزدیک ہندوؤں کی بابت یہ حکم ہے کہ "اما القتل و اما الاسلام"۔ . . . سلطان نے کہا "اے مغیث تو عالم ضرور ہے لیکن تیرا تجربہ کچھ نہیں۔ اگرچہ میں اَن پڑھ ہوں لیکن تجربہ رکھتا ہوں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ ہندو کبھی کسی مسلمان کا مطیع اور فرمانبردار ہو کر نہیں رہے گا جب تک کہ اس کو بے نوا اور بے حیثیت نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ آئندہ رعیت کے پاس فقط اتنا ہی چھوڑا جائے کہ وہ زراعت اور دودھ دہی کے لئے سال بسال سلطان کر سکیں لیکن وہ ذخیرہ جمع کرنے کا موقع ہرگز نہ پائیں"۔ پھر سلطان نے بیت المال اور بادشاہ کے متعلقین کے حقوق کی نسبت قاضی سے سوال پوچھا۔ اس نے جواب دیا "اگر خداوند عالم خلفائے راشدین کی پیروی کر کے آخرت کے درجات طلب کریں تو جیسا کہ اہل جہاد کے لئے ۲۳۴ تنکہ (۵ ۳/۴ تنکہ = ۵ روپیہ) کی رقم مقرر ہے اتنی ہی مقدار خداوند عالم اپنے اور اپنے اہل و عیال کے اخراجات کے لئے لے لیں اور اگر اس سے بادشاہی کی شان قائم نہ رہ سکے تو جتنی رقم درگاہ کے بڑے بڑے لوگوں کو دی جاتی ہے اتنی ہی رقم بیت المال سے وصول کر لیں اور اگر آپ چاہیں تو اس سے بھی زیادہ اور اچھا مال لے لیں تاکہ خداوند عالم میں اور دوسروں میں امتیاز ہو جائے۔ لیکن اگر آپ نے تجاوز کر کے زیادہ لے لیا اور لاکھوں کروڑوں سونے کی اور جڑاؤ چیزیں اپنی حرم کو دینی شروع کر دیں تو قیامت کے دن اس سب کے لئے آپ سے بازپرس ہوگی"۔ اس جواب پر علاؤالدین غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا "تو میری تلوار سے نہیں ڈرتا کہ تو کہتا ہے کہ جو مال میرے حرم پر خرچ ہوتا ہے وہ حرام ہے"۔ قاضی اپنے گھر

چلا گیا۔ اس نے اگلے روز غسل کیا، صدقہ تقسیم کیا اور اہل خانہ کو الوداع کہہ کر دربار میں حاضر ہوا۔ علاؤالدین نے اس کو پاس بلایا اور لطف و کرم سے پیش آیا اور اپنا خلعت خاص اتار کر اس کو عطا کیا اور ایک ہزار تنکہ عطا کر کے کہا "قاضی مغیث۔ میں جس بات میں ملک کی بھلائی دیکھتا ہوں اسی کا لوگوں کو حکم کرتا ہوں۔ اگر لوگ تعمیل نہیں کرتے تو سخت احکام نافذ کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ احکام جائز ہیں یا ناجائز ہیں"۔ (تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۰-۲۹۶)۔

علاؤالدین ہندوؤں پر سخت ظلم و جبر روا رکھتا تھا۔ ایسا کہ ان کے پاس سواری کا گھوڑا تک نہ تھا۔ ان کو ہتھیار رکھنے منع تھے۔ حکم تھا کہ وہ اچھا لباس نہ پہنیں۔ اس نے ان کو زندگی کی ہر قسم کے آسائش و آرام سے محروم کر رکھا تھا۔ دوآبہ کے سرکش ہندوؤں پر پچاس فیصدی زمین کی لگان لگائی گئی۔ ان کے مویشیوں پر اور ان کے گھروں پر بھی ٹیکس لگائی گئی۔ دودھ دینے والے جانوروں پر بھی ٹیکس تھی۔ اگر کوئی افسر رشوت لے کر ٹیکس چھوڑ دیتا تو سلطان کو خبر ہو جاتی تھی کیونکہ اس کا جاسوسی کا محکمہ بڑا زبردست تھا وہ افسر کو سخت عذاب اور سزائیں دیتا۔ اس کے احکام پر اس سختی سے عمل کیا جاتا تھا کہ ٹیکس وصول کرنے کے لئے صرف ایک معمولی ملازم کافی ہوتا جو بیس ہندو شرفا کو رسی سے باندھ لیتا اور ان کو زدوکوب کر کے ان سے مالیہ وصول کیا کرتا تھا۔ غیر مسلموں کی ہراسانی کا یہ عالم تھا کہ سلطان کے احکام سنتے ہی وہ "چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھس جاتے تھے"۔ وہ زر مالیہ اکٹھا کرنے والوں سے وبائے طاعون سے زیادہ خائف تھے۔ ان کے گھروں میں سیم و زر تو بجا رہا پان کھانے کے پتے بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان کی

مالی حالت اس قدر گر گئی تھی کہ ہندو سرکاری ملازموں کی بیویاں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے مسلمانوں کے گھروں میں نوکرانیاں ہو کر کام کرتی تھیں بس ہندو حکومت کی ملازمت کو موجب عار سمجھتے تھے اور سلطنت کے ہندو دکانداروں کو کوئی شخص اپنی بیٹی دینے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔

سلطان علاؤالدین پہلا ہندوستانی فرمانروا تھا جس نے مے فروشی اور شراب خوری کا مکمل طور پر انسداد کیا۔ اُس نے تمام نشہ آور چیزوں مثلاً نبیذ۔ بھنگ وغیرہ کو اور جوا بازی کو خلافِ قانون قرار دے دیا اور اُن کو استعمال کرنے والوں کو شہر سے نکال دیا۔ اُس نے طوائف کے طبقہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنا پیشہ چھوڑ دیں اور اُن کے نکاح جبراً کروا دیئے۔ اس کے زمانہ میں ایک گروہ تھا جو بچوں کو کھا جایا کرتا تھا اور اُن کے خون کو جادو منتر کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اُس نے اس گروہ کے آدمیوں کو گردن تک زمین میں گڑوا کر سنگسار کر دیا۔

ہندوستان کی قرونِ وسطیٰ میں علاؤالدین کی اقتصادی اصلاحات نہایت اہم قسم کی ہیں۔ فوج کی تنخواہوں کو کم رکھنے کے لئے اُس نے اشیا کی گرانی کی روک تھام کر کے ہر شے کا نرخ مقرر کر دیا۔ چنانچہ برنی کہتا ہے کہ اُس نے ٹوپی، کنگھی، تیل، جوتی، سوئی، سبزی، گنا، مٹھائی، پھل اور کھانے کی چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کی قیمت مقرر کر دی۔ لونڈیوں، غلاموں اور خادمہ تک کی قیمتِ خرید مقرر کر دی۔ کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ وزن میں کم تولے کیونکہ سلطان سخت سزائیں دیتا تھا اور ایسا سخت تھا کہ پورے خاندان کو قتل کروا ڈالتا تھا۔

محمد بن بختیار خلجی نے بہار کے صوبہ کو فتح کر لیا۔ اُن ایام میں بہار ہی ایک ایسا صوبہ تھا جس میں بدھ مت زندہ تھا کیونکہ یہاں کے پالا خاندان کے راجے متعصّب اور کٹر بدھ تھے۔ فتح کے بعد بہتیرے بھکشو قتل کر دیے گئے۔ ان کے وہار مسمار و منہدم کر دیئے گئے۔ اُن کے عظیم الشان کتب خانے اور مورتیاں برباد کر دی گئیں۔ بہار کی فتح سے بدھ مت کا عملی طور پر شمالی ہند میں خاتمہ ہو گیا۔

ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں کہ بہار کے صوبہ میں اور اس کے ارد گرد کے صوبوں میں تیرھویں صدی کے شروع میں مسیحی کلیسیائیں اِس کثرت سے آباد تھیں کہ پٹنہ کا شہر ایک میٹروپولیٹن کا صدر مقام ہو گیا تھا۔ اِس صدی کے آخر میں جب اٹلی کا مارکو پولو ہندوستان آیا تو وہ لکھتا ہے کہ وسط ہندوستان میں چھ ریاستیں تھیں جن میں تین مسلمان اور تین مسیحی حکمران تھے۔ جب بہار کا صوبہ اسلامی سلطنت کا حصّہ ہو گیا تو وہاں کی مسیحی کلیسیاؤں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگرچہ یہ کلیسیائیں پہلے بدھ مت کے متعصّب راجاؤں کے ہاتھوں ایذائیں اُٹھا چکی تھیں پر ان راجاؤں کی سختی اسلامی حکومت اور بالخصوص علاؤالدین کی سی نہ تھی۔ انھوں نے شریعتِ ارتداد کا سا قانون اور اسلامی شریعت کی سی پابندیاں نافذ نہ کی تھیں۔ اور راجاؤں کی بدسلوکی کے باوجود یہ کلیسیائیں ترقی کرتی گئی تھیں۔ جتنے مسیحی لوگ اسلامی حکومت کے علاقوں سے بھاگ کر یہاں پناہ گزین بھی ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اب یہ صوبہ بھی اسلامی حکومت کا حصّہ بن گیا اور اس پر بھی شرع اسلام کی پابندیاں لگ گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار کمزور ایمان والے عیسائیوں نے اپنے مسیحی کا انکار کر کے اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ اور یوں اپنی جان اور اپنے خاندانوں کی آبرو کو بچا لیا ہو گا۔

ایک روز سلطان علاؤالدّین نے اپنے امرا سے پُوچھا کہ یہ بے انتہا دَولت اور خزائن جو میرے قبضہ میں ہیں، مَیں اُن سے کیا کروں۔ اِس کے کوتوال نے کہا کہ اگرچہ سُلطان کی سلطنت وسیع ہے لیکن ابھی ہندوستان کا جنوبی حِصّہ تسخیر ہونے کی انتظار کر رہا ہے۔ چتوڑ۔ رنتھمبور۔ چندیری۔ مالوہ۔ اجین وغیرہ فتح ہونے والے ہیں۔۔ علاؤالدّین یہ جواب سُن کر خُوش ہوگیا۔

ایبک اور بختیار کی فتوحات نے محمد غوری کے کام کو مکمّل کر کے بندھیاچل کے سلسلہ کے شمال کی جانب کے تمام ہندوستان کو زیر کر لیا تھا۔ علاؤالدّین سے پہلے کسی مُسلمان فرمانروا کا یہ حوصلہ نہ ہُوا تھا کہ دریائے نربدا کے پار اور ست پورہ کی پہاڑیوں کے پار ہو کر جنوبی ہند میں مہاراشٹر کے مُلک میں جائے جو مرہٹوں کا وطن اور قدیم ہندوؤں کی ریاستیں تھیں۔ لیکن علاؤالدّین ۱۲۹۴ء میں دُشوار گذار دّروں میں سے گذر کر بندھیاچل کے کوہستانوں اور جنگلوں کو پار کر گیا اور اُس نے مرہٹہ کی راجدھانی دیوگری پر حملہ کر کے اُس کو سر کر لیا یوں اسلامی افواج نے پہلی بار دکن میں قدم رکھا۔ علاؤالدّین وہاں سے بے شمار زر اور خزانے حاصل کر کے واپس لوٹا۔ اُس نے مَلک کافور کو (جو پہلے ہندو تھا) مشرقی گھاٹ کی طرف تلنگانہ کو سَر کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب وُہ راجدھانی ورنگل کو فتح کر کے واپس آیا تو اپنے ساتھ ایک سَو ہاتھی۔ سات ہزار گھوڑے اور بے شمار خزانہ لایا۔ ۱۳۱۰ء میں کافور ساحل مالابار کی جانب گیا۔ وُہ جنوب میں میسور تک چلا گیا اور معبر کے مندر میں جو سونے کا دیوتا تھا توڑ ڈالا۔ شمالی دکن نے سُلطان کی اطاعت قبول کر لی اور کافور اپنے ساتھ ۶۱۲ ہاتھی۔ بیس ہزار گھوڑے۔ قیمتی

پتھروں۔ موتیوں اور جواہرات کے صندوق اور چھیانوے ہزار من سونا لے کر آیا۔ ان جنگوں میں اس قدر خونریزی ہُوئی کہ ہر حملہ میں ایک لاکھ سے پانچ لاکھ آدمی کام آئے۔ اُلغ خاں اور دیگر مصنّف ہم کو بتلاتے ہیں کہ راجپوتوں اور سیرہ کے گرجے سونے سے بھرے تھے جن کو جرنیل کافور نے لُوٹ لیا اور مالِ غنیمت میں اپنے ساتھ لے آیا۔

سلطان علاؤالدّین کے خصائل و عادات اور اُس کے حالات و عبادات اور سیاسی نظریوں کو دیکھ کر ناظرین خود ہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اُس کی آنکھوں میں مسیحی کلیسیا جیسی ذلیل اقلیّت کیا وُقعت رکھتی ہوگی ... ہم نے قاضی مغیث کی گفتگو مختصر طور پر لکھی ہے تاکہ ناظرین خود قیاس کر لیں کہ علاؤالدّین کے عہد کے علما اور ہند کی اسلامی حکومت کے فقہا مسیحی کلیسیا جیسی بے جان جماعت کی نسبت کس قسم کے خیال رکھتے ہونگے۔ اور اُن کے خیالات کا اثر کلیسیاؤں اور مسیحیوں کی زندگی پر کیا پڑتا ہوگا۔ جب ہندو جیسی مقتدر اور مالدار اکثریت اس قدر پست ہمّت اور بزدل ہو گئی تھی کہ ایک معمولی حیثیت کا محصّل بیس بیس شرفا کو ایک ہی رسّی میں باندھ کر زدوکوب کر کے مالیہ وصُول کرتا تھا تو بیچاری مسیحی کلیسیاؤں کی ہراسانی ذلت اور پست ہمّتی کا اندازہ بآسانی ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر بادشاہ علاؤالدّین کی مانند زبردست سُلطان نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر اس صدی میں علمائے اسلام کا امُور سلطنت میں ہاتھ ہوتا تھا۔ اور یہ طبقہ غیر مُسلموں کو اسلام منوانے میں جوش پیدا ہوتا تھا۔ بلکہ بعض سلاطین کے عہد میں غیر مُسلم اپنے مذاہب کی رسُوم کو ادا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ متعدد اشخاص اس جُرم کی پاداش میں مارے گئے کہ وُہ اپنے مذاہب کی رسُوم کو

ادا کرتے تھے ۔۔۔ غیر مسلموں اور عیسائیوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا ۔ سلطنت کا تمام دار و مدار فوج اور طبقۂ علماء پر تھا ۔ ہر بادشاہ موقعہ اور حالات کے مطابق اسلامی شرع پر چلتا تھا ۔ اگرچہ علاؤالدین علماء کی پرواہ نہیں کرتا تھا ۔ اور اُن کو ملکی معاملات میں مداخلت کرنے نہیں دیتا تھا۔

لیکن عام طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ خلجی سلاطین غیر مسلموں کو حلقۂ اسلام میں لانے میں سرگرم رہتے تھے ۔ چنانچہ ابن بطوطہ ہم کو بتلاتا ہے کہ ان سلاطین کے زمانہ میں جب کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تھا تو اُس کو دربار میں سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور سلطان اُس کو خلعت اور بھاری انعام واکرام دے کر بڑے عہدہ پر ممتاز کر دیا کرتا تھا ۔

جس طرح محمود غزنوی کے حملوں نے کلیسیائے ہند کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا تھا اور حملہ آوروں کے لئے نئے راستے نے شمالی ہند کے صوبوں کی کلیسیاؤں کو پراگندہ حال کر دیا تھا اسی طرح اب علاؤالدین کے بندھیاچل کے کوہستان کو پار کرنے سے مسلم حملہ آوروں کے لئے ایک نیا راستہ کھل گیا ۔ اس سے پہلے جیسا ہم اس سلسلہ کی جلد دوم کے باب ہفتم میں ذکر کر چکے ہیں عرب تاجر ہندو راجاؤں کی رواداری سے فائدہ اٹھا کر مختلف وسیلوں سے جنوبی ہندوستان میں اسلام پھیلا رہے تھے ۔ اب تک کوئی مسلمان حملہ آور شمال کی جانب سے جنوبی ہندوستان کو نہ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند کی کلیسیائیں آرام اور چین سے زندگی گذار کر ترقی کر رہی تھیں ۔ لیکن اب یہاں بھی اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان

فتوحات کے ساتھ مسیحی کلیسیاؤں کے چین و آرام کی زندگی اور ترقی کا زمانہ بھی رخصت ہونے لگا ۔ جب اسلامی فتوحات بڑھتی گئیں اور اسلامی طاقت ملک میں قائم ہو گئی اور لوگوں نے دیکھا کہ اب اطاعت کئے بغیر چارہ نہیں تو جوق در جوق بے شمار غیر مسلم دائرۂ اسلام میں آ گئے ۔ جُوں جُوں اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہوتی گئیں اور اس کو قیام نصیب ہوتا گیا مسیحی کلیسیاؤں پر مصائب و ادبار کی کالی گھٹائیں چھا کر آنے لگیں ۔ ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں کہ جنوبی ہند میں مسیحی کلیسیائیں بڑا اقتدار اور رسوخ رکھتی تھیں اور روز افزوں ترقی کرتی جا رہی تھیں ۔ لیکن اب اُن کی ترقی کی رفتار رکی ہوئی تھی اور جہاں جہاں اسلامی سلطنت گئی وہاں مسلمان فرمانرواؤں نے نہ صرف ان پر ترقی کی راہیں مسدود کر دیں بلکہ قرآنی احکام اور شریعت اسلام کی پابندیاں لگا کر ان کو ایک بے سر و سامان اقلیت بنا دیا ۔ چنانچہ علاؤالدین کے عہد میں ۱۳۱۰ء میں مغربی کلیسیا کا پادری مینن ٹلس (MENIN TILLUS) جنوبی ہند کے مشرقی ساحل میں گیا ۔ وہ پوپ کا لیگیٹ (LEGATE) تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کو مشرقی ساحل پر غلبہ حاصل ہے ساحل کے علاقوں میں مسیحی بستے ہیں لیکن وہ تعداد میں کم ہیں اور نہایت معمولی حیثیت کے لوگ ہیں ۔ یہاں جو مسیحی مذہب کا اقرار کرتے ہیں یا مسیحی نام رکھتے ہیں اُن کا ناک میں دم کر دیا جاتا ہے اور اکثر ایسی ایذائیں دی جاتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی ۔ ان پر ظلم و ستم کرنا ایک عام اور معمولی بات ہے ۔ بدقسمتی سے وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کی پالیسی کی وجہ سے (جیسا ہم پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں) ان ممالک کی کلیسیائیں خود ہر وقت اسلام کی زد میں رہتی تھیں اور اس قابل نہ تھیں کہ وہ ہندوستانی کلیسیا کی مدد کر سکیں

اور اپنے بشپ اور مبلغین بھیجتے رہیں یا ہندوستانی قسیسوں کی تعلیم و تربیت ہی کر سکیں۔ پس ہندوستان کی کلیسیا روز بروز بیش از بیش کمزور ہوتی چلی گئی اور بہت سے مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ محمود غزنوی نے پہلا حملہ ۱۰۰۱ء میں کیا تھا اور اب تین سو سال کے متواتر اسلامی حملوں اور منگولوں اور مونگونیوں کی پے در پے تباہ کاریوں نے شمالی اور وسط ہند اور اب جنوبی ہند کے بعض حصوں میں کلیسیاؤں کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اُن کا جینا اور مرنا قریباً برابر ہو گیا۔ وہ مسیحی بادشاہتیں جن کا مارکو پولو ذکر کرتا ہے اسلامی حملوں کے طوفان کی نذر ہو کر ختم ہو گئیں۔ ہاں۔ ان مسیحی کلیسیاؤں میں پھر بھی ایسے جانباز تھے جن کے دم سے مسیحیت کا نام و نشان برقرار رہا اور اُن کا مذہبی جوش خاکستر کے تودوں میں بھی چنگاریوں کی طرح جلتا رہا۔

فصل سوم۔ خاندانِ تغلق و لودی

مبارک خلجی، خسرو خاں اور غیاث الدین تغلق:۔

سلطان علاؤ الدین کے بعد اُس کا بیٹا قطب الدین مبارک خلجی تخت نشین ہوا۔ نالائق سلطان کو مے نوشی، عیش و طرب اور ہوا پرستی کے سوا کوئی کام نہ تھا حتیٰ کہ وہ دربار میں زنانہ کپڑے پہن کر آتا اور حیا سوز حرکات کا مرتکب ہوتا تھا۔ لیکن ان خصائل کے باوجود ابن بطوطہ کے مطابق اس کے عہد میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو مسلمان ہو جاتا تو بادشاہ کی

طرف سے اُس کو خلعت اور سونے کے کنگن انعام میں دیئے جاتے تھے"۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب اِس قسم کے فاسق و فاجر شخص کی سلطنت میں بھی نو مریدوں کا ایسے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا اور اُن کے تالیفِ قلوب کے لئے اُن کو انعام و اکرام دیئے جاتے تھے تو کتنے مسیحیوں نے اُن ایام میں حرصِ زر اور حبِ جاہ کے لالچ میں آکر اسلام قبول کر لیا ہوگا جب تختِ دہلی پر کٹر سلاطین متمکن ہوں گے۔

مبارک شاہ خلجی اپنے آپ کو "خلیفۃ اللہ"، "امام الاعظم خلیفۂ رب العالمین" کہتا تھا۔ دہلی کا نام "بیت الخلافت" اور "دار الخلافہ" ہو گیا۔ اُس کے عہد میں تدریجاً تمام سلطنت میں طوائف الملوکی اور بدامنی پیدا ہو گئی اور مسیحی کلیسیا جیسی امن پسند اور صلح کُل اقلیت محض طوائف الملوکی کا شکار ہو کر تباہ ہوتی گئی ہوگی۔

خسرو خاں مبارک خلجی کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ مؤرخ برنی اُس کو "برادر بچہ بد اصل" کہتا ہے۔ امیر خسرو اس کو "برادو" بتلاتا ہے جو غالباً ہندوؤں کی کوئی نیچی ذات تھی اور مسلمان ہونے سے پہلے وہ اس ذات کا تھا۔ بادشاہ ہوتے ہی اُس نے اسلام کی جڑوں پر کلہاڑا مارنا شروع کیا۔ برنی لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "دہلی پھر ہندوانہ ہو جائیگی اور مسلمانی ختم اور کمزور پڑ جائیگی"۔ اس کے قبیلہ کے ہندو عام مسلمان عورتوں اور لونڈیوں کو اپنے قبضہ میں لے آتے تھے۔ ہندو ایسے غالب ہو گئے کہ انہوں نے مسجدوں کی محرابوں میں بت رکھ دیئے جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو بڑے اور اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا۔ اور حکم دے دیا کہ تمام سلطنت میں گائے ذبح نہ کی جائے۔ اگر کوئی پکڑا جاتا تو اُس کو اُسی کی گائے کی

کھال میں سلوا کر جلا دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ بغاوت ہو گئی اور تغلق خاندان کا **غیاث الدین** دہلی کا سلطان بن گیا اور ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ وہ خود پکا مسلمان تھا اور لواطت کا دشمن تھا پس وہ اپنے امرا کے بیٹوں اور خوبصورت غلاموں کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا۔ چنانچہ برنی کہتا ہے کہ "شاید سلطان غیاث الدین نے کبھی زنا نہ کیا"۔ اس کا باپ قرونہ ترک تھا اور اس کی ماں پنجاب کی ہندو عورت تھی لیکن وہ خود کٹر مسلمان تھا اور شریعت اسلام پر سختی سے پابند تھا وہ علمائے فضلاء اور مشائخ کا بڑا قدردان تھا پس اس کے عہد میں علما اور فضلا کی منزلت بڑھ گئی۔ وہ شیخ سراج الدین اور شیخ نجم الدین دمشقی جیسے اصحاب کی مجلسوں اور حلقۂ درس میں جاتے اور ان کے علم و فضل سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اس کے مذہبی تعصب کی وجہ سے ہندوؤں سے حسب معمول توہین کا برتاؤ ہوتا رہا۔ اس نے حکم دیا کہ اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ ہندوؤں کے پاس اس قدر زیادہ مال نہ ہو کہ وہ گستاخ ہو جائیں اور نہ اس قدر کم ہو کہ وہ اپنی زمینوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور تجارت کا خاتمہ ہو جائے۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ جب مقتدر اکثریت کا یہ حال تھا تو غریب مسیحی اقلیت کی کس مپرسی کی حالت کیا ہوگی۔

(۲) محمد بن تغلق (از ۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء)

تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں دہلی کے بادشاہوں کے خاندانوں میں کوئی نہ کوئی بادشاہ زبردست گزرا ہے۔ چنانچہ خاندان غلاماں میں بلبن۔ خاندان خلجی میں علاؤالدین اور خاندان فیروزہ (تغلق) میں محمد بن تغلق

زبردست سلاطین تھے۔ تاریخ ہند میں محمد بن تغلق کا شمار عظیم بادشاہوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ تمام سلاطین دہلی سے زیادہ عالم اور باکمال سلطان تھا۔ قدرت نے اس کو بلا کا حافظہ عطا کیا ہوا تھا اور وہ ہر قسم کے علم و فن کو اس طرح اپنا لیتا تھا کہ سب دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ ایک ماہر خوشنویس تھا۔ اور نہ صرف فارسی شعرا کا کلام اس کو حفظ تھا بلکہ وہ خود بھی زبردست شاعر تھا۔ منطق۔ ریاضی۔ نجوم۔ طبعیات اور یونانی فلسفہ میں ایسی دسترس رکھتا تھا کہ اچھے اچھے عالم اس سے بحث کرتے گھبراتے تھے۔ برنی کہتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا ارسطو تھا۔ ابن بطوطہ (از ۱۳۳۳ء تا ۱۳۴۲ء) بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کی فلسفیانہ طبع ہر بات کی تحقیق کرنا چاہتی تھی۔ گو اس کا اعتقاد اسلام میں پختہ تھا لیکن اس کو یہ اعتقاد شکوک و شبہات۔ بے دینی اور الحاد۔ مسائل دین اور فقہ کی تحقیق اور جستجو کے بعد حاصل ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ عقلیت پسند تھا۔ اگر اس میں جلد بازی اور انتقام کی عادت نہ ہوتی اور وہ صبر و تحمل سے کام لیا کرتا اور مردم شناس اور مزاج شناس انسان ہوتا تو وہ ہندوستان کا بہترین سلطان ہوتا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اس نے شیخ شہاب الدین کو کہا کہ "عقل ختم نبوت کے عقیدہ کو تسلیم نہیں کر سکتی"۔ اس پر اس مسلمان عالم کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے سلطان کے منہ پر اپنا جوتا مارا۔ سلطان نے اس کو قلعہ کے اوپر سے خندق میں پھینک دیا۔ ناظرین پر اس ایک مثال سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ سلطان نے دینی اور دنیاوی علوم کا وسیع مطالعہ کیا ہوا تھا اور ہر بات میں تحقیق سے کام لیتا تھا۔ اس کو قرآن حفظ تھا اور نماز روزہ کا سخت پابند تھا۔ حتیٰ کہ بیماری کے ایام میں بھی روزہ قضا نہ کرتا تھا اور معمولی سی

معمولی بات میں بھی احکامِ شریعت کو نگاہ میں رکھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ ظالم سنگدل اور انتقام لینے والا شخص تھا جو اُس کے خیالات سے اتفاق نہ کرتا وہ اُس کو بے دریغ قتل کر دیتا تھا۔ اُس کی بے رحمی کا اندازہ اِس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے ہاتھیوں کے سامنے پھینک دیتا تھا جن کے دانتوں میں خنجر لگے ہوتے تھے۔ ہاتھی اُن کو ہوا میں اُچھال اُچھال کر پاؤں تلے روند ڈالتے تھے۔ پھر وہ اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا تھا۔ اُس نے اپنے بھتیجے کی کھال اُتروا دی، اور اُس کو زندہ آگ میں کباب بنا کر اُس کے گوشت کو اُس کے خاندان کے پاس بطور تحفہ بھیج دیا!

مسلمان سلاطین احتساب کو ایک مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ پس جہاں جہاں نو مسلموں کی آبادی ہوتی یا مسلمانوں کی نو آبادیاں ہوتیں وہاں قاضیوں اور محتسبوں کو سلاطین مقرر کر دیا کرتے تھے۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں ایک عہدہ قاضی القضاۃ کا تھا اور ایک عہدہ شیخ الاسلام کا تھا۔ پہلے کا کام مقدمات کی سماعت کرنا اور احکام سزا وغیرہ دینا تھا لیکن دوسرا صرف قاضی ہوتا تھا جو شرع کے مطابق مسائل طے کیا کرتا تھا۔ ایک عہدہ محتسب کا بھی تھا۔ ان عہدہ داروں کو فیاضی سے جاگیریں اور ہزاروں ٹنکے دیئے جاتے تھے۔ صرف دہلی میں دو ہزار مسجدیں اور ایک ہزار مدرسے تھے۔ وہ اسلامی اُخوت و مساوات کا اس قدر قائل تھا کہ ابو الصفا عمرو بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس نے خود دیکھا کہ سلطان ایک فقیر کے جنازے کو کاندھا دیئے ہوئے تھا۔ اُس کے زمانہ میں اُس کے تین مؤرخ گذرے ہیں لیکن اُن میں سے ہر ایک کے مذہبی خیال سلطان سے مختلف تھے جس کی وجہ سے اُن کی تاریخیں مشتبہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ برنی سترہ سال سے زیادہ اس کا ندیم رہا۔ لیکن سلطان عقلیت پسند

تھا اور سیاسی انقلابی خیال رکھتا تھا۔ اسلامی مساوات کے اصول کی بناء پر اُس نے حسب و نسب کے تمام امتیازات مِٹا دیئے اور ہر شخص کو سرکاری ملازمت میں لے لیا لیکن یہ باتیں برنی کو پسند نہ تھیں۔ ابن بطوطہ دہلی کا قاضی تھا لیکن وہ بیزار ہو کر دہلی سے معبر چلا گیا جہاں اُس نے باغی حکمران جلال الدین کی سالی سے بیاہ کر لیا۔ تیسرا مؤرخ عصامی تھا جو سلطان سے نفرت رکھتا تھا۔ سلطان کے مذہبی تصورات میں تصورِ خلافت کو ایک مرکزی جگہ حاصل تھی کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ خلافت سے رابطہ رکھے بغیر دینی اور سیاسی زندگی کی تنظیم نہیں ہو سکتی پس جب ۱۳۴۳ء میں اُس کو خلیفہ کا منشور حاصل ہوا تو اُس نے قرآن اور مشارق الانوار سامنے رکھ کر لوگوں سے بیعت لی۔ وہ نماز با جماعت پر اِس قدر زور دیتا تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا تھا اُس کو سخت سزا دیتا تھا۔ ایک روز اُس نے نو آدمی اسی قصور پر قتل کروا دیئے اس نے متعدد اشخاص مقرر کر رکھے تھے جو ایسے مسلمانوں کو پکڑ لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بازاروں میں چلتے پھرتے نماز یاد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ناچنے والی عورتیں بھی نماز کی پابند ہو گئیں! دہلی کے سلاطین میں وہ پہلا شخص تھا جس نے نماز کے سلسلہ میں احتسابی کارروائی کی۔ شاہی خاندان کی ایک عورت زنا کی مرتکب ہوئی تو سلطان نے اُس کو بے تامّل سنگسار کر دیا۔

محمد تغلق نے چند ایسے ٹیکس لگائے جو شریعت کے چار ٹیکسوں یعنی خراج۔ زکوٰۃ۔ جزیہ اور خمس کے علاوہ تھے۔ اُس نے ہندوؤں میں ستی کی قبیح رسم کو حکماً بند کر دیا جو چودھویں صدی میں ہندوستان کے طول و

عرض میں مروّج تھی۔ اُس نے چند ہندوؤں کو اعلیٰ ملازمتوں پر بھی رکھا کیونکہ وُہ جانتا تھا کہ چتوڑ اور رنتھمبور جیسے حصین قلعوں کو قابو میں رکھنا آسان بات نہ تھی۔ ابن بطوطہ بتلاتا ہے کہ ایک ہندو رتن نام مالیات کا ماہر تھا جس کو سلطان نے ملازم رکھا تھا۔ اگرچہ سلطان بے درد تھا لیکن وُہ بےحد درجہ کا انصاف پسند شخص تھا۔ محکمۂ قضاۃ کی تفصیلات کو وُہ خود دیکھتا تھا اور اگر کوئی فیصلہ سلطان کے خیال کے مطابق نہ ہوتا اور حق ہوتا تو وُہ اُس کو بلا تامل قبول کر لیتا تھا۔ اُس کا بھائی مبارک خان دیوان خانہ میں قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مقدمات میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مبارک خان "میر داد" کا عُہدہ رکھتا تھا۔ اُس کا یہ کام تھا کہ بڑے سے بڑے اُمرا کو جن سے قاضی بھی خائف تھے عدالت میں حاضر کرے۔ پس جب کبھی کوئی مُلّا یا شیخ یا سیّد فساد پر آمادہ ہوتا یا بیت المال میں غبن کرتا تو اُس کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

سلطان اس بات کا بڑا آرزومند تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تمدن کی ترقی ہو۔ اسی بات کو زیرِ نظر رکھ کر اُس نے حکم دیا کہ دہلی کی مسلم آبادی جنوبی ہند میں رہائش اختیار کرے۔ اُس نے شمالی ہند کی تمدنی اور مذہبی زندگی کو جنوبی ہند میں منتقل کیا کیونکہ وُہ خیال کرتا تھا کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہوگی یا کم ہوگی وہاں نہ تو سیاسی نظام کی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور نہ اسلام کی اشاعت ہوگی۔ پس اُس نے علماء اور مشائخ کو ایسے دُور دراز علاقوں میں بھیجا جہاں مسلمانوں کی آبادی کم تھی۔ بڑے بڑے علماء کو حکم دیا کہ وُہ زیادہ تعداد میں دکن میں رہ کر تبلیغِ اسلام کریں اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسلام کے حلقہ بگوش بنائیں۔ اُس کی یہ تجویز اشاعتِ اسلام کی منظم

کوشش تھی۔ انہی ایام میں اُس نے حکم دیا کہ دہلی اور دیگر شہروں اور قصبوں کے عُلما وہاں حاضر ہوں۔ ایک بڑا خیمہ نصب کیا گیا اور سلطان نے منبر پر چڑھ کر مسلمانوں کو ترغیب دی کہ کفار کے ساتھ جہاد کیا جائے۔ دکن کے علاوہ سلطان نے ہندوستان کے دیگر حصّوں میں بھی عُلماء کو تبلیغِ اسلام کے لئے بھیجا۔ چنانچہ اُس نے شمس الدین یحییٰ کو کہا "تیرے جیسا عالم یہاں کیا کر رہا ہے۔ تُو کشمیر کو چلا جا اور وہاں کے بُت خانوں میں جا کر خلقِ خدا کو اسلام کی دعوت دے۔ (رہبر الاولیا صفحہ ۲۸۸) ہندوستان کے مؤرّخ اور دیگر اسلامی ممالک کے مؤرخ بھی لکھتے ہیں کہ سلطان محمد بن تغلق نے اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی جدّوجہد کی۔ اور اُس کی کوششوں سے اسلام ہندوستان کے دُور و دراز حصّوں میں پھیل گیا۔ سلطان عام مسلمانوں کی دینی تعلیم کا خاص خیال رکھتا تھا۔ مکتبوں میں ہزاروں فقہا مقرّر تھے جو بچّوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ چنانچہ صرف ایک شہرِ دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے جن میں سے ایک شافعی مذہب کا تھا اور باقی حنفی مذہب کے تھے۔

(۲)

محمد بن تغلق کے زمانہ میں مغربی کلیسیا کے بعض مبلّغین تبریز سے [illegible] جانے کے لئے روانہ ہوئے لیکن بادِ مخالف نے اُن کے جہاز کا رُخ بدل دیا اور وُہ سالسٹ (بمبئی) جزیرہ کے ایک مقام تھانہ میں جا نکلے۔ یہ مغربی کلیسیا کے ابتدائی مبلّغین میں سے تھے۔ ان میں سب سے مشہور نام پادری جورڈینس (JORDANUS) کا ہے جو ڈومینک کی جماعت کا راہب یا درویش تھا۔ اُس نے ایک کتاب "مرابلیا" (MIRABILIA) لکھی ہے اور اُس کے دو خطوط بھی موجود ہیں۔ اُس نے اکتوبر ۱۳۲۱ء میں

فرانسسکی اور ڈومینکن جماعتوں کے پادریوں کو جو ایران میں مقیم تھے لکھا اور کہا کہ ہندوستان مسیحی تبلیغی مساعی کے لئے ایک عمدہ اور زرخیز کھیت ہے اور ان کو یہ صلاح دیتا ہے کہ وہ سورت، بڑوچ اور کوئلن میں مبلغین بھیجیں۔ دوسرے خط میں (جو اس نے جنوری ۱۳۲۴ء کو لکھا) وہ ان کو بتلاتا ہے کہ وہ اپنے چار ہمراہی فرانسسکی راہبوں کے ساتھ بادِ مخالف کی وجہ سے تھانہ میں ہے۔ تھانہ میں اُن دنوں پندرہ نسطوری مسیحی خاندان بستے تھے۔ انہوں نے پادری جورڈینس کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ ان کو کسی مسیحی پادری کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ان مسیحیوں سے اُس کو معلوم ہوا کہ سوفیر اور بڑوچ میں مسیحی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ اس پر وہ اپنے چاروں ہمراہیوں کو تھانہ میں چھوڑ کر بڑوچ کی جانب چل پڑا۔ لیکن وہ ابھی سورت تک ہی گیا تھا کہ اس نے سنا کہ اس کے ساتھیوں کو قید کر لیا گیا ہے۔ پس وہ فی الفور اُن کی مدد کو واپس چلا گیا۔ لیکن اُس کے واپس تھانہ پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ساتھی شہید کر دیئے گئے تھے۔ تھانہ پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ اس شہر میں ایک شخص یوسف کٹر اور متعصب مسلمان تھا جو سانتز سے آیا ہوا تھا۔ اس نے گورنر کو اطلاع دی کہ یہاں چار مسیحی مبلغ انجیل کی تبلیغ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ گورنر نے ان کو طلب کیا۔ جورڈینس لکھتا ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یورپ کے رہنے والے ہیں اور درویش ہیں۔ ہم مقدس توما کے مزارِ مبارک کی زیارت کرنے جا رہے تھے لیکن بادِ مخالف نے ہمارے جہاز کا رخ بدل کر ہمیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ جب ان کے ایمان کی نسبت ان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم خدا کے فضل سے مسیحی

ہیں اور انہوں نے بڑے جوش سے مسیحی نجات کا پرچار کیا۔ اس پر گورنر نے کہا کہ ان سے کوئی خلافِ قانون حرکت سرزد نہیں ہوئی اور ان کو چھوڑ دیا۔ لیکن یوسف کے کہنے سننے سے وہ پھر قید کر لئے گئے اور پھر گورنر کے حضور پیش کئے گئے۔ اس مرتبہ وہاں کا قاضی بھی موجود تھا اور گورنر کے پاس بیٹھا تھا۔ تھانہ کے بہت سے مسلمان اور بت پرست بھی تماشہ دیکھنے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ قاضی نے ان سے مناظرہ کرنا چاہا اور سوال پوچھا کہ تم جب حضرت مسیح کو ابنِ مریم تسلیم کرتے ہو تو پھر وہ ابن اللہ کیسے ہوا؟ جب اس سوال کا جواب خاطر خواہ دیا گیا تو قاضی نے چاہا کہ ان کو باتوں میں پھنسائے۔ پس اس نے سوال کیا کہ تم حضرت محمد کی نسبت کیا کہتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم محمد کی باتیں نہیں سناتے بلکہ خداوند مسیح کی تعلیم سناتے ہیں۔ لیکن یہ جواب قاضی کے منشاء کے مطابق نہ تھا۔ پس اس نے ان سے سیدھا سوال کیا کہ تم پیغمبرِ اسلام کی بابت کیا کہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے تم کو صاف طور پر اپنا ایمان اور عقیدہ بتلا دیا ہے جو ہم خداوند مسیح، منجی جہان کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس سے تم خود ہی محمد کی نسبت نتیجہ نکال سکتے ہو۔ لیکن قاضی کے ارادوں کے لئے یہ جواب ناکافی تھا اور اس نے بانیٔ اسلام کی رسالت کے سوال کا صاف صاف جواب دینے پر بہت اصرار کیا۔ تب ان میں سے ایک کے منہ سے چند ایسے الفاظ نکل گئے جو مسلمانوں کو برے لگے۔ اس کا بولنا تھا کہ چاروں طرف سے غوغا بلند ہو گیا۔ چاروں پر موت کا فتویٰ دیا گیا اور حکم ہوا کہ ان کو شارع عام پر زندہ آگ میں جلا دیا جائے۔ آگ کی تپش اس قدر تھی کہ اس کے پاس بھی کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کو وہاں لے جایا گیا اور قاضی نے کہا کہ تم نے

کہا ہے کہ مسیحیت برحق مذہب ہے اور اسلام من جانب اللہ نہیں ہے۔ اگر تم اس بات پر خلوص دل سے ایمان رکھتے ہو تو آگ میں سے گذر جاؤ۔ اگر تم سچے ہوگے تو آگ تم پر سرد پڑ جائیگی۔ اور تمہاری بات ثابت ہو جائے گی۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ مسیح کی خاطر اس امتحان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں وہ خدا کی اور مسیح کی حمد و ستائش کے گیت گاتے ہوئے آگ میں کود پڑے تمام خلقت اس بات کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ گئی کہ آگ نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ یہاں تک کہ نہ اُن کے سر کے بال جلے اور نہ اُن کے جُبّے جلے۔ ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں اُن کو چھوڑ دو۔ لیکن قاضی نے ہجوم کو مخاطب کر کے کہا "آگ نے ان لوگوں پر اس واسطے اثر نہیں کیا کیونکہ ان کے جُبّوں کا کپڑا حضرت خلیل اللہ کے مُلک کا ہے۔ کلدیوں نے حضرت ابراہیم کو بھی آگ میں پھینک دیا تھا لیکن آگ کے شعلے پھول بن گئے تھے۔ ان کے جُبّوں کی وجہ سے آگ نے اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ اس پر اُن کے جُبّے اور کپڑے اُتار لیے گئے اور اُن کو مادر زاد ننگا کر کے دھکتی آگ میں پھینک دیا گیا لیکن آگ نے پھر بھی اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ اُن کے بال تک نہ جلے۔ اس پر گورنر نے اُن کو پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ جہاں تم چاہتے ہو چلے جاؤ۔ عوام النّاس ہر جگہ اس معجزہ کا چرچا کرنے لگ گئے اور لوگوں کے دلوں میں اسلام کی نسبت شبہات پیدا ہونے لگے۔ قاضی چند روز صبر کر کے گورنر کے پاس پھر گیا اور اُس کو درویشوں کے خلاف اُکسایا۔ اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ میں اُن کو کس طرح سزائے موت دے سکتا ہوں۔ قاضی نے کہا اگر یہ چند دن اور آزاد رہے تو یہاں کے لوگ مسیحی ہو جائیں گے اور اسلام کو زک پہنچے گی۔ گورنر نے جواب دیا کہ میں اُن پر کس بناء

پر اب نئے سرے سے مقدمہ چلاؤں۔ قاضی نے کہا کہ مقدمہ کرنے کی ضرورت نہیں کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ اگر کوئی شخص حج نہ کر سکے اور وہ ایک عیسائی کو جان سے مار دے تو اُس کو حج کے برابر ثواب مِلتا ہے اور خدا اُس کے اگلے پچھلے تمام گناہ مُعاف کر دیتا ہے۔ جب رات پڑ گئی تو فوج کے سپاہی بھیجے گئے اور انہوں نے تینوں برادران کو مکان کے باہر گھسیٹ کر ایک درخت کے نیچے شہید کر دیا۔ یہ دن ۱۸۳۱ء کے مقدس ہفتہ کی جمعرات کا روز تھا۔ اگلے روز چوتھا درویش بھی پکڑا گیا، اور مبارک جمعہ کے روز اُس کو شہید کیا گیا۔

جوزڈینس نے واپس تھانہ میں آکر شہیدوں کی لاشوں کو لیا اور سورت لے جا کر گرجا میں بڑے احترام سے اُن کو دفن کیا۔ اب وہ اکیلا رہ گیا تھا اور ہمیشہ مغموم رہتا تھا۔ لیکن وہ کبھی نا اُمیدی اور یاس کی دلدل میں نہ پھنسا۔ چنانچہ وہ جنوری ۱۸۳۲ء میں لکھتا ہے معزز باب۔ اب یہ درویش اکیلا رہ گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں میرا کوئی ساتھی نہیں رہا۔ اپنے ہمراہیوں کی شہادت کے بعد دس دن کے اندر میں نے نوّے شخصوں کو بپتسمہ دیا ہے۔ میں اب تک بیس اشخاص کو تھانہ میں اور ۳۵ کو سفا میں بپتسمہ دے چکا ہوں۔ اس کے لئے مسیح خداوند کی حمد ہو۔ میں اب تھانہ اور اُس کے گرد و نواح میں اڑھائی سال سے اکیلا کام کر رہا ہوں۔ لیکن اب تک اس لائق نہیں خیال کیا گیا کہ اپنے مُبارک ساتھیوں کی طرح تاج شہادت حاصل کروں۔ گو میں نے بے اندازہ مصیبتیں جھیلی ہیں۔ بحری ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پڑا ہوں مسلمانوں کے قید خانوں میں صرف ایک قمیض میں کئی دن رات کاٹے ہیں۔ ان کی طعن و تشنیع اور ہنسی ٹھٹھے کا نشانہ بنا رہا ہوں۔ میں نے بھوک، پیاس، سردی گرمی، غضب و عقوبت سب کچھ خوشی سے برداشت کیا ہے۔ میں تو مسیح کی خاطر ان سے بھی زیادہ بلکہ موت بھی

قبول کرنے کو تیار رہوں۔ افلاس کی وجہ سے مختلف جسمانی امراض کا شکار بھی رہا ہوں۔ پھر بھی مَیں نے ۱۳۰ مرد اور عورتوں کو بپتسمہ دیا ہے۔ اس واسطے دیگر برادران کو روانہ کریں تاکہ وہ صبر اور استقلال سے کام کر کے بپتسمہ یافتوں کو بچائے رکھیں اور وہ بپتسمہ سے الگ رہ کر خُداوند کے گیہوں کے کھتے میں جمع ہو جائیں۔ بُت پرستوں میں خُدا کا کلام بغیر کسی روک ٹوک کے سُنایا جاسکتا ہے اور تمام مشرقی ممالک میں بُت پرستوں کو بپتسمہ دینے اور لینے سے کوئی نہیں روکتا۔ اگر دو یا تین سَو محنتی درویش ایسے ہوں جو سرگرمی اور ایمان داری سے ہندوستان میں آکر انجیل جلیل کی اشاعت کریں تو مَیں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ ہر سال کم از کم دس ہزار انسان مسیحی ایمان کے جھنڈے کے نیچے لائے جاسکتے ہیں۔ ہائے افسوس! لاکھوں رُوحیں زندگی کے کلام کے بغیر تباہ ہو کر مر گئی ہیں اور اب بھی برباد ہو رہی ہیں۔ اِس دردناک حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُن میں خُدا کا کلام سُنانے والے موجود نہیں ہیں۔ اور جب مَیں سُنتا ہُوں کہ مسلمانوں کے واعظین روزانہ بُت پرستوں کو محمدی ایمان کی طرف لے جا کر گمراہ کر رہے ہیں تو مجھے سخت قلق اور رنج ہوتا ہے۔ ان کے واعظین تمام مشرق میں جگہ بہ جگہ دوڑتے پھر رہے ہیں تاکہ سب کو راہِ خُداوند (مسیحیت) سے منحرف کر دیں۔ یہی لوگ ہم پر ناحق الزام لگاتے ہیں۔ اور ہم کو جسمانی عقوبتیں اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں۔ ہم کو قید خانوں اور تیرہ و تاریک زندانوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اور سنگسار کرتے ہیں۔ یہ باتیں خود میرے تجربے میں آچکی ہیں۔ کیونکہ ان مسلمانوں نے مجھے چار دفعہ قید خانوں میں ڈالا ہے۔ اُنہوں نے بار بار میرے بال نوچے ہیں۔ اُنہوں نے متعدد بار مجھ کو کوڑے مارے ہیں۔ مجھے پتھراؤ کیا گیا ہے۔ صرف خُدا ہی جانتا ہے کہ اُنہوں نے کئے بار میرے ساتھ

یہ سلوک کیا ہے۔ مَیں تو ان کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ مَیں نے اپنے گناہوں کی وجہ سے اِن پے در پے سزاؤں کی برداشت کی ہے۔ مجھے صرف اِس بات کا افسوس ہے کہ مَیں اپنے چار ساتھیوں کی طرح اپنے ایمان کی خاطر شہید نہیں کیا گیا بلکہ ابھی تک زندہ ہوں لیکن خُدا کی مرضی پُوری ہو۔ میرے سامنے پانچ ڈومینیکی اور چار فرانسسکی (MINORITES) اپنے ایمان کی خاطر بڑے عذاب کے بعد شہید کئے گئے۔ ہائے مجھ پر افسوس کہ مَیں ان میں سے ایک نہ تھا۔" ۱۳۳۰ء میں جورڈینس سنوڈی ہندوستان کو قلن کا بشپ بنا دیا گیا۔ اس کا مستقر علاقہ کراچی سے شمالی مالابار تک تھا۔

مذکورہ بالا اقتباس سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مسیحی کلیسیا کو اسلامی سلطنت کے کونہ کونہ میں حقیر اور ذلیل اقلیت شمار کیا جاتا تھا اور اُس کے شرکا کو کیسی کیسی آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس اقتباس سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ کلیسیا کا حوصلہ ایسا ٹوٹ گیا تھا کہ اُس نے بُت پرستوں میں بھی انجیل کی تبلیغ کرنا بند کر دیا تھا۔ پردیسی کلیسیاؤں کے نظام نے اُس کے دم کو گھونٹ دیا۔ پردیسی بشپ اور مبلغ کم آتے تھے ہندوستانی کلیسیاؤں کی اپنی کوئی تنظیم نہ تھی۔ اُدھر حکومت ان کو ہر طرف سے مصیبتوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ تبلیغ و اشاعت کا کام کس کو سُوجھتا؟ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ کلیسیا پر روز بروز مُردنی چھا رہی تھی کیونکہ مسیحی نجات کی تبلیغ ہی کلیسیا کی زندگی کی رُوحِ رواں ہے۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ نسطوری پیٹریارک عبدیشوع نے حالاتِ وقت کو پیشِ نظر رکھ کر ہندوستان جیسے اور دیگر دُور دراز مقامات کے میٹرو پولیٹنوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ صدر مقام (بغداد) میں

کلیسیائی کونسلوں کے انعقاد کے وقت حاضر نہ ہوں تو وہ معذور سمجھے جائینگے لہٰذا ہم کو حیرت نہیں ہوتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے میٹروپولیٹنو اور بشپوں کے نام اُس زمانہ کی کونسلوں کی فہرست میں ہم کو نہیں ملتے۔ تاہم پیٹریارکوں کے خطوط میں اور نسطوری مؤرخوں کی کتابوں میں ہم کو کہیں کہیں ایسے مقامات ملتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے شمال۔ شمال مغرب اور مغرب کے علاقوں میں ان صدیوں کے دوران میں مسیحی بشپوں کے صدر مقام موجود تھے جن کے ماتحت کلیسیائیں ہندوستان میں بکثرت پائی جاتی تھیں گو ان کے اقتدار اور شمار میں روز بروز تنزل واقع ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر منگانا ہم کو بتلاتا ہے کہ روسی ترکستان کے صوبہ سیمیری چینسک (SEMIRY CHENSK) کے ایک قبرستان میں بعض قبروں کے کتبے ثابت کرتے ہیں کہ ان قبروں میں شمالی ہندوستان کے مسیحی مدفون کئے گئے تھے۔

رُومی کلیسیا بھی سلاطین دہلی کے ایّام میں اپنے مبلّغین مُلکِ ہند و چین کو بھیجا کرتی تھی۔ یہ مبلّغین تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں آتے تھے۔ ان میں سے پادری جورڈینس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ سنہ ۱۳۲۵ء میں رُومی کلیسیا کا پادری اوڈورک (ODORIC) اور سنہ ۱۳۲۹ء میں پادری جان ڈی مارگ نولی (JOHN DE MARIGNOLLI) سُلطان محمد بن تغلق کے عہدِ سلطنت میں ہندوستان آئے تھے۔

رُومی کلیسیا کے جو مبلّغ چین کو جاتے تھے وہ آتے جاتے وقت ہندوستان سے گذرتے تھے۔ ان میں سے بعض نے چند مدّت کے لئے یہاں قیام بھی کیا۔ مثلاً مانٹی کورونو کا پادری جان چودھویں صدی کے شروع (سنہ ۱۲۹۲-۹۳ء) میں تیرہ ماہ جنوبی ہندوستان رہا اور اُس نے قریباً ایک سَو اشخاص کو بپتسمہ

بھی دیا۔ لیکن یہ مبلّغین ہندوستان کی کلیسیا کا کوئی مفصّل حال نہیں لکھتے بلکہ صرف ضمنی طور پر ہی چند سطور لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً جان لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ان ساحلی علاقوں میں مسیحی بہت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں اور جو ہیں، وہ کسی قسم کا رسُوخ نہیں رکھتے۔ اور ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنوبی ہند میں اسلام کے تمدن کی داغ بیل محمد بن تغلق کے منصوبوں نے ڈالی اور اس کے بغیر بہمنی حکومت جو ڈیڑھ سَو سال سے زیادہ جنوبی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کا مرکز رہی، کبھی وجود میں نہ آ سکتی۔ ان منصوبوں اور منظم کوششوں کا اثر جنوبی ہند کی کلیسیاؤں کی زندگی پر پڑا۔ اب تک یہ کلیسیائیں امن اور چین سے رہتی تھیں اور بلا کسی قانونی مزاحمت کے مسیحیت کی تعلیم کا ہر جگہ آزادانہ پرچار کر کے ہر کس و ناکس کو منجئی عالمین کے قدموں میں لاتی رہتی تھیں۔ ہندو عام طور پر اُن کو صرف حقارت کی نظر سے ہی دیکھتے تھے لیکن جیسا ہم چند دوم میں بتلا آئے ہیں ہندو مت انجیل جلیل کی تعلیم سے متاثر ہو کر فرسودہ اور قدیم خیالات کو ترک کر کے اپنے عقائد کو مسیحیت کی روشنی کے مطابق کرنے کی جدّوجہد کر رہا تھا۔ باوجود ان کوششوں کے جنوبی ہندوستان کی مسیحی کلیسیائیں اقتدار اور شمار میں روز افزوں ترقی کرتی رہی تھیں لیکن اب سلطان علاؤالدین کی فتوحات نے جنوبی ہند کی راہ اشاعتِ اسلام کے لئے کھول دیا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کے منصوبوں نے اشاعتِ اسلام کی کوششوں کو ایک منظم صورت دے دی۔ اب جہاں جہاں اسلامی سلطنت جنوبی ہند میں پھیلتی شروع ہوئی اور جہاں جہاں علماء اور مبلّغ پہنچے وہاں کی کلیسیاؤں کے شمار و اقتدار میں فرق ہونا شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور "اما القتل و اما الاسلام"

کے اصول یہاں بھی کچھ حد تک کارفرما ہوتے لگے اور جس حد تک یہ اصول کارفرما ہوتے گئے اُس حد تک کلیسیاؤں کی زندگی پر اثر پڑتا گیا۔ اگر دجیا نگر کی طاقتور سلطنت کی رُکاوٹ اسلام کی راہ میں حائل نہ ہوتی تو تمام جنوبی ہند کا بھی وُہی حال ہو گیا ہوتا جو شمالی ہندوستان کا ہُوا تھا۔ اور جنوبی ہند کی کلیسیائیں بھی کمزور ہو کر اپنی زندگی سِسک سِسک کر کاٹتیں۔ لیکن دہلی کی سلطنت کے زمانہ میں دجیا نگر اور دیگر زبردست ہندُو راجدھانیوں کے راجاؤں نے ڈٹ کر اسلامی افواج کا مقابلہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلامی افواج کو صرف چند محدُود علاقوں میں ہی فتح نصیب ہُوئی اور جنوبی ہندوستان کی کلیسیائیں مقابلتاً کمزور اور ضعیف نہ ہُوئیں۔ اور ان کی ہستی معرضِ خطر میں نہ پڑی۔

جب محمد بن تغلق ۱۳۵۱ء میں فوت ہُوا تو اُس کی سلطنت میں ۲۳ صُوبے تھے جو شمال میں لاہور اور دہلی سے لے کر جنوب میں دوارا سمدر اور معبر تک اور مشرق میں لکھنوتی، بنگال اور اودھ سے لے کر مغرب میں ٹھٹھہ اور سندھ تک پھیلے ہُوئے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ اورنگ زیب کے وقت تک دہلی کی سلطنت کبھی ایسی وسیع نہ ہُوئی تھی۔ اِس وسیع سلطنت کے اِن صُوبوں کی کلیسیائیں بے بس و لاچار ہو کر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں جو اب ساڑھے تین سو سال سے اسلامی سلطنت کا حصّہ تھے لیکن جو صُوبے تازہ فتح ہُوئے تھے اور جن میں ابھی اسلامی حکومت مستحکم اور پائدار نہیں ہُوئی تھی وہاں کی کلیسیاؤں کی گو ترقی بند ہو گئی تھی لیکن وُہ کس مپرسی اور بیکسی کی حالت میں ابھی نہ تھیں۔

اور ہندوستان کے طُول و عرض میں جو کلیسیائیں اسلامی حملوں اور اسلامی حکومت کی زد سے بچی رہی تھیں وُہ ترقی کرتی رہیں اور آزادانہ بغیر کسی قانونی رُکاوٹ کے انجیل جلیل کا پیغام ہر خاص و عام کو پہنچاتی تھیں۔

محمد بن تغلق کے آخری ایام میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اُس کے حکام قدیم نمکخوار ملازم نہ تھے جو نسل کا لحاظ کر کے یا شاہانہ نظرِ کرم کی وجہ سے اُس کے وفادار رہتے۔ تُرک ختم ہو چکے تھے اور خلجی خاندان کے سلاطین نے اُس قدیم رابطہ کو توڑ دیا تھا جس کی بناء پر حکام ایک دُوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اب قرونہ خاندان برسرِ حکومت تھا جو نہ خالص تُرک تھا اور نہ خلجی تھا۔ یہ خاندان مخلوط النسل تھا۔ سلاطین کی مائیں ہندوستانی اور باپ تاتاری تھے۔ حکام بُعد کے قسمت آزما لوگ تھے جو پردیسی تھے۔ کوئی افغان تھا، کوئی ایرانی تھا، کوئی خراسانی تھا اور کوئی سوگونی مغل کا تھا۔ گو قاہرہ کے عباسی خاندان کے خلیفہ نے محمد بن تغلق کو فرمانروائے ہند تسلیم کر کے اُس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض کر دی تھی لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہُوا۔ یکے بعد دیگرے مختلف صُوبوں نے سر اُٹھایا اور سلطنت سے الگ ہوتے گئے۔ محمد تغلق کی موت کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور اس کی جگہ متعدد خود مختار ریاستیں نمودار ہو گئیں۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (از ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء)

فیروز تغلق کی ماں ابوہر کے بھٹی راجپوت راجہ رنامل کی بیٹی تھی، اور اُس کا باپ غیاث الدین تغلق کا بھائی رجب تھا۔ گو فیروز کی ماں ہندو زادی تھی لیکن خود کٹر مسلمان تھا اور ہر امر میں شریعتِ اسلام کا پابند تھا۔ تخت

پر قدم رکھنے سے پہلے اُس نے دو رکعت نماز وضو کر کے پڑھی اور سجدہ کر کے خدا سے دُعا مانگی۔ وہ ہر روز قرآن کی چند سُورتوں کی تلاوت کرتا تھا اور پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ وہ قرونِ وسطےٰ کے سلاطین میں سب سے زیادہ اسلام کا عاشق تھا۔ خلیفہ المعتضد باللہ کے دربار سے اُس کو حکومت کے تعیّن کا منشور حاصل ہُوا اور "سیف الخلافت" اور "قسیم امیر المومنین" کے خطابات عنایت ہوئے۔ فیروز نے حکم دیا کہ جن بادشاہوں کی مسلسل کوششوں سے ہندوستان فتح ہُوا تھا، اُن کے نام اور القاب عیدوں اور جمعہ کے خطبوں میں پڑھے جائیں۔

جتنا محمد تغلق بے رحم اور خونخوار تھا، اُتنا ہی فیروز تغلق رحم دل تھا۔ تخت نشینی کے بعد اُس نے ان تمام لوگوں کے وارثوں کو جن کو محمد تغلق نے سزائیں دی تھیں زر اور جاگیریں دے کر خوش کر دیا اور اُن سے معافی نامے لکھوا کر اُن سب کو ایک صندوق میں بند کر کے محمد تغلق کی قبر کے سرہانے رکھ دیا تاکہ "حق تعالےٰ اپنے کرم سے میرے مخدوم اور مربّی کو غریقِ رحمت کرے"۔ اُس نے ہر ممکن طور پر محمد تغلق کی غلطیوں اور خلافِ شرع باتوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ جن ٹیکسوں کا وصول کرنا قرانی احکام کے مطابق نہیں ہے وہ بیت المال میں جمع نہ کئے جائیں اور اُس نے قریباً تئیس ٹیکس معاف کر دیئے۔ مالِ غنیمت کا تناسب پھر قرآن کے مطابق کر دیا گیا کیونکہ اب تک لوٹ کا ۴/۵ حصّہ بیت المال میں داخل ہوتا اور ۱/۵ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا۔ اُس نے ۴/۵ حصّہ سپاہیوں کا اور ۱/۵ بیت المال خمس کا حصّہ شرع کے مطابق کر دیا۔ اُس نے حکم جاری کیا کہ جو لونڈیاں پُرانی رسم کے مطابق خمس میں سے خریدی جائینگی اُن کے بچے جائز اولاد شمار نہ کئے جائینگے۔

احکامِ شرع کے مطابق محلات پر جو تصاویر اور نقش تھے وہ سب مٹا دیئے گئے۔ ریشمی لباس کا پہننا ممنوع ہو گیا اور سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال بند کر دیا گیا۔ تلواروں اور ہتھیاروں کے قبضوں کا زر و جواہر سے مرصع ہونا موقوف ہو گیا۔ زین۔ لگام۔ خیمے۔ پردے اور کرسیوں کے نقش محو کر دیئے گئے۔

فیروز نے بے شمار پُرانی مسجدوں کی مرمّت کی اور نئی مسجدیں بنوائیں۔ جہاں خانقاہوں میں سناٹا ہوتا تھا اب قرآن خوانی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سلطان مزاروں کی زیارت کرنے جاتا تھا۔ اُس نے پُرانے مزاروں کی مرمّت اور نئے مزار تعمیر کرائے۔ نظام الدّین اولیا کے مقبرے کے دروازے اور جالیاں صندل کی بنوائیں اور وہاں سونے کی زنجیروں میں سونے کی قندیلیں لٹکائیں۔ وہ مشائخ اور فقرا سے ایسی عقیدت رکھتا تھا کہ اُس نے ۳۶ لاکھ تنکے کے وظائف اور ایک کروڑ تنکہ مالیت کی زمین اُن کو دے دی۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُمرائے سلطنت نے بھی ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مسجدیں اور مزاریں بنوائیں۔

فیروز کی سلطنت "حکومتِ الٰہی" کے اصولوں پر مبنی تھی جس کا ذکر ہم پہلے سیکشن کے باب دوم میں کر آئے ہیں۔ اورنگ زیب سے پہلے کسی بادشاہِ دہلی کے زمانہ میں فیروز شاہ اور سکندر لودی کے سوا مُلک ہند کو اس سختی اور پابندی کے ساتھ قرآنی احکام اور شریعت کے ماتحت نہیں کیا۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں دیوانِ شرع کی اہمیّت اور اُس کے اختیارات کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صدر صدور شرعی معاملات میں مُطلق العنان حاکم تھا جس کے احکام الٰہی احکام کا درجہ رکھتے تھے۔

فیروز شاہ کتاب "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں بدعت اور بُت پرستی کے

استیصال پر فخر کرتا ہے۔ اُس نے غیر مسلموں کی عبادت کی جگہوں کو مسمار کر کے اُن کی جگہوں پر مسجدیں بنوائیں۔ شرع کے مطابق نئے گرجاؤں اور نئے مندروں کا بنانا جائز نہ تھا۔ کوہانہ میں ہندوؤں نے ایک نیا مندر تعمیر کر دیا تو وہ کہتا ہے "وہ لوگ قید ہو کر ہمارے رُوبرُو لائے گئے۔ ہم نے حکم دیا کہ عوام کو اُن کی شرارت کی اطلاع دی جائے اور پھر اُن کو برسرِ عام قتل کر دیا جائے۔ اُن کی پُستکوں اور اُن کے بُتوں کو سب کے رُوبرُو آگ میں جلا دیا جائے تاکہ سب لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ کوئی ذمّی ایک اسلامی مُلک میں اس قسم کی شرارت نہیں کر سکتا۔" فیروز ہر ممکن طور پر کوشش کرتا تھا کہ غیر مسلم اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے "ہم کو یہ توفیق ملی کہ اہلِ ذمہ کو دینِ حق کی ترغیب دیں۔ پس ہم نے اعلان کر دیا کہ کافروں میں سے جو کوئی بھی کلمہ پڑھے اور اسلام قبول کرے اُس کو جزیہ مُعاف ہو گا۔ جب یہ اعلان لوگوں کے کانوں تک پہنچا تو ہندوؤں کے گروہوں کے گروہ آنے لگے اور وہ مشرف بہ اسلام ہوتے گئے" (فتوحاتِ فیروز شاہی صفحہ ۱۶-۱۷)۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے اعلانوں کا اثر مسیحی کلیسیا کے نادار اور ذلیل ممبروں پر کس قدر بڑا ہو گا اور کتنے کمزور ایمان والے ان سے متزلزل ہو گئے ہوں گے اور اس دُنیا کی محبت اور انعام و اکرام کے لالچ نے کتنوں کو مسیحیت سے رُوگرداں کر دیا ہو گا۔ غیر مسلموں کو یہ ترغیب بھی دی جاتی تھی کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے تو اُن کو اچھے عہدوں پر فائز کر دیا جائے گا۔ مسیحیوں کا واسطہ ہر روز مُسلمان حکام سے پڑتا تھا جن کے اثر، رسوخ، حرصِ جاہ اور حسد کی وجہ سے بہتوں کے ایمان لڑکھڑا گئے ہوں گے۔ ان پر سماجی اور سیاسی دباؤ تھا۔ بہت سے مُسلمان عورتوں سے نکاح کر کے مسلمان ہو گئے ہوں گے اور

بعض خانگی معاملات سے بیزار ہو کر اسلام کی آغوش میں چلے گئے ہوں گے۔ دیگر شرعی احکام کی طرح شریعتِ ارتداد کے قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ ایک برہمن کی نسبت لکھا ہے کہ اُس نے ایک مسلمان عورت کو ہندو بنا لیا۔ فیروز شاہ نے اُس کو بُلا کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن برہمن نے صاف انکار کر دیا۔ سُلطان نے اُس کو شاہی محل کے سامنے زندہ جلا دیا۔ اسی طرح نواہوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ واضح طور پر دینِ اسلام کا اقرار کریں جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اُن کو شریعتِ ارتداد کے مطابق قتل کر دیا گیا۔ ایسے حالات میں اُن مسیحیوں کا جو اسلام قبول کر چکے تھے واپس کلیسیا میں آنا ایک ناممکن امر تھا۔ سُلطان شرعی معاملات میں اس قدر جوشیلا تھا کہ وہ عُلما اور مشائخ کے فتووں پر عمل کر کے اُن سب کو سخت عذاب دیتا تھا جو رافضی اور بدعتی تھے۔ یُوں اُس نے رافضیوں، خارجیوں اور جبریہ، قدریہ وغیرہ سب کا انسداد کر دیا۔ وہ شیعوں کا دشمن تھا۔ اُس نے اُن کو قتل کروا دیا اور جو کٹر شیعہ تھے اُن کو سزا، تہدید اور تشہیر کی سزا دی۔ اُس نے شیعہ کی کتابوں کو جلا دیا "یہاں تک کہ خدا کے فضل سے اس فرقہ کا فتنہ بالکل دفع ہو گیا۔" جب ایک شخص رکن الدین مہدی نے آخر الزمان ہونے کا دعویٰ کیا تو سُلطان نے ہر خاص و عام کو جمع کر کے سب کے سامنے اُس کی کھال اُتروا دی اور اُس کے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور ایک ایک ہڈی توڑ ڈالی۔ سب مہدیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

اس قسم کے سُلطان سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسیحی کلیسیا کو چین سے رہنے دیتا۔ کلیسیائیں پہلے ہی بے بس تھیں۔ وہ اُس کے عہد میں اور بھی کمزور و بے زبان ہو گئی ہوں گی۔ اور افلاس کے مارے تنگ دست ہو کر

اپنی زندگی گذارتی ہوں گی۔ اُن کے لئے ملازمت کے دروازے بند تھے کیونکہ سُلطان نے کسی غیر مُسلم کو حکومت کے عہدے نہ دیئے۔ سلطنتِ دہلی کی تاریخ میں اُس نے پہلی مرتبہ برہمنوں پر بھی جزیہ لگا دیا۔ یہ حکم عُلماء اور مشائخِ اسلام سے فتوے حاصل کرنے کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ تمام مُلک میں اِس حکم سے کھلبلی مچ گئی۔ برہمنوں نے بھُوک ہڑتال کر دی۔ آخر کار ہندوؤں نے اُن کے جزیہ کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔

باوجود اِس کے اسلامی جوش کے سُلطان فیروز علم پرور شخص تھا۔ گو وہ بُت و بُت پرستی سے سخت نفرت رکھتا تھا اور اُس نے جگناتھ کے بُت کو زمین سے اکھڑوا کر بے حُرمت کر دیا تھا لیکن جب اُس نے نگر کوٹ کا قلعہ فتح کیا اور وہاں کا کُتب خانہ اُس کے ہاتھ آیا تو اُس کے حُکم سے ایک فلسفہ کی کتاب کا سنسکرت سے ترجمہ کر دیا گیا جس کا نام "دلائلِ فیروز شاہی" رکھا گیا۔ چند اور سنسکرت کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ برنی نے اُس کے زمانہ میں تاریخ لکھی اور اختیار برمکیاں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اُس نے "فتاویٰ جہانداری" بھی لکھی جس میں سے ہم آگے چل کر اقتباس کرینگے۔ سُلطان فیروز علمِ تاریخ کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُس نے راجہ اشوک کی ایک لاٹھ "مینارِ زریں" کو بالائی جمنا سے نکلوا کر فیروز آباد (دہلی) کی مسجد میں گاڑ دیا۔ ایک اور لاٹھ کو میرٹھ سے منگوا کر دہلی کی پہاڑی پر لگا دیا۔

فیروز جنگ اور خُونریزی سے نفرت کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سلطنت دہلی کے مختلف صُوبے سرکش ہوتے لگے۔ لیکن اُس کا وزیر مقبُول خاں نہایت دانا شخص تھا جو تلنگانہ کے ہندوؤں میں سے مُسلمان ہو کر اس درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ سُلطان نے اُس کو "خانِ جہان" کا خطاب دے دیا۔ اگرچہ وہ

بہت لکھا پڑھا شخص نہ تھا لیکن نہایت ہوشیار اور دانش مند تھا۔ اس وزیر کی دو ہزار حریمیں اور کنیزیں تھیں جن میں یُونانی حُور زمیں تھیں۔ عیسائی بھی تھیں اور چینی بھی تھیں۔ اس وزیر کی حکمتِ عملی نے سُلطان کی رہی سہی سلطنت کو بچا لیا۔ سُلطان فیروز کو خود غُلاموں اور لونڈیوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اُس کو بے شمار غلام اور لونڈیاں تحفہ کے طور پر بھی ملتی تھیں۔ یہ اس کثرت سے تھے کہ صُوبہ میں ان کا شمار دو لاکھ چالیس ہزار ہو گیا تھا۔ سُلطان نے ان کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا تھا جس کے باقاعدہ دیوان، خزانچی، محاسب اور وزیر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سلطنت کی بُنیاد غلاموں پر ہو گئی جن سے سُلطان مُلکی اور فوجی خدمت لیا کرتا تھا۔ غلاموں کا طبقہ روز بروز طاقت پکڑتا گیا۔ اس طبقہ کی ایک بڑی تعداد غیر مُسلم غُلاموں اور لونڈیوں کی تھی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جو مُسلمانوں کے گھروں میں رہتی تھیں اور مُسلمان بچوں کی مائیں ہو گئی تھیں۔ غلاموں میں سے بعض جاگیر دار ہو گئے۔ فیروز کی مَوت (۱۳۸۸ء) کے بعد یہ نو مُسلم جاگیردار غلام اور ہندو راجے خود مختار ہونے شروع ہو گئے۔ پہاڑی علاقوں کے اور دُشوار گذار صُوبوں کے ہندو راجا ہر جگہ سرکش ہو کر خُود مختار ہو گئے اور مُلک میں پھر طوائف الملوکی کا دَور دَورہ ہو گیا۔ یہ دَور سُلطان کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی جیسا ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ اس کو خان جہان کی پیش بندیوں نے چندے روکے رکھا تھا۔ چنانچہ سُلطان کی زندگی ہی میں اوڑیسہ میں ایک مسیحی بادشاہت قائم ہو گئی تھی اور ۱۳۷۵ء کے کیٹلین (CATALAN) نقشہ میں اوڑیسہ کے ایک مقام کی نسبت یہ نوٹ درج ہے "یہاں سٹیفن بادشاہ حُکمران ہے"۔

فیروز شاہ کی حکومت کے دوران میں یورپ کے ممالک کے سیاح اور پادری
جو ہندوستان میں آئے وہ ہم کو بتلاتے ہیں کہ مسیحی اس ملک کے طول و
عرض میں تھے لیکن دور و دراز مقامات میں رہتے تھے اور جاہل تھے
اور عموماً مسیحی عقائد سے ناواقف تھے۔ پس کوئی جائے تعجب نہیں کہ
وہ اقتصادی حالات۔ سیاسی دباؤ اور ملک کے اسلامی قوانین کے ہاتھوں
تنگ آکر جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے ہوں اور شاہی انعام و
اکرام سے مالا مال ہو کر خانِ جہان کی طرح اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے ہوں
جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے اسلامی حکومت کے قیام نے قانوناً اور عملاً
ذات پات اور دیگر امتیازات مٹا دیئے جو ہندوستان میں صدیوں پہلے
سے چلے آتے تھے۔ اگرچہ مسیحیت اور مسیحی مبلغین ملک میں موجود تھے لیکن
وہ صرف پند و نصیحت سے ہی کام لے سکتے تھے۔ وہ قوانین نافذ کر کے
ملک کے رسوم و رواج کو بدل نہیں سکتے تھے لیکن اسلامی حکومت کے
سیاسی نظام میں ہندوؤں کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی حیثیت برابر ہو گئی۔
شریعت کی نظر میں چھوٹے بڑے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہمن اور شودر سب
کے سب ہندو ہی تھے اور سب سے بلا امتیازِ ذات ایک ہی قسم کا سلوک
کیا جاتا تھا۔ اسلامی حکومت سے پہلے بڑی ذاتوں کے ہندو شہر کی
فصیل کے اندر رہتے تھے اور اچھوت ذات کے لوگ فصیل کے باہر ہی
بود و باش کر سکتے تھے۔ اسلامی حکومت نے یہ تمیز ختم کر دی۔ جو لوگ ہندوؤں
اور عیسائیوں میں سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے وہ اوروں سے
اونچے اور اعلیٰ شمار کئے جاتے تھے۔ ملیچھ اور ناپاک شمار ہونے کی بجائے وہ اسلامی
برادری میں شمار کئے جاتے تھے۔ اسلامی حکومت میں شہر کی فصیل ذاتوں کو

جدا کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ شہر کی حفاظت کا وسیلہ بن
گئی تھی۔ اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ نومسلم ترکوں۔ افغانوں اور
سیّدوں کے ساتھ اخوت و مساوات کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے
لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ وہ ہندوستان کے سماجی امتیازِ ذات اور ذات پات
کے جھگڑوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے تھے۔ اس ملک میں دو ہزار تین سو
اٹھہتر (۲۳۷۸) بڑی ذاتیں تھیں اور چھوٹی ذاتوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ یہ
ذاتیں ایک دوسرے سے قطعی طور پر جدا تھیں اور ہر ذات کے درمیان
ایک ایسی خلیج تھی جس کو کوئی پار نہ کر سکتا تھا۔ اب اسلامی حکومت نے ملک کے
طول و عرض میں ایک زبردست سماجی انقلاب پیدا کر دیا۔ جن شہروں میں
نیچ اقوام کو چلنے پھرنے کی اجازت بھی نہ تھی اور جن کے اندر وہ سورج کے ڈوبنے
کے بعد قدم بھی نہ رکھ سکتے تھے اب وہی لوگ مسلمان ہو کر شہروں کے اندر اپنے
گھر بنانے لگے اور فصیل کے اندر بود و باش کرنے لگ گئے۔ جہاں منو سمرتی کے
مطابق برہمنوں کو تعزیرات ملک کی رو سے موت کی سزا نہیں ملتی تھی اب اسلامی
قانون کی نظر میں سب غیر مسلم طبقوں کے افراد کی حیثیت صرف "کافر" یا "مشرک"
کی ہی رہ گئی۔ تمام باقی امتیازات اٹھ گئیں۔ ہندو سماج نے نچلے طبقہ کے لوگوں
کو نہ صرف شہروں میں بسنے سے بلکہ فوج میں شہری ہو کر بھرتی ہونے کے حق
سے بھی محروم کر رکھا تھا لیکن اب مسلمان ہو کر بھی چنڈال نہ صرف شہروں
میں بود و باش کرنے لگ گئے بلکہ فوج میں ملازم ہو کر اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔
اس طرح اسلامی سلطنت نے راجپوتوں کی فوجی اجارہ داری بھی ختم کر دی اور
برہمنوں اور اونچی ذاتوں کے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کو بھی ختم کر دیا۔
غیر مسلم پیشہ وروں اور دستکاروں کے سب طبقوں کے لئے ملازمت اور

کام کے دروازے کھل گئے اور چنڈال تک مسلمان ہو کر کارخانوں میں کام کرنے لگ گئے اور بعض نے تجارت و حرفت کے پیشے اختیار کر لئے۔

سلطان سکندر لودی (از ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ مطابق ۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء)

لودی خاندان کا بانی بہلول تھا۔ لودی افغان خاندان تھا جو تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آتا جاتا رہتا تھا۔ بہلول کا اقتدار رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ وہ ۱۴۵۱ء میں دہلی کا سلطان ہو گیا۔

سکندر بن بہلول نہایت حسین و جمیل اور باطن کا پاکیزہ شخص تھا۔ وہ مذہب اسلام کی طرف بہت غلو رکھتا تھا۔ عالمگیر اورنگ زیب سے پہلے غالباً تمام سلاطین و بادشاہانِ دہلی میں سکندر لودی سے زیادہ متعصب بادشاہ کوئی نہیں گذرا۔ گو اُس کی ماں ایک ہندو سنار کی بیٹی تھی لیکن لڑکپن ہی سے اس میں شدید مذہبی تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ کوئی کام جو خلافِ شریعت ہو اُس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ اُس نے کثرت سے مسجدیں بنوائیں اور ہر مسجد میں تنخواہ دار واعظ اور قاری رکھے۔ وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ نوافل پڑھتا تھا۔ تہجد اور اشراق کی نمازوں تک کو کبھی قضا نہ کرتا تھا۔ رات کے وقت ستر (۷۰) عالموں کا انبوہ اُس کے پلنگ کے ارد گرد بیٹھ جاتا تھا اور وہ اُن سے مسائل دریافت کرتا رہتا تھا۔ اُس کو مذہبی مباحثوں کا بے حد شوق تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے علماء کو طلب کر کے کوروکشیتر کے کنڈ کو تباہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ جب عبد اللہ اجودھنی نے جو بڑا جید عالم تھا کہا کہ ہندوؤں کے کسی قدیم بُت خانہ کو غارت کرنا یا اُن کی قدیم رسوم سے

تعرض کرنا مناسب نہیں تو سکندر کو اس قدر غصہ آیا کہ خنجر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ تم کفار کی طرفداری کرتے ہو۔ جب اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو کہنے لگا کہ اگر تم اجازت دے دیتے تو ہزاروں مسلمان آسودہ ہو جاتے (تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۰۷)۔ تاریخ داؤدی کا مصنف لکھتا ہے کہ اُس نے متھرا کے مندروں کو مسمار کروا کر اُن کی جگہ مسجد اور سرائے بنوائی اور مندروں کے بتوں کو قصابوں کو دے دیا جنہوں نے گوشت بیچنے کے لئے اُن کے بٹے بنا لئے۔ اس نے حکم دیا کہ ہندو دریائے جمنا کے گھاٹ پر غسل نہ کریں۔ حجاموں کو حکم ہوا کہ وہ ہندوؤں کے سر اور داڑھیاں ہندوانہ طریقہ سے نہ تراشیں۔ اس نے غیر مسلموں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ خود اسلامی مؤرخ کہتے ہیں کہ وہ اسلام میں اس درجہ تک تعصب رکھتا تھا کہ وہ افراط کی حد کو پہنچ گیا تھا (طبقاتِ اکبری جلد اوّل صفحہ ۳۳۵)۔

سکندر کے دربار میں علمی چرچے ہوتے رہتے تھے۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ فنِ طب کی مشہور سنسکرت کتاب ارک بھاوید کی فارسی میں طبِ سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی۔ جب فارسی خواں ہندوؤں کی حکومت کی ملازمت کے سلسلہ میں ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے عہد میں کائستھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تحصیل کی اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کر لی کہ بدایونی لکھتا ہے کہ ایک ہندو مسلمانوں کو درس دیا کرتا تھا اور باوجود کفر کے اسلامی علم شریعت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

سکندر لودی کے عہد میں آگرہ کے شہر کو پھر رونق حاصل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ متھرا کے راجہ کنس کے وقت آگرہ میں ایک حصین قلعہ تھا جہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ محمود غزنوی نے آگرہ کو برباد کر دیا اور وہ ایک معمولی گاؤں

ہی رہ گیا۔ اس وقت کے بعد سکندر کے عہد میں اس کی ترقی پھر شروع ہوئی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں وُہ دارالسلطنت ہو گیا۔

سکندر کی حکومت کے اصول حکومتِ الٰہی کے اصول تھے۔ اُس کے محکمۂ احتساب کے افسر ہر جگہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کوئی خلافِ شریعت بات کہیں ہونے نہ پائے۔ اور لوگوں سے یہ مچلکے لکھوا لیتے تھے کہ وُہ آیندہ کبھی ایسی باتوں کا ارتکاب نہیں کرینگے جو شرعِ اسلام کے موجب جائز نہ ہوں۔ اس قسم کی طبیعت و خصلت رکھنے والا سلطان کب گوارا کر سکتا ہوگا کہ مسیحی کلیسیا یہاں بڑھیں، پھلیں اور پھولیں۔ آرنلڈ لکھتا ہے کہ سکندر اپنے مذہبی جوش کی وجہ سے "بُت شکن" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس نے ہندوؤں کو سخت سے سخت ایذائیں دیں تاکہ وُہ اپنے مذہب کو ترک کریں (پریچنگ آف اسلام باب ۹)۔ ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ جب ہندوؤں کی مقتدر اکثریت سے اِس قسم کا سلوک ہوتا تھا تو بے کس و لاچار مسیحی کلیسیا کی ذلیل اقلیت کا سکندر کے عہدِ حکومت میں کیا حال ہو گا۔

فصل چہارم

سلطنتِ دہلی کے ایّام اور مسلمانوں کے مذہبی رجحان

سلطنتِ دہلی کے ایّام میں اور بالخصوص چودھویں صدی میں مسلمانانِ ہند کے عام مذہبی رجحانات کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کو علمِ فقہ سے خاص طور پر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ سلاطینِ دہلی جیسا ہم گذشتہ فصلوں میں بتلا آئے ہیں مذہب کے شیدائی تھے اور علما و فقہا کے ایسے قدردان تھے کہ وُہ اُن کے اشاروں پر چلتے اور اُن کے فتوؤں پر عمل کیا کرتے تھے۔ پس قدرتاً اُن کی رعیّت علمِ فقہ سے بہت دلچسپی لیتی تھی۔

شریعت یا فقہ اس مجموعۂ قوانین کا نام ہے جو مسلمانوں کی مذہبی، سماجی، اور تمدّنی زندگی پر حاوی ہے۔ اور جس کی حدود سے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے۔ ہم حصّۂ اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ جب اسلامی فتوحات وسیع ہوتی گئیں اور اسلام کا غیر مسلم اقوام و ممالک کے تمدّن و مذاہب اور نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا تو بے شمار ایسی باتیں مسلمانوں کے پیش آئیں جن کا ذکر قرآن اور نبیٔ عرب کے اقوال میں نہ تھا۔ پس اسلامی قانون کے چار اصول مقرر کیے گئے۔ قرآن، سنّتِ نبوی، قیاس اور اجماع۔ ان اصولوں پر فقہ کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وُہ مالک بن انس کی موطّا ہے۔ اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد

ابی سلیمان نے سینچا اور پھر امام اعظم ابو حنیفہ (از ۶۹۹ھ تا ۷۶۷ھ) نے اس کو چار چاند لگائے۔ بعد میں اس کے دو مشہور شاگرد امام یوسف اور محمد (جن کو "صاحبین" بھی کہتے ہیں) کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انہیں کی مرتب کردہ فقہ پر آجکل اہلِ سُنت عمل کر رہے ہیں۔

ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ تیرھویں صدی میں جب منگولیوں کا سیلاب اٹھا تو وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے ممالک کے سرکردہ مسلمان علما اور فقہا ہندوستان میں پناہ کے لئے آ گئے۔ سلطانِ دہلی نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ان میں سے بعض کو بیش از بیش وقار حاصل ہو گیا اور ساتھ ہی سلطنت میں اسلام کی عظمت اور رونق بڑھ گئی۔ ان اسباب کا یہ نتیجہ ہوا کہ عوام مسلمان اسلامی علوم و فنون کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے لگ گئے۔ اس صدی میں فقہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو حاشیے اور شرحیں تیار کی گئی ہیں وہ اب بھی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ نہ صرف دہلی بلکہ ہر صوبہ کے بڑے شہر مثلاً ملتان وغیرہ علم و فضل کا مرکز بن گئے۔ صوفیہ تک فقہ کے ماہر ہوتے تھے۔ چنانچہ نظام الدین اولیا کے خلیفوں اور مریدوں کو کتاب ہدایہ از بر حفظ تھی۔ محمد تغلق کو بھی اس کا ایک ایک نقطہ یاد تھا حالانکہ وہ اپنے آپ کو شخصی اجتہاد کا مجاز سمجھتا تھا اور عوام کی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے اقتدار کے تحت رکھنا چاہتا تھا۔ فیروز تغلق کو فقہ سے خاص شغف تھا چنانچہ ضیاالدین برنی نے اپنی کتاب فتاویٰ جہانداری اسی کے عہد میں لکھی تھی۔ اس کے عہد میں فقہی علوم ہر طرف مروج تھے حتّٰی کہ شاہی محلات میں اس کا چرچا ہوتا رہتا تھا۔

اس کا اثر مسیحی کلیسیا کی زندگی پر قدرتاً پڑا ہوگا۔ علم فقہ کے مطالعہ اور اس کے عام چرچے نے مسلمانوں کی ذہنی زندگی کو ایک ایسے ڈھانچہ میں ڈال دیا جو صدیوں سے اب تک اُن کی زندگی کے ہر شعبہ میں برقرار رہا ہے۔ وُہ ہر امر کو فقہی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وُہ قدرتاً عیسائیوں کو۔ اُن کے ماضی کو اور اُن کے مستقبل بلکہ اُن کی ہستی کو اُسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے عُلما اور فقہا دیکھتے تھے۔ جب نہ صرف سلاطین و حکام اور اُونچے طبقہ کے تُرک، اور افغان "ذمّی" عیسائیوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے اور عوام مُسلمان بھی اُن کو ہر طرف ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے تو مسیحی کلیسیاؤں کا وجُود اور عدم وجُود برابر خیال کیا جاتا تھا۔ پس اُن کی پست ہمّتی اُس فضا کا حصّہ ہو گئی ہو گی جس میں وُہ سانس لیتے تھے۔ اور یہ حالت بیس یا پچاس سال کی عارضی مُدت کی نہ تھی بلکہ اب تین صدیوں سے چلی آتی تھی۔ اور سلطنت کے استحکام اور وُسعت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ اس ذلّت کی زندگی سے نکلنے کی عیسائیوں کو کوئی اُمید نظر نہیں آتی تھی۔ ہاں۔ اس بدترین ذلّت کی زندگی سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ عیسائی مسیحیت کو خیرباد کہہ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ بالخصُوص جب وُہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کلیسیا کے جو ممبر منجئ عالمین کا انکار کر کے اسلام قبُول کر لیتے ہیں وُہ بالادست طبقہ میں جا کر خوشحال زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کو ٹیکسوں اور جزیہ کی غلامی سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے سرکاری ملازمت اور درباری عُہدوں کے دروازے کھُل جاتے ہیں، اور بادشاہوں اور حاکموں سے انعام و اکرام حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی تجارت

کو فروغ حاصل ہو جاتا ہے اور ذلّت کی زندگی بسر کرنے کی بجائے ہر خاص و عام ان کو عزّت کی نظر سے دیکھ کر ان کی توقیر و تکریم کرتا ہے تو ہزاروں مسیحیوں کا مرتد ہو کر اسلام کو قبول کر لینا کوئی اچنبھے کی بات معلوم نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرجاؤں میں سناٹا بڑھنے لگا اور ان گھروں میں قرآن خوانی کی آوازیں آنے لگیں جہاں پہلے مُنجّیٔ عالمین کا نام لیا جاتا ہے۔

(۲)

ہم چودھویں صدی کے صرف ایک مصنّف ضیاء الدین برنی کی دو کتابوں سے دو مختصر اقتباس کرتے ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ مسلمان عُلما غیر مسلم مذاہب کو کن نظروں سے دیکھتے تھے اور وہ خود قیاس کر سکتے ہیں کہ عوام النّاس جو فقہ کا ہر وقت چرچا کرتے رہتے تھے مسیحی کلیسیا کے شرکاء کی نسبت کس قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ فتاویٰ جہانداری میں ضیاء الدین برنی لکھتا ہے: "اگر محمود غزنوی ایک بار اور ہندوستان کی جانب آ جاتا تو تمام ہندوستان کے برہمن جو اس لمبے چوڑے ملک میں کفر کے احکام کی بقا کے موجب اور مشرکانہ رسوم کی پائداری کا سبب ہیں، تہ تیغ ہو جاتے۔ وہ ان کے قریباً اڑھائی لاکھ سرغنوں کی گردن مار دیتا اور جب تک تمام ہند و ستان اور اس کے تمام باشندے اسلام قبول نہ کر لیتے اور کلمہ نہ پڑھ لیتے وہ اپنی تلوار کو میان میں نہ کرتا۔ کیونکہ محمود شافعی مذہب کا پیرو تھا اور امام شافعی کا حکم ہندوؤں کے لئے یہی ہے کہ وہ یا تو اسلام قبول کریں یا قتل کئے جائیں۔ ہندوؤں سے جزیہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ نہ ان کے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے اور نہ کوئی پیغمبر ان میں ہوا ہے۔" پھر یہی مصنّف اپنی کتاب نعتِ محمدی میں لکھتا ہے: "... دوسری قسم مصطفٰے علیہ السّلام کے دین کے دشمنوں کی ہے۔ وہ

دینِ حنیفی اور اس دین کے احکام کی وجہ سے مصطفٰے علیہ السّلام سے دشمنی رکھتے تھے اور رکھتے چلے آئے ہیں۔ اس قسم کے دشمنوں کے چند گروہ تھے اور اب بھی ہیں مثلاً عیسائی اور یہودی، دہریہ، سوفسطائی، زنادقہ، بظاہر مسلمان اور دل میں کافر، آتش پرست، مجوس، فلاسفہ، ہندو اور تمام مشرک اور کافر جو بنے دینوں میں اور دینِ مصطفٰے میں اختلاف دیکھ کر مصطفٰے علیہ السّلام سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب دہلی کا دار الملک فتح ہوا اور ملعون چنگیز خاں کے ڈر کے مارے ہر ملک کے بڑے بڑے عُلماء دہلی پہنچے اور دہلی کی سلطنت سلطان شمس الدین التتمش کے ہاتھوں میں آئی اور عُلماء پر ہندوؤں کے کفر اور شرک ظاہر ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ نہ تو ان کے پاس کتاب ہے اور نہ وہ اہلِ ذمّہ ہیں اور کہ جب وہ لشکر اور تلوار کو اپنے سروں پر چلتی دیکھتے ہیں تو خراج ادا کرتے ہیں اور اگر اُن کو نہیں دیکھتے تو سرکش اور باغی ہو جاتے ہیں تب یہ بزرگ عُلما ایک دوسرے کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کرنے لگے کہ ہندوؤں کے ساتھ "یا قتل اور یا اسلام" کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے یا صرف اس بات پر ہی راضی ہو جانا چاہیئے کہ وہ خراج دیں اور اس کے عوض ثروت و دولت اور آرام سے زندگی بسر کر کے بت پرستی کریں اور کفر کی باتیں بے خوف و خطر کیا کریں اور ان کی عزت کی خاطر ہم اپنی جانیں قربان کرتے پھریں۔ ان عُلما نے آپس میں بہت بحث کی۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو مصطفٰے علیہ السّلام کے بدترین دشمن ہیں اور اس دین کا حکم ہندوؤں کے بارے میں یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے اور غلام بنا لیا جائے۔ اور ان کی توہین اور ذلّت کر کے ان کا مال لوٹ لیا جائے۔ دینِ حنیفی میں اس قسم کا حکم نہ تو یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے ہے اور نہ دوسرے

مذہبوں کے بارے میں اس قسم کا حکم ہے۔ یہ برہمن عوام ہندوؤں کے کفر اور شرک کا اصلی سبب ہیں اور انہوں نے شروع ہی سے عام ہندوؤں کے دلوں پر کفر اور شرک کی باتوں کو نقش کر رکھا ہے۔ پس اس سبب سے جہاں بھی کوئی ہندو پایا جاتا ہے خواہ وہ اسلام کا مطیع ہو یا نہ ہو وہ دینِ مصطفٰےؐ کا بدترین دشمن ہے۔ علماء کے اس گروہ نے یہ صلاح کی کہ اس قسم کے دشمنوں کے ساتھ مناسب احکام اور کارروائی کے لئے سلطان سے پہلے بات چیت ہو جائے۔ پس ان میں سے چند علماء جو اپنے زمانہ کے معتبر ترین عالم تھے سلطان شمس الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اس مسئلہ کو تشریح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس سے درخواست کی کہ ہندوؤں کے لئے "یا قتل یا اسلام" کا حکم صادر ہونا چاہیئے کیونکہ دینِ حنیفی کا یہی حکم ہے کہ ہندوؤں سے خراج اور جزیہ نہ لیا جائے۔ سلطان نے ان سے بات چیت کی اور وزیر کو فرمایا کہ علماء کا جواب دے اور ان کو اپنی رائے بتلائے۔ نظام الملک جنیدی نے سلطان سے عرض کی کہ اس بات میں کوئی شک اور شبہ نہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ "یا قتل اور یا اسلام" کا اصول برتنا چاہیئے کیونکہ وہ دینِ مصطفٰے علیہ السلام کے بدترین دشمن ہیں۔ اور وہ نہ تو اہلِ ذمہ ہیں۔ اور نہ عہد۔ ہندوستان میں نہ تو کوئی کتاب نازل ہوئی ہے اور نہ کوئی پیغمبر آیا ہے لیکن ابھی ہندوستان نیا نیا فتح ہوا ہے اور ہندوؤں کی کثرت اس قدر ہے کہ مسلمان ان کے درمیان نمک کی طرح بالکل تھوڑے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ اگر ہم اس قسم کا حکم ان کے لئے جاری کر دیں تو وہ سب متحد ہو کر ایک ہو جائیں اور خدشہ ہے کہ ملک میں گڑبڑ ہی اور فتنہ پڑ جائے۔ ہم چونکہ تعداد میں تھوڑے ہیں اور فتنہ ہر طرف سے اٹھ کھڑا ہوگا ہم ان کا

مقابلہ نہ کر سکیں گے ہاں۔ جب چند سال گزر جائیں گے اور دارالسلطنت میں اور صوبوں میں اور شہروں اور قصبوں میں مسلمانوں کے قدم جم جائیں گے اور ہمارے پاس بہت فوجیں جمع ہو جائیں گی پھر البتہ ہم ہندوؤں کے ساتھ "یا قتل اور یا اسلام" کے اصول پر عمل کر سکیں گے۔ جب علماء نے وزیر کا یہ مصلحت آمیز جواب سنا تو انہوں نے سلطان سے کہا کہ اگر آپ ہندوؤں کے قتل کا حکم نہیں دے سکتے تو کم از کم آپ اپنے دربار میں ان کی کسی قسم کی عزت نہ کریں اور ان کو یہ اجازت نہ دیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان سکونت کریں۔ آپ دارالسلطنت اور صوبوں اور شہروں میں جہاں مسلمان رہتے ہیں ان کو یہ اجازت ہرگز نہ دیں کہ وہ بت پرستی کریں اور کفر کے احکام اور رسوم بجا لائیں۔ بادشاہ اور وزیر دونوں نے علماء کی یہ تینوں باتیں قبول کر لیں لیکن چونکہ شروع میں ہی ان کے قتل کا حکم نہ دیا گیا اب اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں اور دینداروں کے درمیان کفر اور شرک اور بت پرستی بیٹھ گئی ہے۔" (صفحہ ۳۹۰ تا ۳۹۲)۔

مندرجہ بالا واقعات سے اور سلطان علاؤالدین اور قاضی مغیث کی گفتگو سے ناظرین پر چودھویں صدی کے مسلمانوں کی ذہنیت روشن ہو گئی ہوگی۔ ہر چھوٹا بڑا، جاہل اور عالم مسلمان غیر مسلم مذاہب اور غیر مسلموں کے وجود کو گوارا نہیں کرتا تھا۔ ہر مسلمان بچہ اسی فضا میں پلتا تھا اور اس کی ذہنی تربیت اور روحانی پرورش اسی فضا میں ہوتی تھی۔ علمائے دینِ اسلام "اما القتل واما الاسلام" کے اصول پر ہر بادشاہ کو چلنے کی ترغیب دیتے تھے اور کہتے تھے کہ کاش مسلم فرمانروا ابتدا ہی سے اس شرعی حکم پر عمل کرتے۔ لیکن محمد قاسم سے لے کر سلطنت دہلی کے آخری سلطان تک تمام فرمانروا چاہتے

تھے کہ مسلمان مُلک میں مُٹھی بھر ہیں پس اُنہوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس شرعی حکم پر عمل نہ کریں۔ علیٰ ہٰذا القیاس وُہ اسلامی شریعت کے دیگر سخت احکام پر کبھی عمل نہ کر سکے کیونکہ ان احکام کو پُورا کرنے کے لئے یہ لازم تھا کہ مُلک میں مُسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت ہو۔ لیکن چُونکہ مُسلمان شمار میں مقابلتہً بُہت کم تھے پس ان کے سامنے دو راستے کُھلے تھے۔ یا تو وُہ یہ کہتے کہ اسلامی شریعت اور قرآنی احکام حالات کی تبدیلی کے باعث ناقابلِ عمل ہیں اور یا وہ ان احکام پر سختی کے ساتھ عمل کرتے۔ اہلِ سُنّت کے عقیدہ کے مطابق اسلامی شرع کی تاویل جو چار اماموں نے کی ہے وُہ قطعی اور آخری ہے اور "انسدادِ بابِ اجتہاد" کی وجہ سے اسلامی شریعت کی کوئی نئی تاویل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ مُسلم سلاطین مانتے ایک بات تھے لیکن کرتے دُوسری بات تھے۔ وہ زبان سے تو شرعی احکام کا اقرار کرتے تھے لیکن عملاً وُہ یہ ثابت کر رہے تھے کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے شرع کے احکام ناقابلِ عمل ہیں۔ جلال الدین فیروز خلجی جیسے سُلطان تو دانت پیس کر رہ جاتے تھے اور کہتے تھے "ہر روز ہندو جو خدا کے دُشمن ہیں اپنے سنکھ بجاتے میرے محل کے نیچے سے گذرتے ہیں لیکن ہم میں یہ طاقت نہیں کہ روک سکیں"۔ بلبن جیسے سُلطان مُلک و سلطنت کی مصلحت کو تمام شرعی احکام پر مقدم سمجھ کر صرف اُن احکام کا ہی احترام کرتے تھے جو مُلکی ضروریات سے نہ ٹکراتے تھے۔ سُلطان محمد تغلق جیسے اپنے آپ کو اجتہادِ شخصی کا مجاز سمجھتے تھے حالانکہ ہر امید اُن کے نوک زبان ہوتی تھی۔ سُلطان علاؤالدین جیسے کہتے تھے "مجھے یہ نہیں جانتا کہ میرا حکم شرع کے مطابق ہے یا نہیں۔ جس بات کو میں رعایا کے حق میں بہتر خیال کروں گا میں اسی کا حکم دُوں گا"۔

ہندوؤں کو تو ان کی غالب اور مقتدر حیثیت جابر سلاطین دہلی کے ہاتھوں سے بچا گئی۔ اس کی بجائے کہ یہ بُت پرست اکثریت کافروں میں شمار کی جائے سلاطین نے ہندوؤں کو "اہلِ ذمہ" کے تمام حقوق دے دیئے اور ان کا شمار اہلِ کتب میں کر لیا۔ عام طور پر علما نے بھی ان کو "مشابہ اہلِ کتاب" کا درجہ دے دیا اور ہندوؤں کو ہمیشہ "اہلِ ذمہ" ہی شمار کیا گیا۔ اسلامی فتوحات کے پہلے دور میں مندروں کو منہدم کر دیا گیا تھا لیکن تُرکوں نے عام طور پر ہندوؤں کی اکثریت کی وجہ سے ان کی رسوم و رواج میں اندرونی مداخلت نہ کی حتیٰ کہ دیوداسیوں کی سی قبیح رسم کی اصلاح کا خیال تک نہ کیا۔

مسیحی کلیسیا ایک بیکس اور بے نوا اقلیت تھی جس کا خدا ہی حافظ تھا۔ سلاطین کو اس پر جبر و ظلم کرتے وقت شرعی احکام سے بھی ٹکرانا نہ پڑتا تھا۔ اِدھر ہندوستان کی کلیسیا کا یہ حال تھا، اور اُدھر مغربی ممالک کی کلیسیاؤں نے چودھویں صدی میں نام نہاد "صلیبی جنگوں" کا فتنہ برپا کر رکھا تھا جن کی وجہ سے ہر مشرقی مُلک کی کلیسیا پر اور کلیسیائے ہند پر بھی بُرا اثر پڑا ہو گا۔ ہر مُلک کے مُسلمان فرمانروا مسیحیت اور مسیحی کلیسیا کے جانی دُشمن ہو گئے۔

ہندوستان میں دہلی کے سلاطین اپنے ممالک محروسہ میں مسیحی کلیسیاؤں پر پیش از پیش سختی کرنے لگے ہوں گے اور اُن کو جزیہ اور ٹیکس سے آزادی کا لالچ، جاہ و مرتبہ اور ثروت کا طمع اور انعام و اکرام کی حرص سے دائرہ اسلام میں لاتے گئے ہوں گے۔ ایسے مسیحیوں کی نسبت لکھا ہے "اُن کا خدا پیٹ ہے اور وُہ دُنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں"۔ وُہ "کشادہ" راستہ کو اختیار کر گئے "جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اس سے داخل ہونے والے بہت

تھے لیکن حقیقی ایماندار مسیحی یہی سمجھتے رہے کہ "ہمارا وطن آسمان پر ہے اور ہم ایک منجی خداوند یسوع مسیح کے وہاں سے آنے کے انتظار میں ہیں جو اپنی اس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے ہماری پست حالی کے بدن کی شکل کو بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائیگا"۔ وہ شاہان الطاف و اکرام کو "کوڑا کرکٹ" سمجھتے رہے تاکہ مسیح کو حاصل کریں اور اُس میں پائے جائیں"۔

(۱۴)

سلاطین دہلی کے زمانہ میں مسیحیت اور مسیحی کلیسیاؤں کے تنزل کے اسباب صرف قرآنی احکام اور شریعتِ اسلام اور حکومت کا دباؤ اور عام مسلمانوں کا ذلت آمیز سلوک ہی نہ تھے۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ جیسا ہم ان صفحوں میں بار بار ذکر کر چکے ہیں سلطنت دہلی کے بے شمار مسیحی بمصداق مقولہ "النّاس علیٰ دین ملوکھم" مسیحی کلیسیا کو چھوڑ کر جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے لیکن یہ باتیں کلیسیا کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب نہ تھیں۔ اس کی کمزوری کا بنیادی سبب یہ تھا کہ کتاب مقدس اور انجیل جلیل کا سُریانی زبان سے ہندی زبان میں ترجمہ نہ کیا گیا تھا۔ پس عوام مسیحی اپنے ایمان کے اصُول سے ناواقف تھے۔ اُن کو مسیحی نجات کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اُن کو الٰہی محبت کا عرفان حاصل نہ تھا۔ وہ "نئے سرے سے" پیدا نہ ہوئے تھے اور روح القدس کے بپتسمہ سے ناواقف تھے۔ ان کی رُوح اس رُوحانی خوراک سے ناآشنا ہو گئی تھی جو ایماندار کی رُوح کے لئے گوشت اور خون ہوتا ہے اور اس کے ایمان کو تازگی اور اس کی رُوح کو فرحت بخش زندگی دیتا ہے۔ وہ پشتوں سے مسیحی

چلے آتے تھے لیکن مسیح کا ذاتی تجربہ نہ رکھنے کی وجہ سے صرف نام کے مسیحی رہ گئے تھے۔ اسلامی سلطنت کی وجہ سے اسلامی تہذیب اور ثقافت کا غلبہ تھا جو صدیوں سے چلا آیا تھا۔ مسیحی تہذیب کا نام و نشان ہی رہ گیا تھا۔ اور اب مسیحی کلیسیائی رسُوم کی ادائیگی کو ہی (جو سُریانی زبان میں ہوتی تھیں) مسیحیت سمجھے ہوئے تھے۔ کلیسیائی رسُوم و عقائد کو ایک غیر زبان میں ادا کرنے اور رٹ لینے سے مسیحی ایمان کو تقویت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کلیسیائی عبادتیں بھی سُریانی زبان میں ادا کی جاتی تھیں جن سے عوام ناواقف ہوتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ طوطے کی طرح غیر زبان میں دُعائیں اور نمازوں کا پڑھنا افراد کی اور کلیسیا کی رُوحانی زندگی کی نشو و نما اور ترقی میں مدد نہیں دے سکتا۔ ان کو میکانکی طور پر حفظ کرنے سے رُوح نہ تو تازہ رہ سکتی ہے اور نہ شگفتہ ہو سکتی ہے۔ بالخصوص جب سلطنت کی بادِ مخالف سموم کی طرح اس کو صدیوں تک مُرجھاتی چلی آتی رہی ہو اور ہر پُشت کے لوگ کلیسیاؤں کی نظروں کے سامنے گروہ در گروہ مُرتد ہو کر اسلام قبُول کرتے چلے جا رہے ہوں۔ اور مذہب کی تبدیلی سے دُنیاوی عرُوج حاصل کر رہے ہوں۔

کلیسیا کی کمزوری کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ کلیسیا اپنے پاؤں پر کھڑی نہ تھی۔ نہ صرف کتاب مقدس اور انجیل جلیل ہندوستان کی کسی زبان میں بھی میسر نہ ہو سکتی تھی بلکہ اس کے کلیسیائی نظام اور انتظام کی تشکیل بھی اس کے ہاتھوں میں نہ تھی۔ ایران کے بشپ اور کیتھولی کوس ہی اس کے بشپ اور کیتھولی کوس ہوتے تھے۔ اور وہ کالے کوسوں دور، بین النہرین کے مُلک میں رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندوستانی

کلیسیاؤں کے بشپ پردیس سے آتے تھے اور دیس کی کلیسیاؤں پر حکومت کرتے تھے۔ کلیسیاؤں کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اور چونکہ وہ ہندوستان کی کلیسیاؤں کی اندرونی مشکلات اور بیرونی دقتوں کو کما حقہ، سمجھ نہیں سکتے تھے کلیسیا قدرتاً ترقی نہ کرسکتی تھی۔ ہم کو کہیں ایسا بشپ نظر نہیں آتا جو ہندی نژاد ہو۔ ہندوستان کے بشپ گننے کو ہندوستان کے بشپ تھے لیکن وہ ہندوستانی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے قسیس اور شماس (پریسٹ اور ڈیکن) بیرونی ممالک میں جاکر تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے اور یہ تعلیم و تربیت بھی زیادہ تر اسی پر مشتمل ہوتی تھی کہ وہ سُریانی زبان کی تحصیل کریں، سُریانی زبان میں عبادت کراسکیں اور سُریانی کلیسیائی رسُوم کو پورا کرسکیں اور اُس کلیسیا کے عقائد کی تعلیم حاصل کریں جس زبان میں اُن عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی اس کی اصطلاحات ہمارے دیس کے فلسفہ کی سی اصطلاحات نہ تھیں۔ ایرانی کلیسیا کے قدیم فضلاء کے خیالات اور تصوّرات ہندوستان کے لئے موزوں نہ تھے۔ ایرانی کلیسیا کے عُلماء ہی گذشتہ وقتوں میں، اُن کے دینی مسائل کو حل کیا کرتے تھے۔ ان علما کے خیالات نے ابتدائی صدیوں میں بڑا کام دیا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیالات کام کے نہ رہے۔ ہندوستان کی دیسی کلیسیائوں نے کوئی فاضل پیدا نہ کئے تھے جو اس کارِ عظیم کے اہل ہوتے۔ اور ہندو فلسفہ اور اصطلاحات کے مطابق انجیلی عقائد کی توضیح اور تشریح کرکے ہندوؤں کو مُنجی کے قدموں میں لاتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انتظام اور نظام سے ہندوستان کے بے شمار شہروں قصبوں کی کلیسیاؤں کی رُوحانی اور تعلیمی ضروریات تو الگ رہیں، یہی

ضرورریات بھی پُوری نہ ہوسکتی تھیں۔ اور جُوں جُوں قرآنی احکام اور شریعتِ اسلام کی گرفت ایرانی کیتھولی کوس اور ایرانی بشپوں پر ایران کے مُلک اور دیگر ممالک پر مضبوط ہوتی گئی تُوں تُوں ایرانی بشپ کم آنے لگے ہندوستان کے مسیحی قسیس اور شماس کے ہندوؤں کے لئے تربیت پانے کے لئے بیرونی ممالک میں رفتہ رفتہ جاتے بند ہوگئے۔

ستم پر ستم یہ ہُوا کہ مغربی مسیحی مبلغین کا ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں داخل ہونا حُکماً بند کر دیا گیا کیونکہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے جذبات بھی بھڑک گئے تھے اسی سبب سے کسی مغربی کلیسیا کے مبلغ کو ہندوستان میں انجیل کی منادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حالانکہ مُسلمان تجار ہندوستان کی اشیا کو مغربی ممالک کے مسیحی سوداگروں کے ہاتھ بحیرۂ رُوم کے گِردو نواح میں بیچتے تھے۔ لیکن نہ تو کوئی مسیحی تاجر اور نہ کوئی پردیسی مبلغ انجیل کی تبلیغ کرسکتا تھا یا کلیسیاؤں کے ایمان کی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھال سکتا تھا۔

کلیسیا کے نظام کی تشکیل بھی ایرانی کلیسیا کی طرز پر ڈھالی گئی تھی جس کا ہندوستانی طرز سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ یہ پردیسی بوٹا ہندوستان کی زمین میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ سیاسی طوفانوں کے ایام میں غیر ملکی بشپ اور مبلغ ہندوستان سے بھاگ کر اپنے ملکوں میں پناہ لینے اور جاتے۔ اُس وقت جب کلیسیا کو دینی رہبروں کی ضرورت ہوتی تو یہ بشپ غائب ہوجاتے تھے۔ ہندوستانی بشپ کوئی نہ تھے اور نہ کلیسیائی نظام کے مطابق ان کا انتخاب ہوسکتا تھا۔ پس آہستہ آہستہ ہندوستانی قسیسوں اور شماسوں کا تقرر بند ہوگیا اور ان کا شمار کم ہوتا گیا کیونکہ

کوئی ہندی نژاد بشپ موجود نہ تھا جو اُن کا تقرر کر سکتا۔ اگر ہندوستان کی کلیسیا کا نظام پردیسی کیتھولیکوس کے ہاتھ میں نہ ہوتا اور ہندوستانی بشپ وجود میں آگئے ہوتے تو جب کیتھولیکوس خود اسلامی حکومت کے ہاتھوں خوار اور لاچار ہو رہا تھا، اور ایرانی بشپ آنے بند ہو گئے تھے تو یہ ہندوستان کے بشپ اُن کی جگہ لے لیتے اور خود مل کر ایک آرچ بشپ کو چُن لیتے — تب کلیسیائی زندگی سنبھل جاتی، ہندوستانی قسیس اور شماس لاکھوں کی تعداد میں ملک کے چپے چپے میں ہوتے، کلیسیاؤں کی زندگی چمک اُٹھتی کتابِ مقدس اور انجیل جلیل کا ترجمہ ملک کی زبانوں میں ہو جاتا اور انجیل جلیل کا جانفزا پیغام ہر کس و ناکس کے کانوں میں پہنچ جاتا اور نجات کی تبلیغ سے مسیحی کلیسیا وسیع ہوتی جاتی اور سلطنت کی تمام رکاوٹوں کے باوجود مسیح کی رُوح سے تقویت پا کر ایک مقتدر ہستی ہو جاتی۔ لیکن غیروں کی رُوحانی غلامی کلیسیا کی گردن میں لعنت کا طوق بن کر رہی اور بالآخر اس کی موت کا سبب ثابت ہوئی۔

فصل پنجم

امیر تیمور کا حملہ اور مسیحی کلیسیاؤں کا استیصال

امیر تیمور ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا۔ وہ ماں کی طرف سے چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ اُس کے آبا و اجداد سائبیریا کے صحرائی قبیلہ برلاس کے تھے

۳۴ سال کی عمر میں وہ چغتائی ترکوں کا لیڈر بن گیا اور ایران اور اس کے قریبی ممالک سے جنگ کر کے چنگیز کی طرح ہر طرف تاخت و تاراج اور لوٹ مار کرتا ملکوں کو فتح کرتا اور شہروں کو غارت کرتا چلا گیا۔ جس جگہ اور ملک کو وہ شکست دیتا تھا وہاں کے باشندوں قیدیوں اور فوجیوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کا ایک بڑا مینار کھڑا کر دیتا تھا۔ اُس نے اپنی فتوحات کے حالات ملفوظات میں چغتائی ترکی زبان میں لکھوائے جس کے حروفِ تہجی کو نسطوری مبلغین نے ایجاد کیا تھا۔ اس کا ترجمہ ابوطالب حسینی نے عہدِ شاہجہان میں فارسی میں کیا۔ اس کتاب میں وہ ہندوستان کے حملہ کی نسبت لکھتا ہے:—

ان ایام میں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کفار کے خلاف جہاد کر کے غازی کہلاؤں۔ میں نے سُنا تھا کہ کفار کو قتل کرنے والا غازی کہلاتا ہے اور اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو وہ "شہید" ہوتا ہے — جب میں نے فال کی خاطر قرآن کو کھولا تو آیتِ قتال نکلی۔ پس میں نے اپنے امیروں اور فوجی افسروں کو بلایا اور اُن سے اس بات کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا خیال مبارک ہے۔ سلطان محمود نے تیس ہزار کے رسالہ سے ہندوستان کو فتح کیا اور سونے، چاندی اور جواہرات کے ہزاروں بوجھے اپنے ساتھ لایا اور سب سے خراج حاصل کرتا رہا۔ ہمارا امیر سلطان محمود سے بڑھ چڑھ کر ہے اور ایک لاکھ رسالہ اُس کے ہمرکاب ہے۔ انشاءاللہ حضور فتح حاصل کر کے خدا کے نزدیک مجاہد اور غازی ہوں گے اور دنیا میں فاتح جہان ہوں گے ہماری فوج ہندوستان کی دولت سے مالا مال ہو جائیگی اور ہم ہفت اقلیم کے مالک بن جائینگے۔ شاہزادہ شاہ رخ نے کہا "پہلے زمانہ میں سلطنت روم

کے بادشاہ قیصر کہلاتے تھے، ایران کے بادشاہ کسریٰ، تاتار کے بادشاہ خاقان، اور چین کے بادشاہ فغفور اور ایران و توران کے بادشاہ شہنشاہ کہلاتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اب ایران و توران کے شہنشاہ ہیں پس ہم کو ہندوستان کا بھی شہنشاہ ہونا چاہئے۔" شاہزادہ محمد سلطان نے کہا "ہندوستان کا ملک سونے اور جواہرات سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں چاندی، سونے، ہیروں، لعلوں کی اور زمرد، لوہے، فولاد، تانبہ اور پارے وغیرہ کی سترہ کانیں ہیں۔ ان کے علاوہ دیدہ قدر درخت اور خوشبودار پودے اُگتے ہیں جن سے ہوا معطر اور زمین ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتی ہے۔ چونکہ اُس ملک کے باشندے بُت پرست، شمس پرست، بے دین اور کافر ہیں پس اللہ اور اُس کے رسُول کا حکم ماننا ہم پر فرض ہو جاتا ہے اور اس پر حملہ کرنا باعثِ ثواب ہے۔" میرے صلاح کاروں نے کہا کہ "ہندوستان کا سالانہ محاصل چھ ارب مثقال ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس پر فتح حاصل کرینگے"۔ اس پر میں نے اپنے ممالک مقبوضہ سے افواج کو جمع کیا۔ اور رجب المرجب سنہ ۸۰۰ھ (مارچ ۱۳۹۸ء) میں حملہ کرنے کے لئے کُوچ کر دیا۔ اس کی تاریخ ابجد کے حساب سے "فتح قریب" ہے"۔

پشاور اور سندھ کی وادی کو فتح کرتا ہوا تیمور عازم دہلی ہوا جہاں محمود تغلق بادشاہ تھا۔ وہ راستہ میں ہر شہر کو تاخت و تاراج کرتا گیا۔ جب وہ دہلی کے قریب پہنچا تو اُس کے ساتھ ایک لاکھ قیدی تھے۔ اُس نے جنگ سے پہلے سب کو قتل کر دیا اور فتح کے بعد دہلی میں داخل ہُوا۔ وہ لکھتا ہے "دہلی کے قتلِ عام میں میرے سپاہیوں نے اس قدر لُوٹ حاصل کی کہ ہر سپاہی کے پاس پچاس اور سو کے درمیان قیدی مرد، بچے اور عورتیں تھیں اور کسی کے

پاس بیس قیدیوں سے کم نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے اندازہ لعل، ہیرے، جواہرات، موتی، چاندی سونے کے زیورات، اشرفیاں، سونے اور چاندی کے علائی تنکے، سونے چاندی کے برتن، کمخواب کے کپڑے اور زرق برق کے لباس مالِ غنیمت میں میرے ہاتھ آئے۔ سوائے ان محلوں کے جن میں مسلمان علما، اور سید بستے تھے تمام شہر کو قتل و غارت کر دیا گیا کیونکہ قلم تقدیر سے اُن کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ان قیدیوں میں جو لوگ کسی فن کے کاریگر یا دستکار تھے اُن کو میں نے بچا لیا تا کہ وہ سمرقند میں ایک ایسی جامع مسجد تعمیر کریں جس کا ثانی روئے زمین پر نہ ہو۔

میں نے دہلی میں پندرہ روز قیام کیا۔ ہر روز عیش کا دن اور ہر رات عشرت کی شب تھی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ خدا نے مجھے کفار کو قتل کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا ہے پس میری فوج ظفر موج نے دیگر شہروں کا رُخ کیا۔ ہر جگہ کفار کو قتل کرتا ایک جگہ پہنچا جہاں کفار نے پہاڑوں میں پناہ لے کر مجھ سے مقابلہ کیا۔ لیکن پہلے ہی حملہ میں میرے سپاہیوں نے اس قدر کشت و خون کیا کہ کافروں کا خون پہاڑیوں پر سے ندیوں کی طرح میدان کی جانب بہنے لگا۔ تقریباً تمام کے تمام کافر جہنم واصل ہو گئے اور میری فوج کے ہاتھ بے اندازہ مال اور جانور آئے"۔

دہلی کی تاریخ میں تیموری حملہ اس شہر کے منحوس ترین واقعات میں سے ہے۔ تیمور کے سپاہی غیر مسلموں کے گھروں میں گھس گئے اور ہر کوچہ میں قیامت بپا ہو گئی۔ باشندوں نے عالم یاس میں اپنے گھروں کو آگ لگا کر اپنی عورتوں کی عفت بچانے کی خاطر ان کو شعلوں میں پھینک دیا۔ دہلی۔ سیری۔ جہان پناہ اور قدیم دہلی کے چاروں شہروں میں تیموری

فوج نے نہایت بے رحمی سے قتل و خون کیا۔ قیدی عورتوں کے بدن زیورات اور قیمتی ہیروں لعلوں اور موتیوں سے لدے تھے۔ دہلی میں پندرہ روز قیام کر کے وہ میرٹھ کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں وہ لوٹ مار قتل اور غارت کرتا ہوا ہردوار کی وادی میں سے گزرتا ہوا سوالک پہاڑوں کے راجاؤں۔ ملکوں اور لوگوں کو قتل و غارت کرتا گیا۔ وہاں سے اس نے جموں کی راہ لی جہاں کا راجہ خوف و دہشت کے مارے مسلمان ہو کر تیمور کی حفاظت میں آ گیا۔ وہاں سے وہ کانگڑہ کو فتح کر کے چلا اور راہ میں جو شہر اور قصبہ اس کو نظر آیا وہ کھنڈرات کا ڈھیر ہو گیا۔ وہ لاہور۔ ملتان۔ دیپال پور۔ کشمیر وغیرہ علاقوں کو زیر و زبر کرتا سمرقند واپس پہنچا۔ وہ لکھتا ہے "جیسے مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ میں نے ملک کو کفار کے وجود سے پاک کر دیا ہے تو میں نے واپسی کا حکم دیا۔ میں نے دریائے گنگا کو عبور کر کے اس کے کنارے پر نماز عصر پڑھی اور اپنے اللہ کا شکر کیا کہ جس کام کو پورا کرنے کے لئے میں نکلا تھا وہ میں مکمل کر سکا۔ میں نے ملک کو دریائے سندھ سے دہلی تک فتح کر لیا تھا اور شمالی ہند کے ہر شہر اور قصبہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یکے بعد دیگرے تمام صوبے میرے قبضے میں آتے گئے۔ میں نے آگرہ کو تباہ کر دیا اور جمنا کی وادی بنارس تک میرے اختیار میں آ گئی۔ شاہزادہ محمد سلطان نے حیدرآباد اور دکن کو فتح کر لیا اور اب وہ میسور میں جنگ کر رہا ہے اس نے راجپوتانہ فتح کر لیا ہے۔ اس کے بیٹے عمر شیخ کے بیٹوں نے بہار اور اڑیسہ کو فتح کر لیا ہے۔ نورالدین نے بنگال اور آسام کو برما کی سرحد تک فتح کر لیا اور سب کے سب مال غنیمت میں جنگی ہاتھیوں کو قید کر کے لے آئے کیونکہ ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ جنگ میں سب کے لشکر ان کے خوف و دہشت کے مارے

کانپ اٹھتے تھے۔ میرے محاسبوں کا یہ اندازہ ہے کہ ہندوستان سے میں اس قدر مالِ غنیمت لوٹ کر لایا ہوں کہ اگر میں یورپ کے تمام ملکوں پر فتح پا کر ان کو لوٹ لیتا پھر بھی وہ لوٹ ہندوستان کی لوٹ کے بالکل کسی طور پر پاسنگ نہ ہوتی۔ . . . . . میں نے بے شمار کافروں کو تلوار کا لقمہ کر دیا۔ ہندوستان کے راجاؤں اور بادشاہوں کو اپنا مطیع کر لیا اور جمنا کے کناروں کو عبور کر کے بے دینوں اور کافروں کو جہنم واصل کر دیا اور تمام ملک کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے جہاد کے کام کو پورا کیا اور دینِ حق ہر جگہ غالب ہو گیا ہے"۔

تیمور نے ہندوستان آنے کے لئے کوہ ہندوکش کو ۱۳۹۸ء کے موسم بہار میں پار کیا تھا۔ اسی سال ماہ دسمبر میں اس کے شہنشاہِ دہلی ہونے کا اعلان ہو گیا اور اس کے اگلے سال مارچ ۱۳۹۹ء میں وہ ہندوستان کی حدود کو پار کر کے واپس چلا گیا۔ اور ایک سال کے اندر اس نے ملک کے طول و عرض میں تباہی بربادی اور خونریزی کر دی۔

ہندوستان سے واپسی کے وقت وہ کوہ ہندوکش کی ان پہاڑیوں میں گزرا جہاں وہ اقوام بستی تھیں جن کو افغانستان کے مسلمان "ہندوکش کے سیاہ پوش کافر" کہتے تھے۔ ان اقوام کے لوگ غالباً مسیحی تھے جن کو نسطوری مبلغین منجی عالمین کے قدموں میں لے آئے تھے۔ تیمور نے ۱۳۹۹ء میں ان کو بھی تباہ و برباد کر دیا چنانچہ ایک سنگِ مرمر کی لاٹ کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے "سیاہ پوش کافروں" پر فتح حاصل کی۔

بالآخر ۱۴۰۵ء میں تیمور راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

(۲)

ہم حصہ اول کے باب ہفتم کی فصل ششم میں ذکر کر آئے ہیں کہ جب تیمور نے مغربی ایشیا کے ممالک کو مسخر کر لیا تو اُس نے اُن ملکوں کے مسیحیوں کا قتلِ عام کر دیا۔ ایسا کہ اُس کے زمانہ میں اُن ملکوں کی کلیسیائیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔ اُس نے مسیحی کلیسیاؤں کے مرکزوں اور بالخصوص بغداد، تکریت، دیار بکر، ماردین، اربیل، طور عبدین وغیرہ شہروں میں بشپوں، قسیسوں، شماسوں اور مسیحیوں کو چن چن کر شہید کر دیا۔ اُس نے مخالف فوجوں کے تمام عیسائیوں کا دو دفعہ قتلِ عام کر دیا لیکن دونوں دفعہ اُن فوجوں کے مسلمان سپاہیوں کو قتل نہ کیا۔ اُس نے جارجیا کے عیسائیوں کو بھی کچل دیا اور اُن کی بیخ کنی کر کے ہی دم لیا۔

ہندوستان میں بھی تیمور نے ملک کے طول و عرض میں جس جس شہر قصبہ اور گاؤں کو روندا۔ اُس نے اُن مقامات کی کلیسیاؤں کا بھی قتلِ عام کر دیا۔ ایسا کہ اُس کے حملہ کے ایک سال کے اندر اندر جو بچے کھچے عیسائی زندہ رہ گئے تھے اُنہوں نے یا تو اسلام قبول کر لیا اور یا وہ تلوار کا لقمہ ہو گئے۔ وہ جہاں گیا وہاں مسیحی کلیسیاؤں کی بیخ کنی کرتا چلا گیا۔ اُس کے واپس چلے جانے کے بعد شمال ہندوستان میں صرف کہیں کہیں مسیح کے نام لیوا رہ گئے۔ علامہ سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص سے پوچھا گیا کہ تیمور لنگ کا فساد کس زمانہ میں ہوا تھا۔ بجواب ملا کہ سالِ عذاب میں کیونکہ ابجد کے حساب سے لفظ "عذاب" کے ۷۷۳ عدد ہوتے ہیں (صفحہ ۳۱۹)۔ کم از کم ہندوستان کی کلیسیاؤں کے حق میں اُس کا حملہ ہر معنوں میں عذاب ثابت ہوا۔

(۳)

تیمور کے حملہ کے قریباً نصف صدی بعد ۱۴۴۰ء کے قریب

کونٹی (NICOLO CONTI) ہندوستان آیا۔ وہ پہلے تین ہفتے گجرات میں رہا اور وہاں سے بیجا نگر کی سلطنت میں گیا۔ اس سلطنت کا وزیر مسیحی تھا جس کی نسبت عبدالرزاق شاہِ ایران کا سفیر شاکی تھا۔ کیونکہ اُس نے عبدالرزاق کا وظیفہ بند کر دیا تھا۔ کونٹی ہم کو بتلاتا ہے کہ اس کو شمالی ہندوستان کا ایک مسیحی ملا جس نے اُس کو بتلایا کہ ایک بادشاہت ہے جو کیتھے (CATHAY) سے بیس روز کا سفر ہے جہاں کا راجہ اور رعایا سب نسطوری ہیں۔ لیکن یہ محض سُنائی بات ہے جو اُس نے خود نہیں دیکھی۔ پھر وہ ان باتوں کا ذکر کرتا ہے جو اُس کی آنکھوں نے خود دیکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "نسطوری مسیحی ہندوستان میں ہر طرف پراگندہ ہیں جس طرح ہمارے درمیان یہودی خوار و پراگندہ ہیں۔ . . . ہندوستان میں ان مسیحیوں کے سوائے عام طور پر لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ . . . یہ نسطوری مسیحی ہندوستان کے تمام حصوں میں پائے جاتے ہیں۔"

کونٹی کے علاوہ اور لوگ بھی ہم کو پندرھویں صدی کے آخر میں بتلاتے ہیں کہ نسطوری مسیحی ہندوستان کے تمام علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ بیچارکس اور ادسونیس لکھتے ہیں کہ دریائے گنگا کے کنارے پر اور ہندوستان کے وسط اور مشرق میں بے شمار نسطوری مسیحی بستے ہیں۔ پندرھویں صدی میں جینوا کا سوداگر سٹیفن (HIERONINO DI SANTA STEFENO) کالیکٹ گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ "جس حصہ کو شمالی ہندوستان کہتے ہیں وہاں کئی ہزار مسیحی خاندان بستے ہیں۔" زمانہ حاضرہ کا زبردست اور مستند مؤرخ ڈاکٹر لاٹوریٹ لکھتا ہے کہ "پندرھویں صدی میں نسطوری مسیحی ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود تھے لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان

کی تعداد شمال میں کم ہوتی گئی" (جلد ۲ باب پنجم)۔ ان صدیوں میں کلیسیا کے شرکا "ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود" تو تھے لیکن ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ۱۴۹۰ء میں جنوبی ہندوستان کے عیسائیوں نے نسطوری کیتھولیکوس سے درخواست کی کہ وہ اُن کو ایک بشپ بھیجے کیونکہ وہ مدت سے بغیر کسی بشپ کے تھے۔ پروفیسر برکٹ لکھتا ہے کہ چونکہ مسلمان بادشاہ کلیسیاؤں کا ناطقہ تنگ کئے رکھتے تھے لہذا وہ مدت سے بغیر کسی بشپ کے تھے۔ اس وسیع برِ اعظم صغیر میں کلیسیائیں ہر جگہ بغیر کسی تنظیم کے بکھری پڑی تھیں کیونکہ مغربی ایشیا کے سیاسی حالات کی وجہ سے بدیسی نسطوری کلیسیا ان ہندوستانی کلیسیاؤں کی شیرازہ بندی نہیں کر سکتی تھی۔ کلیسیا نہ صرف ہندوستان کی جغرافیائی وسعت کی وجہ سے پراگندہ ہو رہی تھی بلکہ اس برِ صغیر کے جس کونہ میں بھی رہتی تھی وہاں وہ ذلیل اور حقیر ہی شمار کی جاتی تھی اور صدیوں کی ذلت کی وجہ سے وہ پست ہو گئی تھی۔ اس کس مپرسی اور گمنامی کی حالت میں وہ صدیوں تک بے نام و نشان زندگی گذارتی رہی۔ سولھویں صدی کے آخر میں شمالی ہند اور وسط ہند میں مسیحیت کا وجود برائے نام ہی رہ گیا ایسا کہ مغل بادشاہ اکبر (از ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کو انجیل کی تعلیم کی نسبت خبر دینے والے نسطوری کلیسیا کے قسیس نہ تھے بلکہ رومی کلیسیا کے پادری تھے۔ اس کا ذکر ہم ان شاء اللہ اس سلسلہ کی اگلی جلد (جلد چہارم) میں کرینگے۔

باب چہارم

شمالی ہندوستان کے مذاہب و فلسفہ پر مسیحیت کا اثر

فصل اوّل۔ مسیحیت اور ہندو فلسفہ

ہندومت اور ہندو فلسفہ گذشتہ چار ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے خدا کی تلاش اور انسانی رُوح کے قدرتی میلانوں اور رجحانوں کو پورا کرنے کی کوششیں کرتا چلا آیا ہے۔ آسمان، سورج، چاند، ستاروں، بجلی، آگ وغیرہ کی پرستش اسی مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے شروع ہوئی۔ اُس زمانہ میں برہمنوں کا اقتدار بڑا زبردست تھا جن کے ذریعہ دُعا اور پُوجا پاٹھ، خونیں قربانیوں وغیرہ کے وسیلے ویدی دیوتاؤں کو خوش کر کے ہمارے دیش کے لوگ اپنے دل کی خواہشوں، آرزوؤں اور رُوحانی تمناؤں کو پورا کرنے یا اُن کو حاصل کرنے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ باتیں ایسے لوگوں کی بھوک اور پیاس کو نہ مٹا سکیں جو غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ اور جو خدا، رُوح اور انسان کے حقیقی منزل مقصود اور کائنات کی ابتدا وغیرہ مسائل کو حل کرنے کی تلاش میں لگے رہتے تھے۔ اس گروہ میں ایسے برہمن بھی تھے جن کے دلوں اور دماغوں میں یہ تصورات جوش مارتے رہتے تھے۔ برہمنوں کے

علاوہ بعض راجگان اور اُن کے اُمرا بھی اِس زُمرہ میں شامل تھے۔ اس گروہ کی دماغی کاوشوں نے اُپنشد اور ہندو فلسفہ کے مسالک پیدا کئے۔ برہمنوں کی رسوم اور سوشل قوانین کو بے فائدہ خیال کر کے رد کر دیا گیا۔ فلسفہ نے مذہب کی جگہ غصب کر لی چنانچہ نیا کے فلسفہ میں علم اور منطق کا وہ ڈھانچہ موجود ہے جو آج کل بھی کام آتا ہے۔ عالمِ فطرت کی ویشیشکی تاویل موجود ہے۔ سانکھیا میں سائنس اور علم النفس کے نظریئے ہیں۔ یوگ میں کاملیت کی راہ بتلائی گئی ہے۔ پوروَ میمانسا میں اخلاقی اور معاشرتی امور پائے جاتے ہیں۔ گیتا میں واجب الوجود ہستی پر ایمان رکھنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اخلاقی کاملیت اور فطری کمال کی راہ پائی جاتی ہے ویدانت کی تاویل میں شنکر اچاریہ، راما نج، مادھو، نمبارک، ولبھ، جیدگو سوامی وغیرہ جیسے زبردست مفکّروں نے ایسے فلسفیانہ اور دقیق مسائل اور حل پیش کئے ہیں جو کسی قوم کے لئے بھی مایۂ ناز ہیں اور نوعِ انسانی کے لئے فخر کا باعث ہیں۔ گذشتہ چار ہزار سالوں کے دوران میں جُوں جُوں سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات بدلتے گئے ہندوؤں کے فلسفیانہ خیالات میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی گئیں اور ہندو فلاسفہ اور مفکّرین کے نظریئے بھی زمانہ کے خیالات کے مطابق مناسب رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔

لیکن فلسفہ اور فلسفیانہ تصورات چند ایک روشن دماغ لوگوں ہی کی تسلّی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہ عوام کے دلوں کو نہیں چھوتے اور نہ اُن کی روحانی بھوک پیاس کو مٹا سکتے ہیں۔ جس طرح صرف رسم پرستی عوام النّاس کی اُمیدوں اور روحانی اُمنگوں کی تشنگی کو نہیں بجھا سکتی اُسی طرح فلسفیانہ نظریہ جات یہ کام سر انجام نہیں دے سکتے۔ کہتے ہیں کہ جب شنکر اچاریہ

کی ماں جانکنی کی حالت میں تھی تو اُس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جس سے آخری دم میں اُس کی آتما کو شانتی نصیب ہو۔ اس پر بیٹے نے ماں کو ایک پُرمغز فلسفیانہ درس دیا جو بچاری ماں کے کام کا نہ تھا۔ اِن باتوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عوام جادو، منتر، ٹونگے اور مظاہرِ قدرت، درخت، پتھر وغیرہ اور بھوت پریت وغیرہ کی طرف متوجّہ ہو گئے۔

عوام النّاس کی روحانی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے بدھ مت اور جین مت نمودار ہُوئے۔ بدھ مت نے اخلاقیات پر زور دیا لیکن جین مت نے اخلاقیات کو اپنے فلسفہ کا محض ایک ضمنی نتیجہ بنا دیا۔ بدھ نے یہ تعلیم دی کہ خونیں قربانیاں اور رسم پرستی سب بے فائدہ ہیں اور تپسیا انسانی زندگی کے لئے ایک جال ہے جس کی خوشنما دھوکے سے زیادہ وقعت نہیں۔ فلسفیانہ قیاسات فضول اور تضیعِ اوقات ہیں۔ صرف اس ایک بات کی ضرورت ہے کہ انسان نیک اخلاق کی زندگی بسر کرے۔ بدھ مت میں اخلاق نے خدا کی جگہ غصب کر لی۔

(۲)

ہماری اس کتاب کا شروع ساتویں صدی مسیحی سے ہے جب راجہ ہرش تھانیسر میں ۶۰۶ء سے ۶۴۷ء تک حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ حضرت محمد کا ہم عصر تھا۔ اس کے راج میں رواداری سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔ کوئی شیو کی، کوئی سانپ کی، کوئی وشنو کی، کوئی سورج کی، کوئی گنیش کی، کوئی کارتک (محبّت کا دیوتا) کی پوجا کرتا تھا۔ ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ہندوؤں کے بے شمار مذہبی فرقے تھے اور ہندوستان کے لوگ ہر قسم کے

دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ مسلم فتوحات سے پہلے برہمنوں کا اقتدار زندگی کے ہر شعبہ میں اور ملک کے ہر حصّہ پر تھا۔ جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں بدھ مت اور جین مت برہمنوں کے بلند بانگ دعوؤں کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر ہر جانب زور پکڑ گئے تھے۔ خود راجہ ہرش برہمنوں اور بودھوں، دونوں کی رسوم کے مطابق پوجا کیا کرتا تھا اور دونوں کو دان دیا کرتا تھا چنانچہ ہیون سانگ (YUAN CHWANG) ہمیں بتلاتا ہے کہ راجہ ہرش نے پریاگ میں تہوار کے دنوں میں پہلے دن بدھ کے بُت کو نذرانے چڑھائے۔ دوسرے روز اُس نے سورج دیوتا کی جو اس کے باپ کا دیوتا تھا اور تیسرے روز اُس نے شیو کی پوجا کی۔ لیکن بالآخر بدھ کو برہمنوں نے ایسی شکست دی کہ وہ ہندوستان سے غائب ہو گیا اور جین مت نیم مُردگی کی حالت میں مرد بیمار کی طرح رہا۔

راجہ ہرش دریائے گنگا کے نشیب سے ہمالیہ اور دریائے نربدا تک تمام شمالی ہندوستان کا واحد حکمران تھا۔ اُس نے ۶۲۰ء میں جنوبی ہندوستان کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ آخری ہندوستانی شہنشاہ تھا کیونکہ اُس کے بعد کسی ہندوستانی راجہ کو یہ نصیب نہ ہوا کہ ملک کے تمام شمالی حصّہ کا حکمران ہو۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے اسی راجہ کے عہد میں یہاں پندرہ سال (۶۳۰ء تا ۶۴۵ء) کاٹے۔ اُس نے بدھ مذہب اور سنسکرت کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے ساتھ واپسی پر بہت سی کتابیں، مورتیاں اور تبرکات لے گیا جن کو لادنے کے لئے بائیس خچروں کی ضرورت پڑی۔ ہیون سانگ مہایانہ بدھ مت کی تعلیم دیتا تھا۔ پس راجہ ہرش نے قنوج میں ایک بڑا جشن منایا جس میں اس مت کا پرچار کیا گیا۔ اس پر برہمن اور ہینایانہ مت

والے برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے چینی سیاح اور راجہ کے خلاف سازشیں کیں۔ ان کو خطا پر یہ سزا دی گئی کہ پانچ سو برہمن ملک بدر کر کے سرحد کی جانب بھیجے گئے۔

راجہ ہرش ایک آزاد خیال اور روشن دماغ شخص تھا جو سنسکرت کا مُربی تھا۔ مشہور ڈراما رتناولی اُس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان صدیوں میں سنسکرت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ سورماؤں کے کارنامے، رومانی قصّے، ڈرامے، غزلیں، فرضی قصّے، امثال کی کتابیں وغیرہ سنسکرت میں لکھی گئیں جو نہایت مقبول عام ہو گئیں۔ ان میں کالیداس کی شکنتلا مشرق و مغرب میں زبان زد خاص و عام ہے۔

ہم جلد اوّل میں بتلا چکے ہیں کہ جب مقدس توما رسول شمالی ہند میں آئے تھے تو اس زمانہ میں بدھ مت کے پیرو وہاں کثرت سے بستے تھے۔ بدھ کی زندگی کی دو تصویریں ہم کو تاریخ کے اوراق میں نظر آتی ہیں۔ راجہ اشوک کے زمانہ کی تصویر یہ تھی کہ گو وہ انسان تھا لیکن ابھی دیوتا نہ مانا گیا تھا۔ وہ صرف ایک معلم ہی تھا لیکن خود نجات دہندہ نہ بنایا گیا تھا۔ لیکن بدھ کی دوسری تصویر یہ تھی کہ بدھ بنی آدم کے رنج و مصیبت میں سب کا مددگار ہے۔ وہ ہر انسان کے غموں میں اُس کا شریک ہے۔ سب کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔ اس کا پیغام دکھیوں اور ماندوں کے لئے تسکین قلب اور آرام جان ہے۔ اس دوسری تصویر نے شمالی ہند میں رواج پایا۔ مقدس توما رسول اور اُن کے پیرو ہر خاص و عام کو انجیل کا پیغام دے کر کہتے تھے کہ خداوند مسیح گنہگاروں کا منجی، مصیبت زدوں کا مددگار ہے جس کی خدمت کرنا سعادت دارین ہے کیونکہ اُس نے سب پر یہ فرض کر دیا ہے کہ تمام انسانوں کی بغیر کسی تمیز کے مدد کریں۔

پس بدھ مت کے پیروؤں نے خداوند مسیح کے تمام اوصاف اور منصوبوں کو بدھ پر چسپاں کر دیا۔ چنانچہ کشان خاندان (از ۷۸ء تا ۲۲۰ء) اور گپتا خاندان (از ۳۲۰ء تا ۶۵۰ء) کے راجاؤں کے زمانہ میں بدھ کی نسبت یہ عقیدہ رائج تھا کہ وہ جہان کا نجات دینے والا ہے جس کے ساتھ بھگتی مارگ کے مطابق محبت کرنی لازم ہے۔ اور کہ اس کے حکم کے مطابق کل بنی نوع انسان کی خدمت کرنے سے ہی اس کی خدمت کی جاتی ہے۔ ہر انجیل خواں بدھ مت کی اس تعلیم پر انجیل کی تعلیم کا اثر دیکھ سکتا ہے۔

ہم اس حصہ کے باب اول میں بتلا چکے ہیں کہ ان صدیوں میں شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بے شمار کلیسیائیں ہر جگہ موجود تھیں اور نسطوری کلیسیاؤں میں اس قدر طاقتور تھیں کہ ہندوستان کے میٹروپولیٹن کا رتبہ چین کے میٹروپولیٹن سے بڑا تھا جس کا رتبہ سمرقند کے میٹروپولیٹن سے بڑا تھا۔ کلیسیاؤں کی کثرت کے باعث ہندوستان کے بشپ کو جو پہلے فارس کے میٹروپولیٹن کے ماتحت ہوتا تھا ساتویں صدی کے پہلے نصف میں خود مختار میٹروپولیٹن کا رتبہ دے دیا گیا اور اب سے وہ بلا واسطہ سیدھا بابل کے پیٹریارک کے ماتحت ہو گیا۔ اس میٹروپولیٹن کا صدر مقام ٹیکسلا کے قریب گندس پور میں تھا جو موجودہ شاہ آباد کے قریب تھا۔

ہم جلد دوم میں یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ جنوبی ہند میں انجیل کی تعلیم نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ پس یہ بات قرین قیاس ہے کہ جس طرح مسیحیت نے جنوبی ہند کی مذہبی اور ادبی دنیا کو ان صدیوں میں متاثر کیا تھا اسی طرح اس نے شمالی ہند کی مذہبی اور ادبی فضا کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ کیونکہ جب دو مختلف قسم کی سماجیں صدیوں تک ایک جگہ رہیں تو وہ بند کمروں میں مقید ہو کر نہیں

رہتیں۔ ہندو اور مسیحی روزانہ ایک دوسرے سے میل جول رکھتے تھے اور باہم صلح اور آشتی سے نسل در نسل زندگی گزارتے تھے۔ جنوب کے ہندو فضلاء اور فلاسفہ نے شمال میں آ کر ہندومت کے تصورات میں انقلاب پیدا کر دیا اور یہ فلاسفہ، جیسا ہم جلد دوم کے باب نہم میں ذکر کر چکے ہیں مسیحیت کی تعلیم سے بہت متاثر ہو چکے تھے۔ انجیل جلیل کی تعلیم نے ان کے خیالات، تصورات اور دینی معتقدات کے رخ کو کلیتہً پلٹ دیا تھا۔ پس یہ ایک ناممکن امر ہے کہ نسطوری کلیسیا کے مبلغوں اور عالموں نے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں پر اثر نہ کیا ہو۔ اس زمانہ کی دینی اور ادبی کتب جو سنسکرت میں لکھی ہیں اس خاص نکتہ نگاہ سے زیادہ علمی تحقیق کی محتاج ہیں۔ خدا کرے کہ کوئی سنسکرت کا فاضل اٹھے اور ان کا اس زاویہ نگاہ سے گہرا مطالعہ کرے جس سے مستقل نتائج پیدا ہوں۔

ہمیں یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نویں صدی فلسفیانہ مناظروں اور مذہبی مباحثوں کی صدی تھی جب تمام شمالی اور جنوبی ہند میں ہر چہار سو ہندو فلاسفر اور فضلاء اور ان کے چیلے ملک کے مختلف کونوں میں بحث و مباحثہ جاری رکھتے تھے اور خود راجے ان مناظروں کو اپنے سامنے کرواتے تھے۔ شنکراچاریہ اپنی فلسفیانہ کوششوں میں مجاہدانہ ذوق سے مصروف تھا۔ مسیحی علماء کی سرفروشانہ تبلیغی کوششوں سے متاثر ہو کر ہندو مفکر اپنے معتقدات کی نظر ثانی کر کے بھگتی کی تحریک کو از سر نو زندہ کر رہے تھے۔ اور جنوبی ہند سے شمالی ہند میں آ رہے تھے۔ اندریں حالات شمالی ہند میں مسیحیت کی تعلیم کے اثرات کو نظر انداز کرنا تاریخ سے ظلم کرنا ہے۔

(۳)

ہم اُوپر بتلا چکے ہیں کہ بدھ کا زمانہ فلسفہ کے لئے گویا موسمِ بہار تھا حق تو یہ ہے کہ ہندو فلسفہ کی ترقی بدھ مت کے اُن پے در پے حملوں کی وجہ سے تھی جو بدھ مت اور جین مت کے پیرو ہندوؤں کے قدیم عقائد اور رسُوم پر کر رہے تھے۔ ان حملوں نے ہندوؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے عقائد وغیرہ کی از سرِ نو تنقید کر کے اُن کا کوئی نیا ڈھانچہ قائم کریں۔ بدھ مت کے مفکروں نے منطقیانہ دلائل سے دقیانوسی خیالات کی دھجیاں اُڑا دیں۔ جین مت تجارتی طبقہ اور متوسط طبقہ میں پھیل گیا۔ راجپوتانہ اور ہندوستان کے بعض دیگر علاقوں کے راجے بھی جین مت کے پیرو ہو گئے اور یوں اس کی طاقت بھی بڑھ گئی۔ سنہ ۹۵۰ء کے بعد تین صدیوں تک جین مت طاقتور رہا۔ اس کے بعد اس کا اقتدار کم ہوتا گیا۔

اِس مت کی مشہور کتابیں خداوند مسیح کی پیدائش کے بعد احاطۂ تحریر میں آئیں جب مسیحیت کی تعلیم نے ہندوستان کو متاثر کر دیا تھا۔ چنانچہ نایا دتار چھٹی صدی مسیحی کی تصنیف ہے۔ مانکیا نندی نے اپنی کتاب سنہ ۸۰۰ء میں لکھی۔ دیو سوری نے بارھویں صدی میں لکھا اور مصنف پربھا چندر اس کے بعد ہوا۔ جب کوئی جین مت کا عالم اِن کتابوں کی مکمل طور پر چھان بین کریگا تب اہلِ علم کو معلوم ہو سکیگا کہ انجیلی تعلیم نے ان صدیوں کے مصنفوں کو کس قدر متاثر کیا تھا۔

بدھ مت بھی ڈھائی سو سال قبل مسیح سے لے کر سنہ ۳۵۰ء سنِ عیسوی تک عوام میں پھیل گیا اور ہندو مت اور برہمنوں کے لئے خدشہ کا باعث بنا رہا۔ چوتھی صدی عیسوی کے بعد جب سنسکرت کا احیا ہُوا تو بدھ مت کو دھکا پہنچا۔ اور صدیوں تک بدھ مت اور ہندو مت میں کشمکش جاری رہی۔

بدھ مت والوں نے برسرِ اقتدار رہنے کی خواہش نہ چھوڑی۔ لیکن راجپوت راجاؤں کے لئے برہمنوں کا طبقہ زیادہ مفید تھا پس ہندو مت کامیابی کے ساتھ بدھ مت کا مقابلہ کر سکا۔ مشرقی بنگال میں راجہ ششنک نے بدھ مت کے پیروؤں کو ایذائیں دیں تاکہ اس کا استیصال کرے لیکن عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں بدھ مت کے پیروؤں کو اُس قسم کی عقوبتوں اور ایذاؤں کا سامنا نہ کرنا پڑا جس طرح مسیحیت کو مغربی ممالک میں قیاصرۂ رُوم کے ہاتھوں اور مشرقی ممالک میں ساسانی شاہنشاہوں کے ہاتھوں متواتر صدیوں تک لگاتار مصیبت پر مصیبت اُٹھانی پڑی تھی۔ بدھ مت کے زوال کا اصلی سبب یہ تھا کہ اب وہ قدیم وقتوں کی طرح سادہ مذہب نہ رہا تھا اور نہ اس کے پیروؤں کے وہ اخلاق رہے تھے جنہوں نے دُنیا کو موہ لیا تھا۔ اس میں رسم پرستی اور دستور پرستی آ گئی تھی۔ بدھ کے مذہب میں سے بدھ کے اصُولوں کی رُوح اُڑ گئی تھی اور ان کی جگہ بت پرستی، توہم پرستی اور دیگر خرابیوں نے لے لی تھی۔ اس کے بھکشو عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی جو روز بروز وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ ہندو مت نے اس سے فائدہ اُٹھا کر راجپوت راجاؤں کی مدد سے اور برہمنوں کے علم اور جوش کے ذریعہ غلبہ حاصل کر لیا۔

شنکر اچاریہ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ ٹیلنگ کے مطابق وہ چھٹی صدی میں تھا۔ بھنڈارکر کے خیال میں وہ سنہ ۶۸۰ء میں پیدا ہُوا تھا۔ میکس مار اور پروفیسر میکڈونیل کے مطابق وہ سنہ ۷۸۸ء میں پیدا ہُوا اور سنہ ۸۲۰ء میں مر گیا۔ بہرحال جب اُس نے آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی میں ویدانت کے اصُول کا پرچار کیا تو بدھ مت اس نہ برداشت

فلاسفر کے مقابلہ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ برہمنوں نے ہر جگہ اپنے پرچارک بھیجے جنہوں نے بدھ مت کے پیروؤں کو ہندو مت کا پھر حلقہ بگوش کر لیا علاوہ ازیں ہندو مت میں دیگر عقائد کو اپنے اندر جذب کرنے کی عادت ہے اور اس نے بدھ کو وشنو کا اوتار قرار دے دیا۔ یوں رفتہ رفتہ بدھ مت اور ہندو مت میں جو شے مابہ الامتیاز تھی وہ عوام الناس کی نظروں میں جاتی رہی۔

بہار میں بدھ مت کے پیرو کثرت سے رہتے تھے کیونکہ وہاں کے پال راجے اس مت کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد کے مختلف شمالی حصوں میں جہاد کی جنگیں ہر سُو ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں پر یہ ظاہر ہونے لگا کہ ان کو ڈٹ کر اسلامی افواج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ جب اسلامی افواج نے بارھویں صدی میں بہار پر حملہ کیا تو انہوں نے بدھ مت کے مندروں اور وہاروں کو مسمار کر دیا، اور ایسا تباہ کیا کہ جس مذہب کے پیرو راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے اب اُن کا نام و نشان بھی مُلک سے مِٹ گیا۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ بہار کا صوبہ ایسا تھا جس میں مسیحی کلیسیائیں کثرت سے بستی تھیں اور اس کا شہر پٹنہ ایک بیٹر وپولیٹن کا صدر مقام تھا جس مسیحیت نے وسط ہند کے رہنے والے ہندوؤں پر اثر کر رکھا تھا اس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ لیکن جب اسلام کا قدم وسط ہند اور بنگال کی جانب بڑھا اور اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہوتی گئیں تو جنگ و جدل کی فضا میں انجیل کے اصول محبت کی تعلیم اجاگر نہ ہو سکی مسلمان ملیچھوں کا مقابلہ کرنے اور ان کو قتل کرنے کے خیال نے ہر خاص و عام کے دل میں جگہ کر لی۔

دشمن کا مقابلہ نہ کر"۔ "جو تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے اُس کی طرف بایاں بھی پھیر دے"۔ "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو"۔ "مبارک ہیں وہ جو صلح جو ہیں"، کی آوازیں جنگ و جدل کے شور و غوغا میں سُنائی نہ دے سکتی تھیں۔ جس تعلیم کی وجہ سے لاکھوں نے اپنے منجی کو قبول کر لیا تھا اب وہ اسلام کی آمد سے صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔

سلطنت دہلی کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی جنگیں درحقیقت دو مختلف سماجی نظاموں کی جنگیں تھیں۔ ہندوؤں کی سماج پرانے اعتقادات، فرسودہ رسومات اور بوسیدہ توہمات و تصورات کی سماج تھی جس کی اصلاح میں ہندو مفکر خود کوشاں تھے۔ اسلامی سلطنت کی سماج پردیسی دین کے الٰہیات، قرآنی احکام، حدیث و فقہ کے ارشادات اور عرب، عجم، عراق و دیگر غیر ممالک کے خیالات، رسوم و رواج وغیرہ کی سماج تھی اور دونوں سماجوں میں تصادم کا ہونا ایک ناگزیر امر تھا۔ بالخصوص جب اس سماج کا نظام جہاد کے جوش، مال غنیمت کی حرص اور تبلیغ اسلام کے جذبہ سے مخمور تھا۔ ہندو ملک کے راجاؤں کے باہمی نفاق، ذات پات کے افتراق مذہبی فرقوں اور دیگر اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی جوش اور اُن کے باہمی اتفاق کا مقابلہ نہ کر سکے۔ گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں شمالی ہندوستان کے میدان صرف میدانِ جنگ ہی بنے رہے۔ پرتھوی راج دہلی کا آخری ہندو بادشاہ تھا۔ اُس کی اور اُس کے حلیف قنوج کے راجہ جے چند کی موت سے ہندو مت میں ایک نئے باب کا اضافہ شروع ہو گیا۔

(۴)

نویں صدی میں شنکر اچاریہ نے ویدانت کے ادوائت فلسفہ کی بنیاد ڈالی۔ بارھویں صدی میں رامانج نے شنکر اچاریہ کی مخالفت میں اپنا فلسفہ

شروع کیا۔ یہ دونوں زبردست ہندو فلاسفر جنوبی ہند سے شمالی ہند آگئے اور دونوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ یہاں صرف کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شمالی ہند کے مُفکّر اور ہندو مت کے مُصلحین کے خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہوگیا۔ چونکہ ان فلاسفروں اور دینی اصلاح کرنے والوں کے خیالات کو انجیل کی تعلیم نے متأثر کیا تھا ہم یہاں نہایت مختصر طور پر اس انقلاب کی تاریخ بتلاتے ہیں۔

لفظ "ویدانت" کے معنی ہیں "وید کا آخر"۔ یعنی وُہ تعلیم جو ویدوں کے آخر میں اُپنشدوں میں پائی جاتی ہے۔ بادرائنیہ نے کوشش کی کہ اُپنشدوں کے مختلف زاویوں کو ایک ہی نظام میں منظم کر دے۔ لیکن یہ کوشش درحقیقت فلسفیانہ نہیں بلکہ دینیات کا ایک نظام ہے جس میں اُس نے اپنے دینی عقائد کو مرتب کیا ہے۔ چنانچہ ڈوائسن (DEUSSEN) اپنی کتاب "سسٹم آف دی ویدانت" میں لکھتا ہے کہ بادرائنیہ کی تصنیف کا اُپنشدوں سے ویسا ہی تعلق ہے جو مسیحی دینیات کا انجیل سے ہے۔ اس میں اُس نے اُپنشدوں کی تعلیم کو جو خدا، کائنات اور رُوح سے متعلق ہے اور جس کے اجزا بظاہر ایک دُوسرے کے نقیض ہیں ایک ہی نظام میں یکجا اکٹھا کیا ہے اور مخالفین کا جواب دیا ہے" (صفحہ ۲۱)۔ بادرائنیہ نے اس کام کو ۵۵۵ سُوتروں میں سرانجام دیا ہے جو زیادہ تر صرف دو یا تین لفظوں پر ہی مشتمل ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ یہ مختصر سُوتر بذاتِ خود بے معنی ہیں اور تاویل کے محتاج ہیں۔ لیکن دِقّت یہ ہے کہ ہر تاویل کرنے والا اپنی مرضی کے مطابق ان کی تاویل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ ان تاویل کرنے والوں میں شنکر، بھاسکر، یادو پرکاش، رامانج، کیسو، نیل کنٹھ، مادھو، بلدیو، وَلبھ، وجنانبکشو زیادہ تر مشہور ہیں۔ لیکن ان کی

تاویلوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کی تاویل درست ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے تصوّرات، جذبات اور تعصبات سے کام لے کر یہ تاویلیں کی ہیں۔ بلکہ بعض نے تو ایسی من مانی تاویلیں کی ہیں کہ ڈاکٹر رادھا کرشن کہتے ہیں کہ ان پر "تاویل" کا لفظ صادق نہیں آتا۔ بادرائنیہ کا زمانہ ڈاکٹر کیتھ (KEITH) کے مطابق ۲۰۰ء سے بعد کا نہیں (صفحہ ۵-۶) گو بعض ہندو فاضل خیال کرتے ہیں کہ یہ سُوتر پانچ سو سال قبل از مسیح اور ۲۰۰ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا تھا۔

ہم نے جلد دوم کے باب نہم کی فصل سوم میں شنکر اچاریہ کے فلسفہ کے اصُول کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ادوائت ویدانت کے فلسفہ کے مطابق جیو کا جوہر وُہی ہے جو آتما کا ہے "تو وہی ہے"۔ لیکن اس کے فلسفہ میں یہ بڑا نقص ہے کہ اس میں اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ اخلاق کی قدر و قیمت ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اخلاقی اُمور صرف تب ہی کچھ معنی رکھ سکتے ہیں جب انسان کی رُوح میں اور بیرونی دُنیا کی اشیا میں جو زمان و مکان کی حدود میں واقع ہیں تمیز برقرار رکھی جائے۔ لیکن شنکر کے فلسفہ کے مطابق اخلاقی دُنیا بھی مایا ہی مایا ہے اور انسان کرم کے ذریعہ مکتی حاصل نہیں کر سکتا۔ اَودّیا کا جو ہماری محدودیت کی جڑ ہے، خاتمہ ہونا لازمی ہے تاکہ ہم یہ محسوس کر سکیں کہ ہم اور آتما ایک ہی ہیں۔ جب تک ہم اپنی محدودیت اور اَودّیا کی حالت میں رہتے ہیں ہم کامل نہیں ہو سکتے خواہ ہماری اخلاقی زندگی کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ پس شنکر کے مطابق ہم اپنی بڑی سے بڑی کوششوں سے بھی مُکتی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ کرم خواہ اُن کا تعلق ویدوں کی رسُوم کے ساتھ ہو یا خُدا کی عبادت کے ساتھ ہو، صرف محدودیت کے ساتھ ہی تعلق رکھتے ہیں پس وُہ ہم کو سنسار

کی قید میں ہی رکھ سکتے ہیں اور اس چکر کا کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ اس چکر سے ہم کو گیان ہی کے ذریعہ مکتی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ گیان ہم کو ہماری انفرادیت سے باہر نکال لاتا ہے ایسا کہ ہم لامحدود کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں۔ پس نیک اخلاق ہم کو واجب الوجود ہستی تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ روحانی ترقی کی کسی منزل پر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اپنی منزل مقصود کو پالیا ہے۔ یہاں ہم کو مقدس پولوس کی انجیل کی تعلیم اور شینکر اچاریہ کی تعلیم میں جو فرق ہے وہ صاف اور نمایاں طور پر نظر آجاتا ہے۔ مقدس پولوس کہتا ہے کہ ہم شریعت کے کاموں کے ذریعہ نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک ہم خودی کو نہ چھوڑینگے ہم نجات نہیں پائینگے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ہم خودی کو پیش نظر رکھ کر نیک کام کریں جن کا درحقیقت کچھ فائدہ نہیں ہے۔ پس مقدس پولوس کہتا ہے کہ نجات کے لئے ایمان لازمی امر ہے لیکن شینکر کہتا ہے کہ نجات کے لئے گیان لازمی امر ہے۔ شرتی کے مطابق حقیقی ازلی آزادی جو واجب الوجود کی صفت رکھتی ہے، وہ کرم سے نہیں ملتی۔ ہم کرم کے ذریعہ اودیا کو نہیں نکال سکتے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں۔ ہم کرم اس لئے کرتے ہیں کیونکہ ہمارے اندر کسی شے کو حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن جہاں خواہش کا وجود ہے واں مکتی کا وجود ناممکن ہے۔ ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شینکر اچاریہ کا فلسفہ اپنی گہرائیوں اور منطقیانہ دلائل میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذرنے کے باوجود اس کا فلسفہ ہندوستان کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ لیکن یہ فلسفہ نہ تو انسان کی قدرتی اور فطرتی میلانات اور رجحانات کو پورا کر سکتا ہے اور نہ انسان کی ذہنی تحریکات کے کام آ کر ان کا ممد و معاون

ہو سکتا ہے۔ شینکر کا واجب الوجود ایک مجرد تصور ہے جو بے لچک، ٹھوس اور غیر متحرک ہے۔ پس وہ ہماری زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ایسی واجب الوجود ہستی ہماری عبادت اور پوجا کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس واجب الوجود کا تصور تاج محل کے روضہ کی طرح ہمارے دلوں میں حیرت اور تعجب کے جذبات پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ خود انسانی جذبات کی جانب سے بے نیاز ہے۔ اس واجب الوجود مطلق ہستی کو نہ تو اس کے پرستاروں کے خوف پر ترس آتا ہے اور نہ اس کو ان کی محبت کے جذبہ کی پرواہ ہے۔

شینکر اچاریہ کے فلسفہ کا ایک اور جزو ہے جس نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی زندگی پر بے حد اثر ڈالا ہے اور وہ جزو تیاگ اور تپسیا کا جزو ہے جو نہایت اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں کوئی شے بھی اس قابل نہیں کہ اس کا پیچھا کیا جائے۔ بیماری اور موت سب خلقت کے حصے میں ہے۔ اگر آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ایک دن تو سب نے مرنا ہے۔ مٹی کے سوا انسان کا کچھ حصہ باقی نہیں رہتا۔ روئے زمین کی کوئی شے انسانی روح کی ترقی کے لئے زینہ کا کام نہیں دے سکتی۔ شینکر کہتا ہے کہ سنسار اور اس کی سب چیزوں کی محبت فضول اور بے کار ہے۔ اس کی وہ یہ مثال دیتا ہے کہ ایک شخص پر ایک جنگلی درندہ نے حملہ کیا۔ اس نے درندے سے بچنے کی خاطر ایک اندھے کنوئیں میں جو قریب ہی تھا، چھلانگ مار دی۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ ایک اژدہا منہ کھولے اس کی جانب چلا آ رہا ہے۔ اس نے اوپر جو نظر کی تو ایک درخت کے پودے کو دیکھا جو کنوئیں کی دیوار میں اُگ رہا تھا۔ پس اس نے کود کر اس کو پکڑ لیا۔ سہارا لیتے لیتے وہ تھک گیا اور خیال کرنے لگا کہ بس میں اب گرا۔ موت کنوئیں کے اندر و باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

لیکن وُہ پودے سے لٹکا ہی رہا، ناگاہ اُس کی نظر درخت کی جڑ کی طرف جو گئی تو کیا دیکھتا ہے کہ دو چُوہے، ایک کالا اور دُوسرا سفید، اُس کی جڑ کو کاٹ رہے ہیں۔ شنکر کہتا ہے کہ اسی طرح ہم سنسار کے چکر میں سفر کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ سب اشیا جن سے ہمارا لگاؤ ہے، فانی ہیں لیکن پھر بھی ہم ان پودوں کا سہارا پکڑے رہتے ہیں اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ دن کا سفید چوہا اور رات کا کالا چوہا ان چیزوں کی جڑوں کو برابر کاٹ رہا ہے۔ لیکن ہم زندگی کے درخت سے دیدہ و دانستہ لٹکتے رہتے ہیں اور اس درخت کے پتّوں پر کے شہد کو چاٹتے رہتے ہیں۔ پس شنکر کہتا ہے کہ بڑی سے بڑی تپسیا کے بغیر زندگی کے مقصد کا حصُول ناممکن ہے اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ہمارے اندر کی خواہش مر جاتی ہے اور ہم دُکھ سُکھ دونوں کو تیاگ دیتے ہیں۔

ہم نے شنکر اچاریہ کے فلسفہ کے اس پہلو کا ذکر کیا ہے کیوں کہ ان خیالات کا اثر ہندوستان میں اسلامی تصوّف اور مسیحی تصوّرات پر پڑا ہے اور یہ اثر صدیاں گذرنے کے باوجود موجودہ زمانہ تک بھی زائل نہیں ہُوا۔ زمانہ نے بہتیرے پلٹے کھائے۔ تصوّرات کی دُنیا میں بڑے انقلاب آئے لیکن شنکر کے فلسفیانہ خیالات اَب تک ہمارے مُلک کے انسانوں کے دل و دماغ کو متأثر کرتے چلے آتے ہیں۔

(۵)

شنکر اچاریہ کے قریب تین صدیوں کے بعد رامانج (از ۱۰۲۷ء تا ۱۱۳۷ء) آیا جس کا ذکر ہم جلد دوم کے باب نہم کی فصل سوم میں کر آئے ہیں۔ شنکر اچاریہ کے بعد اس کے فلسفیانہ خیالات نے ہندو فلسفہ اور ہندو مت اور ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر کیا ہے۔ شنکر

اور رامانج دونوں ویدانت کے زبردست مُفسّر ہیں۔ دونوں کے سامنے ایک ہی قسم کے مسائل ہیں۔ دونوں ایک ہی متن سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن دونوں کے فلسفیانہ نتائج میں بُعد المشرقین ہے۔ رامانج کے خیالات جیسا ہم جلد دوم میں بتلا چکے ہیں مسیحی الٰہیات سے متأثر تھے۔ وُہ ایک مجرد واجب الوجود ہستی کو نہیں مانتا بلکہ وُہ ثنویت کا سب سے بڑا فلسفی ہے۔ وُہ خُدا اور کائنات کو جُدا مانتا ہے۔ وُہ خُدا کی شخصیت کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ خُدا ایک ہے لیکن اُس کی جوہرِ ذات میں تفریق ہے اور اُس میں ماتحت ذاتیں ہیں جو ازلی ہیں۔ خُدا اور کائنات کا بجنسہٖ وُہی تعلّق ہے جو رُوح اور بدن کا ہے وُہ شنکر کے اس نظریہ کا سخت مخالف ہے کہ واجب الوجود کی وحدتِ محض وحدتِ وجود یا وحدتِ جوہر ہے۔ وُہ ہر فردِ بشر کے حقیقی وجُود کا قائل ہے اور کائنات کو مایا نہیں مانتا۔ جہاں شنکر کہتا ہے کہ جس طرح تمام کائنات مایا ہے اُسی طرح اوتار بھی مایا ہی مایا ہیں اور اُن کا دیگر اشیا اور انسانوں کی طرح کوئی حقیقی وجُود نہیں ہے وہاں رامانج کہتا ہے کہ خُدا دُنیا میں انسانوں میں فی الحقیقت آیا اور وشنو محض اپنے فضل و کرم کی وجہ سے مجسّم ہو کر اس دُنیا میں آیا تاکہ بنی نوع انسان نجات پائے۔

رامانج خُدا اور کائنات کے باہمی تعلّقات پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خُدا ایک قائم بالذّات اور واجب الوجود ہستی ہے۔ انسانی ارواح گو ہستی ہیں گو ان کی ہستی کا مدار اور انحصار خُدا کی ہستی پر ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ رُوحانی اصول کائنات میں جاری اور ساری ہے اور وُہ مایا نہیں ہے۔ وُہ اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ نجات یافتہ رُوحوں کی انفرادیت باقی رہتی ہے۔ اگرچہ کائنات دُنیا اور انسانی رُوح دونوں کا وجُود ہے تاہم وُہ پرماتما کی ذات کی ہستی نہیں ہیں

کیونکہ برہما ازل سے ہی ہر نقص سے مبرا ہے لیکن مادہ ایک غیر شعوری شئے ہے اور روح میں اودیا اور دُکھ دونوں موجود ہیں۔

رامانج کی اخلاقیات بھی قدرتاً شنکر کی اخلاقیات سے مختلف اور جداگانہ ہیں۔ رامانج کے فلسفہ میں ہر فرد بشر فاعل خود مختار ہے جب انسانی رُوح اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کرکے خُدا کو بھول جاتی ہے تو خدا کرم کے قانون کے ذریعہ اس کو ہوش دلاتا ہے۔ چونکہ خُدا ہر انسان میں بستا ہے پس انسان اپنی گنہگاری کا احساس کرکے خُدا سے مدد کا طلبگار ہوتا ہے۔ رامانج کے فلسفیانہ خیالات میں انسانی ذمہ داری، گناہوں کے احساس اور خُدا کے فضل پر خاص زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ یامناچاریہ کہتا ہے کہ "میں ایک ایسا برتن ہوں جس میں ہزاروں گناہ بھرے پڑے ہیں" اور پھر وہ خُدا کے رحم اور فضل کے لئے دعا کرتا ہے۔ رامانج کہتا ہے کہ مکتی نہ تو گیان سے حاصل ہوتی ہے اور نہ کرم سے بلکہ وہ بھگتی کے ذریعہ خُدا کے فضل سے ہی ملتی ہے۔ پس وشِشٹومت میں تپسیا کو دخل نہیں ہے۔ حقیقی گیان ہم کو تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب ہمارے بُرے کرموں کا ناش ہو جاتا ہے لیکن جب تک ہمارے کرموں میں خودی کا عنصر موجود ہے، یہ ہو نہیں سکتا۔ محض رسوم کو پورا کرنے سے ہمارے بُرے کرم دُور نہیں ہوتے۔ مُکتی حاصل کرنے کے لئے صدق دل سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ گیان اور کرم دونوں بھگتی کے وسیلے ہیں اور بھگتی محض جذبہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے تصور میں خدا کا حقیقی عرفان اور خُدا کی مرضی پر تابعداری سے چلنا، دونوں شامل ہیں۔ اس کا کمال وجدانی طور پر خُدا کا حصول ہے۔ بھگتی اور مُکتی دونوں کا باہمی تعلق ایسا ہے کہ بھگتی کی ہر منزل پر ہم اپنے آپ کو کامل کرتے چلے جاتے ہیں اور

خُدا کا شعور منزل بمنزل زیادہ گہرا اور واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسان اپنے آپ کو کلی طور پر خُدا کو سونپ دیتا ہے کیونکہ خُدا اُس کی جان کی جان ہے۔ اس منزل پر خُدا خودی کی جگہ لے لیتا ہے اور ہماری زندگی میں ایسی عظیم تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہماری کایا پلٹ جاتی ہے۔

اب ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ گو شنکر اور رامانج دونوں ایک ہی متن سے بحث کرتے تھے لیکن دونوں کے نتائج ایک دوسرے سے کُلیتہً مختلف تھے۔ شنکر کے واجب الوجود کا تصور ست، چت، آنند کا ہے جس میں بھگتی کے لئے کوئی جگہ نہیں کیونکہ بھگتی مت ایک شخصی خُدا کا قائل ہے۔ مایا کے عقیدہ میں محبت اور دین داری اور اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پس شنکر اور رامانج کے فلسفیانہ نتائج ایک دوسرے کی جڑ پر کلہاڑی کا کام دیتے ہیں۔

رامانج کے زمانہ میں ہندوؤں کی اخلاقی اور روحانی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی تھی۔ عوام الناس کا مذہب بس یہی تھا کہ منتروں کے اخلاق سوز رسوم کو روزانہ ادا کریں۔ جادو منتر کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ عوام الناس کی زندگیوں پر شنکر کے فلسفہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوتا تھا۔ پس رامانج نے وشِشٹومت اور اپنے فلسفیانہ خیالات کے پرچار کے لئے پرچارک بھیجنے اور ملک کے ہندو مٹھوں کی باقاعدہ تنظیم کرنے اور کتابوں کو لکھنے کا انتظام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس غرض کے لئے اُس نے شری رنگم کو اپنا صدر مقام بنایا اور چوبیس ایسے مبلغ چُنے جو اپنے علم و فضل اور پارسائی کے لئے مشہور تھے۔ اُس نے مندروں کی پوجا

پاٹ وغیرہ کی اصلاح اور بیوہ عورتوں کی دردناک حالت کی اصلاح بھی کرنا چاہیے۔ رامانج کی بھگتی کے فلسفہ میں ذات پات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا سے محبت کرنے اور ذات پات میں کوئی تعلق نہیں۔ خدا سے محبت کرنے والوں میں کسی قسم کے امتیاز کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس بھگتی کے فلسفہ میں نہ کسی پروہت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ کسی درمیانی کی۔ کیونکہ محبت کے نذرانہ اور خدا کے فضل کے درمیان کوئی انسان حائل نہیں ہوتا۔ ان خیالات کے پرچار سے اُس نے برہمنوں کی دشمنی سہیڑ لی۔ پس اُس کو جنوبی ہند سے شمالی ہند کی جانب نقل مکانی کرنی پڑی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے مت اور فلسفہ کا پرچار ہندوستان کے طول و عرض میں ہو گیا۔ سلطنت دہلی کے زمانہ میں اُس کے خیالات نے تمام شمالی ہندوستان اور مغربی ہندوستان کے لوگوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ یہ خیالات جیسا ہم پہلے دوم میں بتلا چکے ہیں مسیحیت سے متاثر تھے۔ جب رامانج نے شمالی ہند میں رہائش اختیار کر لی تو اُس کے خیالات نے شمالی ہند کے مسیحیوں کے خیالات کو قدرتاً متاثر کیا کیونکہ یہ انجیلی خیالات تھے جنہوں نے ہندو فلسفہ کا جامہ پہن رکھا تھا۔ جب کوئی مسیحی فاضل مسیحی دینیات کا مطالعہ رامانج کے فلسفیانہ تصورات کی روشنی میں کریگا تو وہ ایک ایسی بنیاد رکھیگا جو ہمارے ملک میں پائدار ثابت ہوگی۔ اور ہمارے ہم وطنوں کو منجی کے قدموں میں لانے کے لئے مفید ہوگی۔

(۲)

رامانج کا ہم عصر نمبارک (تاریخ وفات ۱۱۶۳ء) بھی شنکر کے فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ وہ نمبا میں پیدا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بھنڈارکر

کا خیال ہے کہ یہ جگہ وہی ہے جو موجودہ نمبا پور ہے جو بلیری کے ضلع مدراس کے صوبہ میں ہے۔ رامانج کی طرح وہ بھی بھگتی خیالات کا معتقد تھا اور اس کا نظریہ "دویت آدویت" کہلاتا ہے۔ رامانج اور نمبارک دونوں وحدت اور کثرت کے وجود کو حقیقی اور لازمی قرار دیتے ہیں۔ دونوں کے فلسفہ کے مطابق زندہ ہستیاں اور مادہ چیزیں، دونوں برہما کے اوصاف ہیں لیکن رامانج وحدت پر زور دیتا ہے اور نمبارک کے خیال میں دونوں برابر طور پر حقیقی ہیں اور برابر طور پر لازمی ہیں۔ رامانج ہر فرد کی روح (چت) کو اور دنیا (اچیت) کو برہما کے اوصاف بتلاتا ہے اور وحدت پر زور دیتا ہے لیکن نمبارک کے نظریہ کے مطابق پرماتما میں وحدت کے ساتھ ساتھ کثرت بھی موجود ہے۔ وہ عقل کا دلدادہ نہیں ہے اور صاف کہتا ہے کہ خدا کا ثبوت منطق کی رُو سے ممکن نہیں بلکہ صرف مقدس کتابوں کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ خدا کو ماوراء کائنات ماننے کے باوجود خدا کو شامل کائنات مانتا ہے جس طرح مٹی کے گھڑے میں مٹی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اسی طرح کائنات میں برہما کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ رامانج نارائن اور اُس کی بیوی لکشمی کو مانتا تھا لیکن نمبارک کرشن اور رادھا کو مانتا تھا۔ نمبارک بھی رامانج کی طرح وشنومت کا پیرو تھا۔ اُس کا زمانہ رامانج کے بعد اور مادھو سے پہلے کا تھا۔ نمبارک کے پیرو متھرا اور اُس کے مضافات میں پائے جاتے ہیں۔

رامانج اور نمبارک دونوں وشنومت کے پیرو تھے۔ ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت یا تو وشنومت کی پیرو ہے اور یا شومت کی مقلد ہے اگرچہ ہندو تثلیث کے قائل ہیں جو برہما، وشنو ---

---------- اور

شِو پر مشتمل ہے ۔ برہما کائنات کا خالق ہے ۔ وِشنو تمام خلقت سے محبت کرنے والا نگہبان اور رکھوالا ہے اور شِو تباہ کرنے والا ہے جو زندگی کے جنم اور موت کے لامتناہی چکر میں سب اشیا کو ازسرِ نو تشکیل دیتا ہے تثلیث کا یہ فلسفیانہ تصور اُپنشدوں کی وحدت کے تصور کے زیرِ اثر وضع کیا گیا ۔ لیکن اس نے ہندوؤں کے مذہبی شعور میں کوئی گہری جگہ حاصل نہیں کی عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شِو مت اور وشنو مت والے برہما کو شِو یا وِشنو کا ظہور ہی سمجھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں میں برہما مت نہیں ہے بلکہ اُن کا تیسرا مت شکتی مت ہے ۔ ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت پُرانوں کو مانتی ہے ۔ ان کی چودہ ضخیم جلدیں ہیں جن میں قدیم زمانہ کے بادشاہوں اور بہادر شجاع سورماؤں کے قصے کہانیاں، آفرینش کے نظریے، دینیات کے مسئلے، یاترا کے مقامات کے حالات، اور دیوی دیوتاؤں کے مندروں کے بیان ہیں ۔ ان پُرانوں کی اصل جڑ نہایت قدیم ہے لیکن ان کی موجودہ صورت خداوند مسیح کے بعد کی دس صدیوں کی ہے ۔ ان کا ضمنی ذکر اس واسطے کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ہماری کتاب کے زمانہ کے ساتھ ہے ۔

ابتدا ہی سے شِو مت وشنو مت کا حریف چلا آیا ہے جنوبی ہند میں تو اس کے پیروؤں کی اکثریت ہے اور یہ مت وہاں سنِ عیسوی سے پہلے رائج تھا ۔ پانچویں اور چھٹی صدی مسیحی میں شِو مت اور وشنو مت نے بُدھ مت اور جین مت کے ساتھ سر دھڑ کی بازی لگائی اور ان پر غالب آ گئے ۔ گیارھویں صدی میں شِو مت نے اپنا فلسفہ وضع کیا جس کو "شِو سدھانت" کہتے ہیں ۔ اِس فلسفہ نے ہندو خیالات پر بڑا

زبردست اثر کیا ۔ شِو سدھانت کے مطابق دُنیا مایا نہیں ہے ۔ یہ سنسار ازل سے ہے ۔ مادہ اور جیو بھی ازلی ہیں ۔ دُنیا کا وجود اخلاقی مقصد رکھتا ہے اور خدا ہر وقت انسان کو مادہ کی غلامی سے بچاتا ہے ۔ چنانچہ میکنکلر کہتا ہے کہ اس مت کے مطابق خُدا کی یہی مرضی ہے کہ سب بنی نوعِ انسان اس کو جانیں"۔ بالفاظِ دیگر انسان ہی صرف خُدا کو جاننے کی خواہش نہیں کرتا بلکہ خُدا کی بھی یہی مرضی ہے ۔ ہر شخص جو انجیل کی تعلیم سے واقف ہے، ان عقاید میں انجیلی تعلیم کا اثر دیکھ سکتا ہے ۔ اِس سدھانت کے مطابق گناہ کی غلامی تین قسم کی ہے جس کو دُور کرنا ہر انسان کا فرض ہے ۔ اوّل ۔ لازم ہے کہ ہم "آنوم" یعنی اَوِدیا کو دُور کریں کیونکہ وہ ایک پلیدگی ہے جو روشنی کو تاریک کر دیتی ہے ۔ دوم یہ کہ ہم کرم کے اثر کو زائل کریں جس کی وجہ سے ہم کو ایک بار اور جنم لینا پڑتا ہے ۔ سوم یہ کہ ہم مایا کو دُور کریں جو تمام ناپاکیوں کی اصل جڑ ہے ۔ خدا خود ہماری کوششوں میں ہماری مدد کرتا ہے کیونکہ وہ کوئی ایسی واجب الوجود ہستی نہیں جو مجرد تصور ہی ہو اور انسانی کوششوں کی طرف سے لاپرواہ ہو ۔ شِو ایک ایسا خدا ہے جو فضل سے بھرپور ہے اور ازل سے ہمیشہ اسی انتظار میں رہتا ہے کہ انسانی رُوح اُس سے محبت کرے اور وہ اس پرستش کو خوشی سے قبول کرتا ہے ۔ خدا اور انسان میں جو تعلقات ہیں وہ شخصی قسم کے ہیں ۔ خدا کا فضل ہی حقیقی آزادی کی شاہراہ ہے اور یہ فضل اِس بات کا متقاضی ہے کہ ہر انسان بچے کی طرح شِو پر بھروسا رکھے "جو انسان شِو کے نزدیک نہیں آتے وہ اُس کی بخشش سے محروم رہتے ہیں لیکن جو اُس کے قریب آتے ہیں وہ اُن کو ہر اچھی چیز عطا کرتا ہے ۔ خدا کی ذات میں نفرت کا نشان بھی نہیں ہے"۔ اس فلسفہ میں گناہ کا احساس بڑا

زبردست ہے۔ شِیو کا بھگت اِس احساس کے مارے چلّا اُٹھتا ہے کہ اُس کے گناہ اُس کو خُدا کی رفاقت اور قُربت سے باز رکھتے ہیں (مقابلہ رُومی ۷: ۱۸ - ۲۴)۔ ہندوستانی کلیسیا کی تعلیم کی اشاعت کے زیرِ اثر ہندومت میں گناہ اور ہستی اور خُدا کے فضل سے نجات حاصل کرنے کے عناصر نے جگہ پائی۔ چنانچہ سرچارلس ایلیٹ لکھتا ہے "کسی دُوسرے مت میں ہر بشر کی انفرادی مذہبی زندگی میں اِس قسم کی رُوحانی جنگ، رُوحانی یاس، اُمید و بیم کی ایسی جھلک، ایسا ایمان اور بھروسا نہیں پایا جاتا جو شِیومت کی کتابوں میں پایا جاتا ہے" (ہندوازم اینڈ بُدھ ازم جلد ۲ صفحہ ۲۱۷)۔ اس فلسفہ میں گُرو یا اُستاد کا وجود لازمی قرار دیا گیا ہے اور سچے گُرو کی یہ پہچان ہے کہ اُس میں شِیو بستا ہے اور گُرو کی آنکھوں کے ذریعہ وہ چیلے کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ سچے گُرو کا ایسا جنم آخری جنم ہوتا ہے۔ شِیو جنم نہیں لیتا اور نہ وہ مجسّم ہو کر انسان کی شکل میں آتا ہے۔ شِیومت میں اخلاقیات پر از حد زور دیا گیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ "جو لوگ تمام بنی نوع انسان سے محبت نہیں رکھتے وہ خُدا کو پیار نہیں کرتے" (مقابلہ کرو ا۔یوحنا ۴: ۷ - ۸)۔ اس مت میں اگرچہ کرم کا قانون اٹل ہے پھر بھی انسان فاعل خود مختار ہے (گلتی ۶: ۷ وغیرہ) جب انسان نیکی کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خُدا بھی اُس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ ہر شخص جو انجیلی تعلیم سے واقف ہے ان عقائد میں اس کا اثر دیکھ سکتا ہے۔ مسیحیت کے زیرِ اثر بعد کے زمانہ کے شِیومت کے معلّم ذات پات کے مخالف ہو گئے اور کہنے لگے کہ جس طرح خُدا ایک ہے اسی طرح ہر انسان کی اصل اور ذات بھی ایک ہی ہے (دیکھو اعمال $\frac{17}{25}$)۔ ممکن ہے کہ اسلام نے بھی اس بات میں اس پر اثر کیا ہو لیکن اسلام انسانی اُخوت کا قائل نہیں وہ صرف اسلامی اُخوت کا

ہی قائل ہے (نساء ۸۸ ممتحنہ ۱۰)۔ اِس مت میں بارھویں صدی مسیحی میں جو نئی تحریک پیدا ہوئی وہ برہمنوں کے اختیار اور اقتدار کے خلاف گویا ایک بغاوت تھی۔ اس تحریک کا بانی بسوّ تھا جو خود برہمن تھا۔ یہ تحریک جُونوں کے نظریہ کی بھی قائل نہ تھی۔ اس کے مطابق انسان بار بار جنم نہیں لیتا۔ شِیومت کے مطابق نجات یافتہ رُوح خُدا کے ساتھ ایک ہو کر فنا نہیں ہو جاتی بلکہ وہ ہمیشہ خُدا کے حضور اور اُس کی قُربت میں رہتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "جب انسانی رُوح گناہ سے آزاد ہو جاتی ہے تو اُس کو شِیو کا سا مقام حاصل ہو جاتا ہے"۔ شِیومت کے بعض پیرو کہتے ہیں کہ جب انسان گناہ سے آزاد ہو جاتا ہے تو بدن میں شِیو کی سی روشنی آ جاتی ہے اور وہ روشن ہو جاتا ہے"۔ خُدا سے یگانگت حاصل کرنے سے پہلے جیون مُکت کی حالت خُدا کی سی ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ جسم میں ہی ہوتی ہے۔ ایسا شخص دُوسری تجویز نہیں بدلتا۔ شِیومت کے پرچارک نہایت جوشیلے تھے اور اُنہوں نے تمام ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے مت کی تعلیم کو پھیلا دیا ہر انجیل خواں پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اس مت کے عقائد پر انجیل کا کس قدر اثر ہے۔

(۷)

ہم نے جلد دوم کے باب نہم کی فصل سوم میں مادھوا چاریہ (تاریخ پیدائش ۱۱۹۹ء) کے حالات اور فلسفیانہ خیالات کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسّی سال تک زندہ رہا۔ پس وہ غالباً رامانج کا ہمعصر تھا۔ اس کی نشو و نما اُس زمانہ میں ہوئی جب شمالی ہندوستان میں اسلامی سلطنت مستحکم ہو چکی تھی۔ وہ ایک نہایت زبردست مناظر تھا جو ہندوستان کے طول و عرض میں گیا اور نہایت دلیری سے ہندومت کے دیگر فرقوں اور اسلام کا مقابلہ کرتا رہا۔ اِس نے

شینکر اور رامانج کی طرح بھاگوت گیتا اور ویدانت سوتر کی تفسیریں لکھیں۔ وہ ہردوار میں رہا جہاں سے اس نے اپنے پرچارک چاروں طرف بھیجے۔ مادھو کے خیالات رامانج سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ شینکر مجرد وحدت کا قائل تھا۔ رامانج نے اس وحدت کی قطعیت اور ہمہ گیری کو نرم کیا لیکن مادھو صاف کہتا ہے کہ کائنات کا وجود خارجی وجود ہے اور ازل سے ہی خدا سے جدا ہے۔ انسانی روح اور مادی اشیا نہ تو خدا ہیں اور نہ خدا کا حصہ ہیں۔ اس کا فلسفہ واضح طور پر ثنویت کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "تت تو ام اسی" محض فضول بات ہے۔ انسانی روح خدا نہیں۔ جب وہ آزاد بھی ہو جاتی ہے تب بھی وہ خدا سے جدا وجود رکھتی ہے۔ خدا کا فضل گیان سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ خدا کی نیکی کے اس علم سے حاصل ہوتا ہے جس کا نتیجہ نیک اعمال ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "جب انسانی روح آزاد ہو جاتی ہے تو وہ وشنو کے حضور تا ابد رہتی ہے اور اس مبارک حالت میں مگن رہتی ہے۔ وشنو آزاد روحوں کی پناہ گاہ اور اعلیٰ ترین حاکم ہے اور وہ ابد تک اس کے تابع فرمان رہتی ہیں کیونکہ وہ ان کا خداوند ہے"۔ خلق خدا کی خدمت کرنی تمام نیکیوں سے افضل ہے۔ ان عقائد سے ظاہر ہے کہ انجیلی تعلیم نے اس پر بڑا اثر کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ وشنو کے بیٹے وایو کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے جلد دوم میں بتلایا ہے کہ اس کے فلسفہ پر مسیحیت کا نمایاں اثر ہے۔ ہندوستان کے تمام متوں میں صرف مادھو کا ہی مت ہے جو نجات کا اس قسم کا ذریعہ بتلاتا ہے۔ اور جب ہم اس بات کو زیر نظر رکھتے ہیں کہ اس کی زندگی کے بعض واقعات خداوند مسیح کی زندگی کے واقعات کی نقل ہیں تو ہم پر یہ اثر اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً مادھو کا لڑکپن میں اڈپی کے مندر کو جانا۔ اپنے مت کے پرچار سے پہلے ہمالیہ پہاڑ پر دعا اور فاقہ کرنا۔

روٹیوں میں اعجازی طور پر افزائش کرنا وغیرہ۔ بلکہ بعض خالص انجیلی محاورے اس کے مت میں پائے جاتے ہیں مثلاً "خوشخبری کا دینا"۔ "آدمیوں کے مچھوے بنانا" (متی ۴/۱۹) وغیرہ۔ یہ تمام باتیں شمار میں اس قدر ہیں کہ وہ اتفاقیہ نہیں ہو سکتیں۔ ان سے صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مادھو کی تعلیم انجیل سے بہت حد تک متاثر تھی۔

(۸)

ہم نے جلد دوم کے باب نہم کی فصل سوم میں رامانند (تاریخ پیدائش ۱۲۹۹ء) اور کبیر (از ۱۳۸۰ء تا ۱۴۲۰ء) کا ذکر کیا ہے پس ہم ناظرین کی توجہ اس جلد کی طرف منعطف کرنے پر اکتفا کر کے یہ ایزاد کرتے ہیں کہ گو بھاگوت مت اور بھگتی نے ہندوستان میں جنم لیا تھا لیکن رامانند کی بھگتی کے تصورات گیتا کی بھگتی سے کہیں زیادہ پختہ اور مکمل ہیں۔ ڈاکٹر گرائرسن کا قول ہے کہ گیتا کے توحیدی خیالات اور رامانند کی توحید میں وہی نسبت ہے جو افلاطون کے خیالات اور مقدس پولوس کے خطوط میں ہے۔ بھاگوت مت کی شمع جنوبی ہند میں مدھم طور پر جلتی تھی لیکن چودھویں صدی میں رامانند کے تصورات نے اس کو ایسا چمکا دیا کہ نصف صدی کے اندر اندر یہ مت ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل کر زبردست صورت اختیار کر گیا۔

رامانند ذات پات کے امتیاز کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "کسی شخص کا یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے سے اس کی ذات پات کی نسبت سوال کرے۔ جو انسان خدا سے محبت رکھتا ہے وہ خدا کا ہے"۔ چنانچہ اس کے چیلوں میں برہمن، حجام، راجپوت، چمرنگ وغیرہ سب تھے۔ وہ عورتوں اور مردوں دونوں کو برابر طور پر اپنے چیلے بناتا تھا۔ وہ الہ آباد میں پیدا ہوا تھا اور اس نے تمام شمالی ہند کے تیرتھوں کی یاترا کی

تھی۔ وہ ہندو عوام کو ہندی میں تعلیم دیتا تھا اور مسلمانوں کو بھی اپنے بھگتی کے عقائد کی تعلیم دیتا تھا۔

کبیر کے خیالات پر مسیحیت نے زبردست اثر کیا تھا۔ اس اثر کی چند مثالیں ہم جلد دوم میں دے آئے ہیں۔ اسلام نے بھی اُس کو متاثر کیا تھا۔ وہ بت پرستی، ذات، اور عبادت کی ظاہری رسوم کا سخت مخالف تھا۔ وہ خدا کی وحدانیت کا قائل تھا جس کو وہ کبھی علی اور کبھی رام کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے "سر کو مونڈنے، سجدہ کرنے اور دریا میں نہانے کا کیا فائدہ ہے جب تم خون کرتے ہو، مسواک کے کرنے، مالا جپنے، گلا پانی سے صاف کرنے، مندر میں سروں کو جھکانے، دعا مانگنے اور مکہ مدینہ جانے کا کیا فائدہ ہے جب تمہارے اندر فریب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے؟" "ہندو برت رکھتے ہیں، مسلمان روزہ رکھتے ہیں لیکن جن دنوں اور مہینوں میں برت اور روزے نہیں رکھے جاتے کیا وہ خدا نے نہیں بنائے؟" "اگر خدا مندروں میں ہی رہتا ہے تو کائنات میں کون بستا ہے؟ رام کو کس نے بتوں کے درمیان بیٹھے اور مقدس مقامات میں رہتے دیکھا ہے؟" کبیر خدا کی وحدت کی منادی کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اسلام اور ہندو مت کی بنیادی تعلیم ایک ہی ہے۔ دونوں ایک ہی خدا کے پرستار ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "ہندو اور مسلمان ایک ہی مٹی کے برتن ہیں"۔ "اللہ" اور "رام" ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں"۔ بیرونی اور غیر ضروری باتوں نے دونوں میں جدائی کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ پس وہ ہر جگہ ایسی امتیازات کو ختم کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ وہ ہندوؤں کی بے جا رسوم اور بالخصوص جنیو، ذات پات اور مندروں کی رسوم کا جانی دشمن تھا۔ وہ اسلامی روزہ، حج اور نماز لازمی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خدا کی وحدت کی بھگتی کے ذریعہ نجات کو حاصل کرنے کی اور

تمام مذہبوں اور فرقوں کو یکساں طور پر ماننے کی تعلیم دیتا تھا۔ اس قسم کی تعلیم وحدتِ ادیان کا ہم آگے چل کر فصل سوم میں ذکر کریں گے۔ کبیر اس بات پر زور دیتا ہے کہ حقیقی گورو کی تلاش کی جائے اور جب وہ مل جائے تو اس کی دل و جان سے فرمانبرداری کی جائے۔ کبیر پنتھی شمالی اور وسط ہند میں لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

(۹)

وَلَبھ جنوبی ہند کا ٹیلیگو برہمن تھا جو نقل مکانی کر کے شمالی ہند آ گیا تھا اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کا زمانہ ۱۵۳۰ء کا ہے۔ اُس نے وشنو سوامن کے خیالات کو تکمیل دی جو تیرھویں صدی میں رہتا تھا۔ وہ نہ صرف اُپنشدوں کو اور بھاگوت گیتا اور برہم سُوتروں کو ہی مانتا تھا بلکہ بھاگوت پران کو بھی مستند سمجھتا تھا۔ اُس نے ویدانت کی توحیدی تاویل کی تاکہ خدا اور کائنات، دونوں کے حقیقی وجود کو تسلیم کر سکے۔ اُس کے فلسفہ کو "شُدھ ادوَیت" یعنی خالص ادوَیت کہتے ہیں جو شنکر اور رامانج دونوں کے فلسفہ سے الگ ہے۔ اُس کا یہ نظریہ ہے کہ جس طرح برہما ازلی اور حقیقی ہے اُسی طرح کائنات ازلی اور حقیقی ہے جس کی پیدائش اور خاتمہ برہما کی شکتی کی وجہ سے ہے۔ برہما جب چاہتا ہے اپنی مرضی کے مطابق انسان بن کر ظاہر ہوتا ہے لیکن تجسّم سے اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کا علتِ فاعلی ہے اور علتِ مادی بھی ہے۔ ہر فرد برہما کا حصہ ہے کیونکہ دونوں کا جوہرِ ذات ایک ہی ہے۔ دونوں کا رشتہ شعلہ اور آگ کی مثال سے واضح ہو جاتا ہے۔ مایا کی دنیا کا وجود بھی حقیقی ہے کیونکہ برہما کائنات کا علتِ فاعلی اور علتِ مادی ہے۔ وہ نہ صرف کائنات کا خالق ہے بلکہ وہ خود کائنات ہے"۔ برہما نے چاہا کہ اس

کی وحدت کثرت ہو جائے گی پس وہ آپ دُنیا اور انسانی ارواح کی کثرت ہو گیا کیونکہ برہما کی ذات میں، اپنے ظہور کی خواہش موجود ہے۔

وَلّب کے فلسفہ کے مطابق مایا ایشور کی اُس طاقت کا نام ہے جس کے ذریعہ دُنیا کی ارتقا اور اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ برہما کو کوئی نہیں جانتا لیکن جب وہ کائنات کے ذریعہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تو وہ جانا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو حقیقت سے واقف ہیں، اُن کو یہ علم حاصل ہو جاتا ہے کہ دُنیا برہما کا ظہور ہے۔ مایا اور اودیا میں فرق ہے۔ اودیا کا تعلق انسان کے ذہن کے ساتھ ہے۔ کائنات غیر حقیقی شے نہیں کیونکہ اگر دُنیا کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو ہم یہ بھی نہ کہہ سکتے کہ دُنیا اور برہما ایک ہی ہیں۔ اور ایک حقیقی وجود کسی غیر حقیقی شے کے برابر نہیں ہو سکتا۔

وَلّب کہتا ہے کہ چونکہ جیو مایا سے مقید ہے پس انسان صرف خُدا کے فضل اور کرم ہی کی وجہ سے نجات حاصل کر سکتا ہے اگرچہ گیان مُکتی کے حصُول میں مدد دے سکتا ہے۔ لیکن گیان کے حاصل کرنے کا اصلی وسیلہ بھگتی ہے۔ جب ہم خُدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں تو ہمارے گناہ ہم سے دُور کئے جاتے ہیں۔ وَلّب ہر قسم کی تپسیا کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا بدن خُدا کی ہیکل ہے پس اس کو خراب اور برباد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اس قسم کی تمام کوششیں بے سُود ہیں۔ خُدا کا عرفان حاصل کرنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی کرم ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور نجات یافتہ لوگ کرم کرتے رہتے ہیں۔

زندگی کا اعلےٰ ترین مقصد انسان کی مُکتی نہیں ہے بلکہ کرشن کی خدمت ہے۔ اور اُس کی لیلاؤں میں شرکت کرنا انسان کا بہترین مطمعِ نظر ہے۔

وَلّب اس بات پر خاص طور پر زور دیتا ہے کہ انسان کو کرشن سے غیر مشروط طور پر محبت رکھنی چاہیے۔

وَلّب نے اپنے خیالات کا پرچار متھرا اور اُس کے گرد و نواح میں کیا جہاں سے اُس کا مت مغربی ہند اور شمالی مغربی ہند میں پھیل گیا۔ موجودہ زمانہ میں اُس کے بے شمار پیرو بمبئی اور کچھ میں رہتے ہیں۔ جہاں تک اُس کے فلسفیانہ خیالات، توحید، تجسیم، مظہرِ خُدا، وحدت فی الکثرت۔ حقیقی نجات کے مفہوم اور تپسیا کے متعلق ہیں ان پر مسیحیت کا اثر ظاہر ہے۔ لیکن زمانہ کے گذرنے کے ساتھ اُس کے پیروؤں نے اُس کی تعلیم کو ایسا بگاڑا کہ وہ شہوت پرستی کا ذریعہ بن گئی۔ اور آج کل اُس کا مت عشق بازی ہو گیا ہے۔ اُس کے پروہت کرشن کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے اختلاط کرتے ہیں۔ اس بگاڑ کی اصل وجہ یہ تھی کہ وَلّب بھاگوت پران کو مستند مانتا تھا اور کہتا تھا کہ زندگی کا اعلےٰ ترین مقصد کرشن کی لیلا میں شرکت کرنا ہے اس پران میں کرشن اور گوپیوں کی کہانیوں کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس سے قوتِ متخیلہ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بھگتی کو عشقیہ پیرایہ میں زن و مرد کے جنسی تعلقات کے ذریعہ پیش کیا گیا اور اس مت میں بھگتی مخربِ اخلاق ہو کر رہ گئی۔

(۱۰)

جنوبی ہند کے وِشنو مت کے ماننے والوں نے بندرابن کی لیلا اور گوپیوں کی کہانیوں کو بہت نہ بڑھایا لیکن جیسا ہم ابھی کہہ چکے ہیں شمالی ہند میں اُن پر بے حد زور دیا گیا۔ چنانچہ نمبارک کی تصنیفات میں کرشن کی پیاری محبوبہ رادھا کو نہ صرف گوپیوں کی سرکردہ بلکہ کرشن کی ازلی محبوبہ قرار

دیا گیا۔ چے دیو اور چنڈی داس (جو چودھویں صدی میں تھا) کی تصنیفات میں ہم کو رادھا کرشن مت کی وُہ حالت نظر آتی ہے جو بہار اور بنگال کے صوبوں میں مروّج تھی۔ چیتنیہ کے خیالات نے اسی فضا میں پرورش پائی۔ یہ مشہور بنگالی مصلح اور فلاسفر ۱۴۸۵ء میں پیدا ہُوا تھا۔ پچیس سال کی عمر میں اُس نے سنیاس اختیار کیا اور تمام بنگال میں چھ سال تک شہر بہ شہر پھر کر ویدانت فلسفہ کی تعلیم دیتا رہا۔ اس کے بعد وُہ پوری آیا جہاں اُس نے اپنی زندگی کے بقایا سولہ سال کاٹے۔

چیتنیہ نے وِشنو مت کو نئی تشکیل دی۔ وُہ ذات پات کا سخت مخالف تھا اور اُخوتِ انسانی کی تعلیم دیتا تھا۔ چنانچہ اُس کے حلقہ میں ایسے آدمی بھی تھے جو پہلے مسلمان تھے۔ مثلاً ہری داس اُس کے اوّلین چیلوں میں سے تھا جو پہلے ایک مسلمان فقیر تھا۔ یہ شخص اپنے زُہد و تقدّس کے لئے ایسا مشہور ہے کہ وُہ وِشنو مت کا ایک بڑا رُکن مانا جاتا ہے۔ اُس کے چیلے رُوپ اور سناتن پہلے مسلمان ہو گئے تھے اور ہندو سماج نے اُن کو خارج کر رکھا تھا لیکن چیتنیہ نے اُن کو اپنے حلقہ میں شامل کر لیا۔ اُس کی یہ تعلیم تھی کہ انسان نہ تو اپنے اعمال کے ذریعہ نجات حاصل کر سکتا ہے اور نہ مذہبی رسُوم پر عمل کرنے سے مکتی پراپت ہوتی ہے۔ صرف ہری کا نام جپنے سے اور اُس کی تعریف کے گیت گانے سے ہی نجات ملتی ہے۔ سری کرشن ہی واحد اور بزرگترین خُدا ہے۔ اُس کی وُہ لیلا جو گوکل میں رچی گئی ایک ابدی تصوّر ہے۔ ہر انسان کرشن کو بھگتی کے ذریعہ اور صرف بھگتی کے ذریعہ ہی حاصل کر سکتا ہے۔ انسانی رُوح کی اعلےٰ ترین منزل یہی ہے کہ وُہ ابد تک اپنے مالک میں اُسی طرح مگن رہے جس طرح ایک عاشق اپنے معشوق میں مگن رہتا ہے۔ رادھا ہر فردِ بشر کی رُوح ہے جو محبت کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔

حقیقی نجات یہ نہیں کہ جنم کے چکر سے چھٹکارا ملے بلکہ انسان کا حقیقی مقصود یہ ہے کہ پہلے کرشن کی خدمت کی جائے، پھر اُس سے محبت کی جائے۔ پھر اُس کا بیٹا بن کر انسانی زندگی بسر کرے۔ اس مسلک کی آخری منزل یہ ہے کہ وُہ کرشن کا عاشق صادق ہو کر رہے۔ ہم خُدا کو دماغ اور عقل کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ صرف جذبات کے ذریعہ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اس کے فلسفیانہ خیالات کی یُوں تشریح کرتا ہے "جس طرح شہد کی مکھی شہد نہیں ہوتی بلکہ اُس کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے اور جب وُہ شہد کو پی لیتی ہے تو وُہ شہد سے اس قدر بھر جاتی ہے کہ وُہ گویا شہد ہی ہو جاتی ہے اسی طرح انسان کی آتما پرماتما سے انفرادی طور پر الگ ہوتی ہے اور ہر وقت پرماتما کی تلاش میں ہی رہتی ہے۔ پھر وُہ محبّت کے ذریعہ پرماتما سے معمُور ہو جاتی ہے اور اپنی زندگی اور خُودی کو فراموش کر کے گویا پرماتما میں جذب ہو جاتی ہے" (وِشنوازم صفحہ ۸۰)۔

چیتنیہ نے وِشنو مت میں نئے سرے سے زندگی ڈال دی۔ اُس نے اپنے دو چیلوں کو بنگال بھیجا اور کہا "اس مت کا خاص و عام میں سب کو پیغام دو۔ تمام لوگوں کو اور چنڈالوں کو بھی سبق دو اور ہر ایک کو بھگتی اور محبت کے اصُول کی تعلیم دو"۔ اس کا محبّت کا اصُول ایمان پر مبنی ہے اور تمام مخلُوقات پر حاوی ہے۔ اس محبّت کے دائرہ میں ذات اور نسل کی امتیاز نہیں ہے اور اس کا مفہُوم ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہے۔ محبت اس کی تعلیم کا مرکز ہے وُہ کہتا تھا کہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو جسم اور رُوح سمیت خُدا کو دیدے۔ اور اپنی ذاتی اغراض و مفاد کو پسِ پُشت پھینک کر ہر انسان کو چاہیے کہ وُہ ہر حالت میں اپنے مالک کی مرضی پر چلے اور اس راہ میں کسی قُربانی سے بھی

دریغ نہ کرے۔ کرشن سے اُس کو اِس قدر عشق تھا کہ کرشن کے بانسری بجانے کا خیال ہی اُس کو وجد کی حالت میں لے آتا تھا۔ اُس کا دل محبت اور انسانی ہمدردی سے پُر تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "جب مَیں انسانوں کے دُکھ اور رنج کی طرف دیکھتا ہُوں تو میرا دل غم کے وفور سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اَے خُدا تُو اُن کے گناہ مجھ پر لاد دے۔ اُن کے گناہوں کی سزا میں اُن کے عوض مجھ کو جہنم میں دھکیل دے۔ پر تُو اُن کے دلوں کے غم دُور کر دے"۔ یہ تھی محبت کی تعلیم جو چیتنیہ برہمنوں اور شودروں، بڑوں اور چھوٹوں، سب کو سکھلاتا تھا چیتنیہ اُخوت انسانی کا سبق ہر کس و ناکس کو دیتا تھا اور کہتا تھا کہ خُدا ہندوؤں اور مسلمانوں، برہمنوں اور چنڈالوں، سب کا خُدا ہے اور اُس کی نظر میں سب برابر ہیں اور اُس کا ہر پرستار اُس کو پا سکتا ہے۔ اُخوت کا یہ سبق اُس نے مسیحیت سے سیکھا تھا۔

چیتنیہ نے محبت کے اصُول کو اِس قدر عام کر دیا کہ وہ کہتا تھا کہ اپنے دُشمنوں سے بھی محبت رکھو۔ اِس کے لئے درخت کی مثال دے کر کہتا تھا کہ "تم درخت کی مانند بنو جو اُن سب کو سایہ دیتا ہے جو اُس کو کاٹتے ہیں۔ وہ کسی سے پانی تک نہیں مانگتا خواہ وہ کملا کر مر ہی کیوں نہ جائے۔ وہ آفتاب کی گرمی، دھوپ، آندھی، طوفان، بارش وغیرہ سب کی برداشت کرتا ہے۔ سب کو خوشبودار پھول اور ذائقہ دار پھل دیتا ہے۔ تم درخت کے نمونہ کو ہمیشہ نگاہ میں رکھو اور نہایت صبر تحمل اور محبت کے ساتھ سب لوگوں کی خدمت کرو"۔ یہاں مسیحیت کا اثر ظاہر ہے۔

جس زمانہ میں وشنومت محض جنسی جذبات کو پُورا کرنے کا آلہ ہی رہ گیا تھا۔ چیتنیہ نے جنسی پاکیزگی کو بھگتی مت کا جزو لاینفک قرار دے دیا (متی ۱۹: ۱۲ و

تھسلنیکیوں ۲: ۲۲ وغیرہ) چودھویں صدی میں چندی داس نے تعلیم دی تھی کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات ہی نجات کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس کا فرقہ "سہجیا" (بمعنی فطرتی) مت کہلاتا ہے۔ اِس مت کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ عیاشی اور زناکاری عام بات ہو گئی تھی۔ چیتنیہ نے اِس قسم کے خیالات کی جان توڑ مخالفت کی اور اس کی روک تھام کی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں وشنو مت زور پکڑ گیا اور بنگال، بہار اور اڑیسہ کے عوام چیتنیہ کے معتقد ہو گئے۔

سولھویں صدی میں چیتنیہ کے مت کو جیوگوسوامی نے اور اُس کے بعد بلدیو نے فلسفیانہ شکل دی۔ بلدیو کی تصنیفات سیدھی سادی عام فہم آسان زبان میں لکھی ہیں، اس واسطے وہ مقبول خلائق ہو گئیں۔ لیکن یہ دونوں مصنف راماُنج اور مادھو کے فلسفیانہ خیالات سے بہت متاثر تھے۔ بلدیو کے فلسفہ کے مطابق وشنو ایک آخری اور قطعی حیثیت رکھتا ہے اور وہ محبت اور فضل کی شخصی صفات سے متصف ہے۔ ان کے علاوہ ست، چت اور انند بھی اُس کی صفات ہیں۔ وہ ان معنوں میں نرگن ہے کہ وہ پرکرتی اور سگون کی صفات سے مبرا ہے کیونکہ وہ قادرِ مطلق اور عالمِ کل ہے۔ وہ کائنات کا منبع اور اُس کا سہارا ہے اور اس کی علتِ غائی، علتِ فاعلی اور علتِ مادی ہے۔ خُدا کی ذات خاص طور پر محبت اور انند ہے۔ اوتار اور تجسم کا مطلب یہ ہے کہ اوتار خُدا کے ساتھ ایک ہوتا ہے۔ دیگر افراد خُدا کی ذات سے الگ ہوتے ہیں اور اُس کا حصّہ نہیں ہوتے۔ لیکن اوتار خُدا سے الگ نہیں ہوتے۔ خُدا لا محدود شکلیں اختیار کرتا ہے۔ اُن میں سب سے بڑی کرشن کی صُورت ہے جس کی سب سے بڑی خوشی کا ظہور محبت میں ہوتا ہے۔ جب کرشن خُدا کے ساتھ ایک ہوتا ہے تو اُس کی تین قوتیں

ہوتی ہیں یعنی چت، مایا اور جیو۔ چونکہ وہ چت ہے اُس کی ذات میں ادراک اور ارادہ دونوں موجود ہیں۔ چونکہ وہ مایا ہے وہ تمام کائنات کا خالق ہے۔ چونکہ اُس میں جیو ہے وہ تمام رُوحوں کا خالق ہے۔ اُس کی چت کا سب سے بڑا ظہور رادھا ہے۔ جیو گوسوامی کہتا ہے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ جب اُس کو اُس کی ذات کے پہلو سے دیکھا جاتا ہے تو وہ برہما ہے جب خالق کے پہلو سے اُس پر نگاہ کی جاتی ہے تو بھگوان ہے۔ پہلا تصور مجرد تصور ہے لیکن دوسرا تصور عالم محسوسات سے متعلق ہے جو زیادہ حقیقت رکھتا ہے۔ بلدیو کہتا ہے کہ خدا کا نام ہری ہے۔ اپنی عظمت کبریائی اور شان میں وہ نارائن ہے اور اپنی خوبصورتی اور وجدانی حالت میں وہ کرشن ہے۔

اس کے فلسفہ کے مطابق کائنات اور مخلوق، سب خدا کی شکتی کی وجہ سے وجود میں آئے۔ اور ان کا انحصار اُس پر ہے۔ اگرچہ وہ اُس سے جدا ہیں اور دونوں میں امتیاز موجود ہے۔ وہ نہ تو خدا کے ساتھ ایک ہیں اور نہ اُس سے جدا ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس فرق کو جو فرق ہے بھی اور فرق نہیں بھی ہے، ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دُنیا کا وجود حقیقی ہے اور وہ مایا نہیں ہے۔ اور نہ وہ دھوکا فریب ہے۔ اُس کو "مایا" فقط اُس کی ذات کی وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کا دھیان خدا سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مایا کے زور کی وجہ سے انسان خدا کی بجائے دُنیا کا غلام ہو جاتا ہے اور اپنی اصلیت کو فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن جوں جوں ہم میں کرشن کی محبت بڑھتی جاتی ہے ہم کو خدا کا ادراک بلاواسطہ ہو جاتا ہے۔ جو محبت کرشن اپنی خلقت سے کرتا ہے وہ ہم کو اس محبت میں نظر آتی ہے جو وہ رادھا سے کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے مخلوق اُس میں اور اُس کی نجات کی اُمید میں قائم رہیں۔ جنسی عشق (کام)

اُس پریم سے جدا ہے جو درحقیقت رُوحانی محبت ہے۔ نجات کا راستہ بھگتی کا راستہ ہے۔ ویدوں کا اور بھگوت پران کا مطالعہ لازمی ہے اور گرو کا احترام واجبات میں سے ہے۔ دینی امور میں عقل پر بھروسا کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔ ذات پات کی تمیز کوئی حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ کوئی انسان ایسا نیچ نہیں ہے کہ خدا کا فضل اُس کو اُوپر اُٹھا نہ سکے۔ اُس کے فلسفہ میں اخلاقیات کا بڑا حصہ ہے جس میں اخلاقی خوبیوں اور نیکیوں پر زور دیا گیا ہے۔ بالخصوص تمام مخلوقات کے ساتھ رحم۔ حلم۔ سکون۔ طمانیت۔ دل کی پاکیزگی اور دُنیاوی خواہشات میں نہ اُلجھنے کی تلقین کی گئی ہے (مقابلہ کرو گلتی ۵: ۲۲ تا آخر) محبت اور بھگتی کے اعلیٰ تجربہ کا نام نجات ہے۔ نفسانی ارواح آسمان میں خدا کی خدمت کے مقام میں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں اور اس پر پروانہ وار نثار ہوتی ہیں۔ قید سے خلاصی کا نام ہی محبت ہے۔ بھگتی ہی دراصل مُکتی ہے جس کے ذریعہ ہم جُونوں کی غلامی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ تب رُوح وہ مقام حاصل کر لیتی ہے جو خدا کا سا ہے اگرچہ وہ خدا میں کبھی فنا نہیں ہوتی۔

چیتنیہ اور اُس کے چیلوں کے مذکورہ بالا خیالات اور تصورات ہم کو بار بار انجیلی آیات و مقامات اور انجیلی تعلیم کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ امر ایسا واضح ہے کہ ہم نے بار بار انجیلی حوالہ جات دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ جو اصحاب انجیل کی تعلیم سے واقف ہیں اُن پر یہ حقیقت بار بار روشن ہو گئی ہو گی کہ یہ تمام تعلیم مسیحیت کی مرہونِ منت ہے۔ چیتنیہ کی پیدائش تک کی کہانیاں ثابت کر دیتی ہیں کہ اُن پر انجیلی اثر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اُس کی پیدائش کے وقت دانشور آئے اور اُنہوں نے اُس نوزائیدہ بچہ کو سجدہ کیا اور اُس کے حضور نذرانے گزرانے (مقابلہ کرو متی ۲ باب)[1]

[1] ENCYCL. OF RELIG. AND ATHICS. VOL. 3. P.33A(B)

جس طرح انجیل میں محبت کے رُوحانی تصوّر کو مرکزی جگہ حاصل ہے اسی طرح چیتنیہ کی تعلیم میں محبت کا عنصر مرکزی جگہ رکھتا ہے۔ دُشمنوں سے محبت رکھنے کا اصُول۔ اُخوّتِ انسانی کا سبق۔ اخلاقی پاکیزگی کی تعلیم۔ تجسّم کا مفہوم۔ خدا کی تین شکتیوں کا عقیدہ اور اُن کا مفہوم۔ خُدا کے عرفان کا حصُول۔ نجات کا تصوّر۔ انسانی رُوحوں کا آخری مقام و منزل۔ ایمان اور شانتی کے اصُول وغیرہ وغیرہ سب کے سب ہم کو بار بار انجیل کے مقامات اور اُس کی تعلیمات کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "چیتنیہ کی تعلیم پر مسیحیت کا اثر نمایاں ہے" (جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۳۶)۔[1]

(۱۱)

سولھویں صدی قرونِ وسطیٰ میں ایک تاریخی صدی تھی۔ اس صدی میں یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی عظیم مذہبی تغیرات اور انقلابات برپا ہوئے۔ مُلک کے مختلف حِصّوں میں مذہبی مُصلح اُٹھے جنھوں نے ہندومت کے عقائد کو حالاتِ زمانہ کے مطابق ڈھالا اور انجیل کی تعلیم کی روشنی میں اخوّتِ انسانی کی اور ذات پات کے امتیازات کو ختم کرنے کی تعلیم دی۔ چنانچہ آسام میں شنکر دیو جو وِشنو مت کا رسُول تھا پیدا ہُوا۔ وُہ کرشن کو ماننے والا تھا لیکن بُت پرستی۔ ذات پات اور خُونیں قربانیوں کا سخت دُشمن تھا۔ اس کے بعد اُس کا چیلا مادھو دیو اس کا جانشین ہُوا جس نے نام گھوش اور رتناولی کتابیں لکھی ہیں، جو بڑی مقبول ثابت ہُوئیں۔ پہلی کتاب نام گھوش ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو سولھویں صدی کے پہلے نصف میں لکھے گئے تھے۔ ان اشعار میں شنکر دیو کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ بھگتی مارگ پر

[1] ABID. VOL. 2. P. 136.

یہ کتاب ایک نہایت مُستند رسالہ ہے۔

اِس کتاب کے مطابق انسان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وُہ اپنی فِطرت کو ایسا تبدیل کرے کہ وُہ ایک نیا انسان ہو جائے اور اس کی رُوح کی بیقراری تسلّی سے بدل جائے اور اس کا پژمُردہ دل تسکین اور آرامِ جان حاصل کرے، تاکہ اس کی حیوانی طبیعت الٰہی فطرت ہو جائے۔

یہ کتاب اِس بات پر زور دیتی ہے کہ خُدا کا نام لے لے کر گایا جائے۔ شنکر دیو چار امُور پر زور دیتا تھا:۔ (۱) نارائن کا گیان حاصل کیا جائے۔ (۲) نارائن کے اوتار سری کرشن کی کامل اطاعت کی جائے۔ (۳) ست سنگ کی رفاقت حاصل رہے۔ (۴) خُدا سے جب دُعا کی جائے تو خُدا کا نام ترنّم سے گایا جائے جس سے عبادت گذار کے دِل میں لُطف کا جذبہ پیدا ہو۔ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ یہ چاروں باتیں انجیل ہی میں مسیحیت میں (۱) خُدا کے عرفان اور (۲) مجسّم خُدا مسیح کی کامل پیروی (۳) مُقدّسوں کی رفاقت اور (۴) زبور اور رُوحانی گیتوں میں خُدا کے اور مسیح کے نام پر تاکید کی گئی ہے (کلسی ۳/۱۶ ۔ افسی ۵/۱۹ وغیرہ)۔ اس کتاب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ناظرین خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں انجیل کی جھلک موجود ہے:۔

(۱) "خُدا اُن سب کی پناہ گاہ ہے جو فروتن اور حلیم ہیں اور جو کھوئے ہُوئے گم گشتہ ہیں۔ جن کی زندگیاں ان کے قابو میں نہیں ہیں اور جن کی زندگیوں میں گناہ سرایت کر گیا ہے۔ (زبور ۳۴/۱۸ ۔ متی ۱۸/۱۱ ۔ رومیوں ۷ باب وغیرہ)۔

(۲) گو میں شب و روز ہزاروں گناہ کرتا ہُوں پھر بھی اَے خُدا میں تیرا ہی بندہ ہُوں۔ اَے میرے خُدا تُو اپنے فضل اور کرم سے مجھ کو معاف کر۔ (لوقا ۱۵ باب وغیرہ)۔

(۴) خواہ ہم سے کتنے ہی قصور سرزد ہوئے ہوں مگر ہم ہر رو ز کے سامنے دس دفعہ اپنا ماتھا شرد ھا کے ساتھ ٹیکیں تو ہم کو معاف کیا جائیگا اور ہم نجات حاصل کر لینگے۔ (۱۔ یوحنا ۱: ۹ وغیرہ)۔

(۵) بھگتی کے لئے زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ کسی قسم کی چھوت اُس کو پلید نہیں کر سکتی۔ (یوحنا ۴/۲۰-۲۴ ۔ متی ۲۳/۲۵-۲۶)۔

(۵) خُدا کی بھگتی کرنے والوں میں رنگ و نسل آدمی اور عورت۔ مرتبہ اور تعلیم۔ خاندانی فخر و نسب اور ذات پات کی اُونچائی یا نچائی اور فرقہ وارانہ تمیز نہیں۔ تمام بھگت ایک ہی خاندان کے شرکا ہیں۔ (مقابلہ ۱۷/۲۶ ۔ یعقوب ۲: ۱-۹)۔

واقف کار ناظرین خود دیکھ سکتے ہیں کہ شینکر دلو کے خیالات پر نہ صرف اُپنشدوں بھاگوت گیتا اور بھاگوت پران کا بڑا اثر ہے بلکہ انجیل کی تعلیم نے اُس کے بُنیادی عقائد کو متاثر کر رکھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جب انجیلی تعلیم کے نور کی روشنی میں ہندوستان میں بھگتی مت کا احیاء ہُوا تو اس کی نشوونما نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ جُوں جُوں صدیاں گزرتی گئیں انجیلی رُوح اس میں سرایت کرتی گئی۔ خُداوند مسیح کے نام کی بجائے رام یا کرشن وغیرہ کے نام چسپاں کر دیئے گئے اور ہندو مت کے مختلف مفکروں نے انجیل کی تعلیم کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

(۱۲)

آخر میں ہم تُلسی داس (از ۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء) کا ذکر کرتے ہیں جو دانند کے سلسلہ میں ساتواں شخص تھا۔ وُہ ہندوستان کے مُعلموں کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر گرائرسن تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وُہ ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اور مُصلح ہُوا ہے۔ اُس کی نظم "رام چرت مانس" (جو سنسکرت کی رزمیہ نظم پر مبنی ہے) شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں وُہی درجہ رکھتی

ہے جو عیسائیوں میں بائبل کو حاصل ہے۔

تُلسی داس وشنو مت کا پیرو تھا اور رام کی پرستش کرتا تھا جس کو وُہ خُدائے لامحدود کا مجسم اوتار مانتا تھا۔ وُہ فلسفۂ ویدانت کی اصطلاحات کا استعمال تو کرتا ہے پر اُن سے ہمہ اوستی مفہوم کی بجائے توحیدی مفہوم لیتا ہے۔ چنانچہ اُس کے عقیدے کے مطابق خُدا واحد ہے جو غیر مخلوق اور لاثانی ہستی ہے۔ وُہ پرم آتما ہے جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہ دُنیا اُس کی ہستی کا پرتو ہے۔ خُدا مجسم ہو کر دُنیا میں آیا۔ اُس نے جو کچھ کیا اُس محبت کی وجہ سے کیا جو وُہ اپنی مخلوق سے رکھتا ہے۔ وُہ حلیم اور فروتن لوگوں کے لئے فضل اور رحم سے بھرپور ہے اور اپنے رحم کی وجہ سے غضب سے باز رہتا ہے۔ وُہ نیک اور قادر پروردگارِ عالم ہے۔ چونکہ وُہ پاک اور قدوس ہے پس گناہ اُس کی ذات کے منافی ہے لہذا گناہ نہایت مکروہ اور نفرت انگیز ہے۔ انسان فطرتاً گنہگار ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ نجات پائے پس خُدا اپنے لامحدود رحم کی وجہ سے خود مجسم ہو کر دُنیا میں آیا اور اُس نے رام کی شکل اختیار کی تاکہ دُنیا گناہ اور پاپ سے نجات حاصل کرے۔ اب وُہ آسمان پر ہے۔ وُہ ایسا خُدا ہے جو انسانی کمزوریوں اور آزمائشوں سے بخوبی واقف ہے کیونکہ اُس نے اُن کا خود تجربہ کیا ہے اور اُن سے مقابلہ کر کے خود ہر قسم کی بدی سے پاک رہا ہے (عبرانی ۴/۱۵ وغیرہ) وُہ گناہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پس وُہ اُن سب گنہگاروں کی مدد کرتا ہے جو اُس کو پکارتے ہیں۔ (عبرانیوں ۷: ۲۶ وغیرہ ۔ ۱۔ یوحنا ۳/۹ وغیرہ) ہر انسان کا فرض ہے کہ وُہ ہر دُوسرے انسان کو اپنا بھائی سمجھے اور اُس سے ویسا ہی سلوک کرے۔ (۱۔ یوحنا ۴/۲۰ ۔ متی ۷/۱۲ وغیرہ) ڈاکٹر گرائرسن کہتے ہیں کہ تُلسی داس پہلا شخص ہے جس نے گناہ کا نیا مفہوم پیش کیا اور وُہ پہلا شخص ہے جس نے رام کی آسمانی انسانیت کی تعلیم دی۔ یہ دونوں

باتیں اُس نے نسطوری مسیحی مبلغوں سے حاصل کیں جس طرح کبیر نے اپنی تعلیم مسیحی مبلغوں سے حاصل کی تھی۔ وہ پہلا ہندو معلم ہے جس نے یہ تعلیم دی کہ خدا انسانی کمزوریوں میں ہمارے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور یہ تعلیم خصوصی طور پر انجیلی تعلیم ہے (متی ۱۲/۹ - رومیوں ۸/۲۵ - عبرانیوں ۴/۱۵ وغیرہ) اُس کی بعض دعائیں بھی ایسی ہیں جو مسیحی عبادت کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور اُس کی تصنیف میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ مثلاً "اے خداوند۔ میری طرف نظرِ عنایت فرما۔ میں تو اپنی کوششوں سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر میں تیرے پاس نہ آؤں تو کس کے پاس جاؤں؟ میں اپنی حالتِ زار کس کے آگے بیان کروں۔ میں نے اکثر تیری طرف سے پیٹھ موڑا ہے۔ لیکن تو اپنے رحم اور فضل کی طرف پہلے نظر کر اور پھر میری طرف دیکھ۔ تو مجھے اپنا بنا کیونکہ تو ہی میری حقیقی پناہ گاہ ہے۔ جو تیرے ہاتھ کو پکڑتا ہے وہی نجات پاتا ہے۔"

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ تلسی داس کی تعلیم کی اصل جڑ مسیحیت کا یہ اصول ہے کہ خدا دنیا کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ گنہگار دنیا کو نجات بخشتا ہے (یوحنا ۳/۱۷)۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا نے رام کا اوتار اس غرض کے لئے نہیں لیا تھا کہ بدوں کو فنا کرے بلکہ اُس اوتار کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ بدوں کی روحوں کو بدی کی طاقتوں سے چھٹکارا بخشے۔ اگرچہ رام گناہ سے ناواقف تھا پھر بھی وہ بدترین گنہگاروں کو نجات کی بخشش عطا کرتا ہے بشرطیکہ وہ اُس کے پاس آئیں۔ گنہگار پر لازم ہے کہ وہ فروتنی سے اپنے گناہوں کا اقرار کرے اور نیک اعمال پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو جیسا وہ ہے ویسا ہی رام کے سپرد کر دے۔ پھر رام اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر اُس گنہگار کو نجات بخشتا ہے جس طرح اُس نے لاتعداد گنہگاروں کو جو اُس کے پاس آتے ہیں نجات بخشی ہے"۔ "نجات کے لئے ایک اور صرف ایک ہی بات کی ضرورت ہے کہ گنہگار رام کا حقیقی بھگت ہو جائے

موت کے بعد ایسے شخص کو رام کی قربت کی حقیقی اور دائمی خوشی حاصل ہوتی ہے اور یہی اصلی مکتی ہے"۔ "رام پر ایمان لانا ایک ایسی کشتی ہے جس کا ملاح رام خود ہے۔ وہ اپنے محبت بھرے بازوؤں کو پھیلا کر ہر گنہگار کو دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ میں تم کو پار لے جاؤں گا" (متی ۱۱: ۲۸ وغیرہ)۔

مذکورہ بالا اقتباسات (جو بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے گئے ہیں) ثابت کر دیتے ہیں کہ تلسی داس کی تعلیم درحقیقت انجیلی تعلیم ہے۔ فرق صرف یہی ہے کہ ان میں مسیح کی جگہ رام کو دے دی گئی ہے۔

گو سولھویں صدی میں کبیر کے بعد تلسی داس رام مت کا سب سے بڑا معلم تھا لیکن اُس نے کسی مت کی بنا ڈالنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ بایں ہمہ فی زمانہ اُس کے پیرو ایک کروڑ سے کم نہیں ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں ہندو مت کے چند فلاسفروں اور مصلحوں کا ذکر کیا ہے جو سلطنت دہلی کے ایام میں تھے مسیحیت نے اُن کی طفیل شمالی ہندوستان کی مذہبی دنیا کی کایا پلٹ دی۔ گو اُس زمانہ میں مسیحی کلیسیا ایک کمزور اقلیت تھی تاہم انجیل کے نور کی شعاعوں نے بالواسطہ ہمارے وطنِ عزیز کو چمکا رکھا تھا۔ اور اگر مسیحیت اپنے اندر ان ایام میں ابتدائی صدیوں کی سی زندگی رکھتی تو ہندوستان منجی جہان کے قدموں میں کب کا آگیا ہوتا؟

فصلِ دوم

مسیحیت اور صوفیہ کے سلسلے

ہم حصۂ اوّل کے باب پنجم میں اسلامی تصوف کی ابتدا کا ذکر کر کے مختصر طور پر صوفیائے کرام کے مختلف خانوادوں اور سلسلوں کے بانیوں کی نسبت بتلا چکے ہیں کہ وہ ایسے مقامات سے آئے تھے جو اُن کے زمانہ میں مسیحیت کے مرکز تھے جن میں کلیسیا کے پیٹریارک۔ میٹروپولیٹن۔ بشپ قسیس۔ شماس اور مبلغین بکثرت تھے۔ پس قدرتاً اُن کے معتقدات۔ رسمیات اور طرزِ زندگی نے ان سلسلوں کے بانیوں پر اثر کیا تھا۔

ہندوستان میں چودہ خانوادوں میں سے صرف چار خانوادے ہیں جن کے پیرو کثرت سے اس مُلک میں پائے جاتے ہیں:۔ (۱) چشتیہ۔ (۲) قادریہ۔ (۳) سہروردیہ اور (۴) نقشبندیہ۔

سلسلۂ چشتیہ کا بانی خواجہ ابو اسحٰق شامی تھا۔ اس سلسلہ کے چار بزرگ صوفی دُنیا کے رُکن سمجھے جاتے ہیں:۔ (۱) خواجہ ابو احمد (سالِ وفات ۹۶۶ء) جو ابو اسحٰق کے خلیفہ تھے اور ابدال کے درجہ پر پہنچے۔ (۲) خواجہ ابو محمد (سالِ وفات ۱۰۲۰ء)۔ (۳) خواجہ ابو یُوسف (سالِ وفات ۱۰۶۷ء) اور (۴) خواجہ مودود (سالِ وفات ۱۱۳۳ء)۔ سلسلۂ قادریہ کے بانی سیّد عبدالقادر جیلانی یا گیلانی تھے (از ۱۰۷۸ء تا ۱۱۶۶ء) جو حسنی الحسینی بھی کہلاتے ہیں کیونکہ اُن کی ماں امام حسین کی اولاد سے اور باپ امام حسن کی

اولاد سے تھے۔ گیلان یا جیلان بحرِ کیسپین کے جنوب میں واقع تھا۔ ان کو عموماً "پیرِ دستگیر"۔ "غوث الاعظم"۔ "محبوبِ سبحانی" کہتے ہیں سہروردی سلسلہ کے بانی حضرت ضیاءالدین نجیب سہروردی تھے (سالِ وفات ۱۱۶۷ء)۔ نقشبندی سلسلہ کے بانی خواجہ بہاؤالدین نقشبند (سالِ وفات ۱۳۸۹ء) تھے۔ خواجہ بہاؤالدین ۱۳۱۸ء میں بخارا کے مضافات میں پیدا ہوئے جو مسیحیت کا گڑھ تھا۔

اس فصل میں ہم اس گروہِ صوفیہ کے انبوہِ کثیر میں سے صرف چند ایک اولیاء اور مشائخ کا ہی ذکر کرینگے تاکہ ناظرین اُن کے مسلک۔ تعلیم۔ طرزِ زندگی اور تبلیغی مساعی وغیرہ سے واقف ہو کر خود فیصلہ کر سکیں کہ مسیحیت نے اُن پر کس قدر اثر کیا تھا اور اُنہوں نے شمالی ہند کی کلیسیا کے ممبروں کو کس قدر متاثر کیا ہوگا۔

(۱)

(۱) **خواجہ معین الدین چشتی** (سُلطان الہند۔ غریب النواز) نے چشتی سلسلہ کا ہندوستان میں آغاز کیا۔ جب وہ ۵۲ سال کا تھا تو شیخ عثمان ہارونی نے اُس کو خرقۂ خلافت دیا۔ وہ پہلے ملتان آیا اور پھر دہلی سے ۵۶۱ھ مطابق (۱۱۶۵ء) میں اجمیر گیا اور آخر تک وہیں رہا۔ اس زمانہ میں اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا راجہ پتھورا تھا۔ ان ایام میں محمود غزنوی کے حملوں کی وجہ سے غیر مسلموں کے دِلوں میں اسلام کے خلاف نفرت اور عداوت تھی۔ اس کے حسنِ سلوک نے اُن کے دِلوں کو موہ لیا کیونکہ اُس زمانہ میں عیسائی اور ہندو درویشوں اور فقیروں کا کمال یہی سمجھتے تھے کہ وہ تارک الدُّنیا اور صاحبِ کمالات ہوں۔ شہاب الدین غوری کی فتح

کے بعد جہاں ایک طرف بعض ہندو بزورِ شمشیر مسلمان کئے جا رہے تھے وہاں دوسری طرف صوفیہ کی تعلیم بعض کو اسلام کا حلقہ بگوش کر رہی تھی۔ اجمیر اور اس کے گرد و نواح میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی۔ اجمیر میں خانقاہ اور لنگر خانہ قائم ہو گیا۔ خواجہ معین الدین نے متعدد صوفیوں کو خلیفہ بنا کر مختلف اطراف میں اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ اسی وجہ سے خواجہ کو "وارث النبی فی الہند" کا لقب دیا گیا ہے۔ وہ ۹۷ سال کی عمر پا کر ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۴ء میں فوت ہو گیا۔

(۲) **ابوالحسن علی ہجویری** خواجہ معین الدین کے ہندوستان آنے سے پہلے فوت ہو چکا تھا۔ وہ ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء کے قریب پیدا ہوا تھا اور ممالکِ شام۔ عراق۔ بغداد وغیرہ (جو مسیحیت کے مرکز تھے) کے اولیاء کی صحبت میں رہ چکا تھا۔ وہ آخر زندگی تک (۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء) لاہور میں رہا جہاں اس کا مزار بھی ہے۔ اس کو "داتا بخش" اور "داتا گنج بخش" کہتے ہیں وہ فارسی کی قدیم صوفیانہ کتاب کشف المحجوب کا مصنف تھا

(۳) **خواجہ قطب الدین بختیار کاکی** (قطب الاقطاب) ماوراء النہر میں پیدا ہوا جہاں مسیحی کلیسیائیں بکثرت بستی تھیں۔ وہ بغداد گیا جو اس زمانہ میں اسلامی علم و فضل کا مرکز تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ان دنوں بغداد میں ہی تھا۔ ان ایام میں بغداد نسطوری کلیسیا کے پیٹریارک کا صدر مقام بھی تھا

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جب غوریوں نے پنجاب کو فتح کیا تو شمالی ہند کی سماجی زندگی کلیتہً بدل گئی تھی۔ اسلامی دنیا کے مختلف گوشوں سے صوفیہ۔ شاعر اور اربابِ علم و فضل لاہور آ گئے اور ان کی آمد سے پنجاب کی اخلاقی۔ ثقافتی۔ سماجی اور مذہبی دنیا میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ پنجاب سے مسلمان

وادیٔ گنگا کی جانب بڑھے اور انہوں نے اجمیر۔ بدایون۔ قنوج۔ بہرائچ اور دیگر مقامات میں بستیاں قائم کر لیں جہاں خواجہ معین الدین اور مولانا رضی الدین حسن صغانی (مصنفِ مشارق الانوار و ساکن بدایون) جیسے متعدد بن مسلمان اور صوفی رہتے تھے۔ ملتان شمالی ہند میں اسلامی علوم کا مرکز تھا جس کو "قطب اسلام" کہتے تھے۔

خواجہ قطب الدین نے خواجہ معین الدین چشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ جب وہ ملتان میں شیخ بہاؤ الدین زکریا کے ہاں مقیم تھا تو منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جب وہ ملتان سے دہلی آیا تو سلطان التمش نے اس کا استقبال کیا اور درخواست کی کہ خواجہ اس کے پاس ہی مقیم ہو لیکن خواجہ نہ مانا۔ پس سلطان خود ہفتہ میں دو بار اس کی خانقاہ میں جایا کرتا تھا۔ "قطب صاحب" کے قیام سے شاہی دربار پر غیر معمولی اثر پڑا کیونکہ ان کی تمدری کی وجہ سے سلطان اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ وفات (۱۲۳۵ء) سے پہلے خواجہ نے بابا فرید کو اپنا خرقہ۔ دستار اور جوتیاں دے کر اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔

(۴) **شیخ فریدالدین مسعود "گنج شکر"** (المعروف بابا فرید ۵۸۴ھ (۱۱۸۸ء) میں ملتان کے ضلع میں پیدا ہوا۔ ہندوستان کے صوفیہ میں اس کو نہایت ممتاز جگہ حاصل ہے کیونکہ وہ "قطب الاقطاب" کا خلیفہ تھا اور نظام الدین اولیاء جیسا عظیم صوفی اس کا خلیفہ تھا اور ہندوستان کی روحانی زندگی میں خود اس کو نہایت اعلیٰ درجہ حاصل ہے۔

وہ ایک ایسے زمانہ میں زندہ تھا جب پنجاب میں غزنوی خاندان کی طاقت ختم ہو رہی تھی اور غوری حملہ آور بڑھے چلے آ رہے تھے شمالی ہند

میں راجپوتوں کی طاقت زوال پر تھی۔ ترکوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا اور منگول حملہ آوروں نے اسلامی سلطنت اور غیر مسلموں کو ہراساں اور ترساں کر رکھا تھا اور وسط ایشیا کے مسلمان چاروں طرف سے ہندوستان میں پناہ لینے کے لئے آرہے تھے۔ یہ ایک طویل زمانہ تھا لیکن اس کی عمر بھی ترانوے (۹۳) کی تھی۔ جب وہ تیس سال کا جوان تھا تو محمد غوری قتل ہو گیا تھا اور اس کی عمر نوے سال کی تھی جب بلبن تخت نشین ہوا۔ پس اس نے خاندانِ غلاماں کے نو سلطانوں کا عہد دیکھا تھا لہٰذا اس کی زندگی قرونِ وسطیٰ کے مذہبی اور سیاسی حالات کی روشنی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

"بابا فرید" کی طفیل سلسلۂ چشتیہ کی جڑیں ہر جگہ مضبوطی سے گڑ گئیں۔ سالہا سال تک اُس کی خانقاہ جو اجودھن (موجودہ پاکپٹن) میں ہے لاکھوں مسلم اور غیر مسلم باشندوں کے لئے کشش کا باعث رہی۔ سلسلۂ چشتیہ چاروں طرف پھیل کر ہندوستان کے دُور دراز مقامات میں قائم ہو گیا۔ اسی وجہ سے بابا فرید کو "شاہِ ملکِ سلوک" کہا جاتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا لوگ ہر طرف سے اُس پر گرتے تھے تاکہ اُس کے سامنے اپنے دِل کا حال کھول کر بیان کریں اور تسلی حاصل کریں۔

بابا فرید نے لاہور میں داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی۔ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ عموماً اُس کو اور اُس کے خاندان کو اچھی روٹی کھانا اور عمدہ کپڑے پہننا نصیب نہ ہوا۔ جو خیرات آتی تھی وہ اُس کے حکم سے شام تک غربا اور مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھی ستھرے کپڑے حاجتمندوں کو دے دیئے جاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں صوفیہ کے ہر مرکز میں خانقاہوں کے ساتھ جماعت خانے ہوتے تھے۔ بابا فرید کے جماعت خانہ میں عالم

اور فاضل۔ تاجر اور افسر۔ عورتیں اور مرد۔ سب کے سب دُنیا کو ترک کر کے درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور جماعت خانہ میں سب کے سب بغیر کسی امتیاز کے ڈیلا اور کریل۔ اور ساگ کے پتوں پر گزارہ کرتے۔ اپنے لئے پانی خود بھرتے اور برتن آپ دھوتے تھے۔ چنانچہ شیخ نظام الدین اولیا کہتے ہیں کہ "جس رات کو ہم شیخ (بابا فرید) کے گھر میں پیٹ بھر کر ڈیلہ کھا لیتے تھے وہ دن ہمارے لئے عید کا دن ہوتا تھا"۔ جماعت خانہ آدھی رات تک کھلا رہتا تھا جس میں عالم اور جاہل۔ فوجی اور شہری۔ ہندو اور عیسائی سب کے سب آزادانہ چلے آتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو دہلی کے سلاطین کے خوف کے مارے جان کی پناہ لینے کے لئے آجاتے تھے۔ بلبن جیسے نسلی اور قومی امتیازات رکھنے والے سلاطین کے زمانہ میں فرید کا جماعت خانہ مساوات اور اخوت کا گہوارہ تھا۔ عوام النّاس کو دہلی کے سلطان کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا لیکن ہر بدنصیب فرید کے پاس پہنچ کر عرض حال کر سکتا تھا۔

بابا فرید نہ صرف ایک زبردست رُوحانی شخص تھا بلکہ وہ اہلِ علم میں سے تھا۔ اُس کے ملفوظات "راحت القلوب" اور "سیر الاولیا" ہیں۔

(۵) شیخ نظام الدین (محبوبِ الٰہی) کا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے لاہور آیا پھر بدایوں گیا جہاں نظام الدین ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں پیدا ہوا۔ خلجی سلاطین اور اُن کے اُمرا اُس کے مُرید تھے۔ چنانچہ جب سلطان علاؤالدین نے ملک کافور کو ورنگل کی فتح کے لئے بھیجا تو اُس نے نظام الدین کی طرف رجوع کیا۔ قطب الدین مبارک شاہ اُس کا دُشمن ہو گیا اور اُس نے اُمرائے دربار پر اُس کی خانقاہ کی طرف جانے پر بندش لگا دی۔ پھر اُس نے حکم دیا کہ نظام الدین خود دربار میں حاضر ہو لیکن وہ نہ گیا۔ اسی اثنا میں قطب الدین مر گیا اور اُس

کے چار ماہ بعد غیاث الدین تغلق خسرو خاں کو قتل کر کے خود بادشاہ ہو گیا۔ غیاث الدین جیسا ہم گذشتہ باب میں لکھ چکے ہیں طبعاً دیندار و دین پرور اور حق گذار شخص تھا جس نے احکامِ شریعت کے لئے قاضی، مفتی، محتسب وغیرہ مقرر کر کے اسلام کو از سرِ نو رونق دی تھی۔ اس کا جانشین محمد تغلق شیخ نظام الدین کا بڑا معتقد تھا۔

شیخ نظام الدین اولیاء اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ نامور اور عظیم صوفی گذرا ہے اور گروہِ صوفیہ میں شیخ جنید اور شیخ بایزید کا ہمسر خیال کیا جاتا ہے۔ بابا فرید کی خانقاہ کی طرح ہر خاص و عام۔ امیر اور غریب۔ عالم اور جاہل۔ آزاد اور غلام سب اُس کے پاس بے روک ٹوک جاتے تھے۔ اور ہجوم کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میلہ لگا ہوا ہے۔ خواجہ قطب الدین اور بابا فرید کی طرح وہ بادشاہوں سے دُور ہی رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ سلطان علاؤ الدین نے اُس کو کہلا بھیجا کہ مَیں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لیکن اُس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس پر سُلطان نے کہلا بھیجا کہ مَیں خود آپ سے ملنے کے لئے آؤنگا۔ اُس نے پیغام بھیجا کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر سُلطان ایک دروازہ سے داخل ہوگا تو مَیں دُوسرے سے باہر چلا جاؤنگا۔ اُس کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے "فوائد الفوائد" سب سے معتبر کتاب ہے جس کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ اُس کی عظمت کا بھید یہ تھا کہ اُس کا دِل ہر کس و ناکس کے لئے محبت سے بھرا تھا۔

(۶) شیخ نصیر الدّین محمود (چراغِ دہلی) کے جد خراسان سے لاہور آئے اور پھر اودھ چلے گئے جہاں نصیر الدین اجودھیا یا (بقولِ دیگر) بارہ بنکی میں پیدا ہوا۔ ۴۳ سال کی عمر میں اُس نے نظام الدین اولیا سے بیعت کی

جس نے اُس کو دہلی میں اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔ سُلطان محمد بن تغلق اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے ہر صُوفی کو مجبور کرتا تھا کہ وہ حکومت کی ملازمت اختیار کرے لیکن چراغِ دہلی نے اِس کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔ وہ اُن علماء، مشائخ اور اکابرین سے تھا جنھوں نے ٹھٹھہ میں بالاتفاق فیروز شاہ کو محمد تغلق کا جانشین بنایا تھا۔ اور فیروز شاہ ہمیشہ اُس کا احترام اور فرماں برداری کرتا رہا۔

ایک دفعہ چراغِ دہلی نماز ظہر کے بعد اپنے حجرہ میں مُراقبہ کر رہا تھا کہ ایک قلندر تراب نے اُس پر حملہ کر کے اُس کو زخمی کر دیا۔ جب مُریدوں نے حملہ آور کو سزا دینی چاہی تو اُس نے قلندر کو بچا لیا اور کہا کہ اگر چھُرا مارتے وقت تمہارے ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو تو مُعاف کر دو اور بیس تنکہ نذر دے کر اُس کو رُخصت کیا۔ اس حملہ کے تین سال بعد ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں وہ فوت ہو گیا۔

(۷) سید محمد گیسُو دراز (خواجہ بندہ نواز) کے مُورثِ اعلیٰ ہرات سے دہلی آئے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اُس زمانہ میں ہرات سقافت کا مقام ہوتا تھا۔ سید محمد ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں دہلی میں پیدا ہُوا۔ وہ چراغِ دہلی کا خلیفہ اور جانشین تھا۔ دہلی میں چالیس سال قیام کر کے تیمور کے حملہ کے زمانہ (۱۳۹۸ء) میں وہ گلبرگہ (دکن) چلا گیا۔ راہ میں وہ جہاں ٹھہرتا لوگ جوق در جوق آتے اور حلقۂ بیعت میں داخل ہو جاتے تھے۔ جب گلبرگہ کے قریب پہنچا تو بہمنی خاندان کا سُلطان فیروز اپنے خاندان اور درباریوں سمیت استقبال کو آیا۔ لیکن فیروز حکیمانہ طبیعت رکھتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ سید محمد گیسُو دراز علمِ شریعت اور خصُوصاً معقُولات سے خالی ہے تو اُس کی توجہ اس سے ہٹ گئی لیکن فیروز کا جانشین سلطان احمد اُس کا بڑا معتقد تھا۔ یہ وہی

سُلطان احمد ہے جس نے بیجانگر کو تاخت و تاراج کر کے مردوں، عورتوں اور بچّوں کو ہر جگہ بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ تین دن تک قتلِ عام ہوتا رہا جس میں بیس ہزار غیر مسلم مارے گئے۔ گیسو دراز گلبرگہ میں ۲۲ سال تک زندہ رہا اور ایک سو چار سال کی عمر پا کر ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں فوت ہو گیا۔ وہ ایک بہت بڑا مصنف تھا جس نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھی ہیں۔

(۸) سُہروردی سلسلہ میں **شیخ شہاب الدّین** کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس کا ذکر سعدی نے بوستان میں بھی کیا ہے۔ وہ عوارف المعارف کا مصنف تھا۔

(۹) **شیخ بہاؤ الدّین زکریا** سُہروردی کے جدِّ امجد مکّہ سے خوارزم اور خوارزم سے مُلتان میں آ کر سکونت گزیں ہوئے۔ بہاؤ الدّین مُلتان میں ۵۷۵ھ (۱۱۶۹ء) میں پیدا ہوا۔ وہ خراسان۔ بخارا۔ بیت المقدس یروشلیم۔ بغداد وغیرہ جگہوں میں تحصیلِ علم کی خاطر گیا۔ یہ سب مقامات اُن ایام میں مسیحیت کے مرکز تھے۔ بغداد کے شیخ شہاب الدّین سُہروردی نے اُس کو خرقہ خلافت دیا اور وہ التمش کے زمانہ میں مُلتان آ گیا اور ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء) میں فوت ہو گیا۔ اس کے مُریدوں میں امیر حسینی (سالِ وفات ۷۱۸ھ) اور فخر الدین ابراہیم عراقی (سالِ وفات ۶۸۸ھ) قابلِ ذکر ہیں۔

(۱۰) **شیخ رُکن الدّین**، بہاؤ الدین زکریا کا پوتا تھا اور ۲۲ سال کی عمر میں اس کا جانشین بنا۔ یہ زمانہ سلطان علاؤ الدین خلجی کا تھا۔ وہ ایک دفعہ مُلتان سے دہلی گیا تو سُلطان نے اُس کا استقبال کیا۔ غیاث الدین تغلق بھی اُس کا معتقد تھا۔ چُونکہ نظام الدّین اولیاء کے تعلقات سلاطین سے اچھے نہ تھے

پس یہ سلاطین چشتیہ سلسلہ کی بجائے دیگر سلسلوں کے صوفیہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور ان کے عقیدت مند تھے۔ جب محمد تغلق تخت نشین ہوا تو اُس نے بھی رُکن الدّین سے مراسم رکھے۔ وہ ۷۳۵ھ (۱۳۳۴ء) میں فوت ہو گیا۔

(۱۱) **قاضی حمید الدین ناگوری** سُلطان شمس الدّین التمش کے عہد میں بخارا سے دہلی آیا۔ وہ سُہروردی سلسلہ سے تعلّق رکھتا تھا۔ اور ۶۷۸ھ (۱۲۷۹ء) میں دہلی میں فوت ہو گیا۔

(۱۲) **سید نُور الدّین مُبارک** غزنوی بھی التمش کے زمانۂ حکومت میں دہلی آیا۔ سُلطان نے اُس کو شیخ الاسلام کے عہدے پر مامور کیا۔

اس سلسلہ کو سُہروردیہ کہتے ہیں کیونکہ سُہرورد، چشت کی طرح ایک مقام کا نام ہے جو عراق عجم کے اندر ہمدان و زنجان کے درمیان واقع تھا۔ حضرت شہاب الدّین ابو حفص (از ۵۴۲ھ تا ۶۳۲ھ) اور ان کے مُرشد یہاں کے رہنے والے تھے۔ چشتیہ سلسلہ کے زاہد چلّہ کشی کرتے تھے اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن سُہروردیہ سلسلہ کا یہ امتیازی نشان ہے کہ وہ دُنیا میں منہمک رہ کر تصوّف کے اصُولوں پر چلتے تھے۔ مثلاً شیخ عمر شہاب الدّین۔ حضرت بہاؤ الدّین زکریا مُلتانی وغیرہ نہ صرف صاحبِ حیثیت تھے بلکہ کر ڈوپتی تھے اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے لیکن وہ ہندوستان کے باشندوں کی زندگیوں کو متاثر نہ کر سکے کیونکہ یہاں جوگ اور سنیاس کو خاص مقبولیت حاصل تھی۔ چشتیہ سلسلہ کے مطابق رُوحانی زندگی کی ترقی "شغل" کی زندگی کے منافی ہے کیونکہ اس میں انسان دولت اور اقتدار پیدا کرتا ہے۔ بابا فرید ہمیشہ اپنے مُریدوں کو کہا کرتا تھا کہ شغل اور جاگیرداری سے پرہیز کرو۔ اس کے برعکس بہاؤ الدّین مُلتان میں (جو سُہروردیہ سلسلہ کا مرکز تھا) امیرانہ ٹھاٹھ سے

رہتا تھا۔ اس کی خانقاہ میں ہر نو وارد کے لئے ایک الگ سجا ہوا کمرہ ہوتا تھا جہاں لوگ ہزاروں کی تعداد میں جاتے تھے اور سب کو اچھی سے اچھی خوراک ملتی تھی۔ اس کے مطبخ میں طرح طرح کے کھانے پکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک دفعہ ایک فقیر کو دیکھا کہ روٹی کو شوربے میں تر کرکے کھا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا سبحان اللہ۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ثرید کو دوسرے کھانوں پر وہی فضیلت ہے جو مجھ کو تمام انبیاء پر اور عائشہ کو تمام عورتوں پر ہے"۔ لیکن عام لوگ وہاں نہ جاتے تھے اور نہ جا سکتے تھے۔ خانقاہ میں مستقل طور پر گودام تھے جہاں گیہوں وغیرہ اشیائے خوردنی جمع رہتی تھیں اور افراط زر و سیم خزانوں میں ہوتا تھا۔ لیکن چشتیہ کا یہ حال نہ تھا۔ مثلاً بابا فرید کے جماعت خانہ میں ہر خاص و عام کو آمد و رفت کی کھلی اجازت تھی۔ سب فرش پر سوتے تھے اور سب کو ایک ہی خوراک ملتی تھی۔ اس کے ہاں نہ تو اشیائے خوردنی جمع تھیں اور نہ زر و مال جمع کیا جاتا تھا۔ شیخ بہاؤ الدین سے ہر شخص ملاقات بھی نہ کر سکتا تھا اور اس کی ملاقات کے اوقات مقرر تھے۔ لیکن بابا فرید سے ملاقات ہر وقت ہو سکتی تھی اور ہر شخص جب چاہتا بلا کسی رکاوٹ کے آ جا سکتا تھا۔ سہروردی سلسلہ کی امیرانہ ٹھاٹھ اس کے ہر مرکز میں تھی۔

نقشبندی سلسلہ نے نہ صرف اسلامی دنیا پر اپنا سکہ جمایا بلکہ ہندوستان اور مسوپوتامیہ کے ملکوں کی سیاسی تبدیلیوں میں بھی اس سلسلہ نے بڑا اہم حصہ لیا۔ تمام صوفیا خانوادوں میں یہ سلسلہ سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد رہا ہے۔ قادریہ سلسلہ نے بھی ہندوستان میں بہت فروغ حاصل کیا اور لاکھوں اس کے مرید ہیں۔ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ قریباً سب سلاطین

دہلی کسی نہ کسی سلسلہ کے معتقد تھے جس کا اثر ان کی حکومت کی پالیسی پر ضرور پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر ہم بتلا چکے ہیں کہ سید نور الدین نے سلطان التمش کے روبرو وعظ کیا جس میں اس نے کہا کہ اگر سلطان دن میں ہزار رکعتیں نماز پڑھے اور تمام عمر روزے رکھے لیکن اگر وہ دین اسلام کی حمایت نہ کرے اور اپنی سطوت کو خدا اور رسول کے دشمنوں کو قلع قمع کرنے میں صرف نہ کرے اور ملک میں امر معروف کو جاری نہ کرائے اور نہی و منکر کو نہ مٹائے تو سلطان کی جگہ دوزخ ہوگی۔ سلطان بلبن اس وعظ کو اکثر یاد کیا کرتا تھا اور اپنے بیٹے کے سامنے اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اسی طرح صوفی سید اشرف جہانگیر سمنانی خاندان تغلق کے زمانہ میں جہاد کے متعلق یہ تعلیم دیتا تھا کہ جب کفار مسلمانوں کے خلاف خروج کریں تو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے۔ سید محمد گیسو دراز کہتا تھا کہ ضرورت کے وقت سالک جہاد میں شریک ہو سکتا ہے لیکن اس کا مقصد درجۂ شہادت کو حاصل کرنا یا ثواب کو حاصل کرنا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو جہاد میں صرف خدا کی خاطر شریک ہونا چاہیے اور جہاد میں اپنی تلوار کو سیف اللہ اور اپنے تیر کو سہم اللہ اور اپنے سنان کو سنان اللہ سمجھنا چاہیے۔ صوفی سید محمد بن علی حسینی بلگرامی جو اودھ کے مشہور خاندان کا مورث اعلیٰ تھا شیخ قطب الدین بختیار کا مرید تھا وہ بھی تلوار کا دھنی تھا۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں بلگرام کے علاقہ کو فتح کر لیا اور وہاں قلعہ تعمیر کیا۔ سلطان التمش نے اس کو جاگیر دی۔ اس قسم کے صوفیا کی زندگی۔ نمونہ اور وعظوں کا اثر مسیحی کلیسیاؤں کی ان جماعتوں پر جو شمالی ہند میں رہتی تھیں ضرور پڑا ہوگا۔

(۲)

ہم حصّہ اوّل کے باب پنجم میں مسیحیت اور اسلامی تصوّف کے باہمی تعلق پر کچھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس فصل میں ہم ہندوستان کے صوفیوں کے حالاتِ زندگی میں دیکھ چکے ہیں کہ یہ صوفیہ یا تو خود ایسے ممالک اور شہروں سے آئے تھے جو مسیحیت کے مرکز تھے اور یا اُن کے آباؤ اجداد ایسے مُلکوں سے ہندوستان میں نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے صوفیائے کرام سیاحت پر بڑا زور دیتے تھے کیونکہ اس وسیلہ سے وُہ اپنے سلسلہ اور پیغام کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔ سیاحت کے سلسلہ میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سید جلال الدین بخاری اور بابا فرید وغیرہ کی طرح وُہ خود بغداد، سمرقند، عراق، تبریز، ماوراء النہر، بخارا، ہمدان، غور، ہرات، خراسان، دمشق، ترکستان، قندھار وغیرہ شہروں میں گئے اور وہاں تعلیم حاصل کی اور کچھ مدت تک رہے۔ یہ تمام مقامات مسیحیت کے گڑھ تھے جہاں مسیحی کلیسیائیں کثرت سے رہتی تھیں اور کلیسیاؤں کے ہیڈکوارٹروں میٹروپولیٹنوں، صدر اسقفوں اور بشپوں کے صدر مقام تھے جہاں سے مسیحی رہبان درویش اور مبلغین ایشیا کے تمام ممالک کو بھیجے جاتے تھے۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ ہندوستان کے صوفیہ کی ملاقات کلیسیا کے اکابر سے ضرور ہوئی ہوگی۔ اور جب ہم ان خانقاہوں کے بوریا نشینوں کی تصانیف اور تعلیم پر نظر کرتے ہیں تو یہ قیاس یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ انجیل جلیل کی تعلیم کی شعاعوں نے بھی اُن کو متاثر کر رکھا تھا۔

صوفیہ کرام کی تعلیم (جس میں انجیل کی جھلک دکھائی دیتی ہے) کی وجہ سے علمائے شریعتِ اسلام اور فقہا ہمیشہ صوفیہ کی جماعت سے

عداوت رکھتے تھے۔ اگرچہ بڑے بڑے صوفیہ مثلاً خواجہ اجمیری حضرت سرہندی، مخدوم بہاری فلسفہ سے اپنا دامن بچا کر رکھتے تھے۔ لیکن اہل تصوّف کے نزدیک انسانی زندگی کا معراج یہ تھا کہ اسے تعلق اللہ کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ وُہ کہتے تھے کہ احساسِ خودی خدا کی راہ میں سب سے بڑا حجاب ہے (یوحنا ۱۲: ۲۴-۲۵ وغیرہ)۔ جب انسان اپنی خودی کو گم کر دیتا ہے تو واصل باللہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ درد کہتا ہے:۔

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھُلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

صوفیہ عموماً شریعت اور احکامِ ظاہری کی جانب سے لاپرواہی ظاہر کرتے تھے لہٰذا علمائے ظاہر اُن پر بدعت اور گمراہی پھیلانے کا الزام لگاتے ہیں۔ وُہ صوفیہ کے کشف و شہود، فنا و بقا، پاس انفاس، نفی اثبات، ناسوت و ملکوت، جبروت و لاہوت، اسماء و لطائف وغیرہ پر اعتراض کرتے تھے۔ علماء تو ایک طرف رہے سلاطین دہلی میں سلطان محمد تغلق صوفیہ کے تصوّرِ ولایت کا خاتمہ کرنے اور خانقاہی نظام کو درہم برہم کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ وُہ امام ابن تیمیہ (سالِ وفات ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء) کی تحریک سے متاثر تھا۔ بعض حکام بھی صوفیہ کے مخالف ہوتے تھے۔ چنانچہ اجودھن کا قاضی بابا فرید کا بڑا دشمن تھا اور اُس نے بابا فرید اور اُس کی اولاد کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ اس پر بابا فرید کو غصہ آ گیا۔ اگرچہ وُہ معافی اور محبت کی تعلیم دیتے تھے لیکن آخر انسان تھے۔ اُنہوں نے طیش میں آ کر اپنا عصا زور سے زمین پر مارا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کہتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ قاضی کے پیٹ میں سخت درد اُٹھا اور وُہ اسی سے مر گیا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ صوفیہ شریعت کے ظاہری اعمال پر زور دینے کی بجائے اعمال کے محرکات اور رُوحانی حالات پر زور دیتے تھے۔ مثلاً روزہ

کی انجیلی تعلیم کو ایک صوفی شاعر یُوں ادا کرتا ہے :۔

این دہاں بند و کہ چیزے کم خورد آں بہ بند چشم و غیرے ننگرد

امام غزالی بھی کہتا ہے کہ "روزہ سے نصف ضبطِ نفس حاصل ہوتا ہے اور ضبطِ نفس ایمان کا نصف ہے"۔ اور یہی تعلیم انجیل جلیل کی ہے۔ چنانچہ مولانا رُومی اپنی مثنوی کے دفتر پنجم کے دیباچہ میں کہتے ہیں کہ شریعت اُس شخص کی طرح ہے جو راستہ دکھاتا ہے۔ جب تو راہ پر آ گیا تو تیرا چلنا "طریقت" ہے۔ جب تُو نے مقصود کو پا لیا تو وہ "حقیقت" ہے۔ شریعت کی مثال ایسی ہے جیسے علم طب کا سیکھنا اور "طریقت" علم طب کے مطابق پرہیز کرنا اور دوا کا استعمال کرنا ہے اور "حقیقت" تندرستی اور صحت کو حاصل کر لینا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شریعت علم ہے۔ طریقت عمل ہے اور حقیقت اس عمل کا اثر ہے۔ محض احکام کے جاننے سے انسان کے اخلاق پاک نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے مجاہدات اور فنائے نفس کی ضرورت ہے (مقابلہ کرو ۱۔ کر $\frac{9}{27}$) اور اس کو طریقت کہتے ہیں۔ شریعت اور حقیقت کا تعلق وہی ہے جو جسم اور جان، پوست اور مغز اور ظاہر و باطن کا تعلق ہے۔ شیخ برہان الدین غریب کہتا ہے کہ اوامر و نواہی کا پابند ہونا شریعت ہے۔ دل کی صفائی کرنا، اور برائیوں کو نیکیوں سے بدل دینا طریقت ہے اور ماسوا اللہ کی باتوں کو دفع کر کے رُوح میں تجلّی پیدا کرنا حقیقت ہے۔ ناظرین ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ صُوفیہ مقدس پولوس اور دیگر مسیحی درویشوں اور رہبانوں کے خیالات سے کس قدر متاثر ہیں۔

ارباب تصوف کے نزدیک قلب کی صفائی اور مجاہدات سے انسان کے باطن میں ایک اور حِس پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کو اُن باتوں کا علم ہو جاتا ہے جو حواس اور قیاس و تخیّل وغیرہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ اور وُہ

باتیں نظر آتی ہیں جن کو جسمانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں (دیکھو ۱۔ کر ۲: ۶ تا ۳: ۳ و ۲۔ کر ۱۲: ۲۔ ۴ وغیرہ)۔ امام غزالی اس کو ایک مثال سے یُوں واضح کرتا ہے کہ ایک حوض ہے جس میں نلوں کے ذریعہ پانی باہر سے آتا ہے لیکن خود حوض کی تہ میں بھی ایک سوتا پیدا ہو گیا ہے جس سے پانی فوّارہ کی طرح اُچھلتا ہے اور حوض میں آتا ہے۔ یہی علمِ باطن ہے جس کو علمِ غیبی۔ علمِ لدُنّی، اور کشف کہا جاتا ہے۔ مولانا رُومی اس نکتہ کو یُوں سمجھاتے ہیں :۔

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

ہیچ جنتی ہست جز ایں رنج برمس آں چو زر سرخ دایں حس ہا چو مس

خویش را صافی کن از اوصافِ خود تا ببینی ذات پاک صافِ خود

پس چو آہن گرچہ تیرہ ہیکلی صیقلی کن صیقلی کن صیقلی

تا دروا شکالِ غیبی رُو دہد عکسِ حوری و ملک در وے جہد

سطورِ بالا میں ہم نے انجیل کے چند مقامات ہی کے حوالے دیئے ہیں لیکن ہر انجیل خواں صُوفیہ کے بنیادی اصُولوں اور ان کی تعلیم کا مقابلہ انجیل کے مختلف حِصّوں سے کر کے خود دیکھ سکتا ہے کہ صُوفیائے کرام اور بالخصُوص شمالی ہندوستان کے صُوفیہ انجیلی تعلیم سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ مولانا رُوم قونیہ (ایکونیم) کے رہنے والے تھے جس کا ذکر مقدس پولوس کے سفروں میں اور انجیل میں آتا ہے۔

ہم یہاں ہندوستانی صُوفیوں میں سے چند مشائخ و اولیاء کے پند و نصائح اور اُن کی تعلیم کے نمُونے درج کرتے ہیں جن سے ناظرین خود ہمارے نظریے کی صداقت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے صُوفیہ کے دل و دماغ پر انجیلی تعلیم نے کس قدر اثر کیا تھا۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (بابا فرید) کے چند مشہور اشعار اور اقوال کو

ملاحظہ کریں :۔ ۵

(۱) اے سرتراش دل نتراش از ہوائے نفس — کز سرتراشیت نمود راہ دین ِ حصول
چندیں ہزار تنش تراشید ہر طرف — زیں ہا یکے بدرگہ مولے نشد قبول

(مقابلہ کرو۔ اعمال ۲۱/۲۱ + رُدم ۲: ۲۸ و ۲۹ + ۱- کر ۱۹/۷ وغیرہ)

(۲) گیرم کہ پیش نماز بسیار کنی — صد روز دو بی شخص بیمار کنی
تا دل نکنی زغصہ و کیں خالی — صد خرمن گل بر سر یک خار کنی

(مقابلہ کرو- ۱- کر ۱۳: ۳ و متی ۷: ۲۲- ۲۳ وغیرہ)

(۳) تو گدائی - دور باش از بادشاہ — تا نیاید بر درِ تو - دور باش
گر وصالِ شاہ سے داری طمع — از وصالِ خویشتن مہجور باش

(مقابلہ کرو- یعقوب ۲: ۲- متی ۶/۲۴ - لوقا ۱۲: ۱۶- ۲۱ وغیرہ)

بابا فرید کے یہ اقوال بھی مشہور ہیں - جو انجیلی تعلیم کے آئینہ دار ہیں :۔

(۴) اپنے دِلوں کو شیطان کے کھلونے نہ بننے دو - اپنے باطن کو ظاہر سے بہتر بنا کر رکھو- (متی ۲۳/۲۵-۲۶ - مرقس ۷: ۱- ۸)-

(۵) بدترین خلائق وُہ شخص ہے جو صرف خوراک اور لباس کی ہی فکر کرتا ہے - (متی ۶: ۲۵ - ۳۴ + لوقا ۱۲: ۱۵ وغیرہ)-

(۶) ہر روز نئے نئے رُوحانی کمالات حاصل کرنے کی تمنا کیا کرو (۱- کر ۱۲: ۳۱ و ۱۴: ۱ وغیرہ)-

(۷) نیکی کرنے کے موقعوں کی ہمیشہ تلاش میں رہو- (گلتی ۶/۱۰ وغیرہ)

(۸) اپنی طاقت پر کبھی بھروسا نہ کرو- (فلپی ۴: ۱۳ - رُومیوں ۵: ۲۰- ۲۱ وغیرہ)

(۹) اپنے دُشمنوں سے صلاح و مشورہ کیا کرو اور ان کو اس طریقہ سے جیت لو- اور اپنے دوستوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت کا سلوک کرکے اُن کی

محبت حاصل کرو- (رُدم ۱۲: ۱۹- ۲۱ - متی ۵: ۴۳- ۴۸ وغیرہ)

(۱۰) سب سے بڑی بلا دُنیا کی حرص ہے - ۱- یُوحنا ۲: ۱۵ - ۱۲ - یعقُوب ۴: ۴ وغیرہ)-

(۱۱) اپنے عیُوب کو ہمیشہ نگاہ میں رکھو- (متی ۷: ۴- ۵ + رُدم ۲ باب)

(۱۲) اُس دولت کو حاصل کرو جو ہمیشہ رہیگی- (متی ۶: ۱۹ - ۲۰)-

(۱۳) علم کو انکساری کے ساتھ حاصل کرو- (امثال ۱: ۷ و ۸: ۱۲ وغیرہ)

(۱۴) جب تمہارا دُشمن تم سے سخت کلامی کرے تو تم بردبار رہو اور غصہ سے مغلوب ہو کر اپنی ڈھال ہاتھ سے مت پھینکو- (رُدم ۱۲: ۲۰- ۲۱ - افسی ۴/۲۶ - کلسی ۳/۸ وغیرہ)-

(۱۵) اگر تم بڑا ہونا چاہتے ہو تو مسکینوں اور عاجزلاچاروں کے ساتھ صحبت رکھو- (متی ۲۰: ۲۴ - ۲۷ و لوقا ۲۲: ۲۴- ۲۷ وغیرہ)-

(۱۶) ایسے کام کرو کہ موت کے بعد تم ہمیشہ کی زندگی کو حاصل کرو- لوقا ۱۲: ۳۳ وغیرہ)-

(۱۷) فقر کی زندگی خوشی سے اختیار کرو- خُدا پر اور صرف خُدا پر ہی توکل رکھو اور صرف اُسی سے محبت کرو- (فلپی ۳: ۷ - ۸ - لوقا ۹: ۵۸ وغیرہ - فلپی ۴/۱۹)-

(۱۸) زکوٰۃ تین قسم کی ہے :- زکوٰۃِ شریعت - زکوٰۃِ طریقت اور زکوٰۃِ حقیقت پہلی قسم کی رُو سے ہم بیس درہم میں سے پانچ درہم دیتے ہیں - دُوسری قسم کی رُو سے ہم پندرہ درہم دیتے ہیں لیکن زکوٰۃِ حقیقت میں ہم سب کچھ دے دیتے ہیں - (مقابلہ کرو لوقا ۲۱: ۱- ۴ + ۲ کر ۸: ۲ و ۱۲ - فلپی ۴: ۱۱ - اعمال ۴: ۳۲ وغیرہ)-

(۱۹) رُوحانی ترقی باطنی پاکیزگی اور ضبطِ نفس کا نام ہے۔ صرف ظاہری عبادت سے باطن کی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔ (یوحنا ۶/۲۳۔ رُومیوں ۲/۲۵۔ ۱۔ تمطاؤس ۴: ۸)۔

(۲۰) اگر تم الٰہی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دِلوں سے غُصّہ۔ نفرت اور حسد نکال دو۔ (گلتی ۵: ۲۰ وغیرہ۔ متی ۵: ۲۳۔ ۲۴ وغیرہ)۔

(۲۱) جو بادشاہی درباروں کے طالب ہوتے ہیں وہ خزانِ الٰہی حاصل نہیں کر سکتے۔ (۱۔ سمو ۱۲ باب وغیرہ)۔

(۲۲) اس دُنیا میں کسی سے دُشمنی نہ کرو۔ اپنے دُشمنوں سے محبت کا سلوک کرو اور اُن سے ہمیشہ لطافت اور ملائمت سے پیش آؤ۔ (متی ۵/۴۴۔ لُوقا ۶/۳۴)۔

(۲۳) محبت نافع ہے لیکن ایمان کے بغیر محبت نفع نہیں بخشتی۔ (۱۔ کر۔ ۱۳: ۱۳ وغیرہ)۔

(۲۴) حقیقی علم انسان میں انکساری پیدا کرتا ہے۔ (امثال ۸: ۹۔ ۱۲ وغیرہ)

(۲۵) جب علما اپنے علم پر فخر کر کے لوگوں سے غرور اور تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے تو بابا فرید کہا کرتے تھے کہ علمِ شریعت کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے تا کہ خلقت کو اس سے آزار پہنچے۔ (متی ۲۳: ۱۳۔ ۱۴ و ۲۳ وغیرہ)۔

(۲۶) اگر تیرے پاس ہے تو غم نہ کر۔ اگر نہیں ہے تو غم نہ کر۔ (مقابلہ کرو زبور ۶۲/۱۰ وغیرہ)۔

(۲۷) دُشمن کی تلخ باتوں سے مُشتعل نہ ہو (متی ۵: ۴۴ وغیرہ)۔

ایک دفعہ کسی نے شیخ نظام الدین اولیاء کو کہا کہ بعض لوگ آپ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا جو لوگ مجھ کو بُرا کہتے ہیں مَیں نے اُن کو مُعاف کیا۔ خُدا کی مخلوق سے عناد اور دُشمنی رکھنا طریقت کے خلاف ہے (متی ۵/۴۴ وغیرہ) ایک شخص نے ایک دفعہ اُس کو اُس کے مُنہ پر گالیاں دیں۔ اور اُس سے کچھ مانگا۔ شیخ نے جو کچھ اُس نے کہا خاموشی سے سُنا اور جو مانگا دے دیا اور کہا میرے پاس بہت لوگ آتے ہیں۔ ایسے شخص کو بھی آنا چاہیئے جو مجھ کو بُرا کہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کسی ایماندار کے دِل کو ستانا خُدا کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ (اعمال ۹: ۴ وغیرہ)۔ اگر کسی کے پاؤں میں مغرب میں کانٹا چبھے تو مشرق والے کو اُس کا درد محسوس ہونا چاہیئے۔ (رُومیوں ۱۲/۵۔ ۱۔ کر۔ ۱۲/۲۶)۔ جب کسی سے تکلیف پہنچے تو کسی حال میں بھی دل سے بددُعا نہ نکلے (رُومیوں ۱۲/۱۷ وغیرہ) درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیئے کیونکہ پردہ پوشی افضل عبادت ہے۔

شیخ بُو علی قلندر دُنیا کی حرص و ہوا کی بابت کہتا ہے:۔

دل چو آلودہ است از حرص و ہوا | کے شود مکشوف اسرارِ خُدا
صد تمنا در دل است اے بوالفضول | کے کند نورِ خُدا در دل نزول
دین و دُنیا ہر دو کے آید بدست | این فضولی ہا مکن اے خود پرست

(متی ۶: ۲۴ + متی ۱۹: ۱۶۔ ۲۲ وغیرہ)۔

شیخ برہان الدین غریب کو ایک شخص نے کہا کہ مَیں دین اور دُنیا دونوں حاصل کرنا چاہتا ہُوں۔ اُس نے جواب دیا کہ خُدا کو حاصل کر لو تو ساری دُنیا کی چیزیں خود بخود حاصل ہو جائینگی۔ (متی ۶: ۳۳ وغیرہ)۔ وہ کہتا تھا کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب پر نظر کرے۔ جس قدر وہ اپنے محبوب کو دیکھیگا اُس کو زیادہ محبوب اپنے اندر نظر آئیں گے (متی ۷: ۱۔ ۵)۔ دُنیا سایہ کی مانند ہے۔ جب انسان سایہ کی طرف مُنہ کرتا ہے تو سایہ اُس کے آگے آگے چلتا ہے

لیکن جب سایہ کی طرف اُس کی پیٹھ ہوتی ہے تو سایہ اُس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ اِسی طرح انسان کو دُنیا کی طرف سے مُنہ موڑ لینا چاہیے (۱۔ یُوحنا ۲: ۱۵)۔ جب تک دل کا ظرف خالی ہوتا ہے وُہ دُنیا سے بھرا رہتا ہے جس طرح ظرف ہَوا سے بھرا رہتا ہے۔ لیکن جب دِل میں محبت بھری ہوتی ہے تو نفسانی خواہشات اس میں سے نکل جاتی ہیں اور وُہ خُدا کی محبت سے معمُور ہو جاتا ہے (متی ۶: ۲۴ وغیرہ)۔ درخت کی طرف دیکھو۔ وُہ خود تو دُھوپ میں کھڑا رہتا ہے لیکن دُوسروں کو سایہ دیتا ہے۔ لکڑی خود تو جلتی ہے لیکن دُوسروں کو آرام پہنچاتی ہے۔ انسان کو خود تکلیف اُٹھانی چاہیے تاکہ اَوروں کو آرام ملے (قولِ مسیحی رُہبان)۔ اگر کوئی شخص تمہارا عیب ظاہر کرے تو دیکھو کہ وُہ عیب تم میں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اُس عیب کو دُور کرو اور عیب ظاہر کرنے والے کا شکریہ ادا کرو۔ اگر وُہ عیب تُم میں نہیں ہے تو دُعا کرو کہ خُدا اُس شخص کو عیب جوئی سے بچائے (قولِ مسیحی صُوفیہ)۔ بابا فرید کہتا ہے کہ درویش کو چار باتیں کرنی چاہئیں:۔ (۱) اپنی آنکھوں کو بند کرنا تاکہ خُدا کے بندوں کے عیوب نہ دیکھے (۲) کانوں کو بہرا کرنا تاکہ جو باتیں سُننے کے قابل نہیں ہیں اُن کو وُہ نہ سُنے۔ (۳) زبان کو گونگی کرے تاکہ جو باتیں کہنے کے لائق نہ ہوں وُہ نہ کہے (۴) پاؤں کو لنگڑا کرے تاکہ نفس جب کسی غیر ضروری یا ناجائز کام کی طرف لے جانا چاہے تو وُہ نہ جا سکے (متی ۸ باب وغیرہ)۔ وُہ کہتا تھا کہ جس کے دل میں دُنیا کی محبت ہے وُہ مردُودِ طریقت ہے (۱۔ یُوحنا ۲: ۱۵)۔ درویشوں کا طریقہ طریقۂ تحمل ہے اور تحمل بھی ایسا کہ اگر کوئی شخص اس کی گردن پر ننگی تلوار رکھ دے تو بھی وُہ اپنے دُشمن سے خُوش رہے اور اُس کے لئے دُعا کرے بد نہ کرے۔

(رُومی ۱۲ باب وغیرہ)۔ توبہ سات قسم کی ہے:۔ توبۂ دِل۔ یعنی حسد۔ ریا۔ لہو و لعب اور تمام نفسانی لذتوں اور شہوتوں سے صدقِ دل سے باز رہنا۔ اِس طرح دِل کی آلائش دُور ہو جاتی ہے اور بندہ اور مولا میں جو پردہ ہے وُہ چاک ہو جاتا ہے۔ (۲) توبۂ زبان جس کے بغیر کوئی شخص انوارِ عشق کی تجلّی کو دیکھ نہیں سکتا۔ (۳) توبۂ چشم ہو تو انسان کسی کے عیب نہیں دیکھتا۔ (۴) توبۂ گوش۔ (۵) توبۂ دست۔ (۶) توبۂ پائے۔ (۷) توبۂ نفس۔ (خلاصہ تعلیم مسیحی صُوفیہ)۔ بابا فرید کا قول ہے کہ دُنیا کے تمام معاملات میں عاقل شخص اللہ پر توکل کرتا ہے۔ متوکل کے ایمان میں خوف۔ رجا۔ اور محبت ہوتا ہے۔ خوف سے وُہ گناہ ترک کرتا ہے۔ رجا سے اللہ کی عبادت کرتا ہے اور محبت سے خُدا کی رضا کی خاطر وُہ تمام مکروہات سے پرہیز کرتا ہے۔ (۱۔ یُوحنا ۴/۱۸۔ زبُور ۳۷ وغیرہ) راہِ سلوک میں سالک پر جس قدر رنج تکلیف اور مُصیبت نازل ہوگی وُہ خُدا کے قریب تر ہوتا جائیگا۔ (۲۔ کر ۱۲/۹۔ فل ۲: ۵ تا ۱۱)۔

شیخ صدرالدین عارف، شیخ بہاؤالدین زکریا کا فرزند تھا۔ اس کا قول ہے کہ دل میں نہ تو بہشت کی آرزو اور نہ جہنّم کا خوف ہونا چاہیے۔ وہاں صرف اللہ ہی اللہ ہو۔ جب یہ حقیقت پکے طور پر دِل کو پکڑ لیتی ہے تو بہشت خُود بخود پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ (قولِ مسیحی رُہبان)۔ وُہ سہروردیہ سلسلہ کا تھا جس کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ؎

مُرادِ اہلِ حقیقت لباسِ ظاہر نیست　　کمر بخدمتِ سلطان بند و صُوفی باش (سعدی)

شرف الدین احمد منیری (از ٦٦١ھ تا ٧٨٢ھ) محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانہ میں تھا۔ اس کا قول ہے کہ جب سالک کا دِل آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے تو نورِ اُس میں تجلّی کی شان میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اُس کے کلام میں تجلّی

ہوتی ہے تو وہ حضرت موسٰے کی طرح خدا سے متکلم ہوتا ہے اور اگر وہ اخلاق کی صفت میں تجلی پاتا ہے تو اس میں وہ بات پیدا ہوتی ہے جو حضرت عیسٰی میں تھی۔

شیخ شہاب الدین مصنف عوارف المعارف خدا سے دعا کیا کرتا تھا کہ خدا جہنم کو اس کے جسم سے ایسا بھر دے کہ اس میں کسی دوسرے گنہگار کے لئے جگہ نہ رہے۔ شاید اس طریقے سے دنیا کے تمام گنہگار نجات پا جائیں۔ ایک مرید نے اس کو لکھا یا شیخ۔ اگر میں صالح اعمال نہ کروں تو سست پڑ جاتا ہوں اور اگر میں ان کو کروں تو مجھ میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ میں کیا کروں؟ اس نے جواب دیا "تم اعمال صالح کرو اور غرور کے لئے خدا سے معافی مانگو"۔

صوفیہ نے اعتکاف کو بھی مسیحی گوشہ نشینوں سے اخذ کیا ہے سید محمد گیسو دراز اعتکاف کے متعلق کہتا ہے کہ اعتکاف رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتا ہے لیکن صوفیہ کبھی چالیس دن اور کبھی اسّی (۸۰) اور کبھی ایک سو بیس دن اعتکاف میں بیٹھتے ہیں۔ چالیس روز کا اعتکاف ماہ شعبان کی آخری دسویں تاریخ اور پورے ماہ رمضان کا ہوتا ہے۔ اس کو "اربعین محمدی" کہتے ہیں۔ اسّی دن کا اعتکاف رجب سے شروع ہوتا ہے اس کو "اربعین عیسٰی علیہ السلام" کہتے ہیں۔ اعتکاف میں ذکر اور مراقبہ برابر کرتے رہنا چاہیئے۔

نقشبندی سلسلہ کے گیارہ قواعد خاص ذکر میں (۱) ہوش در دم یعنی ہر دم خدا کی یاد میں صرف ہو۔ (۲) نظر بر قدم تاکہ گرد و پیش کے حالات کو دیکھ کر اس کے خیالات خدا کی حضوری سے آوارہ نہ ہوں (۳) سفر

در وطن۔ یعنی اس زندگی میں وہ حقیقی وطن کی جانب سفر کر رہا ہے۔ (۴) خلوت در انجمن۔ یعنی لوگوں کے درمیان بھی اس کے خیالات خدا پر مرکوز ہوں۔ (۵) یاد کردن۔ یعنی ذکر کو جو اس نے اپنے پیر سے سیکھا ہے یاد رکھے۔ (۶) باز گشت۔ یعنی وہ کبھی کبھی ذکر کے دوران میں اس قسم کی دعا کیا کرے "اے خدا۔ تو ہی میری حقیقی منزل ہے۔ میں دونوں جہانوں کو تیری خاطر ترک کرتا ہوں۔ مجھ کو برکت دے اور اپنی تجلی کا نور مجھ پر چمکا"۔ (۷) نگاہ داشت یعنی برے خیالوں کو دل میں نہ آنے دے۔ (۸) یاد داشت۔ یعنی بغیر الفاظ اور تصور کے وہ خدا کی حضوری پر توجہ کرے۔ (۹) وقوف زمانی۔ یعنی اس بات کو جانچے کہ اس نے اپنا وقت کس طرح گذارا ہے۔ (۱۰) وقوف اعدادی یعنی ذکر کو اتنی دفعہ دہرائے جتنی دفعہ پیر نے ہدایت کی ہے۔ (۱۱) وقوف قلبی یعنی قلب پر اللہ کا نام نقش ہو اور وہ اس کا تصور کرے۔ جو اصحاب مسیحی رہبانوں کے طریقوں سے واقف ہیں وہ بلاحظہ کر سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا قواعد ان کی صدائے باز گشت ہیں۔

جب ہم بابا فرید کی دعاؤں پر نظر کرتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی دعاؤں کا محرک نہ تو بہشت کا وعدہ ہے اور نہ دوزخ کا عذاب۔ بلکہ اس کی عبادت اس محبت کی وجہ سے تھی جو وہ خدا کے ساتھ رکھتا تھا اور یہ محبت ہر قسم کی رکاوٹ پر غالب آتی ہے جو عاشق صادق اور معشوق حقیقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

تصوف درحقیقت محبت ہی کا پیغام ہے جس کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہر قسم کے نفرقہ اور امتیاز۔ نفرت عداوت اور دشمنی کا ایسا قلع قمع ہو جائے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کی جائے۔ (مقابلہ کرو متی ۵: ۴۳ تا ۴۸)۔

(رومیوں ۱۲: ۱۴ تا ۲۰ وغیرہ)۔ مقابلۂ مذاہب کا ہر طالب علم دیکھ سکتا ہے کہ یہ تعلیم قرآنی نہیں بلکہ انجیلی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے بابا فرید کو ایک قینچی بطور تحفہ دی۔ اُس نے کہا "مجھے قینچی درکار نہیں۔ میں کاٹنا نہیں چاہتا۔ مجھے سُوئی کی ضرورت ہے تاکہ مختلف ٹکڑوں کو باہم پیوند کر سکوں"۔ محبت ہی دوست اور دُشمن کی تمیز کو مِٹا دیتی ہے۔ چنانچہ سعدی جو خود صُوفی تھا کہتا ہے:۔

شُنیدم کہ مردانِ راہِ خُدا — دِلِ دُشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

ہندوستان کے صُوفیہ نے اُخوت و مساواتِ انسانی کا جو سبق سلطنتِ دہلی کی رعایا کو سکھلایا وُہ بھی انجیل کا ہی سبق ہے۔ قرآن اُخوتِ اسلامی کا سبق دیتا ہے لیکن اُخوتِ انسانی کا سبق نہیں دیتا (سورۂ توبہ)۔ اس نے بنی نوعِ انسان کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کر کے دونوں میں حدِ فاصل مقرر کر دی ہے۔ (۲۳: ۲۷)۔ اس کا مفصل ذکر ہم حصۂ اوّل میں کر آئے ہیں۔ لیکن انجیل نے ابوّتِ الٰہی اور اُخوت و مساواتِ انسانی کا سبق دیا ہے (۱۔ یوحنا ۲: ۹ تا ۱۱ + ۳: ۱۰-۱۱ + ۴: ۲۱ و متی ۱۲ وغیرہ)۔ جہاں سلطنتِ دہلی کے صُوفیہ کی یہ کوشش تھی کہ ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور تمام ذاتوں اور فرقوں کو باہم متحد کریں اور اُن کی خانقاہوں میں تمام مذاہب کے پیروؤں کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا تھا اور وُہ سب کو محبت، اُخوت اور مساوات کا سبق دیتے تھے، وہاں علمائے اسلام قرآن و شریعت کے احکام پر عمل کر کے مسلمانوں اور غیروں میں شرعی خلیج کو برقرار رکھنے کے درپے تھے اور سلاطین کو غیر مسلموں کے قتل، آزار، تخریب اور تذلیل پر اُبھارتے رہتے تھے۔ چنانچہ ضیاالدین برنی اپنے غم و غصّہ کا

یوں اظہار کرتا ہے "اگر بادشاہانِ اسلام اتنی قوت اور شوکت رکھنے کے باوجود یہ روا رکھیں کہ اُن کے دارالسلطنت میں اور مسلمانوں کے شہروں میں کُفر کی رسمیں پھیلیں اور کھلم کھلا بُت پرستی کی جائے اور بادشاہ شرائطِ کُفر کے ساتھ رعایت رکھیں کہ وُہ اپنے باطل دین کے احکام بے خوف و ہراس جاری رکھیں اور بُتخانے اور زینت رکھیں اور اُن کے گروہ ڈھول بجا بجا کر شور مچاتے ہوئے گانے ناچنے خوشی کرتے ہوئے نکلیں اور چند ٹنکہ جزیہ دے کر کُفر کی تمام رسموں کو مانیں اور اپنے باطل دین کی کتابوں کا لوگوں کو سبق دیتے پھریں بلکہ بُت پرستی کے احکام کو علانیہ پھیلائیں تو اس طرزِ عمل سے دینِ اسلام باقی دینوں پر کس طرح غلبہ حاصل کر سکے گا"؟ (فتاویٰ جہانداری صفحہ ۱۲۰)۔ سلطنتِ دہلی کے ایام میں خود مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں سخت تفریق و تمیز تھی۔ ان مسلمانوں میں تُرک تھے۔ نو مسلم منگولی تھے۔ عرب تھے۔ وسط ایشیا کے مختلف ممالک کے ہزاروں مہاجرین تھے۔ آزاد تھے۔ غلام بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کو تاتاری طوفان نے بدحواس کر رکھا تھا۔ بہتیرے غوریوں کے سیاسی تسلط سے پہلے مختلف شہروں میں آباد تھے۔ نو مسلم ہندو تھے جو صدیوں سے چھوت چھات اور ذات پات کا شکار رہ کر ہندو سماج، جزیہ اور غلامی سے بچنے کے لیے مسلمان ہو گئے تھے لیکن ان مسلمانوں کا ہر طبقہ دُوسرے طبقوں کے مسلمانوں کا جانی دُشمن تھا۔ ہر طبقہ اپنی طاقت اور قوت بڑھانے کی خاطر دُوسرے طبقوں کے مسلمانوں کو اور اُن کے جائز حقوق کو بے دریغ پاؤں تلے روندتا رہتا تھا۔ اسلامی اُخوت و مساوات صرف کتابوں میں ہی پائی جاتی تھی۔ تُرک غیر تُرکوں کو دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ تُرک اُمراء کا طبقہ بھی ایک دُوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے علماء کو

ملازم رکھتا تھا اور اس طبقہ کے شرکا اُن سے جو چاہتے اپنے مفاد کے لئے کہلوا لیتے تھے۔ بلبن کے زمانہ میں ہر قسم کے مُلکی اور نسلی امتیاز اور دیگر امتیازات زوروں پر تھیں۔ تُرکی سُلطان اور ارکانِ سلطنت ہندوستان کی "خُداداد دولت" سے عیش کرتے تھے اور عوام مُسلمان سخت محنت کرنے کے باوجود بمشکل تمام اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ہر سُلطان۔ امیر اور وزیر اپنے ہی خاندان کے استحکام کی فکر میں تھا۔ التتمش کے مرنے اور بلبن کی تخت نشینی کے درمیانی عرصہ میں خاص طور پر مُلک میں ایسا خلل تھا کہ سب اُمرا اپنا اپنا رسُوخ بڑھانے کی فکر میں تھے اور ایسے ملازم رکھتے تھے جو اُن کی ہاں میں ہاں ملا کر فتوے صادر کریں۔ خود سلاطین نے اسلامی سیاست کی قرآنی بنیادیں بدل دیں تاکہ اُن کا اور اُن کے خاندان کا اقتدار اور طاقت بڑھتی جائے۔ سلطنت کے معاملہ میں اُن کے نظریے قرآنی نہ تھے بلکہ ساسانی تھے۔ جس طرح ساسانی بادشاہوں کو نہ صرف سیاسی اقتدار اور اختیار حاصل تھا بلکہ اُن کو مذہبی فوقیت بھی حاصل تھی اور وُہ اُلوہیت کے انسانی پیکر سمجھے جاتے تھے اسی طرح سلاطین دہلی "ظل اللہ فی الارض" ہو گئے اور نیابتِ خُداوندی کا دعوے کرنے لگے۔ سُلطان فیروز شاہ تغلق جیسے شیدائی اسلام نے اپنے ایک فرمان میں لکھا کہ حضرت امیر المومنین خلیفہ عُمر کا قول ہے کہ سُلطان کا منع کردہ قرآن کے منع کرنے سے بھی بڑھ کر ہے! یہ سلاطین طبقہ عُلما کو بھی اپنی اغراض کا آلۂ کار بناتے تھے جس طرح وُہ اپنی رعیت کے باقی طبقوں کو اپنا آلہ بناتے تھے۔ ایسا کہ جہاں کہیں باغیانہ خیالات کا خدشہ ہوتا تو وُہ عُلماء کو بھیج کر اُن کو یہ تعلیم دلواتے کہ بادشاہ کی فرمانبرداری ایک مذہبی غرض ہے۔ اگر کہیں محصول وصول کرنے میں دقت پیش آتی تو عُلماء اس مشکل کو

آسان کر دیتے تھے۔

حاصل کلام سلطنت کے ایام میں اُخوت اور مساوات کا نام بھی نہ تھا۔ صرف صُوفیہ کی جماعت ہی مجموعی طور پر باستثنائے چند، ان اصولوں پر زور دیتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی صاحب لکھتے ہیں "جس وقت بلبن ایرانی نظریاتِ حکومت کے ماتحت تُرک و غیر تُرک کے امتیازات پر سیاسی نظام کی بُنیادیں استوار کر رہا تھا۔ اُن دنوں میں حضرت بابا فرید گنج شکر نے اپنے جماعت خانے ہر کس و ناکس کے لئے کھول رکھے تھے اور رنگ و نسل فقر و امارت کے امتیازات ختم کر دیئے تھے۔ جس وقت سلاطین کی رزم آرائیوں سے مُلک میں تہلکہ مچا ہُوا تھا مشائخ کی خانقاہیں محبت کے نغموں سے گونجتی تھیں اور ہندو جوگی اور مُسلمان صُوفی تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اور تہذیب و تمدّن کی ایک دُوسری عمارت تعمیر کرتے تھے۔ سلاطین کشورکشائی میں اور صُوفیہ اقلیم دِل کی تسخیر میں مصروف تھے"۔ (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات صفحہ ۱۰) لیکن یہ اُخوت جس کا پرچار بابا فرید اور دیگر صُوفیائے کرام کرتے تھے نہ تو اسلامی اُخوت تھی اور نہ قرآنی تھی بلکہ انجیلی تھی۔

ہر مسیحی قسیس اور خادم الدین اپنے تجربہ سے جانتا ہے کہ دُکھ اور مُصیبت کے وقت لوگ اُس سے تسلّی حاصل کرنے کی اُمید رکھتے ہیں اور قلبی اطمینان حاصل کرنے کے لئے اُس کے آگے اپنا رونا روتے ہیں اور وُہ ہر ایک سے فرداً فرداً مل کر اور اُس کا دُکھ اُٹھا کر اُس کو رُوحانی مشورہ دیتا ہے یہ بات ہمیشہ مسیحیت کا امتیازی نشان رہی ہے۔ ہم اس کتاب کے پہلے حصّہ میں مسیحی عرب بادیہ نشینوں کا حال بتلا چکے ہیں جن کے پاس رُوحانی آرام قلب حاصل کرنے کے لئے دُنیادار ہزاروں کی تعداد میں آتے جاتے تھے اور وُہ ہر ایک سے

فرداً فرداً ملاقات کرکے اُن سے تسلّی آمیز باتیں کرتے تھے اسلامی تصوّف نے اس چیز کو مسیحی قسیسوں اور گوشہ نشینوں سے لیا۔ چنانچہ جب بابا فرید کے پاس لوگ جوق در جوق آتے اور جہاں وہ جاتا تھا اُس پر چاروں طرف سے گرتے تھے تاکہ اُس سے اپنی مشکلات بیان کرکے تسلّی حاصل کریں تو وہ اُن سے کہتا تھا کہ میرے پاس ایک ایک کرکے آؤ تاکہ میں تم میں سے ہر ایک کی انفرادی مشکلات معلوم کرکے تمہاری مدد کر سکوں۔ لوگوں کے دکھوں کو سُن کر اُس کا اپنا جگر پاش پاش ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے اُس کی باتوں میں تاثیر تھی اور لوگ آرامِ قلب حاصل کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا جو مجرد ہو یا محض واحد ہو بلکہ وہ خدا کی حضوری کو ہر دم محسوس کرتا تھا اور یہ احساس اُس کی زندگی کا حقیقی راہنما تھا جس نے اُس کی زندگی کو لوگوں کی نظروں میں قابلِ قدر بنا دیا تھا۔ وہ خدا کی حضوری کو عشقِ حقیقی سے حاصل کرتا تھا اور ہر شخص کے لئے دعا کرتا تھا کہ خدا تم کو "درد" عنایت کرے جس سے اُس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خدا تمہاری آنکھوں میں توبہ کے آنسو اور تمہارے دل میں عشقِ حقیقی کا جذبہ پیدا کرے۔ پروفیسر ٹائن بی (TOYNBEE) درست کہتا ہے کہ "یہ اللہ والے لوگ جن کو عام لکھے پڑھے شخص اینٹی سوشل (سماج سے بے تعلقی رکھنے والے) سمجھتے ہیں درحقیقت سماج کی ضروریات کو بہترین طور پر پورا کرتے ہیں۔ مثلاً مسیحی گوشہ نشین مقدس انطونی (ANTHONY) صحرا میں یا مقدس شمعون (SYMEON) اپنے مینارہ پر۔ اگرچہ یہ عرب بادیہ نشین تارک الدنیا تھے اور انہوں نے سماج سے اپنا تعلق قطع کر لیا تھا تاہم انہوں نے سماج کے دور و نزدیک کے لوگوں پر اس قدر گہرا اور وسیع اثر کیا کہ اگر وہ دنیا میں بود و باش کرتے تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔ وہ اپنے گوشۂ عزلت

سے دنیا کو جدھر چاہتے چلاتے تھے اور دنیا میں رہنے والوں کے دلوں پر بادشاہِ وقت سے زیادہ حکومت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر دم خدا کی حضوری میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِس حقیقت نے دنیا کو عقیدت کے جذبہ سے سرشار کر رکھا تھا۔ وہ خدا کی خلقت کو اُس کے خالق کے قریب لاتے تھے بالخصوص جب سیاسی اور دیگر پریشان کن حالات اُن کو بے چین کر دیتے تھے۔ تب وہ اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے اُن مقدس ہستیوں کی طرف رجوع کرتے تھے" (صفحہ ۱۸)۔

ہندوستان کے صوفیہ کی خانقاہوں کے گرد جو جھمگھٹے جمع رہتے تھے وہ ہم کو بالخصوص اُن جھمگھٹوں کی یاد دلاتے ہیں جو چوتھی صدی مسیحی میں مصر کی کلیسیا کے فقرا، درویشوں اور گوشہ نشین رہبانوں کے گرد جمع ہوا کرتے تھے۔ مقدس انطونی کا نام ان رہبانوں میں سے سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان گوشہ نشینوں میں سے بعض صحراؤں میں جنگلی درندوں کے ساتھ بود و باش کرتے تھے۔ وہ سخت گرمی اور شدت کے جاڑوں میں بھی مادر زاد ننگے رہتے تھے۔ ان بادیہ نشینوں میں سے بعض کی خوراک صرف گھاس ہوتی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ چنانچہ ایک عورت اڑتیس (۳۸) سال تک ایک ہی غار میں رہی اور گھاس اُس کی خوراک تھی۔ سکندریہ کا میکیریس دن میں صرف آدھ پاؤ روٹی پر گذارہ کرتا تھا اور ایامِ روزہ میں سوائے اتوار کے دن کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ ایک اور درویش ٹولومی تھا جس نے چودہ سال تک شبنم کے پانی کے سوا کوئی دوسرا پانی نہ پیا۔ یہ مسیحی رہبان شب بیدار تھے اور رات دن عبادتِ الٰہی میں منہمک رہتے تھے۔ جب نیند کا سخت غلبہ ہوتا تو فقط ایک گھنٹہ سو لیتے تھے۔ باوجود ایسی ریاضتوں کے ان کی عمر

لمبی ہوتی تھی چنانچہ میکبرئیس کی عمر اسّی سال اور انیطونی کی عمر ۹۰ سال تک ہوئی عرب مسیحی راہب شمعون ایک مینارہ کی چوٹی پر ہی رہتا تھا جہاں سے وہ پچاس سال تک نہ اُترا اور ستّر سال کی عمر پاکر ۴۶۰ء میں فوت ہوا۔ اس مقدس ہستی کے مینارہ کے نیچے حاجت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور وہ مینارہ پر سے ہر ایک کو انفرادی طور پر اُس کی رُوحانی اور جسمانی بیماری سے اچھا کرتا تھا۔ لوگ کئی سَو کوس طے کر کے دُور دراز کے مقامات سے اُس کے پاس آتے تھے اور دل کی تسلّی اور رُوحانی پاکیزگی حاصل کر کے خوشی خوشی اپنے وطن کو واپس جاتے تھے۔ ان درویشوں اور رُہبانوں نے اپنے اُوپر دُنیا کی لذّتوں کو حرام کر رکھا تھا تاکہ وہ مصیبت زدوں کی مدد کریں اور لاچار بیکسوں کے چارہ گر ہوں۔ وہ اپنی دعاؤں سے تعلیم اور زندگی سے ہزاروں کو جو اُن کے پاس آرام قلب حاصل کرنے کی خاطر جوق در جوق آتے تھے انجیل کا جانفزا اور رُوح پرور پیغام دیتے تھے۔ تاکہ عوام النّاس دُنیا۔ شیطان اور نفس کے پنجہ سے آزاد ہو کر ایسی زندگیاں بسر کریں جن میں جسمانی خواہشات مصلوب ہو گئی ہوں اور محبّت۔ خوشی اور قلبی اطمینان اُن کو مسرور کرتا ہو۔

(۳)

اسلامی حملہ آور تین اطراف سے ہندوستان میں داخل ہوئے:۔ (۱) سمندری راہ (۲) برّی راہ یعنی ایران میں سے ہو کر وہ سندھ آئے تھے۔ یہ راستہ مسوپتامیہ اور جنوبی ایران۔ بلوچستان سے مکران کے پہاڑوں کے جنوب سے سندھ میں آتا ہے۔ (۳) درہ خیبر کا راستہ۔ صوفیہ اور درویش بھی انہی تینوں راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔

ہم سطورِ بالا میں ذکر کر آئے ہیں کہ جہاں حملہ آور بزورِ شمشیر اسلام پھیلاتے

تھے وہاں صوفیہ کا گروہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام زبان اور قلم سے کرتا تھا۔ خواجہ معین الدّین چشتی نے محمود غزنوی اور غوری کے حملوں کے ساتھ ساتھ متعدد صوفیہ کو "خلیفہ" بنا کر مختلف اطراف و جوانب کو اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ انہوں نے ہر کس و ناکس کو اور ہر مذہب و ملّت کے پیروؤں کو اسلام کا پیغام دیا۔ جہاں مسلم حملہ آور جبراً اسلام پھیلاتے تھے وہاں صوفیہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے اور کمبل کے جھونپڑوں میں عمر گزار دیتے تھے۔ وہ کبر اور پہلو کے تہتوں اور گودڑ سے اپنا پیٹ پال کر یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کی خانقاہیں علوم ظاہری اور باطنی کی تربیت گاہیں ہوتی تھیں۔ اُن کے مُرید اور خلیفے خانقاہوں سے نکل کر چاروں طرف جا کر تبلیغ اسلام کرتے تھے۔ انہوں نے مُلک کی فضا کو جو اسلامی حملوں کی وجہ سے مکدّر ہو رہی تھی حتےّ المقدور ہر جگہ بدلنے کی کوشش کی۔ اُن کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ سینکڑوں مسجدیں اور لنگر خانے موجود ہو گئے۔ ہر طرف مؤذّن کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر خانقاہ کے ساتھ لنگر خانہ تھا جہاں بھوکوں کو کھانا مُفت ملتا تھا۔ صوفیہ ہر مذہب و ملّت والوں سے خندہ پیشانی۔ خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن کے سلوک کو دیکھ کر اور اُن کے درس اور وعظ سُن کر ہزاروں اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے۔

سلطنتِ دہلی کے سلاطین (یا شہنشاہِ ہند) گروہِ صوفیہ کے مُرید ہوتے تھے۔ پس بحکم النّاس علیٰ دینِ ملوکہم (لوگ بادشاہ کے دین کو اختیار کر لیتے ہیں) جب سُلطان ظاہر یا باطن میں کسی صوفی کا مُرید ہوتا تو اُمرا اور عوام بھی اُس کی پیروی کرتے تھے۔ ہندوؤں میں پہلے ہی جوگی اور سنیاسی تھے جن کے وہ معتقد تھے۔ عیسائی بھی مسیحی فقرا اور مسیحی گوشہ نشینوں سے مانوس تھے کیونکہ ایسے لوگ اُن کی کلیسیاؤں میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ مسیحی کلیسیاؤں کے

شرکا فقر وفاقہ کو رُوحانی بلندیوں کا امتیازی نشان سمجھتے تھے۔ صُوفیہ بھی مسیحی رُہبانوں کی طرح مخلوقات کی خدمت و اصلاح کرتے تھے اور ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کے ذریعہ ہندوؤں اور عیسائیوں کو ایک ایسی راہ دکھاتے تھے جو تلوار کی راہ نہ تھی بلکہ محبّت۔ صُلح۔ ہمدردی۔ اُخوّت اور مساوات کی راہ تھی۔ بڑے اور بزرگ صُوفیہ اور اولیا انہی باتوں کا درس دے کر غیر مُسلموں کو حلقۂ اسلام میں لاتے تھے۔ قدرتاً اس کا اثر مسیحی کلیسیاؤں کی تعداد اور اُن کے شرکا کے شمار پر بڑا ہوگا کیونکہ مختلف خانقاہوں کے صدہا فارغ التحصیل طلبا نے شہروں۔ قصبوں۔ گاؤں بستیوں۔ جنگلوں اور غاروں میں مجاہدہ۔ مُراقبہ اور ریاضت سے اسلام کی اشاعت کی۔

صُوفیہ کے گروہ کی خانقاہوں میں (جیسا ہم سطورِ بالا میں لکھ چکے ہیں) غیر مُسلم مردوں اور عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے بہتیرے اپنے دل کی مُرادیں مانگنے کے لئے آتے تھے۔ بہتیری ہندو عورتیں مزاروں پر آکر منّت مانتی تھیں کہ اگر اُن کے ہاں کوئی اولاد ہُوئی تو وہ اپنے بیٹے کو مُسلمان بنا دیں گی۔ چنانچہ فی زمانہ ہندوستان میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن کے آدھے افراد ہندو ہیں اور آدھے مُسلمان ہیں کیونکہ مسلمان افراد کے آبا و اجداد نے اس قسم کی منّت کسی مزار یا قبر پر مانی تھی۔ اندازہ یہی ہے کہ آج کل بھی ہندوستان میں چھ فیصدی ہندو مرد اور عورتیں مُسلمان پیروں کی قبروں اور مزاروں پر مُرادیں مانگتی ہیں۔ اس طریقہ سے ہندوستان میں اسلام کی بہت اشاعت ہُوئی۔ اور اس کا اثر بھی مسیحی کلیسیاؤں کی عورتوں کی اولاد کے شمار پر پڑا ہوگا۔

صُوفیہ میں سیّد یُوسف الدّین کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وُہ حضرت عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھا۔ اُس کو خواب میں حکم ہُوا کہ تم

بغداد سے ہندوستان جاؤ اور اہلِ ہند کو اسلام کے دائرہ میں لاؤ۔ وُہ ۱۴۲۲ء میں سندھ آیا اور اُس نے دس سال کے عرصہ میں سات سو خاندانوں کو حلقۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ سندھ کی اکثر اقوام شیخ بہاؤ الحق کے ذریعہ اسلام لے آئیں۔

مُلتان کا صُوبہ مُسلم مبلّغوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ سندھ اور مُلتان محمد بن قاسم کے زمانہ ہی سے شمالی ہند میں اسلام کے گڑھ ہو گئے تھے تین صدیوں کی اسلامی حکُومت کی وجہ سے سلطنت دہلی کے زمانہ سے بھی پہلے یہاں کے بہت غیر مُسلم مُسلمان ہو گئے تھے۔ خلیفہ عُمر بن عبدالعزیز نے متعدد سندھی ہندو راجاؤں کو اسلام کی دعوت دی اور وُہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ فاتحین کی رپورٹیں جو وُہ بارگاہِ خلافت میں بھیجتے تھے اس بات کی شاہد ہیں کہ غیر مُسلموں کی ایک بڑی تعداد اُس زمانہ میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔ چنانچہ بلاذری قریباً ایک سَو سال کے بعد لکھتا ہے کہ یہ مُسلمان نسل در نسل چلے آرہے ہیں۔ ان ایّام میں غیر مُسلموں کو چند مراعات بھی دی گئیں۔ وُہ اپنے معبدوں کی مرمّت کر سکتے تھے اور اپنی رسُوم بھی ادا کر سکتے تھے جب نویں صدی ہجری میں خلافت کو ضعف ہُوا تو سندھ (جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں) چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہو گیا۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور مُلتان اور منصُورہ کے امیر تھے۔ یہ سلطنتیں خود مختار تھیں۔ اُنہوں نے غیر مُسلموں کو صاف کہہ دیا کہ اگر وُہ بغاوت کرینگے تو اُن کے معبد برباد کر دیئے جائینگے اور اُن کی مورتیاں توڑ ڈالی جائینگی۔ چونکہ یہاں کے مندروں کی یاترا کے لئے اہلِ ہنُود دُور دراز مقامات سے آیا کرتے تھے یہ دھمکی بڑی کارگر ثابت ہُوئی۔

چودھویں صدی کے دُوسرے نصف میں شیخ جلال الدّین ابرانی آسام

میں گیا۔ اُس نے سلہٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ اور وہاں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دیتا رہا۔

مسلمان مبلغین نے بنگال میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی محمد بختیار خلجی نے (جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں) بارھویں صدی کے آخر میں بہار اور بنگال کو فتح کر کے وہاں ایک اسلامی ریاست قائم کی اور بنگال کے شہر گور کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس حکومت کے زمانہ میں بے شمار غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ جلال الدین محمد بادشاہ نے (جو پہلے ہندو تھا) بے شمار لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کیا۔ اُس نے بار بار غیر مسلموں کو ایذائیں دے دے کر حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ مشرقی بنگال میں پانچ صدیوں کی اسلامی حکومت میں لاکھوں غیر مسلم دائرۂ اسلام میں آ گئے۔ صوفیہ کے سلسلوں میں سے شیخ جلال الدین تبریزی (تاریخ وفات ١٢٤٤ء) بنگال آیا۔ وہ شہاب الدین سہروردی کا خلیفہ تھا۔ اُس کے ذریعہ بے شمار لوگ اسلام لے آئے۔ سلسلہ چشتیہ کے نظام الدین اولیا کے خلیفہ سراج الدین کے خلیفہ علاؤ الدین کے ہاتھ پر سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بیعت کی اور اُس نے ہزاروں اہالیانِ بنگال کو داخل اسلام کیا۔ بنگال میں (جیسا ہم بتلا چکے ہیں) مسیحی کلیسیائیں بکثرت موجود تھیں لیکن اسلامی حکومت کے دوران میں بے شمار مسیحی بھی مسلمان ہو گئے۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ صوبۂ بہار میں اس کثرت سے مسیحی کلیسیائیں بستی تھیں کہ پٹنہ ایک میٹروپولیٹن کا صدر مقام تھا جس کے ماتحت نصف درجن سے ایک درجن بشپ اور بیسیوں قسیس اور شماس تھے۔ بہار کی فتح کے بعد ان کلیسیاؤں پر بھی آفتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ نظام الدین اولیا

کے خلیفہ سراج الدین نے بنگال۔ بہار اور آسام میں اسلام کی اشاعت کی اور ان کو تبلیغ اسلام کے مرکز بنا دیا۔

سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں شیخ شرف الدین احمد (سالِ پیدائش ١٢٦٣ء) پٹنہ میں تھا۔ اس کا خاندان بیت المقدس یروشلیم سے آیا تھا۔ اس نے پٹنہ اور اُس کے آس پاس کے شہروں میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی۔ ناگپور۔ چندیری۔ مالوہ۔ اُجین تبلیغ اسلام کے مرکز بن گئے ہم اس حصّہ کے بابِ سوم کی فصل سوم میں بتلا چکے ہیں کہ سلطان محمد تغلق نے تبلیغِ اسلام کی خاطر اپنا دارالسلطنت دہلی سے دکن جنوبی ہند میں تبدیل کر لیا تھا اور اس مقصد کی خاطر اُس نے علما بھی وہاں بھیجے جنہوں نے ہزاروں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا۔ بہمنی خاندان کے مسلمان بادشاہ (از ١٣٤٧ء تا ١٤٩٠ء) اور بیجاپور کے بادشاہ (از ١٤٨٩ء تا ١٦٨٦ء) کی وجہ سے وہاں عربوں کی ایک بڑی تعداد بس گئی تھی جن کے ساتھ مسلمان تاجر اور سپاہی اور مبلغ سبھی آ گئے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیا نے شیخ برہان الدین غریب (از ١٢٥٧ء تا ١٣٣٧ء) ساکن ہانسی کو دکن بھیجا تاکہ وہ بھی وہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ اور حکم دیتے وقت کہا کہ یہ سات سو درویش جو یہاں اس وقت بیٹھے ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ان سات سو اشخاص میں امیر حسن سنجری۔ کمال خجندی۔ شیخ حاکم۔ اور شیخ فخرالدین جیسے زبردست صوفیہ تھے۔ یہ گویا سات سو سپاہیوں کی روحانی فوج کشی تھی۔ اس گروہ کے ذریعہ بے شمار غیر مسلم اور عیسائی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

راجپوت زمانہ میں خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر میں رہائش اختیار کی اور

وہیں ۱۲۳۶ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے پہلے نو مسلم مریدوں میں ایک جوگی تھا جو راجہ کا گرو تھا۔ اُس نے ہزاروں کو مسلمان بنایا۔ ایک دفعہ جب وہ اجمیر سے دہلی گیا تو سات سو غیر مسلموں نے اُس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

ہندوستان میں اسلام کی تاریخ میں سید جلال الدین کی آمد تاریخی باب رکھتی ہے وہ بخارا میں ۱۱۹۹ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۲۴۴ء میں بہاولپور کے اُچھ کے علاقہ میں چلا گیا۔ اس نے وہاں کے گرد و نواح کے لوگوں کو اسلام میں داخل کیا۔ اس کا پوتا سید احمد کبیر مخدوم جہانیاں کے نام سے مشہور ہے جس کی وساطت سے پنجاب کے بہت سے قبائل داخلِ اسلام ہو گئے۔ جب کبھی وہ اُچھ سے دہلی آتا تو راہ میں بے شمار غیر مسلم اُس کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے۔ اُچھ سے ایک میل کے مقام پر سید حسن کبیر الدین بن سید صدر الدین رہتے تھے۔ اُن کی نسبت مشہور ہے کہ جس غیر مسلم پر اُن کی نگاہ پڑتی تھی وہ اسلام قبول کر لیتا تھا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں بو علی قلندر نے شمالی ہند میں آ کر پانی پت میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ سو سال کی عمر پا کر ۱۳۲۴ء میں فوت ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ پر متعدد راجپوت مسلمان ہو گئے۔ صوفیہ نے روہیلکھنڈ میں بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ ایک درویش بلبل شاہ کے ذریعہ چودھویں صدی میں مسلمان ہوا۔ جب ۱۳۸۰ء میں سید علی ہمدانی نے سات سو سیدوں کی جمعیت کے ساتھ ہندوستان میں آ کر پناہ لی تو ان مبلغین کی کوششوں سے چاروں طرف غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ گجرات کے مشہور شاہی خاندان کے نامور بادشاہ محمود بیگڑہ کے زمانہ میں (از ۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء) بے شمار غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح اُجین۔ احمد آباد۔ جونپور بھی تبلیغ اسلام کے مرکز تھے۔

انگریز مؤرخ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ اجودھن میں بابا فرید اور

اُس کے جانشینوں کی بدولت جنوبی پنجاب کے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور گیارہ قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں سب سے مشہور سیال تھے جو جھنگ میں تھے۔ کھوکھر۔ ڈھوڈی اور ٹوانے راجپوت تھے جو دریائے جہلم اور چناب کی وادیوں میں اور جھنگ اور شاہ پور کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ٹوبے ذات کے جھبیر اور ماچھی تھے۔ ان کے ساتھ کھرل۔ ٹوانہ۔ گھیبے وغیرہ ذاتوں کے لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ عوام جوق در جوق بابا فرید کے پاس آ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ چنانچہ سٹیڈ مین لہ (STEEDMAN) کہتا ہے کہ اُن دنوں میں گویا یہ فیشن ہی ہو گیا تھا کہ لوگ پاک پٹن جا کر بابا فرید کے وعظ اور درس سنیں اور جوق در جوق اسلام قبول کریں۔" نظام الدین اولیا کے خلیفوں میں نصیر الدین چراغ دہلی نے دہلی۔ اودھ۔ پنجاب اور گجرات میں اسلام کی اشاعت کی۔

بابا فرید نے اپنے خلیفہ نظام الدین اولیا کو حکم دیا تھا کہ "ہندوستان بگیر" اور اُس نے ہر ممکن کوشش کر کے اس حکم پر عمل کیا۔ وہ پچاس برس تک دہلی میں مقیم رہا اور اس کے زمانہ میں تبلیغ اسلام کی وجہ سے سلسلۂ چشتیہ اپنے کمال کے عروج تک پہنچ گیا۔ اُس کے خلیفوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ہر بڑے شہر میں چشتیہ سلسلہ کے مرکزوں کو قائم کر کے لاکھوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کر لیا۔

لہ JHANG SETTLEMENT REPORT-P.244

باب پنجم

شمالی ہندوستان کے عوام اور مذہبِ وحدتِ ادیان

گذشتہ ابواب کے مطالعہ سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ سلطنت دہلی کے ایام میں شمالی ہند میں مسلمانوں کی تعداد ہر سال کثرت سے بڑھتی گئی ان میں سے بعض بزورِ شمشیر مسلمان بنائے گئے بعض نے جبر و اکراہ سے اسلام قبول کیا۔ لیکن نومسلموں میں سے بہت ایسے بھی تھے جو نہ تو تلوار کے خوف سے اور نہ جبر کی وجہ سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ بیرونِ ہند سے آنے والے تین قسم کے لوگ تھے۔ پہلے وہ جو شمال مغربی سرحد پار کر کے شمالی ہند میں آبسے۔ یہ لوگ زیادہ تر سندھ۔ شمال مغربی سرحد اور پنجاب میں مقیم تھے۔ دوسرے وہ جو بادشاہوں کے اُمراء وغیرہ اور لشکریوں کی اولاد تھے۔ یہ لوگ شمالی ہند میں مقیم تھے لیکن ان کی کچھ تعداد دکن میں بھی بستی تھی۔ تیسرے وہ جو مغربی ساحل کے علاقوں اور شہروں میں بستے تھے۔ یہ لوگ غالباً عرب نژاد تھے جن کے آباؤ اجداد سمندر کے راستہ جنوبی ہند میں (جیسا ہم جلد اوّل میں لکھ آئے ہیں) داخل ہوئے تھے۔ لیکن بالعموم غیر ملکی حملہ آوروں کی اولاد زیادہ تر پنجاب۔ صوبۂ سرحد۔ دہلی اور گرد و نواح میں ہی پائی جاتی تھی۔ نومسلموں نے اپنے لئے ایسے خطاب اور لقب تجویز کر لئے جو غیر ملکی لوگوں کے تھے۔ مثلاً شیخ۔ بیگ۔ خان۔ سیّد وغیرہ

اور بعض تو گھر بیٹھے ہی سیّد بن گئے بعض نے اُن لوگوں کے نام اور لقب اختیار کر لئے جنہوں نے اُن کو مسلمان بنایا تھا اور یا جو غیر ملکی اُمراء کے ملازم اور غلام تھے۔

ابتدائی مسلمان حملہ آور "کفار" کو پہلے اسلام کی دعوت دیتے تھے اور اگر وہ قبول نہ کرتے تو قتل کئے جاتے یا غلام بنا لئے جاتے تھے پس بے شمار لوگ جان کے خوف کے مارے حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ لیکن جب یہ حملہ آور واپس اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے تو ذات پات اور ختنہ وغیرہ کی پابندیوں کی وجہ سے نومسلم واپس اپنے مذہب میں نہ جا سکتے تھے۔ محمد غوری کے بعد جب اسلامی طاقت ملک میں قائم ہو گئی اور لوگوں نے دیکھا کہ اب اطاعت کئے بغیر چارہ نہیں تو قدرتی طور پر بہت غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ سلطنت کے قیام سے اسلام نے ہندومت پر اور ہندومت نے اسلام پر اثر کرنا شروع کر دیا اور نومسلم ہندو قدرتاً اپنے عقائد و رسوم اپنے ساتھ اسلامی سماج میں لے آئے اور اسلام، مسیحیت اور ہندومت میں نئی تحریکیں شروع ہو گئیں۔

مسلمان تاجروں نے بھی اسلام کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ اُن ایام میں مسلمان تاجر سندھ اور بیرونی دُنیا کی اشیا کی خرد و فروخت کا ایک بڑا ذریعہ تھے اگرچہ وہ واحد ذریعہ نہ تھے کیونکہ مسیحی تاجر بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ مسلمان اور عیسائی تاجر چین اور لنکا وغیرہ ممالک کی چیزیں ملتان کے راستہ خراسان اور ترکستان لے جایا کرتے تھے۔ ان مسلمان سوداگروں کی بدولت ہزاروں غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

اچھوت ذاتوں کے لئے اسلام ایک غیر مترقبہ نعمت ثابت ہوئی۔ وہ ذات پات اور ہندو سماج کی دیگر پابندیوں سے آزاد ہو کر کلمۂ توحید

پڑھنے کے بعد اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے بہتر شمار ہونے لگے پس وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔ بعض ہندو مسلمان عورتوں کے عشق میں مبتلا ہو کر اسلامی کلمہ پڑھ لیتے تھے۔ جو غیر مسلم عورتیں یا لونڈیاں مسلمانوں کے گھروں میں ہوتیں وہ بھی مسلمان ہو جاتیں۔ ان کی اولاد بھی قدرتاً مسلمان ہوتی۔ غلام بھی اکثر اپنے مالکوں کا مذہب اختیار کر کے مسلمان ہو جاتے اور بہتیرے غیر مسلم غربت اور خافوں کے مارے اپنے سماج کے حالات سے تنگ آکر اسلام اختیار کر لیتے تھے اور یوں سال بہ سال مسلمانوں کی کثرت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

صوفیہ کے گروہ نے (جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں) ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام کے حلقہ میں داخل کر دیا۔ اُن کا اثر بالخصوص شمالی ہند کی کلیسیاؤں پر پڑا ہوگا کیونکہ مسلمان صوفیہ مسیحی راہبوں کی پیروی کر کے مراقبہ۔ شب بیداری۔ ذکر۔ توکل۔ ریاضت اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مسیحی راہبوں کی خانقاہوں کی طرح مسلمان درویشوں کی بھی خانقاہیں وغیرہ تھیں۔ وہ بھی مسیحی قسیسوں کی طرح مجازات سے بے اعتنائی کر کے حقیقت کی طرف لے جاتے تھے اور معرفت۔ توکل اور تفویض کا سبق پڑھاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ بردیسی مسیحی مبلغین کے نہ آنے کے بعد ہزاروں مسیحی اسلام کے حلقہ میں صوفیہ کی تعلیم کی طفیل داخل ہو گئے ہونگے۔

ہم بتلا چکے ہیں کہ بابا فرید نے نظام الدین اولیاء کو اپنا خلیفہ بنا کر اُس کو حکم دیا تھا کہ "ہند بگیر"۔ اور اس نے ہر ممکن کوشش کر کے اس حکم پر عمل کیا۔ چنانچہ ابو الفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے کہ "دہلی میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی۔ امیر خسرو۔ شیخ علاء الحق۔ اور بنگال میں شیخ وجیہہ الدین

یوسف اور چندیری میں شیخ یعقوب و شیخ کمال۔ اور مالوہ میں غیاث الدین۔ اور دھار میں مولانا مغیث۔ اور اُجین میں شیخ حسام۔ اور گجرات میں شیخ برہان الدین غریب و شیخ منتخب و خواجہ حسن۔ اور دکن میں محبوبِ الٰہی (نظام الدین اولیاء) کے نبیرۂ تاباں کی روح پرور اور جان آفرین شعاع تھے جنہوں نے ہندوستان بھر میں روشنی پھیلا دی"۔

(۲)

ان مذکورہ بالا کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں اسلامی حکومت شمالی ہندوستان میں وسعت پکڑ کر قیام حاصل کرتی چلی گئی اسلام کی اشاعت ہر طرف ہوتی گئی۔ اور شمالی ہند کے باشندے کثرت سے جوق در جوق حکام کے مذہب میں شامل ہوتے گئے۔ اب ہندوستان میں بودھ مت۔ جین مت۔ ہندو مت مسیحیت اور اسلام تھے جن کے عقائد اور رسوم ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس اختلاف کی وجہ سے قدرتاً مختلف مذاہب میں ٹکراؤ اور تصادم کا ہونا ایک لازمی اور ناگزیر امر تھا۔ مذاہب کے اختلافات کے علاوہ نسل و قوم وغیرہ کے اختلافات بھی تھے۔ فاتحین کے دلوں میں جہاں اسلام کا جذبہ جوش زن تھا وہاں اُن کی فتوحات کی وجہ سے غرور بھی اُن کے سروں میں سمایا ہوا تھا اور یہ بردیسی ترک اور افغان ہندوستان کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ برہمن وغیرہ بھی اُن کو ناپاک اور ملیچھ سمجھتے تھے پس یہ تمام مذاہب اور ان کے پیرو صدیوں تک ایک دوسرے کے مقابل صف آرا رہے۔ سلطنتِ دہلی کے ایام میں شمالی ہندوستان کے میدان نہ صرف ہندو اور اسلامی افواج کے میدانِ جنگ تھے بلکہ ہندو مت مسیحیت اور اسلام کے مذہبی تصورات کے بھی میدانِ جنگ بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ جب مختلف مذاہب اور سماجوں

کی ایک دُوسرے سے ٹکّر ہوتی ہے تو ہر مذہب اور سماج کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وُہ غالب ہو اور دُوسروں کو نیچا دکھائے۔ لیکن یہ جنگ دیرپا نہیں ہوتی اور نہ صدیوں تک جاری رہتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب مذہبی تصوّرات کی جنگ میں کسی ایک مذہب کی ہار جیت نہیں ہوتی تب طرفین میں مصالحت شروع ہو جاتی ہے۔ اور ایک سماج کے عقائد و رسُوم اور دستوُرات دُوسری سماج کے عقائد و دستورات کو متاثّر کر دیتے ہیں۔ ہم گذشتہ ابواب میں بتلا چُکے ہیں کہ مسیحیّت نے اسلام اور ہندُومت کے عقائد اور فلسفہ پر کس قدر اثر کیا تھا۔

ہندُومت کی یہ خصُوصیّت ہے کہ وُہ ہر قسم کے مذہبی عقائد اور رسُوم کو اپنے اندر ایسا جذب کر لیتا ہے کہ دُوسرے مذاہب نیم جان یا بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں کیونکہ وُہ اُن کی زندگی کے اصُول کو اپنے اندر کھینچ لیتا ہے۔ چُونکہ مسیحیّت اور اسلام میں عصبیّت کا عنصر بہت زیادہ تھا اور عدم رواداری دونوں کا امتیازی نشان تھا پس اِس تصادُم میں کم از کم یہ تو ہُوا کہ دونوں کی انفرادیت زائل نہ ہُوئی۔ اور جب وُہ زمانہ آیا کہ سب مذاہب میں مصالحت ہو تو ان دونوں مذہبوں نے اپنے عقائد اور دینیات میں مصالحت نہ کی اور نہ وُہ کر سکتے تھے۔ مصالحت نے یہ صُورت اختیار کی کہ سب مذاہب ایک دُوسرے سے رواداری اور صُلح کے ساتھ رہیں اور ہم زیستی اختیار کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلام اور مسیحیّت کے خصُوصی عقائد اور بُنیادی اصُول پر ہندُومت کا بہت اثر نہ پڑا۔ زیادہ سے زیادہ ہندُومت اُن کے بیرُونی پہلوؤں اور رسموں کو ہی چھُو سکا اور ہندُو سماج کی رسُوم اور توہم پرستی وغیرہ ہی مسلم اور مسیحی عوام کو متاثّر کر سکی۔ ان کی مجلسی اور عوامی زندگی پر اور مختلف طبقوں کے باہمی تعلّقات اور شہری اور دیہاتی لوگوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی پر بھی ہندُومت کا اثر پڑا۔

پھر ایک زمانہ آگیا جب غیر مُلکی حملہ آوروں کی نسلیں اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھنے لگیں کیونکہ اُن کے آباؤ اجداد حملہ آوروں کا ہندوستان کے سوا کوئی وطن نہ تھا اور اُنہوں نے یہاں مُستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ وُہ غیر مُسلموں سے (خصُوصاً ہندُوؤں کی مقتدر اکثریت سے) میل جول اور دوستانہ تعلّقات رکھنے لگ گئے اور اُن کے اعتقادات۔ دستوُرات اور رسُومات سے واقف ہو کر اُن میں سے بعض کو اُنھوں نے اپنا لیا۔

(۳)

ہم گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ بھگتی مت کی اصلاحی تحریک نے مسیحیّت کی تعلیم سے متاثّر ہو کر ہندُومت میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔ وِشنو مت۔ شِو مت۔ رام مت اور دیگر اصلاحی تحریکات نے کُل ہندوستان کے ہندُوؤں کو یک جا کر دیا۔ شمالی ہند کے لوگ جنُوبی ہند کے پوتّر استھانوں کا درشن کرتے اور جنُوبی ہند کے لوگ شمالی ہند کے استھانوں کی یاترا کرنے کے لئے ہر طرف جاتے تھے۔ ہندُو شاعر پنڈت اور فلاسفر راجاؤں کے دربار کی زینت ہوتے تھے اور ایک راجہ کے دربار سے دُوسرے راجہ کے دربار جا کر اپنے خیالات کا پرچار کرتے اور دُوسروں سے مناظرے کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ بعض راجے نہ صرف عِلم دوست ہوتے تھے بلکہ وسیع الخیال بھی تھے اور مذہبی رواداری کے حامی ہوتے تھے چُنانچہ پروفیسر اقبال علی شاہ کہتے ہیں کہ ایک ہزار سال ہُوئے ہیں (یعنی سلطنت دہلی کے ایّام میں) کہ گجُرات کے ایک ہندُو راجہ نے پہلے پہل قرآن کا ترجمہ قدیم گجُراتی زبان میں کروایا اور وُہ باقاعدہ اس ترجمۂ قرآن کو سُنا کرتا تھا (ہندوستان ٹائمز ۲۲ مئی ۱۹۵۶ء صفحہ ۳ کالم ۳)۔

مُلک کے مختلف صُوبوں اور شہروں اور راجدھانیوں میں تجارت اور آمد و رفت بھی عام ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندوؤں کے طبقوں میں اور بالخصوص عوام کے نچلے طبقوں میں بھگتی مت نے سلطنتِ دہلی کے ایام میں مذہبی جوش و عقیدت کو ایسا بڑھایا کہ اس نے ہندو سماج میں سیمنٹ کا کام کر کے سب کو بھگتی کے جھنڈے تلے یکجا کر دیا۔ مُلک کے حالات ایسے ہو گئے کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرونِ وسطیٰ میں یہاں کے تمام باشندوں کی زندگی کا نوّے فیصدی حصّہ مذہب کی باتوں سے متعلق تھا۔

اِدھر اسلامی تصوّف اور صُوفیہ کا گروہ ہندوستان کی مذہبی زندگی میں اقتدار حاصل کرتا چلا جاتا تھا۔ ان کی خانقاہوں میں ہندو، مُسلمان، مسیحی۔ چھوٹے اور بڑے۔ امیر اور غریب۔ عالم اور جاہل۔ مرد اور عورتیں۔ شہری اور دیہاتی۔ سب کے سب کا جم غفیر ہوتا جہاں ذات پات، مذہب اور سماج کی جُدائیوں کی دیواریں بریحو کے شہر کی دیواروں کی طرح گر پڑتی تھیں صُوفیہ سب سے محبّت سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ برنی کہتا ہے کہ نظام الدّین اولیاء نے ہر خاص و عام کو اپنے حلقۂ ارادت میں لے لیا۔ امیر و غریب۔ دولت مند اور حاجتمند۔ عالم اور جاہل۔ شہری اور دیہاتی۔ فوجی اور عوام۔ آزاد اور غلام بلا روک ٹوک اُس کے پاس چلے آتے تھے۔ وہ بعض سلاطینِ دہلی کے غیر اسلامی اطوار سے بیزار ہو کر صُوفیہ کے مُرید ہو جاتے تھے اُمرائے سلطنت بھی اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لئے صُوفیہ کے مُرید ہو جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عام و خاص مُسلمان صُوفیہ کے خیالات سے متاثر ہو کر ہندوؤں اور عیسائیوں کے خیالات و معتقدات سے متاثر ہو جاتے تھے۔

علاوہ ازیں قرونِ وسطیٰ کے صُوفیہ سیاحت کو لازمی امر خیال کرتے تھے۔ وہ ہر مُلک صُوبہ اور شہر کے مختلف طبقوں اور مذہبوں کے لوگوں اور مختلف جماعتوں سے مُلاقات کرتے تھے اور اُن سے تبادلۂ خیالات کر کے اُن کے معتقدات پر اپنا اثر قائم کر دیتے تھے۔ اِس طرح صُوفیہ کے گروہ نے سماجی مذہبی اور نسلی امتیازات کی فصیلوں کو ایسا گرا دیا کہ ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور طبقوں میں ایک گونہ یکجہتی پیدا ہو گئی۔ ہندو، مُسلمان، بودھ، مسیحی سب ایک دُوسرے کو خانقاہوں میں ملتے تھے۔ اور آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے تھے جس سے اُن میں یکرنگی پیدا ہو گئی اور شمالی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ چنانچہ نظام الدّین اولیاء ہم کو بتلاتے ہیں کہ ایک دفعہ اجودھن میں بابا فرید کے پاس ایک جوگی آیا۔ مَیں نے اُس سے اُس کے طریق کی نسبت پُوچھا اور مجھے اُس کی گفتگو سے بہت لذّت حاصل ہُوئی۔ بعض برگزیدہ صُوفیہ کے گرد ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ جب بابا فرید شیخ قطب الدّین بختیار کی وفات کے بعد دہلی آیا تو لوگ چاروں طرف سے اُس پر ٹوٹ پڑتے۔ ایسا کہ صُبح کے وقت سے آدھی رات تک لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اُس کو نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے نماز سے بہت پہلے گھر سے نکلنا پڑتا تھا تاکہ لوگوں کے بے پناہ ہجوم کو چیر کر نکل سکے اور وقت پر نماز میں شریک ہو سکے۔ جب وہ گھر سے نکلتا تو لوگ بے تحاشا اُس کی طرف دوڑتے اور اُس کے ہاتھ چُومتے تھے۔ جب ایک ہجوم ہٹتا تو دُوسرا اُس کی جگہ لے لیتا تا وقتیکہ وہ مسجد میں پہنچتا۔ آخر وہ انسان تھا ایک دفعہ ان ہجوموں سے وہ تنگ آگیا اور خفا ہونے لگا۔ تب اُس کے ایک مُرید نے کہا کہ حضور خفا کیوں ہوتے

ہیں۔ یہ تو خدا کی برکت ہے"۔ ان باتوں سے ہم سمجھ سکتے کہ گروہ صوفیہ کا عوام پر کس قدر اثر تھا۔

یہ صوفیائے کرام عالم اور فاضل بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں "کہ وہ مسلم صوفیہ اسلامیات کے فاضل ہوتے تھے۔ اُن کی صف میں ہم کو کوئی جاہل نظر نہیں آتا"۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی اپنے خلیفہ بابا فرید کو کہا کرتے تھے کہ "جاہل صوفی شیطان کا نہایت آسانی سے شکار ہوجاتا ہے"۔ یہ صوفیہ نہ صرف علم کے زیور سے آراستہ ہوتے تھے بلکہ وہ اوصافِ حمیدہ سے بھی پیراستہ ہوتے تھے۔ دشمنوں سے نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے اور سب سے حلیم۔ لطافت اور محبت کا سلوک کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُن کی خانقاہوں اور جماعت خانوں میں تمام مذاہب کے پیروؤں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ علمائے شریعت تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ہندو اور مسیحی عوام کی دلجوئی کریں۔ وہ اپنے علم وفضل پر فخر کرکے عوام سے بلکہ مسلم عوام سے بھی متکبرانہ سلوک کرتے تھے۔ لیکن بابا فرید جیسے صوفی (جو خود عالم ہوتے تھے) کہتے تھے کہ "حقیقی علم انسان میں انکساری پیدا کرتا ہے۔ علم شریعت کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے نہ کہ اس سے خلقت کو ایذا پہنچے" (مقابلہ کرو متی ۲۳ باب۔ لوقا ۱۸: ۹۔ یوحنا ۷/۴۹)۔ ان علمائے ظاہر سے یہ امید کرنا عبث تھا کہ وہ حالاتِ زمانہ کے مطابق اپنے خیالات کو بدل دیں لیکن صوفی علماء نے وہ کیا جو شریعت کے عالم نہ کر سکے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں یگانگت پیدا کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی از حد کوشش کی کہ ان مذاہب کے اعتقادات میں بھی اتحاد۔ یک جائی اور یک جہتی

پیدا ہو جائے۔

صوفیہ نے ویدانت اور تصوفِ اسلام میں یک جہتی اور یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ مولانائے روم کی مثنوی سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے نظریہ جات شنکر اچاریہ کے فلسفہ ادویت کے مؤید ہیں۔ دونوں کے نزدیک علّت معلول سے خارج تصور نہیں کی جا سکتی۔ معلول کسی نہ کسی اسبابِ علل میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو معلول کا وجود پذیر ہونا قطعی ناممکن ہے۔ جلال الدین رومی اور شنکر دونوں کے نزدیک غایتِ حقیقت صرف ایک ہی ہے جس کو پہلا "حق" اور دوسرا "برہم" کا نام دیتا ہے جس سے کوئی صفت بھی منسوب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ شنکر اس کو "نرگن" کہتا ہے اور مولانائے روم کہتا ہے:۔

درگذر از نام و بنگر در صفات — تا صفاتت رہ نماید سوئے ذات

دونوں کہتے ہیں کہ بے چون ہونے کی وجہ سے اُس ذات کا مقام ایسا ہے جو تمام مجوزہ اور متصورہ صفات اور کیفیات سے قطعی ماوراء ہے۔ شنکر نے برہم کو تمام صفات سے عاری اور ساتھ ہی تمام صفات کا جامع بتلایا ہے۔ رومی بھی کہتا ہے کہ اُس ذات کا پتہ دینے کے لئے سب قسم کے اشارے اور کنایات۔ استعارے اور تصورات و بیانات اجتماعی اور انفرادی طور پر قطعی ناقص ہیں اور وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

گرچہ تفسیرِ زباں روشن گر است — لیک عشقِ بے زباں روشن تر است
چون قلم اندر نوشتن می شتافت — چون بعشق آمد قلم بر خود شگافت
محرمِ ایں ہوش جز بیہوش نیست — مر زباں را مشتری جز گوش نیست

سطورِ بالا میں ہم لکھ چکے ہیں کہ سلطنتِ دہلی کے ایام میں بھگتی کی تحریک عوام میں ایسی جوش زن تھی کہ اس نے ملک کے طول و عرض کے ہندوؤں کو بیک ہوا کر دیا تھا۔ صوفیہ بھی بھگتی کے ذریعہ کو دیگر وسیلوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ہندوؤں میں حبسِ دم تھا۔ لطائف کی بھی کچھ صورتیں تھیں۔ تصور و فنا اور "شنتل جوت"، روشنی وغیرہ باتیں پائی جاتی تھیں۔ صوفیہ کے گروہ میں بھی فنا۔ بقا۔ کشف۔ شہود۔ لطائف۔ روشنی۔ نور وغیرہ تھے پس صوفیہ کی یہ کوشش رہی کہ مسلمان اور ہندو۔ فلاسفر اور البیثور کے بھگت سب کے سب آپس میں مصالحت سے رفاقت رکھیں۔ وہ خود کلمہ گو مسلمان تھے اور اشاعت اسلام میں مصروف رہتے تھے لیکن ہندو مت اور مسیحیت میں جو اچھی باتیں اُن کو ملتی تھیں اور جو پسندیدہ اصول وہ پاتے تھے وہ اُن کی قدر کر کے اُن کو اپنا لیتے تھے۔ انہوں نے مختلف خیالات۔ مسائل اور عقائد کو ربط و ترتیب دے کر اپنا ایک نظام کھڑا کر دیا اور مسلمانوں۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کو باہمدگر پیوستہ کر کے مختلف ادیان کی وحدت پر زور دیا۔ قرآن میں لکھا ہے کہ خدا نے اقوام عالم کے پاس نذیر اور پیغمبر بھیجے ہیں (٣٠ : ٥/٢٥)۔ انجیل میں وارد ہوا ہے کہ "ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لاتا اور نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔ جو مجھ کو اے خداوند۔ اے خداوند کہتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخل نہ ہوگا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ قیامت کے دن مجھ سے بہتیرے کہیں گے۔ اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی۔ اُس وقت میں اُن کو صاف کہہ دوں گا کہ میری تم سے کبھی واقفیت

نہ تھی۔ اے بدکارو۔ میرے پاس سے چلے جاؤ" (متی ، باب)۔ صوفیہ اور اُن کے ہم خیالوں نے قرآن و انجیل کی ایسی آیات پر زور دیا اور کہا کہ سب مذاہب ایک ہی تعلیم دیتے ہیں۔ یوں انہوں نے وحدتِ ادیان کے نظریے کی تعلیم دے کر کہا کہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ انسان از سرِ نو پیدا ہو۔ اگر ہم کسی مذہب کی بیخکنی پر تلے ہیں تو ہم اس کے نیک اور پسندیدہ اصولوں کو پائمال کر دیتے ہیں۔ اگر ہم اللہ۔ اللہ یا رام رام یا مسیح کے نام کو ہی صرف جپتے رہیں لیکن اُن سے دل میں محبت کا جذبہ نہیں رکھتے اور یہ نام ہمارے چال چلن اور خصلت پر اثر انداز نہیں ہوتے تو ان کا رٹنا لاحاصل اور رائگاں ہے۔ تمام مذاہب میں سچائی موجود ہے پس ہم کو یہ کہنا نہیں چاہیئے کہ صرف ہمارا ہی مذہب برحق ہے اور باقی مذاہب باطل ہیں[1]۔

صوفیہ کے گروہ نے ہندوؤں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی خیالات میں ایسی یکرنگی پیدا کر دی کہ عوام الناس جو اُن کے زہد و علم کے معتقد تھے یہی خیال کرنے لگ گئے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ خدا ایک ہی ہے جس کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ ایک ایرانی صوفی شاعر کہتا ہے:۔

بنامِ آن کہ او نامے ندارد   بہر نامے کہ خواہی سر برآرد

مسلمان اُس کو اللہ کا نام دیتے ہیں۔ ہندو اُسی ہستی کو رام۔ کرشن وغیرہ بلاتے ہیں۔ عیسائی اُسی ایک ہستی کو مسیح کہتے ہیں۔ فرق صرف نام کا ہی ہے۔ ہندو البیثور کے اوتاروں کو مختلف نام دیتے ہیں مسیحی اُس کے اوتار کو

[1] اس مضمون پر میں نے ایک مستقل رسالہ "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں" لکھا ہے۔ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور سے مل سکتا ہے۔ (برکت اللہ)

یشُوع کہتے ہیں جس میں خُدا نے ظہُور کیا ہے مُسلمان کہتے ہیں کہ اللہ نے محمد میں ظہُور کیا ہے مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح کلمۃ اللہ ازل سے تھا مُسلمان قرآن اور نورِ محمدی کو ازلی مانتے ہیں۔ پس عوام کے دِلوں میں اس خیال نے گھر کر لیا کہ مختلف مذاہب میں فرق صرف نام کا ہی ہے۔ درحقیقت سب مذاہب ایک ہی بات مانتے ہیں اور یُوں وحدتِ ادیان کا نظریہ مقبُولِ عام ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مختلف مذاہب کے امتیازی نشانات اور اختلافات قابلِ التفات نہ رہے اور دینی عقائد پر ایک دُوسرے سے لڑائی مُول لینا خلافِ عقل سمجھا جانے لگا۔ چُنانچہ ہم یہاں چند اشعار درج کرتے ہیں جو اس نظریہ کے حامی ہیں:۔

(۱) ہمہ کس طالبِ یار اند چہ ہشیار چہ مست — ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

یعنی سب ایک ہی خُدا کے طالب ہیں خواہ وُہ ہوشیار ہوں خواہ وُہ مست ہوں تمام عبادت خانے محبّت کے گھر ہیں خواہ وُہ مُسلمانوں کی مسجدیں ہوں یا عیسائیوں کے گرجے ہوں۔

(۲) در حیرتم کہ دُشمنیٔ کُفر و دین چیست — از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

یعنی میں حیران ہُوں کہ مُسلمان اور کافر ایک دُوسرے کے دُشمن ہیں جب کہ کعبہ اور مندر دونوں ایک ہی چراغ سے روشن ہیں۔

(۳) عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کُفر — پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

(۴) جز سخن کُفرے و ایمانے کُجا است — خود سخن در کُفر و ایماں می رود

اس نظریہ کے حامی کہتے تھے کہ کُفر اور اسلام کی تمیز، مسجد و بتکدہ کا امتیاز اور اذان و ناقوس اور گرجاؤں کے گھنٹوں کا اختلاف درحقیقت ہمارے دِلوں کے ہی اختلافات کا آئینہ دار ہے۔ درحقیقت ان میں کوئی فرق نہیں جو عوام النّاس

اُن لوگوں کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے جو اس نظریہ کے مُعتقد تھے جس طرح ہمارے زمانہ میں مہاتما گاندھی مرحُوم کو دیکھا جاتا ہے۔ چُنانچہ جوش کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو جو اُس نے گاندھی کے قتل ہونے پر لکھی:۔

تُو امینِ مرحمت، آئینۂ ایثار تھا — صحتِ افکارِ انساں کے لئے بیمار تھا

برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غمخوار تھا — تُو رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا

السّلام اَے کعبہ و کاشی کے رہبان السّلام

السّلام اَے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

ہم حصّۂ اوّل کے باب پنجم میں بتلا آئے ہیں کہ بصرہ کے اخوان الصّفا کی جماعت اسی قسم کے خیالات رکھتی تھی۔ "رسائلِ اخوان الصّفا" کو عام طور سے ہر دَور میں ممالکِ عربیہ میں خاص وُقعت اور نمایاں حیثیّت دی جاتی رہی ہے۔ یہ رسائل ہندوستان میں بھی چھپتے ہیں اور جابجا داخلِ نصاب ہیں۔ انجیلی مجمُوعہ کے "رسُولوں کے خطوں" کی طرح یہ رسائل جماعت کے اُن ممبروں کے لئے وقتاً فوقتاً لکھے جاتے تھے جو مرکز سے دُور رہتے تھے۔ یہ رسائل بصرہ میں اُنہی ایّام میں لکھے گئے تھے جب سلطنتِ دیلمی قائم تھی۔ یہ جماعت لوگوں میں خیر و شر کی معرفت اور اصلاحِ دین و دُنیا کی خاطر یہ تعلیم دیتی تھی کہ کسی مذہب سے دُشمنی نہ رکھی جائے کیونکہ اسی میں وُہ نجات اور ابدی فلاح سمجھتی تھی۔ اخوان الصّفا بظاہر مُسلمان تھے لیکن وُہ کہتے تھے کہ "شریعتِ اسلام باوجود یکہ اچھّی ہے لیکن ناقص ہے جس کو خُدا کی معرفت حاصل ہے وُہ رسُولوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ حقیقی عبادت کے لئے صرف تسبیح اور تقدیس کی ضرورت ہے۔ روزہ۔ نماز اور دیگر فرائض کی ضرورت نہیں۔ شریعت کے احکام انسانی گڑھنت ہیں"۔ ان کے نزدیک دین مذہب۔ حتّٰی کہ محمد۔ علی۔ قرآن وغیرہ کے

وہ معنی نہیں تھے جو مسلمانوں میں رائج تھے۔ ان کا مذہب صرف فلسفہ عقل۔ اخلاق اور رُوحانیت کا مذہب تھا اور وہ ہر مذہب اور علم کی خوبیوں کو اپنا لیتے تھے۔ صفائی قلب و محبت و اُخوت اُن کا ایمان تھا۔ آخرت میں نجات اُس کو ملیگی جس میں تمام اُمتوں اور دینوں کی فضیلتیں پائی جائینگی۔ اخوان الصفا کے یہ خیالات اسلامی دُنیا کے مختلف مُلکوں میں رائج تھے اور چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی مسیحی) کے بعد دَورِ حاضرہ تک ہر دَور کے مُسلمانوں کے معتقدات پر اثر کرتے چلے آئے ہیں۔ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ یہ خیالات صوفیائے ہند کے سے ہیں اور ہندوستان کے مُسلمانوں کے بعض طبقوں میں بڑے مقبول تھے۔ اور ان سے وحدتِ ادیان کے نظریہ کو بڑی قوت ملی۔

ہندو مت کے مُصلحین بھی اِس بات پر زور دیتے تھے کہ تمام مذاہب کا اصل ایک ہی ہے اور کہ وُہ ایک ہی خدا کو حاصل کرنے کے مختلف راستے ہیں۔ جس طرح گائیوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں لیکن سب کے دُودھ کا رنگ سفید ہی ہوتا ہے اور چراغ مختلف قسم کے ہوتے ہیں لیکن روشنی ایک سی ہوتی ہے وُہ چھ اندھوں اور ہاتھی کی کہانی سُنا کر کہتے تھے کہ جب ہماری باطنی آنکھ کُھل جاتی ہے تو ہم پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مختلف مذاہب ایک ہی سچائی کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ ہم جلد دوم کے باب نہم اور اِس حصہ کے گذشتہ باب کی فصل اوّل میں کبیر کا ذکر کر چکے ہیں۔ گرو نانک کا ذکر ہم انشاءاللہ اگلی جلد میں کرینگے۔ یہ دونوں ہندو مُصلحین اور دھنتا ہندو مت مسیحیت اور اسلام کو ایک دُوسرے

اس موضوع پر ہم نے ایک ٹریکٹ لکھا ہے "کیا کل مذاہب ایک خدا کی طرف جانے کے مختلف راستے ہیں"۔ یہ ایس۔ پی۔ سی۔ کے کشمیری دروازہ۔ دہلی سے بعوض چند پیسوں کے مل سکتا ہے۔ (برکت اللہ)

کے قریب لانے میں کوشاں تھے اور وحدتِ ادیان پر زور دیتے تھے ایسے ہندو رہنماؤں کے چیلوں کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ وحدت الوجود کا عقیدہ و وحدتِ ادیان کے نظریئے کو مُسلم اور غیر مُسلم عوام کے دلوں میں مستحکم کرتا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو حالت یہ ہو جاتی تھی کہ ایک ہی شخص کو مُسلمان مُسلم اور ہندو، ہندو کہتے تھے۔ مثلاً کبیر اور نانک کی وفات پر مسلمان ان کو دفنانا اور ہندو ان کی لاشوں کو جلانا چاہتے تھے۔ یہ بات صرف خواص تک ہی محدود نہ تھی بلکہ عوام میں بھی یہ تحریک ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی مثلاً ایک معمولی حیثیت کی عورت کی نسبت یہ سوال اُٹھا کہ وُہ مُسلمان مری تھی یا ہندو!!

جس طرح صُوفیہ باوجود مُسلمان ہونے کے وحدتِ ادیان کی تحریک کے حامی تھے اور ساتھ ہی اسلام کی اشاعت میں کوشاں تھے اُسی طرح ہندو بھی وحدتِ ادیان کے پرچار کے ساتھ ساتھ مُسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانے میں کوشاں تھے۔ چنانچہ برہمنوں نے مسیحیت کی نقلید میں مسیح کی جگہ کرشن کو اوتار کا درجہ دے کر کہا کہ کرائسٹ اور کرشن درحقیقت ایک ہی ہیں پس تم کو کوئی ضرورت نہیں کہ اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر کے مسیحیت کو اختیار کرو بلکہ تم کو چاہیئے کہ مسیحیت کو ترک کر کے اپنے باپ دادا کا مذہب اختیار کر لو۔ یہی پرچار وُہ مُسلمانوں میں کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ کالپی کے گورنر نصیر خاں نے "راہِ مستقیم سے منہ موڑ لیا اور الحاد اور زندقہ کی راہ پکڑ لی۔ اُس نے نماز روزہ وغیرہ ترک کر دیا اور مُسلمان عورتوں کو ہندو ناٹکوں کے سپرد کر دیا تاکہ اُن کو ناچنے کی تعلیم دیں"۔ پھر لکھا ہے کہ "احمد خان بن مبارک خان لودی حاکم لکھنوتی کافروں کی

صحبت میں رہتا تھا۔ وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر مرتد ہو گیا"۔ ایک اور مقام میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں کافروں کا عمل و دخل ہر دہلی کے پرگنہ میں ہو گیا شعارِ اسلام مٹ گئے۔ بازار میں خنزیر کا گوشت بکتا تھا"۔ (ماخوذ از سلاطینِ دہلی کے رجحانات مصنفہ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی صفحہ ۳۵۱)۔

ہم اس حصہ کے باب سوم کی فصل سوم میں خسرو خان کا ذکر کر آئے ہیں جو ہندوؤں میں سے مسلمان ہو کر اس قدر با اقتدار بن گیا تھا کہ وہ مبارک خلجی کو قتل کر کے خود دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دے کر دہلی کی ایسی حالت کر دی کہ برنی لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دہلی پھر سے ہندوستانی ہو جائے گی اور ہندو غالب ہو گئے تھے۔۔

(۴)

ہم باب سوم میں بتلا چکے ہیں کہ جب مسلمان فاتحین نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن اور اپنا ملک سمجھ کر اس میں مستقل طور پر حکومت اختیار کر بیٹھے تو سلاطین کا ہندوؤں کے سماجی، ذہنی، فکری اور مذہبی حالات سے متاثر ہونا ایک ناگزیر امر ہو گیا۔ نظامِ حکومت کو چلانے کے لئے ہندوؤں کی اشد ضرورت تھی۔ یہ ضرورت محمد بن قاسم کی فتوحات کے وقت ہی محسوس کی گئی تھی۔ سلطنتِ دہلی کے زمانہ میں تو ہر سلطان کو ہندوؤں کی ہر شعبہ میں ضرورت پڑتی تھی۔ ہندو معمار ان کے لئے عمارتیں بناتے تھے۔ ہندو ان کے لئے سکے ڈھالتے تھے۔ وہی ان کی سلطنت کے مالی انتظام کو سنبھالتے تھے برہمن ہندوؤں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے میں حکام کی مدد کرتے تھے۔ شہاب الدین غوری کے وقت سے ہی سلاطینِ دہلی اور ہندو شہزادیوں کے درمیان ازدواجی تعلقات کی بنا پڑ گئی۔ علاؤالدین خلجی اور تغلق شاہ وغیرہ نے

ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اور شاہی محلات میں ہندوانہ اثرات ظاہر ہونے لگے۔ مسلمان شہزادوں اور امرا کے بچوں کی مائیں ہندو ہوتیں بعض سلاطینِ دہلی کی مائیں ہندو تھیں۔ ابنِ بطوطہ نے محمد بن تغلق کی بہن کی شادی کا جو بیان لکھا ہے اس میں ہندوانہ اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ سلاطینِ دہلی کے دربار میں ہندو شاعر، ہندو نجومی اور جوگی بھی ہوتے تھے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں ہندو حکومت کے ملازم بھی تھے۔ بابر کی آمد سے پہلے ہندو مسلمانوں کی فوجوں میں اور مسلمان ہندوؤں کی فوجوں میں ملازم تھے۔ اس کی وجہ نسل یا مذہب نہ تھی بلکہ نمک حلالی کا اصول اس بات کی ضامن تھا۔

ان تمام حالات کا اثر قدرتاً سلاطینِ دہلی کے مذہبی معتقدات و خیالات پر پڑنا تھا۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ ان سلاطین کے ایام میں مختلف وجوہ کے باعث ہزاروں غیر مسلم اور بالخصوص ہندو اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے اور وہ اپنے پرانے عقائد اور رسوم اپنے ساتھ اسلامی سماج میں لے آئے ان نومسلموں میں ایسے لوگ بھی تھے جو ظاہراً مسلم اور دل سے [illegible] اور ہندو رسوم کو خفیہ طور پر پورا کرتے تھے۔ [illegible] "[illegible] پنتھ" "[illegible] پنتھ" وغیرہ فرقے وجود میں آ گئے جو ملک کے [illegible] حصوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ فرقے اپنے عقائد ہندوؤں سے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے تھے [illegible] مگر ان کو اپنے [illegible] میں [illegible] تک پوشیدہ رکھتے تھے۔ ان صدیوں میں دہلی کی وسیع سلطنت کے مختلف کونوں میں ایسے فرقے اور [illegible] بھی پیدا ہو گئے جو ہندو مت اور اسلام کے مجموعہ مرکب تھے۔ بنگال میں فرقہ "ستیا پیر" (سچا پیر) کا واحد مقصد ہی یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان یکجا ہو کر آپس میں صلح اور محبت کی زندگی بسر کریں۔

خاندانِ تغلق، خاندانِ سیّد اور خاندانِ لودی کے سلاطین کے زمانہ میں تعلیمِ تصوّف کے ساتھ ساتھ ویدانت اور تصوّف میں اتحاد پیدا کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ سیّدوں اور لودیوں کے عہدِ سلطنت (از ۱۴۱۴ء تا ۱۵۲۶ء) میں مذاہب اسلام اور ہندو کی آمیزش کی تحریک عوام میں اس قدر بڑھ گئی کہ مخالفت اور شاہی عتاب کے باوجود بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہ زمانہ ابتری اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ بنگال برائے نام دہلی کے ماتحت تھا۔ کشمیر۔ گجرات۔ جونپور۔ مالوہ۔ خاندیش۔ ملتان۔ سندھ وغیرہ ریاستیں خود مختار ہو گئی تھیں۔ گولکنڈہ۔ بیجاپور۔ احمد نگر۔ بیدر۔ اور برار کی پانچ حکومتیں مسلمان تھیں لیکن پانچوں کی پانچوں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ رہتی تھیں۔ پس ملک کی فضا مذہبی رواداری اور وحدتِ ادیان کی تحریک کے موافق تھی۔ خاندانِ سیّد کے عہد میں ایک اسمٰعیلی مبلّغ پیر صدر الدین ۱۴۳۰ء میں سندھ آیا۔ اُس نے ہندوانہ نام اختیار کر لیا اور یہ تعلیم دینے لگا کہ حضرت علی ہندوؤں کے دس اوتاروں میں سے تھا اور کہ وہ وشنو کا اوتار تھا۔ اور حضرت محمد برہما تھا اور حضرت آدم شو تھا۔ بالائی سندھ کے علاقہ کے قصبوں اور گاؤں کے باشندے اُس کے مرید ہو گئے۔ اس نے کچھ کے علاقہ میں بھی اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ وہاں سے جنوب کی جانب یہ فرقہ بمبئی اور گجرات کے صوبوں میں پایا جاتا ہے۔ اب "خوجہ" جماعت مغربی ہند کے تمام تجارتی شہروں میں اور بحرِ ہند کے ساحلی مقاموں میں پائی جاتی ہے۔ اسمٰعیلیوں نے ایک اور مبلّغ نور الدین بھیجا جس نے اپنا نام نورستاگر رکھ لیا۔ اُس نے گجرات کی تین نیچ ذاتوں کو مسلمان کر لیا۔ ایک اور شخص عبد اللہ نے بوہروں کے فرقہ کو مسلمان بنا لیا۔ یہ لوگ شیعہ تھے گو

سلطان فیروز شاہ کے زمانہ میں ان میں سے بعض اہلِ سنّت ہو گئے۔ پیر امام شاہ نے کوچ اور گجرات کے ہندو کاشتکاروں کو پندرھویں صدی کے دوسرے نصف میں مسلمان کر لیا۔ جب ۱۵۱۲ء میں وہ مر گیا تو اس کی قبر ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی زیارت گاہ ہو گئی۔

ہندوستان میں صوفیہ کی تحریک گیارھویں صدی میں شروع ہوئی اور ہر صدی کے گذرنے پر پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتی گئی۔ اس تحریک کے ساتھ ساتھ وحدتِ ادیان کے نظریہ کے معتقد بھی بڑھتے گئے۔ یہ بات اسلامی شریعت کے علما اور فقہا کو اور بعض سلاطینِ دہلی کو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ فیروز شاہ تغلق ان سلاطین میں سے ایک تھا۔ جیسا ہم اِس حصّہ کے بابِ سوم کی فصل سوم میں لکھ آئے ہیں وہ نہایت کٹر مسلمان تھا، ایسا کہ بعض اس کا اولیا میں شمار کرتے ہیں۔ ایک معاصر تو یہاں تک مبالغہ کرتا ہے کہ وہ اس کو "خصائلِ انبیا" رکھنے والا اور اس کے ہر کام کو "بہ الہامِ اللہ" قرار دیتا ہے! اس قسم کا مذہبی سلطان یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان عوام ہندو مت اور ہندو سماج کے خیالات سے اس قدر متاثر ہو جائیں کہ اُن کی جانب بالکل ہی راغب ہو کر وحدتِ ادیان کے نظریہ کو قبول کر لیں۔ اس کا عہد ایسے زمانہ میں تھا جب تصوّف نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ بہت مخربِ اخلاق رسمیں اور خلافِ اسلام بدعتیں عوام میں پھیل گئی تھیں۔ مسلمان اور غیر مسلم عورتیں کثیر تعداد میں مزاروں پر اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لئے جاتی تھیں اور اس کا اکثر اوقات نتیجہ یہ ہوتا کہ حیا سوز حرکتیں واقع ہو جاتیں۔ اُن میں نومسلم عورتیں بھی ہوتیں جنہوں نے اپنے قدیمی خیالات اور توہمات کو نہ چھوڑا تھا۔ پس فیروز شاہ نے عورتوں کا مزاروں پر جانا حکماً منع کر دیا اور یہ بھی حکم

دیے دیا کہ ہندو عورتیں بھی مزاروں اور مندروں میں نہ جایا کریں کیونکہ مندر بھی شیطانی افعال کے مرکز ہو گئے تھے۔

فیروز شاہ نے اُن تمام تحریکوں کو سختی سے روک دیا جو مسلمان عوام کو ہندو مت کی طرف راغب کرتی تھیں۔ اُس نے بھگتی کی تحریک کا اور وحدتِ ادیان کے عقیدہ کا انسداد کرنے کا عزم کر لیا۔ مثلاً نواہنوں کا قتل بھگتی کی تحریک کو روکنے کے لئے کیا گیا۔ نواہنوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وُہ صاف واضح اور غیر مُبہم الفاظ میں فقط اسلام کو قبول کرنے کا اعلان کرے۔ اُس کے انکار پر اُس پر ارتداد کا فتوےٰ لگایا گیا اور فیروز شاہ نے شریعتِ ارتداد کے قانون کے مطابق اُس کو قتل کر دیا۔ ایک دفعہ ایک مسلمان عورت ہندو ہو گئی تو اُس نے عورت کو بھی قتل کروا دیا۔ فیروز شاہ تغلق نے ہر ممکن طور پر کوشش کی کہ مسلمان عوام کے مذہب میں جن توہمات۔ قبر پرستی۔ پیر پرستی وغیرہ اور ہندوؤں کے خیالات اور رسُوم وغیرہ نے دخل پا لیا تھا اُن کا قلع قمع کر دے۔

سلاطینِ دہلی میں سکندر لودی سب سے زیادہ متعصّب اور کٹر مسلمان تھا۔ اُس کی سلطنت کے اصُول (جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں) حکومتِ الٰہی کے اصُول تھے۔ اُس کے محکمۂ احتساب کے افسر ہر جگہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ کوئی غیر مشروع بات کہیں ہونے نہ پائے۔ وُہ لوگوں سے اِس قسم کے مچلکے لکھوا لیتے تھے کہ وُہ ایسی باتوں کا ارتکاب نہ کریں گے جو شریعت کے مُوجب جائز نہ ہوں۔ اِس قسم کی طبیعت رکھنے والا مطلق العنان سُلطان کب گوارا کر سکتا تھا کہ مسلمان ہندوانہ خیالات کو اپنائیں۔ اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ عوام النّاس کا رجحان

وحدتِ ادیان کی طرف نہ جائے لیکن یہ تحریک اُس کے روکنے سے بھی نہ رُکی۔ ہندو اسلام کے اصُول کی بہتر تعلیم حاصل کرنے کے لئے جُستجو کرتے تھے اور سکندر کے شاہی فرمان اِس بات کو نہ روک سکتے تھے۔ ایک صدی کے اندر اندر ہندوؤں نے فارسی زبان کے اندر مسلمانوں کی سی قابلیت حاصل کر لی چنانچہ رائے آنند جیسے ہندو گلستان بوستان اور مُصلح فارسی سے اچھی طرح واقف تھے۔

سکندر لودی کے زمانہ میں صُوفیہ کے گروہ کے اخلاق گر گئے تھے۔ عشقِ حقیقی اور ضبطِ نفس وغیرہ خیالات بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے اور اُن کی جگہ عشقِ مجازی اور نفس پرستی نے غصب کر لی تھی۔ نشہ کی زندگی اور مستی اسلام اور مُلک کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ بھگتی کی تحریک سیلاب کی مانند ہر چہار طرف بڑھ رہی تھی۔ تمام مُلک میں وحدتِ ادیان کا بول بالا ہو رہا تھا۔ تخت نشینی کے بعد سکندر کے دربار میں ایک برہمن لودھن نام پیش کیا گیا جو ہر ایک کو علانیہ کہتا تھا کہ اسلام حق پر ہے اور ساتھ ہی میرا مذہب بھی برحق ہے۔ سکندر نے مُلک کے مختلف حصّوں سے علما کو اکٹھا کیا اور اُن سے فتوےٰ طلب کیا۔ اُنہوں نے فتوےٰ دیا کہ لودھن برہمن کو اسلام کی دعوت دی جائے اور اگر وُہ یہ دعوت قبُول نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ اِس کے انکار پر وُہ قتل کیا گیا۔ (طبقاتِ اکبری جلد اوّل صفحہ ۳۲۲-۳۲۳) سکندر نے علماء کو اپنی حکومت کے دُور دراز مقامات سے اس لئے طلب کیا تھا کیوں کہ یہ تحریک مُلک کے طُول و عرض میں سُرعت کے ساتھ پھیل گئی تھی اور سکندر اِس مقدمہ کو آزمائشی مقدمہ

بناکر اس تحریک کو ہر جگہ روکنا چاہتا تھا۔ لیکن وحدتِ ادیان کی تحریک نہ رُکنی تھی اور نہ ہی رُکی۔ چنانچہ مشہور چشتی صوفی شیخ عبد القدوس کہتا ہے کہ "یہ کیا شور اور غوغا پھیلا دیا گیا ہے کہ کوئی مومن ہے اور کوئی کافر ہے۔ کوئی مطیع ہے اور کوئی گنہگار ہے۔ کوئی راہِ حق پر ہے اور کوئی گمراہ ہے۔ کوئی مسلمان اور پارسا ہے اور کوئی ملحد ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی لڑی کے دانے ہیں۔" سکندر کے رُو برُو ایک اور شخص پیش کیا گیا جس نے کہا کہ ہم پہلے مسلمان تھے اور عثمانی نسل کے تھے لیکن اب میں زُنّار دار ہو گیا ہوں۔ وہ بھی قتل کیا گیا۔ سکندر کی ہمہ تن کوششوں کی وجہ سے اُس کی اٹھائیس سالہ حکومت میں بھگتی اور وحدتِ ادیان کی تحریک قدرے ٹھٹک گئی۔ لیکن اُس کی موت کے بعد اکبر کے عہد تک یہ تحریکیں بیش از بیش زور پکڑتی گئیں اور سیلاب کی طرح ہر مذہب و ملت کو اپنے آگے بہا کر لے گئیں۔ ہر سلطان فیروز تغلق اور سکندر کا سا نہ تھا۔ عام طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سلاطین دہلی (حتّٰی کہ بلبن جیسے سلطان بھی) مزاروں میں جانا موجب سعادت سمجھتے تھے اور اُن کی مرمت اور آراستگی میں روپیہ پانی کی طرح بہا دیتے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی سلطنتِ دہلی کا ہر امیر مزاروں کو جاتا تھا اور فخریہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر سلطان وقت کی پیروی کرتا تھا۔ بعض مسلم سلاطین ہندوؤں کے استھانوں کی بھی یاترا کرتے تھے۔ مثلاً سلطان زین العابدین بادشاہِ کشمیر (از ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) ایک نیک طینت بادشاہ تھا جس نے امرناتھ کی یاترا کی

اور اس تیرتھ کی راہ میں مسافر خانے بنوائے۔ کشمیر کے مسلمان بادشاہوں (از ۱۳۳۹ء تا ۱۸۱۹ء) میں سے کسی نے کسی شخص کو کبھی اس استھان کی یاترا سے منع نہ کیا۔ اگرچہ یہ استھان شو مت والوں کا گویا مکہ ہے۔

(ٹائمز آف انڈیا۔ ۳۰ اگست ۱۹۵۱ء)

(۵)

وحدتِ ادیان کی تحریک کا ہندوستان کی بکھری ہوئی کلیسیاؤں پر کیا اثر پڑا؟ ہم گذشتہ ابواب میں بتلا چکے ہیں کہ نسطوری کلیسیا کے مبلغین ان صدیوں میں پہلی سی تعداد میں نہیں آ سکتے تھے پس سلطنت کے ایام میں کلیسیاؤں کے شرکاء انجیل جلیل کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے مختلف اقسام کے اوہام اور توہمات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ مارکوپولو جس نے ۱۲۸۰ء اور ۱۲۹۵ء کے درمیان دو دفعہ ہندوستان کا سفر کیا تھا لکھتا ہے کہ "عیسائیوں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد دور دور سے مقدس توما رسول کے مزار کی زیارت کے لئے مائلاپور آتی ہے۔ یاتری اپنے ساتھ اُس جگہ کی مٹی تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں جہاں رسول شہید کیا گیا تھا۔ یہ مٹی پانی میں گھول کر مریضوں کو پلائی جاتی ہے اور اس علاج سے بہت بیماروں کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ مائلاپور میں حیرت انگیز معجزات ہر روز صادر ہوتے ہیں۔" اس کی تحریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کلیسیا اوہام پرستی میں مبتلا تھی اور دیگر مذاہب کے عقائد و رسوم نے اس کو بہت متاثر کر رکھا تھا۔ مقدس توما کے مزار کی عبادتوں میں مسیحی۔ ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ چودھویں صدی کے پہلے نصف

ہیں پادری جورج ٹینس رحیبن کا ہم باب سوم کی فصل سوم میں ذکر کر آئے ہیں، لکھتا ہے "ہندوستان کے اس حصہ میں (یعنی کراچی سے شمالی ناگا پار تک) کہیں کہیں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں لیکن وہ صرف نام کے ہی مسیحی ہیں - ان کو نہ بپتسمہ ملا ہے اور نہ ان کو مسیحیت کی کچھ خبر ہے - ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ خداوند مسیح میں اور مقدس توما میں تمیز نہیں کرتے - وہاں میں نے تین سو کو بپتسمہ دے کر کلیسیا میں شامل کر لیا ہے - اس تعداد میں بہت سے مسلمان اور مُبت پرست بھی شامل ہیں"۔ ڈاکٹر جارج ہاولیس لکھتا ہے "یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مت کے معتقدات اور توہمات نے مسیحی کلیسیا کے شرکاء کو متاثر کر رکھا تھا - اس تواریخی حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے حق تو یہ ہے کہ جب دو مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو ان کا ایک دوسرے کو متاثر کر دینا ایک ناگزیر امر ہو جاتا ہے" (صفحہ ۵۵۰)۔

وحدت ادیان کے نظریہ اور بھگتی مذہب نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو باہم اگر اکٹھا کر دیا تھا۔ ہر مذہب کے استھان۔ زیارت گاہ اور مزار پر ہندوؤں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ سطور بالا میں ہم لکھ آئے ہیں کہ مقدس توما رسول شہید کے مزار پر عیسائی۔ مسلمان اور ہندو دُور دُور سے جمع ہو جاتے تھے اسی طرح ہندوؤں کے تیرتھوں پر مسلمان اور عیسائی جایا کرتے تھے اور مسلمانوں کے مزاروں پر ہندو اور مسیحی بھی جایا کرتے تھے۔ شمالی ہند میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں کوئی مزار ہو اور جہاں سب مذاہب کے لوگ جوق در جوق نہ جاتے ہوں۔ یہ مزار نہ صرف بڑے شہروں

میں واقع تھے بلکہ دُور افتادہ مقاموں اور چھوٹے قصبوں میں بھی پائے جاتے تھے، اور سب مرجع خلائق تھے۔ یہ پانزا کے مقام اور مزار معجزوں شفاعتوں اور دُعاؤں کی قبولیت کے لئے مشہور تھے پس عقیدت مند بغیر کسی مذہبی تمیز کے مزاروں کی تعداد میں پہنچ کر "درگاہ" میں اپنی عرضیں گذارتے اور منتیں مانتے تھے۔ چڑھاوے چڑھاتے تھے اور اپنی مُرادوں کو حاصل کرتے تھے۔ مثلاً جب قاضی حمید الدین ناگ پوری کا پوتا شرف الدین بابا فرید کی بیعت کرنے کے لئے اجودھن آیا تو اُس کی لونڈی نے (جو غالباً عیسائی مذہب رکھتی تھی اور جس کو اُس نے ایک صد ٹنکہ کے عوض خریدا تھا) بابا فرید کو ایک رُومال تحفہ کے طور پر بھیجا اور کہلا بھیجا آپ دُعا کریں کہ میرے دل کی آرزو پوری ہو جائے۔ اس پر بابا فرید نے کہا "خدا اس کو آزادی عطا کرے"۔ یہ سُن کر شرف الدین نے اُس کو آزاد کر دیا۔

وحدت ادیان کی تحریک مضبوطی پکڑتی گئی اور ہندو مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے معتقدات اور وہمیات سے متاثر ہوتے گئے اور ہر سماج کے توہمات اور دیگر بُرائیوں نے دُوسری سماجوں میں دخل حاصل کر لیا۔ اس دَور میں مسلمانوں کی عام سماجی حالت اور اخلاقی زندگی بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ اس کا اثر قدرتاً عیسائی کلیسیاؤں کے اخلاق و عقائد اور رسوم پر پڑا جو پہلے ہی توہمات میں مبتلا تھیں۔ ہر سماج میں تعویذ۔ گنڈے عام تھے۔ دیووں۔ جنوں کے فرضی قصوں۔ قبر پرستی اور رسوم پرستی وغیرہ

نے مسیحی کلیسیاؤں کے دین و ایمان اور ذہن و اخلاق کو بھی پست کر رکھا تھا۔ وحدتِ ادیان کی تحریک کے سیلاب کے آگے مسیحی کلیسیائیں ثابت قدمی سے کھڑی نہ رہ سکیں۔ ان کے ایمان عصبیّت اور عقائد کی دیواریں ایک ایک کر کے گر گئیں اور جہاں تک عقائد و اخلاق کا تعلق تھا مسیحی کلیسیاؤں کے عقائد و اخلاق اور دیگر مذاہب کی جماعتوں کے عقائد و اخلاق میں تمیز نہ رہی۔ چنانچہ ڈاکٹر جی۔ اے۔ گرائرسن (G.A.GRIERSON) لکھتے ہیں "چودھویں صدی میں ہندوستان کے بعض نسطوری مسیحی اپنے ایمان اور عقائد سے اس قدر بے بہرہ تھے کہ اُن کی عبادتوں میں مسیحی، ہندو اور اسلامی عناصر ہُوا کرتے تھے (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۷ء۔ صفحہ ۳۱۲)۔

صوفیہ کے گروہ کی موجودگی۔ بھگتی کی تحریک اور وحدتِ ادیان کے نظریے کے پس منظر میں ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ شمالی ہند کی کلیسیاؤں کی زندگی پر ان تینوں نے کس قدر اثر کیا ہوگا۔ عیسائی ایک ذلیل اقلیّت تھے جن کو کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندو ان کو ملیچھ اور مسلمان ان کو ناپاک مشرک اور کافر خیال کرتے تھے۔ اسلامی سلطنت کے صدیوں کے بُرے سلوک نے ان کو بُزدل اور پریشان بنا دیا تھا۔ ان کی خود اعتمادی جاتی رہی تھی۔ وہ اپنا مذہبی جوش کھو بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انجیل تک نہ تھی جو ان کے ایمان کو استقامت دیتی۔ وہ اپنے بشپوں اور قسیسوں اور دین کے دیگر ہادیوں کے بغیر کلیسیائی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان کے ایمان کے قلعہ کی دیواروں پر رخنے پڑ گئے۔ ان کے

ایک طرف سلطنت کا دباؤ تھا دُوسری طرف گروہِ صُوفیہ کی تبلیغ و تعلیم تھی۔ اور پھر یہ تعلیم بھی ایسی تھی جو اُن کے اپنے عقائد کی سی تھی۔ صُوفیہ محبت۔ اُخوّت و مساوات پر مسیحیت کی طرح زور دیتے تھے اور فقر و فاقہ کی زندگی خانقاہوں میں اُسی طرح گذارتے تھے جس طرح مسیحی راہب درویش اور قسیس گذارتے تھے۔ پس پریشان کُن حالات میں اور سیاسی انقلابات میں مسیحی اس گروہِ صُوفیہ کی طرف رجوع کرتے ہوں گے اور اُن سے اپنے دُکھڑے بیان کر کے ہمدردی اور محبت حاصل کرتے ہوں گے۔ خانقاہوں میں ظالم حکّام سے پناہ لیتے ہوں گے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ صُوفیہ کی تعلیم سے متاثر ہو کر بہت اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہوں گے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ انجیل کی تعلیم کے نُور سے محرُوم ہو کر عیسائی کلیسیائیں توہمات میں پڑ گئی تھیں اور گروہِ صُوفیہ میں بھی اُن کو اپنے توہمات کا سامان مل گیا۔ یہ صُوفیہ گو عالم تھے لیکن توہمات میں مبتلا تھے۔ مثال کے طور پر بابا فرید کو لے لو۔ گو وُہ بڑے پایہ کا عالم تھا لیکن ہجُوم کے ہجُوم اُس سے تعویذ لینے کے لئے آتے تھے جن کو وُہ اپنے مُرشد شیخ قطب الدین قطب الاقطاب سے استفسار کرنے کے بعد تقسیم کرنے لگ گئے۔ ایک دفعہ خُود بابا فرید کی داڑھی کا بال جو گِر گیا تو نظام الدین اولیاء نے اُس کو اُٹھا لیا اور بابا صاحب کی اجازت سے تبرّکاً تعویذ کے طور پر رکھ لیا۔ یہ تینوں نامور صُوفی بزرگ عالم تھے لیکن توہمات میں گرفتار تھے۔ پس جب جاہل مسیحی مرد اور عورتیں صُوفیہ کی خانقاہوں اور مزاروں پر آتیں تو

گنڈے تعویذ حاصل کر کے، وہ منتیں مان کر اپنی رُوحانی حاجتوں کو پُورا کر لیتیں۔ کیونکہ اُن میں مسیحی رُوحانیت کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔

ایک زمانہ وُہ تھا جب کلیسیا شمالی ہند میں عُروج پر تھی اور مسیحیت کا آفتاب اپنی شعاعوں سے تمام مُلک کو منور کر رہا تھا لیکن سلطنت کے ایام میں مختلف وجُوہ کے باعث (جن کا ہم گذشتہ صفحوں میں ذکر کر آئے ہیں) جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا کلیسیا کو زوال آتا گیا اسلامی دَور میں ممالکِ ایشیا اور شمالی ہندوستان کی کلیسیاؤں میں وُہ تخلیقی قُوت نہ رہی تھی جو خُدا نے ان مختلف مُلکوں میں، ان کو زمانۂ قدیم ہی سے عطا فرمائی تھی۔ فتنہ اور فساد۔ لڑائی اور جنگ اور پریشانی کی فضا جدّتِ طبع اور تخلیقی کام کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے صدیوں کی پستی اور غلامی انسانی ذہن کے قواء کو اور بالخصوص اس کے تخلیقی قواء کو مُعطل کر دیتے ہیں۔ کلیسیا کے شرکاء ہر مُلک میں قعرِ مذلت میں پڑے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ وُہ بے بس اور مجبُور تھے۔ پس ان سے یہ اُمید کرنا عبث ہے کہ وُہ شمالی ہند کے مختلف مذاہب کے فلسفیانہ تصورات کی جانچ پڑتال کر کے ان کو چھان بین کے بعد کوئی تعمیری صُورت دیتے یا ان کی اصلاح کرتے یا ان میں جوشیلے طور پر اشاعت و تبلیغ کا کام کرتے۔ سیاسی۔ سماجی اور اقتصادی ذلت اور غُلامی کا اثر انسان کی زندگی کے ہر پہلُو پر پڑتا ہے لیکن جب زندگی کے چشمے ہی خُشک ہو جائیں اور جان سے عزیز ایمان۔ مُعتقدات، عبادات وغیرہ ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے رُخصت ہوتے نظر آئیں تو انسانی ذہن و فکر رسا میں قُدرتی طور پر زوال ہو جاتا ہے۔ بہر سبب، غلامی۔

محکُومی اور پستی کی حالت صدیوں تک نسل در نسل جاری رہے تو زوال کا ہونا ایک یقینی امر ہو جاتا ہے۔ ہر جگہ قحط الرجال پڑ جاتا ہے۔ مفکر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو ان کی آواز ماضی کے مفکرین کی صدائے بازگشت ہی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں بجائے تعجب نہیں کہ سلطنت دہلی کے ایام میں بھی کلیسیا ہندو فلاسفروں اور دوسروں کو زیادہ منظم اور تعمیری طور پر متاثر نہ کر سکی۔ یہی غنیمت ہے کہ جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں جنوبی ہند کی کلیسیاؤں کی طفیل مسیحیت ہندوستان کو اور مغربی ایشیا کے ممالک کی طفیل وُہ اسلام کو شمالی ہندوستان میں کسی حد تک متاثر کر سکی۔ لیکن عام طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ کلیسیا شمالی ہند میں اپنے پرانے دستورات و رسُوم اور قدیم عقائد کو ہی چھاتی سے لگائے رہی۔ اس کی رُوحانیت کے نشانات، مرورِ زمانہ کے ساتھ مٹتے چلے گئے یہاں تک کہ ہندو مت اور عقائد کے تصورات اور توہمات اور اسلامی صُوفیانہ و خیالات اور عقیدے اور بھگتی کے اعتقادات اُلٹے شمالی ہند کی کلیسیا کو متاثر کرتے چلے گئے۔

60. TOYNBEE, A.J. .. A Study of History. Abridgement of vols. 7—8 by C.D. Somervell. 1957.
61. TRITTON, S. .. The Caliphs and their Non-Muslim Subjects.
62. UNDERHILL, E. .. Mysticism.
63. WHERRY, E.M. .. Islam and Christianity in India and the Far East.
64. WESTCOTT .. Kabir and the Kabir Panth.
65. WRIGHT, T. .. Early Christianity in Arabia. 1855.
66. Walker, W. .. A History of the Christian Church.
67. WELLS, H.G. .. A Short History of the World.
68. YULES .. Travels of Marco Polo.

Mussorie, N. India. Barakat Ullah.

August. 16th, 1960.

DMP, LAHORE

پی۔ آر۔ پی۔ ایس پریس لاہور میں باہتمام پرنٹر و پبلشر مسٹر
وی۔ ایس۔ کے فضل سیکرٹری پنجاب ریلجس بک سوسائٹی۔
انارکلی۔ لاہور چھپ کر شائع ہوئی۔

18. FURQUHAR .. Outline of the Religious Literature of India.
19. GIBBON .. Decline and Fall of the Roman Empire.
20. GILLAUME, A. .. Legacy of Islam.
21. HOWARTH, H.H. .. History of the Mongols. Part 3 (The Mongols of Persia). 1888.
22. HOWELLS, G. .. The Soul of India.
23. ISHWARI PARSHAD .. History of Mediaeval India.
24. IRVINE .. The Indian Empire.
25. IQBAL .. The Development of Persian Metaphysics.
26. JOHANNS, F. .. To Christ through the vedanta. Part I Sankra.
27. JOHANNS, F. .. To Christ through the Vedanta. Part 2. Ramanuja.
28. JOHANNS, F. .. To Christ through the Vedanta. Part 3. Vallabha.
29. JOHANNS, F. .. To Christ through the Vedanta. Part 4. Chaitanya.
30. KHUDA BAKHSH, S. Politics in Islam. Calcutta 1920.
31. KREMER .. Contribution to the History of Islamic Civilization.
32. KANWAR SAIN .. Indo-Iranian Relations and their Reciprocal Influences.
33. LANE-POOLE .. Mediaeval India (Story of the Nations).
34. LAMB, H. .. Genghis Khan.
35. LAMB, H. .. Tamerlane.
36. LATOURETTE, K.S. .. History of the Expansion of Christianity. Vol. 2.
37. .. Mediaeval India, Aligarh Vol. I Nos. 3 & 4.
38. McGIFFORT, A.C. .. A History of Christianity in the Apostolic Age.

39. MINGANA .. Early Spread of Christianity in India.
40. MINGANA .. Early Spread of Christianity in Central Asia and the Far East.
41. MARGOLIOUTH .. Early Development of Mohammedanism.
42. MARGOLIOUTH, D.S. Mohammedanism. Home University Library.
43. MUIR, W. .. Alkindy.
44. MUIR, W .. The Caliphate.
45. NEALE .. History of the Holy Eastern Church. 1926.
46. NIZAMI, K.A. .. The Life and Times of Shaikh Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar.
47. NICHOLSON .. Literary History of the Arabs.
48. OGILVIE, J.N. .. The Apostles of India.
49. PRAWDIN, M. .. The Mongol Empire: Its Rise and Legacy. Trans. by E. & C. Paul, 3rd. Impression 1953.
50. RAINY, R. .. The Ancient Catholic Church.
51. RADHA KRISHNAN, S. Indian Philosophy.
52. RADHA KRISHNAN, S. Occasional Speeches and Writings. 1st. and 2nd. series.
53. STEWART .. Nestorian Missionary Enterprise.
54. SWEETMAN, J. Windrow. Islam and Christian Theology, London, part I, vol. 1. 1945; part I, vol. 2, 1947; part 2, vol. 1, 1955.
55. SARKAR, J.N. .. Chaitanya's Life and Teachings.
56. STANLEY, A.P. .. Lectures on the History of the Eastern Church.
57. SMITH, V. .. Oxford History of India. 1920.
58. STEEDMAN .. Jhang Settlement Report.
59. SUBHAN, J.A. .. Sufism, its Saints and Shrines.

ASIAN AND NORTH INDIAN CHURCHES IN MIDDLE AGES.

List of books consulted

The following books in English have been consulted in the preparation of this volume. The names of books in Oriental languages are given in the text.

1. ARNOLD, Thomas .. Preaching of Islam.
2. AHMAD SHAH .. The Bijak of Kabir.
3. AMEER ALI .. The Spirit of Islam.
4. BARNETT .. The Heart of India.
5. BROADBENT, E.H. .. The Pilgrim Church.
6. BROWNE, L.E. .. The Eclipse of Christianity in Asia. 1933.
7. BELL, R. .. The Origin of Islam in its Christian Environment. 1926.
8. BOER, T.J. .. History of the Philosophy of Islam.
9. BHANDARKAR .. Vaisnavism, Saivism & Minor Religious Systems.
10. CARPENTER .. Theism in Mediaeval India.
11. DUESSEN .. The System of Vedanta.
12. .. Encyclopedia of Religion and Ethics.
13. .. Encyclopedia of Islam. 1915.
14. .. Encyclopedia Britannica.
15. ELPHINSTONE .. History of India. 9th, ed. 1911.
16. ELLIOT, Charles .. Hinduism and Buddhism. 2 vols.
17. ELLIOT .. History of India as told by its own Historians. Edited by Dawson. 8 vols.